Call No.................. Acc.No..................

1 00 for over-night
oks per day shall be
charged from those
who return them late.

book and will have to
replace it, if the same
is detected at the
time of return

نے جنگل جیسے مطالعے کو غالباً اس لئے ضروری نہ سمجھا کہ وہ بازار میں چلتے ہوئے سکوں کے ذریعے اپنی کلاسیکی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

"دھوپ، سمندر، سایہ" اسی صلاح الدین پرویز کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں، کسی بھی تنقیدی یا ادبی فلسفے سے ماورا، ایسی انفرادی کائنات کا اظہار ہیں جو علامہ اقبال، یا ترقی پسندوں جیسے بڑے موضوعات کے بغیر، بڑی یا مختلف یا جدید تر شاعری کی کائنات ہے۔ صلاح الدین پرویز کا یہ مجموعہ ایک نئے ادبی اسلوب اور طرزِ فکر کی بنیاد ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے شعراء، اس اسلوب کو اختیار کرنے یا اس کے مماثل آنے کی جسارت کر سکیں گے، لیکن پرویز نے اس مجموعے کے ذریعے، اردو شاعری کو ایک نیا وقار عطا کیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی علامتوں، استعاروں اور منفرد اسلوب کے باعث جدید ادب کی تاریخ میں، دوسرے شعراء سے بالکل الگ اور منفرد ہی رہیں گے۔

"دھوپ، سمندر، سایہ" کی نظموں کے مطالعے سے، موجودہ عہد کے کئی اہم ادبی سوالات کا جواز بھی میسر آتا ہے۔ مثلاً جدید شاعری پر موضوعات کی یکسانیت کے علاوہ اس MONOTONY کا الزام بھی ہے، جو تمام جدید شعراء کو کچھ مقررہ تنقیدی اصطلاحات کا اسیر بنا دیتی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے شعراء، اپنا وژن کھو چکے ہیں، ان کے الفاظ بھی محدود ہیں، اور ان کا ذائقہ زندگی کے وسیع تر منظر کے ذائقوں سے محروم ہے۔ صلاح الدین پرویز کی نظمیں، موجودہ عہد کی شاعری پر عاید ہونے والے ایسے ہی بے شمار اعتراضات کو رد کرتی ہیں۔ ان نظموں میں نئی لفظیات کے علاوہ ایک ایسے غیر مشروط ذہن کی کارفرمائی ہے، جس کا رشتہ، صرف الفاظ کی چاشنی سے نہیں، بلکہ اس احساس اور آہنگ سے ہے جو نئے سے نئے اسلوب میں، اور نئے سے نئے آہنگ میں اپنا آزادانہ اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ پرویز کا ذہن لامحدود اور بے کراں ہے اور پرویز کے شعری کردار کو یہ آگہی حاصل ہے کہ جدید عہد کا انسان، آج کی منطق آج کی دانشورانہ اصطلاحات اور فلسفوں سے آگے نکل کر نیچر کی اس ہمہ گیر ابدیت سے اپنا رشتہ جوڑ کر اس لافانی وژن کو حاصل کر سکتا ہے، جس میں پوری کائنات انسان کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ اس مجموعہ کی پہلی نظم "گھر" اسی VISION کا اظہار ہے:

"کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
اداسی کے بادل سے ہیں سر کے درختوں کی ٹہنیاں مڑتے"

بدن کی انگیٹھی سے کوئی جلا ادھ بجھا کوئلہ توڑ لیتے
کوئی تو درختوں سے آواز دیتا
تو جنگل میں رکتے
گھنی جھاڑیوں کے اندھیروں میں آنکھوں میں بھرتے
گھنی جھاڑیوں کے اندھیروں میں آنکھیں بناتے
پرندوں کی ننھی دعاؤں کو آنکھوں سے چنتے
پرندوں کی ننھی دعاؤں کی شبنم سے ہونٹوں کی پیاسی بھگوتے

(گھر)

اس نظم میں جنگل اس فطرت اور زرخیزی، نیز آزادہ خرامی کی علامت ہے، جو انسانی روح کے مسکن سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ پرویز نے انسانی احساس کی اداسی کو اور انسانی جسم کی حرارتوں کو اس ہمہ گیر وژن کا حامل بنایا ہے، جہاں انسان، اس کا جسم اور احساسات، فطرت کے مظاہر سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں پرویز کا وژن، ایک بصیرت ہے۔ جیسے وہ بصارت سے ہم آہنگ کرتے ہوئے گھنی جھاڑیوں کے اندھیروں کو روشنی اور آنکھوں کا استعارہ بنانا چاہتے ہیں۔

صلاح الدین پرویز کی نظموں میں اس عہد کے انسان کا ایک اہم DILEMA بھی موجود ہے۔ جیسے وہ اپنے کائناتی وژن اور نیچر سے ہمہ تن وابستگی کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں ______ نئے انسان کا ڈائیلیما یہ ہے کہ وہ تہذیبوں کی رخشندہ راہوں پر سفر کرتے ہوئے، اس عالمِ فطرت سے دور ہو چکا ہے، جو اس کے احساس، جذبے اور روح کا اصلی گھر تھا۔ اس عالم بیگانگی میں وہ اپنے قدیم احساس کی بازیافت کے لئے ماضی کی جانب مراجعت نہیں کر سکتا، اس مراجعت کا مطلب ہوگا، ماقبل تہذیب کی زندگی۔

پرویز کی نظموں میں، گھر، جنگل، دھوپ، سمندر اور سفر کے استعارے اسی وژن کی جانب نگراں ہیں کہ عہدِ نو کا انسان اپنی روح کا مسکن تلاش کرنے کے لئے خود کو، دانشِ حاضر کے فریب سے نکال کر اپنی بنیادی معصومیت کی جستجو کرے۔ تلاش معصومیت کا یہی عمل، پرویز کی نظموں میں کہیں سادگی میں پُرکاری پیدا کرتا ہے اور کہیں وہ IRONY جس میں پرویز کا شعری کردار، فطرت کے پستانوں سے چپاں، کسی کھلنڈرے بچے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ نظموں کے مطالعے سے اس وژن کو بخوبی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

دھیرے دھیرے شام آرہی ہے
رات کی کتابوں میں
پت جھڑوں کی سانسوں میں
دھندلی دھندلی آنکھوں میں، رات بڑھتی جا رہی ہے
نیند ایک گاؤں ہے
نیند کی تلاش میں
آ ـــــ وازیں آرہی ہیں
پا ـــــ ؤں کھڑاؤں پہنے مست مست گا رہی ہیں۔

(شام)

میں ایسے گھر میں رہتا تھا، رات گئے تک سوتا تھا
صبح ہوئی، جب نیند میں میری
شمس ٹکے تھے اِن آنکھوں میں
آنکھیں سایہ دیتی تھیں
دانتوں کی ہلکی سی لہر سے
سارے سمندر، سارے پانی
دو آنسو آنکھوں کے بن کے
سجدے میں گر جاتے تھے

(دستک)

پرویز کی نظموں میں صبح و شام، رات اور دن، دھوپ اور جنگل اور موسموں کی کتاب کا تذکرہ، انسانی روح کے مسکن کا وژن ہے۔ انھیں احساس ہے کہ ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی ترقی یافتہ مشینی عہد کی اشیاء اور راحتیں، باطن کے خلا کو پُر نہیں کر سکتیں:

یہ ضروری نہیں
ہیٹ اپنے سروں پر جمائے
نئے اجنبی ریزروں کو چھپائے ہوئے پیٹھ میں
بارشیں اپنے کاندھوں پہ ڈالے ہوئے

سب نمازیں پہاڑوں سے لوٹیں
پرندے، کے ہونٹوں پہ دونوں زبانوں کو روکیں
دعا کے لئے ہاتھ باندھیں

خدا!
تو ہمارے لئے عاجزی سے بڑا
دوستی سے ذرا چھوٹے قد کا نبی بھیج دے
یہ ضروری نہیں

یہ ضروری نہیں

کیسے لوگ ہیں
گیس کے ہنڈے
اپنے کاندھوں پر رکھ کر بھی
پُچّے پُچّے
اس کے گلیاروں میں مرجاتے ہیں

بارآئیں
مٹی کے کوزوں میں
پہلے دودھ، دہی، پھر مٹی بن جاتی ہیں

پت جھڑ ایک ننت لوٹن ہے

عہد نو کی زندگی کو اپنے وژن کی لاآفاقی وسعتوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نظموں کی تخلیق، پروین کا وہ عظیم انسانی کارنامہ ہے، جس کی ذمہ داری آج کے شاعر اور آج کے تخلیق کار پر ہے۔ پروین کو احساس ہے کہ دنیا بھر کی عقل اور فراست اور فلسفیانہ قوتیں، یک جا ہو کر بھی ایک نظم نہیں بن سکتیں —— نظم ایک حیاتی لہر ہوتی ہے، اور شاعر اپنے تخلیقی وژن کے ذریعے، نظر کی وسعت اور دانش کی منطقی حدود سے آگے نکل کر، ایسی تخلیق کو جنم دیتا ہے، جس میں شعور، کم، اور باطن زیادہ قوت مند ہوتا ہے۔

باطن کے وژن اور تخلیقی جہت کو فراموش کر دینے کی غلطی، ان تمام جدید شعرا نے کی ہے، جو عہد حاضر کے انسان کو محض ایک منطقی قضیہ تصور کئے ہوئے تھے۔ [illegible] جدید شعرا از خود [illegible] اساس سے ہم آہنگ تصور کر لیتے [illegible]

سے آزاد نہیں رہ سکے۔ جدید شاعری کے فلسفہ طرازوں نے بھی وجودی مفکر سارتر کو اپنی منزل تصور کر لیا۔ سارتر نے چونکہ CONCEPT اور METHOD کی بحث کے ذریعے مارکسی وجودیت کے فارمولے اور مشروط یا COM-MITED ادیب کا تصور پیش کیا۔ اس لئے جدید شاعری کی بحثوں میں بھی صرف یہی منطقی موضوعات اصل محور بنے رہے۔ جب کہ وجودیت کے فلسفے کا وہ عظیم روحانیت پرست مفکر جدید شاعری کی بحثوں میں کہیں موضوع نہ بن سکا، جسے ہم مارٹن ہیڈگر (MARTIN HEIDEGER) کے نام سے جان سکتے تھے۔

ہیڈگر نے یہ تصور پیش کیا کہ جدید عہد کی کائنات میں انسان کو اپنی روحانی سربلندی اور سرشاری کے لئے، ایسے غیر دانش ورانہ انداز فکر کی ضرورت ہے، جو انسان اور اشیاء، انسان اور فطرت، انسان اور کائنات کے درمیان ایک نئے تخلیقی رشتے کو تلاش کر سکے، اور انسانی ذہن اس معصومیت کو دوبارہ حاصل کر سکے، جو صدیوں کی تہذیبی، عقلی اور فلسفیانہ موشگافیوں میں، نیست و نابود ہو چکی ہے۔ ہیڈگر نے یہ بھی بتایا کہ انسانی وجود کے اس جوہر کی تلاش و تخلیق کا کام، فلسفے کے ذریعے ممکن نہیں، بلکہ یہ کام صرف شاعر انجام دے سکتا ہے۔ ہیڈگر کے نزدیک، شاعر ہی وہ اظہار اور وسیلہ ہے، جس میں آنے والے دنوں کے لئے زندگی اور وجود کی عظمت، نیز اشیاء اور کائنات کے لئے مفاہیم کا سرچشمہ موجود ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ صلاح الدین پرویز ہیڈگر کے مطالعے سے مستفید ہوئے یا نہیں ـــــــ لیکن پرویز کی شاعری، ہیڈگر کے وجودی تصور کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔ پرویز کی نظموں میں وژن کی وہ منزل موجود ہے، جہاں شاعر، اشیاء اور کائنات کی ماہیت کو خود بیان نہیں کرتا۔ بلکہ اشیاء اور کائنات، خود پرویز کے تخلیقی وژن پہ اپنے منفرد مفہوم کو آشکار کرتی ہیں۔

اسی باعث پرویز کی نظموں میں انوکھے، اجنبی، نئے استعارے بھی ہیں، ایسا آہنگ بھی، جو ہر ایک نظم میں اپنی انفرادیت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ آہنگ کی یہ ہمہ گیری یکسانیت کو بھی ختم کرتی ہے۔ اور پرویز کی غیر معمولی خلاقانہ قوتوں کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔

صلاح الدین پرویز نے چونکہ یکسر غیر مشروط اور آزاد ذہن کے ساتھ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں کا آہنگ ـــــ ہمہ گیر اور کثیر الجہت ہے۔ اپنے آہنگ کی ہمہ گیری کے ساتھ صلاح الدین پرویز نے اشیا اور کائنات کے نئے رشتوں کو خود ان کے اپنے اظہاری وسائل کے ذریعے تخلیق کیا ہے۔ انسان، اشیاء اور کائنات کے مظاہر کس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو کر اپنے مفہوم کا اظہار کرتے ہیں، اس کی کچھ مثالیں، پرویز کی مختلف نظموں سے:

[illegible]

دودھ کی کٹوریوں سے سورجوں کی آتمائیں متھ رہی ہیں

(شام)

مرے لہو پہ لکنتوں کا بوجھ تھا
اور اب کہیں کہیں
بلندیوں کے ناز پہ
سمندروں کے خوف پہ
دھواں دھواں سا درج ہے
گلاب سی رقابتیں کہاں کہاں لکھی گئیں
گلاب سی رقابتیں مرے بدن میں گھل گئیں

(ایک رات کا منظر)

تھکی خلش خیال میں، گونجیں ہوا کی سردیاں
میرے بدن کی روشنی، لکھ دی کسی نے ریت پہ

(موسم)

صلاح الدین پرویز نے اس وژن کی تکمیل بھی کی ہے، جس کا آغاز ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کیا تھا ــــــ ایلیٹ نے اپنے عہد کے خرابے (WASTE LAND) اور کھوکھلے انسان (THE HOLLOW MAN) کو نئی تخلیقی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس وژن کو تلاش کیا تھا، جو عہد حاضر کی BORDOM سے، اور اس روحانی سربلندیوں اور سرشاری کا وژن تھا۔ جو مسیحو تصور اور حضرت عیسیٰ کے نئے IMAGE کو پیش کرتا تھا۔ صلاح الدین پرویز نے ایسی کئی نظمیں تخلیق کی ہیں جو عشقِ رسول کے علاوہ اسلامی فکر کے تابندہ نقوش کو پیش کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اور عہد ساز نظم "محمدؐ رسول اللہ" ہے۔ یہ عمومی طرز کی نعت نہیں ہے، بلکہ حضور مقبول کی زندگی، ان کے افکار، خدائے برتر سے ان کی قربت، اُمت کے احساس سے ان کی شفقت آمیز وابستگی، اور خود شاعر کے اپنے احساس کا وہ پہلو جو، حضور مقبولؐ ان سے حسن و جمال اور ان کی خصوصیات کو شاعر کی سوچ، افکار اور تصور سے ہم آہنگ کر دیتا ہے ــــــ اس نظم کا ہمہ گیر مفہوم ہے۔ اس نظم کے اظہاری سانچے نے حضور مقبولؐ کو ایسی شخصیت حامل اور ایسے "سراپا" کا پیکر بنا دیا ہے، جس میں ارضی مماثلوں کے استعارے بھی ہیں، اور سے بلند، الوہی کیفیات کو نمایاں کرنے والی علامتیں بھی۔ مثلاً:

وہ شام ابرو، وہ رات گیسو
وہ جسم چھایا، وہ چاند سا تھا
وہ آنکھیں شمعیں، وہ ہونٹ صبحیں

سفید پھولوں کا باغ نیارا
اداس بچوں کا باپ پیارا

کہ جس کی آنکھوں میں، ان کے غم
جاگ میں گا رہے تھے
وہ رحمتوں کا عظیم والی
وہ برکتوں والا آسمانی
وہ جنتوں کا حسین مالی

دعاؤں کے راستے بناتا
زمین کی گرمی پہ چل رہا تھا

حضورِ مقبول کی ذات سے شبِ معراج کا واقعہ منسوب ہے۔ اس تاریک سیارے سے اٹھ کر آسمانوں تک پہنچنے والی شخصیت کو بدروی نے صرف واقعہ معراج کے تذکرے تک ہی محسوس نہیں کیا۔ بلکہ فضا کی بیکراں خاموشی میں، خدائے برتر کے حضور پہنچنے والے پیغمبر کے وجود کو آسمانوں کی رفعتوں میں، اس طرح محسوس کیا ہے۔ جیسے خود شاعر کا احساس بھی آسمانوں میں سفر کر رہا ہے۔

صدا صدا، بے صدا فقیری
ہوا کے کاندھوں پہ چل رہی ہے
مگر بدن ڈر رہا ہے اس کا
صدا صدا، بے صدا فقیری
ہوا ہوا، بے ہوا سواری
بدن بدن، بے بدن نمازی
خموش، خاموش ہے خموشی

یہ مصرعے، جس الوہی کیفیت اور روحانی احساس کی زبان بن گئے ہیں، اس کا اظہار، نثر

کی کسی طویل طویل داستان میں بھی ممکن نہیں۔ شاعری کا یہی اعجاز ہے، جس کے اسرار ہمارے عہد میں صلاح الدین پرویز پر منکشف ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک، پرویز کا یہ مجموعہ ایک ایسی عظیم روحانی اور شعری دستاویز ہے، جس میں ہمارے عہد کے پامال، افسردہ اور عقل و فراست کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے آدمی اور فن کاروں کے لئے ذہنی اور روحانی آزادی کا محضر موجود ہے۔ □

("دھوپ، سمندر سایہ" سے)

صلاح الدین پرویز

"مری رات کھو گئی ہے کسی جاگتے بدن میں"

مجھے یوں جگائے رکھتا کہ کبھی نہ سونے دیتا
سرِ شام ہوتے ہوتے کوئی آکے یہ بتاتا
کہ خزاں برس رہی ہے مری نیند کے چمن میں
مری رات کھو گئی ہے کسی جاگتے بدن میں

مری رات، رات عالی، وہ حسب نسب پیاری
وہ گلاب چہرے والی، وہ رحیم زلفوں والی
وہ برے دنوں کی ساتھی، وہ اداس گل کیاری
مرے ساتھ رہنے والی، کہاں جائے گی دوانی
کہ نہ گھر ہے اس کا کوئی، کہ نہ گھر ہے میرا کوئی
کہاں جائے گی دوانی
کہاں جائے گی دوانی
ابھی کھل اٹھیں گے رستے کہ ہزار راستے ہیں
کہ سفر میں ساتھ اس کے کئی بار ہجر تیں ہیں
کہ دیا جلائے رکھیو، کہیں وہ گذر نہ جائے
کہ ہوا بچائے رکھیو، کہیں وہ بکھر نہ جائے
کہ خزاں برس رہی ہے مری نیند کے چمن میں
مری رات کھو گئی ہے کسی جاگتے بدن میں

رسول اللہ کے نام ایک خط

ادھر ایک شب ہے
عجیب شک ہے!
کہ میری آنکھوں کی جلوتوں میں بنام خلوت
کوئی، ایک مکتوب لکھ رہا ہے
گرامی!
تو چیزے دیگری
رازداں عجب ہے
کہ میں،
کوئی عالی نسب نہیں ہوں
مگر تیرے شجرے میں جڑ گیا ہوں
دکھوں کی چادر، بدن پہ اوڑھے
کہیں کہیں تجھ میں سو گیا ہوں
گرامی!
تو صاحب راز کیسا ہے
تیرا چہرہ تو کندن ہے، اک نگینہ ہے
اور آسماں پر قمر کا پرندہ چھپا پھر رہا ہے
ادھر ایک شب ہے
عجیب شک ہے!
کہ میں شمس ہوں
اور تجھ میں طلوع ہو رہا ہوں ---- !!!

صلاح الدین پرویز

نوحہ

کن آنکھوں کے دریاؤں کا دریا چرا لائی
میں کیسی ہوا ہوں
میں کیسی ہوا ہوں کہ ہواؤں کے بدن سے
مٹی میں سلگتا ہوا جنگل چرا لائی
کوئی مری آنکھوں کو ذرا آکے مسل دے
پانی سے بھگو دے
پانی سے بھگو دے کہ دیا دن نہ دکھا دے
اک گھر تھا کہ چھت جس کی بادل نے بنائی
اس گھر میں کبھی دھوپ کی گرمی نہیں آئی
اک ماں تھی وہاں نام تھا 'باباکی پیاری'
باباکی پیاری
باباکی پیاری نے کبھی غم نہیں دیکھا
پھولوں کو ہی دیکھا
کاندھوں پہ جنھیں باباکے کھلتے ہوئے دیکھا
پانی میں کبھی آنکھ کی تیرتے ہوئے دیکھا
پھولوں کو کبھی سینے سے باہر نہیں دیکھا
باہر نہیں دیکھا
باہر نہیں دیکھا کہ عجب شور مچا ہے
اب گھر میں نہیں کوئی کہ گھر ٹوٹ گیا ہے
گھر ٹوٹ گیا ہے
گھر ٹوٹ گیا ہے کہ یہاں کوئی نہیں ہے

اک ریت کا منظر ہے وہاں کوئی نہیں ہے
کیوں سر کو جھکائے ہوئے چپ چاپ کھڑا ہے
یہ خون بھرا گھوڑا کہاں سے چلا آیا
خالی چلا آیا
خالی چلا آیا کہ انھیں جانا تھا گھر کو
اب ڈھونڈنے نکلوں تو کہاں، کون شہر کو
وہ سامنے اک باغ ہے باباکی پیاری
تھامے ہوئے باباکی غم آبیدہ کلائی
اک ریت کے منظر سے اٹھالیتی ہے بستر
اے لال مرے، آنکھوں میں کیوں نیند نہیں ہے
جاگا ہے بہت دیر ذرا شام تو کرلے
باباکی صبح، اپنی کھلی آنکھوں میں بھرلے
میں لوری سناؤں کہ تجھے گود میں بھرلوں
میں نذریں آتاروں کہ نظر تجھ کو لگا دوں
اب سولے کہ آنکھیں بھی تری جگنے چلی ہیں
اب جگ لے کہ آنکھیں بھی تری سونے لگی ہیں

کن آنکھوں کے دریاؤں کا دریا چرا لائی
مٹی میں سلگتا ہوا جنگل چرا لائی
میں کیسی ہوا ہوں
میں کیسی ہوا ہوں

شہریار

صلاح الدین پرویز

(خالص ذاتی تاثر)

یوں ہوتا ہے کہ زندگی کی لمبی مسافت میں کوئی موڑ ایسا آتا ہے جب کوئی شخص ایک روشن ہالے کی طرح نظر آتا ہے اور پھر دھند اور تاریکی ختم ہو جاتی ہے۔ میں ان خوش قسمت لوگوں میں ہوں جن کو یہ روشن ہالے بار بار ملے ہیں۔ ان میں سے ایک روشن ہالے کا نام صلاح الدین پرویز ہے۔ البتہ اس بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ صلاح الدین پرویز سے میری پہلی ملاقات کا تاثر زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ وہ آج بھی اپنے کمزور لمحوں میں مجھ پر یہی تاثر چھوڑتے ہیں۔ لیکن اب چونکہ ان کی تخلیقی شخصیت پر میری گرفت مضبوط ہو گئی ہے اس لئے ان کی شخصیت کا انسانی پہلو مجھ پر روز بروز روشن اور واضح ہوتا جا رہا ہے۔ صلاح الدین بنیادی طور پر معصوم آدمی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اور کہیں کہیں وہ اپنے کو عیار آدمی کی حیثیت سے بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں ان کے اس پوز سے قطعی مرعوب نہیں ہوتا بلکہ تنہائی میں ان کو متنبہ بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس کی وجہ میری یہ غلط فہمی یا خوش فہمی ہے کہ وہ میری بات بڑے دھیان سے سنتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میری یہ ناصحانہ روش ان کی خاطر نازک پر گراں گزرتی ہو۔ لیکن اپن یار کی یاری اور یار کے افعال کو الگ الگ نہیں سمجھتے کہ یہ رویہ سمجھوتے بازوں کا ہوتا ہے۔ مانا پرویز دولت مند ہیں اور کبھی کبھی اس دولت سے میں بھی مستفید ہوتا رہتا ہوں، لیکن دولت اور دوستی میں اگر کبھی مجھے ایک انتخاب کرنا ہوگا تو میں دوستی کو ترجیح دوں گا۔

بات صلاح الدین پرویز کی چل رہی تھی اور قصہ نکل آیا دولت کا۔ یہ شاید ناگزیر تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں سب سے بڑی 'سرگوشی' اس مسئلہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ نہ جانے کب کیسے اور کیوں اردو کے ادیبوں نے یہ طے کر لیا کہ افلاس اور ادیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور اس معاہدہ کے بعد ادیب کے مفلوک الحال ہونے کو اس کے حقیقی اور فطری ادیب ہونے کی دلیل سمجھا اور سمجھایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اس ادیب کو جس کی زندگی میں آسودگی کا شائبہ بھی نظر آیا، ادب

ی محفل سے خارج کرنا شروع کر دیا۔ محمد علوی کی "تیسری کتاب" کے لفظوں کا شمار باٹ اور ترازو سے اس لئے کیا گیا کہ وہ بہت خوبصورت شائع ہوئی تھی۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ساحر لدھیانوی چھپا ہوا ہے جو تاج محل میں حسن نہیں شہنشاہیت کو دیکھتا ہے۔ حسن تو ہیں کسی غریب عورت کے پھٹے کپڑوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے نیم عریاں جسم ہی میں نظر آتا ہے۔ یہ ہے ہماری صحت مندی کی پہچان۔ محمد علوی یا صلاح الدین پرویز پیسے والے ہیں اس کا تعلق ان کی تخلیقات سے کیا ہے؟ آپ آم کھائیے پیڑ کیوں گنتے ہیں۔ اور پھر اردو کے ادیب اور نقاد اتنے ایماندار بھی نہیں ہیں کہ پیڑ گننے کے بعد آم نہ کھائیں۔ بلکہ میرا اپنا خیال تو یہ ہے پیڑوں کا شمار کرنے کے بعد تو وہ غالب کی طرح یہ کہتے ہیں کہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ عصمت چغتائی کو تنقید اور نقادوں سے جو چڑھ ہے وہ اتنی بے سبب نہیں جتنی معلوم ہوتی ہے۔

تو صلاح الدین پرویز ــــ میری پہلی ملاقات تقریباً ۱۲ سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ الہ آباد سے نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ ان کی چند نظمیں رسائل میں شائع ہو چکی تھیں اور وہ نظمیں ایسی نہ تھیں کہ پڑھنے کے بعد فراموش کر دی جائیں۔ میں ان سے خلوص سے ملا۔ گرمجوشی کا مظاہرہ البتہ میں نہیں کر سکا نہ جانے کیوں مجھے گرم جوشی اور منافقت ایک ہی ر[illegible]کے دو نام معلوم ہوتے ہیں۔ کسی نوجوان ادیب کو یہ ٹھنڈا پن کیوں پسند آتا۔ میری اور پرویز کی کبھی کبھی ملاقات ہوتی اور وہ بھی بڑی بے رخی، محمد علوی اور ندا فاضلی امرتسر کے مشاعرے سے واپسی پر علی گڑھ آئے اور میرے ساتھ ٹھہرے۔ پرویز نے ان دونوں کو مجھے اور خلیل صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کی پہلی منزل بشیر بدر کا گھر تھی۔ اس دعوت کی ملاقات میں تھوڑی بہت گرم جوشی بھی چلی۔ پھر معلوم ہوا کہ صلاح الدین پرویز نے علی گڑھ میں بھر ہم نوجوان ادیبوں کی ایک فوج تیار کر لی ہے اور بہت جلد سکہ بند جدیدیوں کے قلعوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ایک آدھ نشست میں کچھ گوریلا حربے استعمال کئے گئے، لیکن میری ناتوانی اور عدم تشدد کے رویے کو دیکھ کر خود بخود جنگ بندی کا غیر مشروط اعلان بھی کر دیا گیا البتہ بعض دوسرے طریقوں سے آنکھ مچولی جاری رہی۔ اسی عرصے میں پرویز کا 'ژاژ' اور 'کنگیٹو' شائع ہوا۔ دونوں کتابیں انھوں نے از راہ عنایت مجھے بھی دی تھیں اور میں نے دل کھول کر داد دی تھی۔ ان سے ملنے کم اور غیر موجودگی میں زیادہ۔ میں یہاں یہ اعتراف کر لوں کہ پرویز ان چند شاعروں میں ہیں، جن کی اپج اور اڑان پر مجھے پہلے حیرت ہوتی تھی اور اب رشک آتا ہے۔ میں ان کی شاعری نہایت سنجیدگی، احتیاط اور اہتمام سے پڑھتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ پرویز کی شاعری میں

تخلیقی توانائی ہے وہ ان کی عمر کے لوگوں میں مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ "جنگل" کی اشاعت پر
ں نے تبصرہ کیا اور کسی خارجی تحریک کے بغیر کیا۔ اسی اثنا میں یہ معلوم ہوا کہ پرویز لاکھوں میں کھیل
ہے ہیں مجھ پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ البتہ سعودی عرب سے علی گڑھ آئے اور انھوں نے
نی نئی نظمیں سنائیں تو عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ان کے تخیل میں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ
لم و ضبط اور گہرائی پیدا ہوگئی تھی۔ نغمگی جو ان کی شاعری کی بنیادی صفت ہے، وافر مقدار میں ان
موں میں جاری و ساری نظر آئی۔ اس دن سے ہم 'بغل گیر' دوست ہوگئے اور صلاح الدین پرویز
نیت شخص بھی میرے لئے اہم ہوگئے۔ میرے تئیں ان کا احترام علی گڑھ میں افواہ کے طور پر مشہور
ے، اسی لئے جب بھی وہ علی گڑھ آتے ہیں، لوگوں کا تانتا میرے گھر بندھ جاتا ہے، کام صلاح الدین
ویز سے سفارش کرنا ہوتا ہے۔ میں لاکھ لاکھ کہتا ہوں کہ میں بہلت سے لوگوں کی سفارش کر چکا
ں۔ میرے کہنے یا لکھنے کا کوئی اثر نہ ہوگا لیکن میری کوئی نہیں سنتا۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ وہ
کی بات نہیں ٹال سکتے۔ لوگوں کے اس یقین کے ذمہ دار خود صلاح الدین پرویز ہیں۔ وہ بھی
ب سے یہی لکھتے ہیں کہ "میں شہریار صاحب کی بات نہیں ٹالوں گا۔" ویسے ایمانداری کی بات
ہے کہ مجھے اس کی بالکل خبر نہیں کہ میرے کہنے یا لکھنے سے کسی کا بھلا ہوا بھی کہ نہیں۔ ہاں یہ بات
بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صلاح الدین عادتاً فیاض اور مزاجاً رحم دل انسان ہیں۔
ں میں چند ماہ رہنے اور دولت مندوں سے ملنے جلنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دولت
سانیت سے بیر ہے۔ صلاح الدین کے یہاں صورت برعکس دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔

صلاح الدین پرویز ایک انسان ہیں اس لئے ان میں کمزوریاں بھی ہیں بلکہ یوں بھی کہا
تا ہے ان میں کمزوریاں بھی ہیں اس لئے وہ انسان ہیں۔ کمزوریوں کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں
وہ جن سے دوسرے متاثر ہوں اور ایک وہ جن سے وہ آدمی خود متاثر ہو۔ دوسری قسم کی
ریاں بھی بہر حال کمزوریاں ہی ہوتی ہیں۔ صلاح الدین پرویز کی بیشتر کمزوریوں کا تعلق دوسری
سے ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ مبالغہ آمیز تعریف پر یقین کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے
س پر یقین کریں۔ صاف گوئی سے گریز کرتے ہیں اور لوگوں کی توقعات بڑھاتے ہیں۔ بے
رت منکسر المزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ پہلے وغیرہ کا تعلق صلاح الدین سے
دوسرے وغیرہ کا آپ سے اور مجھ سے۔ یعنی ہم اپنے اپنے تخیل اور اختراعی قوت سے جتنی
یسی کمزوریاں چاہیں اور بڑھا لیں شرط صرف اتنی ہے کہ مذکورہ اقسام میں سے ان کا تعلق

ی محفل سے خارج کرنا شروع کر دیا۔ محمد علوی کی "تیسری کتاب" کے لفظوں کا شمار باٹ اور ترازو سے اس لئے کیا گیا کہ وہ بہت خوبصورت [illegible] تھی۔ ہم سب میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ساحر لدھیانوی چھپا ہوا ہے جو تاج محل میں [illegible] ہیئت کو دیکھتا ہے۔ حسن تو ہمیں کسی غریب عورت کے پھٹے کپڑوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے نیم عریاں جسم ہی میں نظر آتا ہے۔ یہ ہے ہماری صحت مندی کی پہچان۔ محمد علوی یا صلاح الدین پرویز پیسے والے ہیں اس کا تعلق ان کی تخلیقات سے کیا ہے؟ آپ آم کھائیے پیڑ کیوں گنتے ہیں۔ اور پھر اردو کے ادیب اور نقاد اتنے ایماندار بھی نہیں ہیں کہ پیڑ گننے کے بعد آم نہ کھائیں۔ بلکہ میرا اپنا خیال تو یہ ہے پیڑوں کا شمار کرنے کے بعد تو وہ غالب کی طرح یہ کہتے ہیں کہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ عصمت چغتائی کو تنقید اور نقادوں سے جو چڑھ ہے وہ اتنی بے سبب نہیں جتنی معلوم ہوتی ہے۔

تو صلاح الدین پرویز سے میری پہلی ملاقات تقریباً ۱۲ سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ الہ آباد سے نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ ان کی چند نظمیں رسائل میں شائع ہو چکی تھیں اور وہ نظمیں ایسی نہ تھیں کہ پڑھنے کے بعد فراموش کر دی جائیں۔ میں ان سے خلوص سے ملا۔ گرمجوشی کا مظاہرہ البتہ میں نہیں کر سکا نہ جانے کیوں مجھے گرمجوشی اور منافقت ایک ہی ر[illegible] کے دو نام معلوم ہوتے ہیں۔ کسی نوجوان ادیب کو یہ ٹھنڈا پن کیوں پسند آتا۔ میری اور پرویز کی کبھی کبھی ملاقات ہوتی اور وہ بھی بڑی رسمی۔ محمد علوی اور ندا فاضلی امرت سر کے مشاعرے سے واپسی پر علی گڑھ آئے اور میرے ساتھ ٹھہرے پرویز نے ان دونوں کو مجھے اور خلیل صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کی پہلی منزل بشیر بدر کا گھر تھی۔ اس روز کی ملاقات میں تھوڑی بہت گرمجوشی بھی چلی۔ پھر معلوم ہوا کہ صلاح الدین پرویز نے علی گڑھ میں بر ہم نوجوان ادیبوں کی ایک فوج تیار کر لی ہے اور بہت جلد سکہ بند جدیدیوں کے قلعوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ایک آدھ نشست میں کچھ گوریلا حربے استعمال کئے گئے، لیکن میری ناتوانی اور عدم تشدد کے رویے کو دیکھ کر خود بخود جنگ بندی کا غیر مشروط اعلان بھی کر دیا گیا البتہ بعض دوسرے بزرگوں سے آنکھ مچولی جاری رہی۔ اسی عرصے میں پرویز کا 'ژاژ' اور 'بگیٹو' شائع ہوا۔ دونوں کتابیں انھوں نے از راہ عنایت مجھے بھی دی تھیں اور میں نے دل کھول کر داد دی تھی۔ ان کے سامنے کم اور غیر موجودگی میں زیادہ۔ میں یہاں یہ اعتراف کر لوں کہ پرویز ان چند شاعروں میں ہیں جن کی اپج اور اڑان پر مجھے پہلے حیرت ہوتی تھی اور اب رشک آتا ہے۔ میں ان کی شاعری کو نہایت سنجیدگی، احتیاط اور اہتمام سے پڑھتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ پرویز کی شاعری میں

جو تخلیقی توانائی ہے وہ ان کی عمر کے لوگوں میں مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ "جنگل" کی اشاعت پر میں نے تبصرہ کیا اور کسی خارجی تحریک کے بغیر کیا۔ اسی اثنا میں یہ معلوم ہوا کہ پرویز لاکھوں میں کھیل رہے ہیں مجھ پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ البتہ سعودی عرب سے علی گڑھ آئے اور انھوں نے اپنی نئی نظمیں سنائیں تو عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ان کے تخیل میں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ نظم وضبط اور گہرائی پیدا ہوگئی تھی۔ نغمگی جو ان کی شاعری کی بنیادی صفت ہے، وافر مقدار میں ان نظموں میں جاری وساری نظر آئی۔ اس دن سے ہم 'بغل گیر' دوست ہو گئے اور صلاح الدین پرویز بحیثیت شخص بھی میرے لئے اہم ہو گئے۔ میرے تئیں ان کا احترام علی گڑھ میں افواہ کے طور پر مشہور ہے، اسی لئے جب بھی وہ علی گڑھ آتے ہیں، لوگوں کا تانتا میرے گھر بندھ جاتا ہے، کام صلاح الدین پرویز سے سفارش کرنا ہوتا ہے۔ میں لاکھ لاکھ کہتا ہوں کہ میں بہلت سے لوگوں کی سفارش کر چکا ہوں۔ میرے کہنے یا لکھنے کا کوئی اثر نہ ہوگا لیکن میری کوئی نہیں سنتا۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹال سکتے۔ لوگوں کے اس یقین کے ذمہ دار خود صلاح الدین پرویز ہیں۔ وہ بھی سب سے یہی کہتے ہیں کہ "میں شہریار صاحب کی بات نہیں ٹالوں گا۔" ویسے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس کی بالکل خبر نہیں کہ میرے کہنے یا لکھنے سے کسی کا بھلا ہوا بھی کہ نہیں۔ ہاں یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صلاح الدین عادتاً فیاض اور مزاجاً رحم دل انسان ہیں۔ بمبئی میں چند ماہ رہنے اور دولت مندوں سے ملنے جلنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دولت کو انسانیت سے بیر ہے۔ صلاح الدین کے یہاں صورت برعکس دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔

صلاح الدین پرویز ایک انسان ہیں اس لئے ان میں کمزوریاں بھی ہیں بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے ان میں کمزوریاں بھی ہیں اس لئے وہ انسان ہیں۔ کمزوریوں کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جن سے دوسرے متاثر ہوں اور ایک وہ جن سے وہ آدمی خود متاثر ہو۔ دوسری قسم کی کمزوریاں بھی بہر حال کمزوریاں ہی ہوتی ہیں۔ صلاح الدین پرویز کی بیشتر کمزوریوں کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ مبالغہ آمیز تعریف پر یقین کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس پر یقین کریں۔ صاف گوئی سے گریز کرتے ہیں اور لوگوں کی توقعات بڑھاتے ہیں۔ بے ضرورت منکسر المزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ پہلے وغیرہ کا تعلق صلاح الدین سے اور دوسرے وغیرہ کا آپ سے اور مجھ سے۔ یعنی ہم اپنے اپنے تخیل اور اختراعی قوت سے جتنی اور جیسی کمزوریاں چاہیں اور بڑھا لیں شرط صرف اتنی ہے کہ مذکورہ اقسام میں سے ان کا تعلق

کمزوری نمبر ۲ سے ہو۔ میں نے جتنی کمزوریاں گنائی ہیں یا جن کا آپ کے ذہن نے اضافہ کیا ہے، یہ حضرت انسان کی پہچان ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اشرف المخلوقات بننے کے بعد حضرت انسان ان کا اظہار ذرا پیچیدہ طریقے سے کرنے لگے ہیں اور آسانی سے پکڑ میں نہیں آتے۔ ایک اور حربہ حضرت انسان نے ان کو چھپانے کا ایجاد کیا ہے کہ بڑی جاں فشانی اور دیدہ ریزی سے اُن کمزوریوں کو دوسروں میں تلاش کیا جائے اور ان کی بے لاگ انداز میں مذمت کی جائے۔ اور آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی عرض کروں کہ یہ حربہ بڑا کارگر ہے۔ مگر صلاح الدین کمال کا آدمی ہے کہ جب کہیں اور جہاں کہیں اس نے اپنی ڈگر سے ہٹنے کی کوشش کی فوراً پکڑا گیا اور جب پکڑا جاتا ہے تو شرمندہ ہونے کی جگہ فلک شگاف قہقہے لگاتا ہے اور مجھ جیسے لوگ سب کچھ بھول کے ان بے محابا قہقہوں کی معصومیت میں کھو جاتے ہیں اور پھر یوں لگتا ہے کہ جو کچھ ہے جیسا کچھ ہے۔ وہی ٹھیک ہے اور سچ ہے۔

مگر صلاح الدین سے مجھے یہ شکایت آج بھی ہے کہ وہ اپنی شاعری کو اپنی شخصیت کے حوالے سے کیوں پہنچوانا چاہتے ہیں اور گفتگو میں علم وفضل کے ڈونگرے کیوں برساتے ہیں ان کو میں یہ کیسے سمجھاؤں یا بتاؤں کہ ان کی شاعری میں جو شخصیت ظاہر ہوتی ہے اس کی تصدیق ان کی معصوم اور سیدھی سادی گوشت پوست کی شخصیت سے نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے فن کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں اور جس طرح کہتے ہیں اس کا تعلق دور دور تک ان کی شاعری سے نہیں ہوتا۔ باتیں بھی بڑے سامنے کی ہوتی ہیں۔ ان کے اس رویے سے مجھے بار بار یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی شاعری سناتے تو اکثر ہیں لیکن تنہائی میں بیٹھ کر معروضی انداز میں نہیں پڑھتے۔ ورنہ وہ اپنی شاعری کی نغمگی اور اس تحیر آمیز تخیل اور لسانی جادوگری پر زور کیوں نہ دیتے، قصور وار صلاح الدین نہیں ہم آپ ہیں جو شاعر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ شاعر اپنی ہر تخلیق کے تخلیقی عمل کی پوری تفصیل بے کم وکاست بیان کرنے پر قادر ہے یا اسے قادر ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ کے بیچ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شاعر جو کچھ بھی اپنی تخلیق سے متعلق کہتا ہے اس سے صرف اس کی آئندہ تخلیقی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ اشارے ملتے ہیں لیکن اس کی گذشتہ تخلیقات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے بلکہ کبھی کبھی شاعر کے فرمودات اس کے اشعار سے لطف اندوزی میں خارج ہوتے ہیں۔ تو عزیزم صلاح الدین آپ ایسے ہی اچھے، جاندار اور خوبصورت شعر کہئے۔ بقیہ ہم لوگوں کو کرنے دیجئے" اور ہاں یہ جھنڈے جلوس کا کیا چکر ہے۔ تماشائے اہل کرم دیکھنے کے لئے بھیس بدلنا ضروری نہیں۔ اپنی تخلیقی

سرگرمی کو نئی سمت دینے کے لئے تمھیں تھوڑی سی تنہائی کی شدید ضرورت ہے۔

صلاح الدین کی ذات بہت صاف اور شفاف ہے بالکل آئینے کی طرح۔ یار لوگوں کے بقول شخصیت کچھ ادر مانگتی ہے۔ تھوڑی گرد، کچھ دھند، ذراسی پیچیدگی۔ میں نے جب صلاح الدین پر لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو طے کر لیا تھا کہ یہ سب چیزیں اِدھر اُدھر سے جمع کر کے موقع موقع سے صلاح الدین میں ڈالتا جاؤں گا اور یوں ان کی ذات کو شخصیت میں تبدیل کر دوں گا۔ چوں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ 'اشیار' بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں اس لئے ان کو پہلے سے اکٹھا نہیں کیا۔ مگر جب وقت آیا تو معلوم ہوا کہ اب یہ SPARES کی شکل میں ہندوستان میں نہیں ملتیں اور باہر سے ان کو منگانے پر پابندی ہے۔ زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ سنی سنائی باتوں پر ہرگز یقین نہیں کرنا چاہئے۔ اب ایسی صورت میں میرے سامنے دو ہی راستے تھے پہلا یہ کہ صلاح الدین پر لکھنے کا ارادہ ترک کردوں دوسرا یہ کہ اس وقت کا انتظار کروں کہ وہ شخصیت بن جائیں۔ پہلے میں جنگل، پہاڑ، درندے اور اسی طرح کے بہت سے ہولناک مراحل تھے دوسرا آنکھ میچ کر طے کیا جا سکتا تھا۔ اپنے مزاج میں جو سلامت روی ہے اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ دوسرے راستے پر چل پڑوں لیکن حیات کے مختصر اور بے ثبات ہونے کے خیال نے کہا کہ پہلے پر چل پڑوں اور اس طرح ذات پر قناعت کرنی پڑی کوئی باریک بین نکتہ چیں شخصیت کا سراغ بھی لگا ہی لے گا۔ □

محمود ہاشمی
اردو سروس، آل انڈیا ریڈیو
نئی دہلی

معصومیت کی خوشبو

ہم عصر تخلیق کاروں پر، ایک دوسرے کے تئیں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ جملہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں نے تنقید کو لاکھ علمی اصطلاحات اور توجیہات کے باوجود سائنس کے زمرے میں شمار نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک تنقید بھی تخلیق ہے۔ اور اس تخلیق کا حق ادا کرنے والوں پر، اپنے عہد کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ صلاح الدین پرویز میرے ہم عصر ہیں، ان کی شاعری کو سمجھنے یا پڑھنے کے لئے میرے پاس ذہن کا سرمایہ ہے۔ لیکن اس شاعری کے تجزیہ کے لئے میں ان ناقدوں کا انداز اختیار نہیں کر سکتا، جو شعری احساسات کے انتہائی نازک لمحوں کے گہوارے میں تنقیدی اصطلاحات اور آلات کی بکتر بند گاڑیوں میں بیٹھ کر داخل ہوتے ہیں۔ میرے لئے پرویز کی شاعری ہی اصل کسوٹی ہے، اس سے ماورا میرا عہد ہے، جس میں بہت سے شعرا موجود ہیں۔ وہ، جن کا اسلوب اور مکتب اور مقام متعین ہو چکا ہے، اور وہ، جو اپنے نئے مجموعے یا اپنی نئی نظم کے ذریعہ، ایک نئے اسلوب کی تفسیر کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پرویز چونکہ اسلوب کے نہیں، بلکہ اسالیب کے شاعر ہیں، اس لئے ان کی شاعری کی تفہیم نسبتاً دشوار ہے۔ لیکن پرویز کے بارے میں لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے دو باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز کی تخلیقی انفرادیت کیا ہے؟ اور دوسرے وہ اپنے معاصرین سے کس حد تک مختلف ہیں۔

"دھوپ، سمندر، سایہ" پرویز کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے، بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ پرویز کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> "پرویز کی شاعری، ہیڈگر کے وجودی تصور کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے۔
> پرویز کی نظموں میں وژن کی وہ منزل موجود ہے، جہاں شاعر، اشیا اور کائنات کی ماہیت کو خود بیان نہیں کرتا، بلکہ اشیا، اور کائنات خود پرویز کے تخلیقی وژن پر اپنے منفرد مفہوم کو آشکار کرتی ہیں۔"

پروفیسر نارنگ نے پرویز کے تخلیقی VISION کی ارتقائی منزل کو بنیاد تصور کیا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جو جدید اور قدیم کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔ جدید ذہن، دراصل ان رابطوں سے بغاوت کے بعد ہی اپنا اظہار کرتا ہے، جو الفاظ اور افکار کو مقررہ مفاہیم کا پابند بناتے ہیں۔ جدید فنکار کے نزدیک، نیا ذہن ہی وہ فعال قوت ہے، جو خود ہی اپنی تخلیق کا بنیادی اصول ہے، اور خود ہی اپنا خالق ہے۔ چونکہ ذہن کی ماہیت اور اس کا وجود خود تخلیق ہے۔ اس لئے ذہن اسی چیز کو تخلیق کرتا ہے جس کی وہ تفسیر کرتا ہے، اور صرف اسی چیز کی تفسیر کرتا ہے، جس کا وہ خالق ہے۔ جدید ذہن، اپنے وجدان کے ذریعہ اپنا اظہار کرتا ہے، اور وجدانی فکر، ان علامتوں میں ظاہر ہوتی ہے، جو فنکار کی روح کا اظہار ہوتی ہیں۔ یعنی جدید شعری تخلیق، غیر منفرد تصورات کا التباس نہیں، بلکہ وژنری (VISIONARY) ارتسامات پر مشتمل ہوتی ہے۔

پرویز کی نظموں کے مطالعہ سے، التباس کا احساس نہیں ہوتا، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بہار کی ایک صبح کا حسن پرویز کی ایک نئی غنائی نظم کا متحرک بنا۔ بلکہ ارتسامات کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرویز کی ایک غنائی نظم، بہار کی ایک حسین صبح کے عناصر پر مشتمل ہے۔

صلاح الدین پرویز کی یہی انفرادیت ہے، جو انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے پرویز کی یہ انفرادیت ان کی شاعری کے ابتدائی عہد سے ہی موجود ہے۔ ۱۹۶۵ اور اس کے بعد کا زمانہ، ہندوستان میں جدید شاعری کے نمایاں رجحانات کا زمانہ ہے۔ اس وقت کئی شعرا اور کئی ادبی رسائل، اپنا مکتبی رجحانات قایم کر چکے تھے، اور نئے شعرا بہت آسانی کے ساتھ ان مکاتب سے خود کو وابستہ کر رہے تھے۔ چونکہ جدید شاعری کی عمرانی توجیہات نے کچھ مخصوص رویوں اور لفظیات کو روشناس کر دیا تھا، اس لئے نئے آنے والوں کے لئے، کمار پاشی یا عمیق حنفی یا منیر نیازی یا شمس الرحمٰن فاروقی یا شب خون کے اندازِ فکر سے خود کو وابستہ کر لینا مشکل نہ تھا۔ پرویز نے اسی عہد میں اپنی طویل نظم "تراش" تخلیق کی، اس نظم کے اسلوب اور طرزِ فکر سے بھی پرویز کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کیوں کہ پرویز نے نہ تو روایتی مکاتبِ فکر کی ہم نوائی کی، اور نہ اپنی تخلیقی بغاوت کو اس عہد کی PUBLIC OPINION کا تابع بنایا۔ وہ زمانہ "انفرادیت" کے اظہار کے لئے خاصا خطرناک تھا۔ کیوں کہ رائج الوقت ادبی مکاتب سے الگ رہ کر خود کو تسلیم کرانا آسان نہ تھا۔ پرویز نے اس انبوہ سے الگ رہ کر اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا، اور نثر و نظم میں وہ تخلیقات پیش کیں، جو جدید ادب کی تاریخ کا ایک منفرد باب ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ پرویز نے اپنی فطری اور تخلیقی انفرادیت کے حصول کے لئے عصری ارتسامات کو نظرانداز کیا ہو ـــــ البتہ دوسرے شعرا کی طرح اپنے عہد کی ہیبت اور وحشت کو ویرانی، ریت، تاریکی، موت اور بےحسی جیسے الفاظ اور رویوں؛ عام طور پر رواج پا جانے والی علامتوں کا وسیلہ نہیں بنایا۔ پرویز کی مکمل فکر، اپنی عصری صداقتوں کو ایسے آئینے میں دیکھتی اور دکھاتی ہے، جس کے ذریعہ کرب کا نہیں بلکہ IRONY کا عکس زیادہ نمودار ہوتا ہے۔ جہاں تک کرب کا معاملہ ہے، بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں سے عصری احساس کو غیرمعمولی شدت کے ساتھ شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے ایلیٹ نے WASTE LAND کے ذریعہ اپنے عہد کے ویرانے کی تمام خصوصیات کو نظم کیا تھا۔ اس نظم پر جس قدر تعبیریں لکھی جا چکی ہیں، ان سے اذیت اور کرب کا فلسفہ، جدید شاعری کا خمیر تصور کیا جانے لگا، لیکن اس فلسفہ کی تقلید میں، صرف وحشت اور ہیبت کو اپنے عہد کا مزاج تصور کر لینا، ایک طرز کی روایت کا پابند ہونے کا مماثل ہے۔ صلاح الدین پرویز کو اپنے عصری مزاج اور حقائق کا اندازہ تو ہے، لیکن ان حقائق کو وہ اپنے وژن کے آئینے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں بعض انتہائی گمبھیر اور سنجیدہ لمحات کی داستان بھی، ان کے منفرد انداز و اظہار کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے ـــــ یہاں ایک خط کا اقتباس تحریر کرنا چاہتا ہوں تاکہ پرویز کی انفرادی فکر کا تجزیہ آسان ہو سکے:

> " ہماری ذات سے ماورا ایک دنیا ہے، جو سمندروں کے مہیب طوفانوں میں اور رات کے بےکراں آسمان میں ٹمٹماتے تاروں کے سکوت و سکون میں اپنا اظہار کرتی ہے جس کے جنگلوں میں سایہ دار درخت ہیں، اور ہواؤں کا شور ہے۔"
>
> لیکن یہ ہماری ذات کا ویرانہ ہے ـــــ کہ HOLY GRAIL کی اسطور ـــــ جو ویران اور بےآب و گیاہ بن گئی ہے۔ جس پر ایک نامرد حکمراں کا سایہ ہے۔ جس میں فصلیں اگنی بند ہوگئی ہیں جانداروں کا تولیدی تسلسل ختم ہوگیا ہے۔ انسان، بچوں کی تخلیق سے نابلد ہوگئے ہیں۔ یہاں صرف VULGARITY کا بھیانک خوف ہے، اور مڈل کلاس کی شرمیلی، لرزتی ہوئی پشیمان اخلاقی قدریں ہیں۔ جنسی تحرک کی لذتیں معدوم ہیں اور عبادتیں بھی وجود نہیں رکھتیں، جو ایک سجدے کو تمام کائنات کی عظمتوں کا

محور بنا دیتی تھیں۔

مجھے اس شاعر کی جستجو ہے، جو اس غیر متحرک، غیر تخلیقی اور مشینوں کے فریب میں
گھرے ہوئے نئے معاشرے کو آزاد اور ہمہ گیر زندگی کی تصویر دکھا سکے
اپنی ایک تخلیقی سطر سے ــــ ایک نظم سے ــــ ایک مصرع سے ــــ
کیا وہ شاعر ایلیٹ ہے؟"

اپنے عہد کی کیفیات کا احساس کرتے ہوئے، امریکی شاعر ہیری کراسی نے ایلیٹ کو خط لکھا تھا، اور اس سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ شاعر، جس کا اس کے عہد کو انتظار ہے ــــ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ہے؟

اردو کے معاشرے میں یہ سوال کس سے پوچھا جا سکتا ہے؟ شمس الرحمٰن فاروقی تو میر، غالب یا ظفر اقبال کا پتہ بتا دیں گے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ذہن میں، کئی نام آ سکتے ہیں، لیکن ان ناموں میں صلاح الدین پرویز کا نام ضرور شامل ہوگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے صلاح الدین پرویز کا نام یاد آئے گا، اور اسی نام پر اصرار ہوگا کہ یہی وہ فنکار ہے، جو اپنی تخلیق کے تحرک سے، اس عہد کی بے حسی اور بے بسی سے ماورا، اس وجود کی داستان سنا سکتا ہے جو خداؤں کا مقرب ہو، اور زمین پر ایک مکمل آدمی کی طرح سانس لیتا ہو۔

اس عہد کی بے حسی اور ذہنوں کے اضطراب کے درمیان ایک تخلیقی رشتے کی تخلیق کرنے والے شاعروں میں پرویز کا نام سب سے انوکھا ہے۔ اس لئے کہ جن نظموں میں اس نے مخالف کیفیات کے درمیان ایک تخلیقی جہت کو تلاش کیا ہے، وہ نظمیں بھی بے حد انوکھی ہیں۔ ان میں منطقی تسلسل کو توڑا گیا ہے۔ شعوری اور لاشعوری کیفیات کے سنگم کو تلاش کیا گیا ہے، اور پامال ضابطوں سے بے نیاز ہو کر، غیر سنجیدہ لمحوں میں، اپنے عہد کے اضطراب کو انتہائی بے تکلفی اور شگفتگی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس طرز کی نظموں کا آغاز، پرویز کی طویل نظم "ژاژ" سے ہوا تھا جو عام طور پر ان علماء کی دسترس سے محفوظ رہی جو ادب و شعر کو خالصتاً سنجیدہ اور کبیدہ لمحوں میں ریاضی کی طرح پڑھا کرتے ہیں۔ اس نظم کا ایک اقتباس دیکھئے:

عجب بات تھی
دوستی
مسجدوں

منڈروں
کی لکیروں کو اک
سادہ قرطاس پر لکھ رہی تھی
عجب بات تھی
دشمنی،
خوف کے
سارے قصّوں کے سر
دھوپ کے آنگنوں میں
نچانے کے کارن پریشان تھی
یہ عجب بات تھی
شہر کی ہر سڑک
ایک ہی وقت میں
بھور تھی ـــــ رات تھی
سب پہاڑوں کے چہروں پر
پستان سے
بامزہ، بدمزہ
بے مزہ ذائقے
اس طرح سے رکھے تھے ـــــ ٹکے تھے
کہ سب ندیاں
چھوٹے تالاب
دریا ـــــ سمندر ـــــ کنوئیں
گھر کے نل
آدمی بن گئے تھے
مگر آدمی
مکڑیوں کو پکڑنے میں مصروف تھے

اور ان کے کنول
تنگ آکر
ہر اک شرم کے شول سے
موٹی موٹی کتابوں کی الماریوں میں،
چھپے تھے کہیں
اک دن
اک خدا
صبح کی چاندنی
تھرکے بادلوں پر سجائے ہوئے
اس زمیں سے
فلک کی طرف چل پڑا

("ژاژ")

پرویز نے روحانی احساس کی پامالی کو سادہ قرطاس پر لکھی ہوئی مسجدوں کی عبارت، نئے شہروں کی تابانی اور تاریکی کو حور اور رات، فطرت سے بے تعلقی کی روش کو اس آدمی کی علامتوں کے ذریعہ تخلیق کیا ہے جو مکڑیوں کو پکڑنے میں مصروف ہے اور جس کا تمام تحرک اور تازہ کاری، قوت نمو اور بالیدگی، ماضی کی ضخیم کتابوں میں قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اور جس کی زمین سے، وقت کی تمام کیفیات کو سمیٹ کر خدا، آسمانوں کی طرف جا چکا ہے ـــــ جو کچھ باقی ہے، اس کی تفصیل کے لئے ہیری کراس کا خط اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظم WASTE LAND پڑھی جا سکتی ہے۔ پرویز نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ "ژاژ" میں اپنے عہد کے ویرانے کا احوال بیان کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ لمحوں میں بکھری ہوئی ان کیفیات کو نظم کیا ہے، جن سے جدید عہد کا کرائسس مجسم ہو جاتا ہے

شاعر کا منصب نہ فلسفہ کی مسند ہے اور نہ معاشرتی تحریکات کی راہنمائی، اسی لئے پرویز نے "ژاژ" میں، تخلیقی بے تکلفی اور لاشعوری آزادی کے ساتھ، اپنے عہد کی کائنات اور انسان کے تمام منتشر لمحوں کو نظم میں تخلیق کر کے مرحلے سے گزارا ہے۔

"ژاژ" پرویز کی شاعری کا کلیدی اظہار ہے۔ اس غیر منظم نظم میں پرویز کی وہ تمام شعری خصوصیات موجود ہیں، جن سے شاعر کی تخلیقی نفسیات کا، احساس کی سمتوں کا، اسلوب اور آہنگ

کا اور فکری نہج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پرویز نے اپنے شعری کردار کو اس معصوم فرد کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس کے گرد دنیا کا تمام اڈمبر موجود ہے، جسے اپنی آتما کا گیان ہے، اور جو اپنی آگہی اپنی روح اور اپنی معصومیت کے ساتھ فطرت سے ہم کنار رہنے میں اپنی آزادی کی حدود متعین کر سکتا ہے:

آتما
جس کو بستے میں رکھ کے کبھی
میں نے سوچا تھا
پیڑوں پہ چڑھ جاؤں گا
اور پھر
ایک آواز
بچے کی صورت
مرے کاسۂ یاد میں آئے گی

("ژاژ")

'کاسۂ یاد' کا استعارہ، شاعر کے احساس کی وسعتوں کا غماز ہے۔ اور وہ آواز، جو بچے کی صورت، اس کاسۂ یاد میں محفوظ کر لینے کی تمنا ہے، شاعر کی REDICAL INNOCENCE ہے، ژاژ کا شعری کردار، انسان کی بنیادی معصومیت اور فطرت کی ہمہ گیری سے وابستگی کو اس لئے ضروری سمجھتا ہے تاکہ اپنے عہد کے تمام اضطراب اور آلودگی سے بلند ہو کر جینے کی نئی راہ نکالی جا سکے۔

"ژاژ" کے مطالعہ سے پرویز کی تخلیقی فکر کے کچھ اور نکات بھی واضح ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پرویز کی نظم کسی ایک لمحے کی افق سے شروع ہونے والی ایک وسیع کائنات کی آزادی کا اظہار ہوتی ہے۔ اسی وسعت میں مفہوم کی نوعیت، اسی گونج کی طرح ہے۔ جو موسیقی کے کسی ایک سُر کو چھیڑ دینے کے بعد، دیر تک مرتعش رہتی ہے اور اپنی آغازی آواز پر حاوی ہو جاتی ہے — تنقیدی اصطلاحات کا استعمال کیا جائے تو اسے ALLITERATION کہا جا سکتا ہے

راہ ریتا۔ رضا۔ ریشماں، راگنی
نام، نغمہ، ندا نیرجا، نازکی

سپنا، ساون، ساور، سجاوٹ، سبو
قبر، قبلہ، قبالہ، قرینہ، قلم

(ثراثر)

اِن مصرعوں میں، ر، ن، س، اور ق کی آوازیں محض اشیا، عوامل یا الفاظ یا ان کے مفہوم کو نہیں، بلکہ اس آہنگ کو نمایاں کرتی ہیں، جو تخلیقی تحرک کا حصہ ہیں، اور جو نظم کی مکمل کائنات میں ایک DYNAMIC SYSTEM کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ شعری نظام پرویز کے اسلوب کا حصہ ہے، کیوں کہ پرویز کے نزدیک، اسلوب تکنیک کا نہیں، بلکہ VISION کا مسئلہ ہے۔ پرویز، اپنی کائنات کو جس وژن کے آئینے میں دیکھتے ہیں، اُسی سے اسلوب کا تعین ہوتا ہے۔ پرویز اپنے وژن کے وسیلے سے اشیا کو ان کی ہمہ جہت اشکال میں شناخت کرتے ہیں اور وژن کی یہی تہہ داری پرویز کی تخلیقات میں کائنات کی ایک نئی تعبیر تلاش کرتی ہے۔ یہ تعبیر وہ ہے، جس کا رشتہ، شاعر کے احساس سے براہِ راست قایم ہے، لیکن معمولی احساس رکھنے والوں کے لئے اس میں الوکھاپن بھی ہے اور تخلیقی ابہام بھی۔ مثلاً پرویز کے یہ استعارے اسی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں :

عکس نے
آبنوسی ارادوں کے بازو گنے
تونے شہرِ امکاں کی
شبنم کے قطرے پہ بنیاد رکھی گئی
وہم کا سانپ
محور کو لے کر اڑا
ایک ضرب فلا
عافیت کے دلاسے پہ چاقو
بھنور کے افق پہ
جو افیون ہے
اس کو رستم کے سہراب نے
کھالیا

(ثراثر)

آبنوسی ارادے / وہم کا سانپ / ایک ضرب خلا / عافیت کا دلاسہ / بھنور کا افق / رستم کا سہراب / یہ تراکیب استعاراتی مفہوم کو گرفت میں لینے کے لئے تخلیق کی گئی ہیں۔ اوران کا سرچشمہ شاعر کا وہ وژن ہے، جو الفاظ کو محض بے صفت اسماو اشیا کی نشانی کی طور پر نہیں بلکہ زندہ اور متحرک تخلیقی قوت کے روپ میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ـــــ اشیاء، مفاہیم اور اشکال کا قلب ماہیت پرویز کے تخلیقی عمل کا خاصہ ہے۔ پرویز داخلی احساس کی مبہم اور نیم روشن کائنات کو بیرونی اشیا اور اشکال میں منتقل کرتے ہیں تاکہ ان کی شعری کائنات، زندگی کے زیادہ توانا اور متحرک لمحوں کا محور بن سکے، زندگی کی قہرناکی اور المیہ کا احساس بھی، ایک سیّال نوعیت کی بے فکری اور آزادہ روی کا حامل بن جاتا ہے۔ اور یہ متحرک، یہ سیال کیفیت، پرویز کی نظموں میں ایک ایسے شعری کردار کی صفت بن کر نمودار ہوتی ہے، جو تاریکی اور روشنی کے درمیان ایک تخلیقی رشتے کو استوار کر رہا ہے۔

پرویز، ایک لمحہ سے افق پر کسی ایک استعارے کے ذریعہ اپنی شعری کائنات کا ایک جہان آباد کرتے ہیں۔ ان کی بصیرت اور وژن اس ایک لمحے کے ماضی، حال اور مستقبل میں ضم ہو جاتا ہے، اور ایسے متخالف عناصر یکجا ہوجاتے ہیں، جن سے ایک زمانی کائنات جنم لیتی ہے۔ مختلف عناصر کے درمیان مفہوم کی وحدت کو تخلیق کرنے کے لئے وہ شعور اور لاشعور، خیال اور خواب لمحۂ موجود اور لمحۂ گزراں کا سفر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان متضاد عناصر میں ایک نئی تشکیل بن جاتی ہے تخلیقی فکر اور وژن کا یہی اعجاز ہے، جو پرویز کی انفرادی شعری تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ وہ الفاظ اور ان کے مقررہ مفاہیم کے بھنور میں الجھتے نہیں، بلکہ زندگی کے مناظر اور مظاہر کو ایک معصوم بچے کی طرح دیکھتے ہیں، ان پہ حیران ہوتے ہیں، اُن میں الم ناکی، سخت گیری، نفاست کرب و انبساط کو محسوس کرتے ہیں، اور مناظر کو، ان کی اشکال کو اپنے شعری تجربے میں اس طرح سموتے ہیں کہ یہ مظاہر اور مناظر ایک نئی شکل، ایک نیا وجود، اور نئی علامت بن جاتے ہیں۔ مثلاً :

(۱) رات اک اینٹ ہے
جس کے ٹکڑے مری روح میں چبھ گئے
رات اک اینٹ ہے
جس کے چہرے پہ ساگر نہیں،
آنکھ ہے

(رات اک اینٹ ہے)

(۲) نبود و بود کی آنکھوں میں
منظر
اور نا منظر پرندے، سنگ ریزے
آدمی نا آدمی
دھوپ کی چھوٹی، بڑی
روشن اندھیری،
سیڑھیاں لکھتے ہیں،
پڑھتے ہیں
ہوا بہ آب جنبش آب
تا
زیرِ بصارت کائی میں لپٹی ہوئی تحت الثریٰ
یاد آجاتے ہیں
(آنکھیں سچ نہیں کہتیں)

(۳) آج سے صرف کچھ سال پہلے کی یہ بات ہے
آسمان جب زمیں پر نہیں تھا
خدا ایک اخبار تھا
اور اخبار میں
توتلی عینکوں کے بڑے شہر کا ذکر تھا
(عورت خدا کا اخبار ہے)

(۴) زندگی سانچہ، خدا آگ ہے، انسان ہیں موم
ڈھل کے بن جائیں نہ کیوں سب ہی کھلونے پیارے
(ایک پورے دن کا منظر)

پہلے اقتباس میں پرویز نے ان خاموش، تاریک اور تنہا لمحوں کے احساس کو پیش کیا، جو روح میں ایک خلش پیدا کرتے ہیں، اس کیفیت کو اُن کا وژن، اُس "رات" کے استعارے میں سموتا ہے، جو ساکت و جامد ہے، جس میں "ساگر" جیسا سیال تحرک نہیں ہے، بلکہ وہ آنکھ ہے، جو خلش پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔ دوسرا اقتباس اُس منظر نامہ کو پیش کرتا ہے، جس میں روشنی یا دھوپ کا عکس یادوں کے نہاں خانوں کو ہویدا کر رہا ہے ـــــ تیسرا اقتباس، اسس [illegible] کا حامل ہے، جو جدید عہد کی بصارت کو "اخبار" تک محدود کر دیتی ہے۔ چوتھا اقتباس پرویز کے تخلیقی تحرک اور استعاراتی نظام کا انتہائی مکمل شاعرانہ اظہار ہے۔ زندگی، خدا انسان اور انسان کی بنیادی معصومیت ـــــ اِن عناصر کو یکجا کرنے کی تخلیقی لگن پرویز کے شعری نقطۂ نظر اور معصومیت کی منزل تک پہنچنے کی آرزو کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ پرویز کی نظموں میں معصومیت کا حصول ایک فنکارانہ مقصدیت کا حامل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے پورے وجود کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے، اور سالمیت کے پُرمسرت احساس کے لئے، معصومیت کو ایک مقدس منزل کا درجہ دیتا ہے، اور تمام مظاہر میں، اِسی پاکیزہ، زندہ اور غیر ملوث کیفیت کو مقدم جانتا ہے۔ معصومیت کی اس جستجو کی کچھ مثالیں دیکھئے:

پرندوں کی ننھی دعاؤں کو آنکھوں سے چُنتے
پرندوں کی ننھی دعاؤں کی شبنم سے ہونٹوں کی پیاسی بھگوتے (گھر)

کوئی خوشبو سی
خلاؤں کے گہرے گھنے جنگلوں میں چھپی دیکھتی ہے
ضدی بچے کو، جس کا کھلونا، نری دھول سے اَٹ گیا ہے (خوشبو)

میل چھپی تھی، اس کے لبوں میں رس ٹپکاتی آئی تھی
نوری کی آواز کہیں سے جس میں گندھ کر آئی تھی (دستک)

دھوپ کی آواز آتی تھی
دھوپ ٹن ٹن بجتی تھی

شام اپنے بچوں میں چھٹیاں مناتی تھی
صبح کے درختوں میں تتلیاں اگاتی تھی
ایک دن ذرا ہم نے
آنکھ دیر سے کھولی
شام اپنے بچوں کے درمیان غائب تھی (قصہ ایک دن کا)

نشیلا باپ : بھوت تھا
سمٹتی ماں : چٹان تھی
بہن کی سوکھی پیاس تھی
اور پھر
مرے لہو پہ لکنتوں کا بوجھ تھا (ایک رات کا منظر)

کہیں دور آنکھوں سے بیٹھی
کسی شب گزیدہ سی ماں کے بدن کو چُرائے
کسی شب گزیدہ سی معصوم ننھی سی بچی نے
شب کو چڑایا (دھڑکتی صدا)

روئی کے گالوں سے بچے
آنسوؤں کی طاق میں جلتے ہوئے
گہرے گھنیرے ، شب نما، ابیض زدہ
اپنے سینے کھولتے ہیں
رزق ہنستا ہے ــــــ (آنکھیں سچ نہیں کہتیں)

میرے بچے نے ــــــ مرے سارے خیالوں اور اندیشوں پر
اپنا چاند جیسا پاک چہرہ رکھ دیا ــــــ (بولتے منہ کی پہلی نظم)

وہ بچے
سیدھے سادے تھے
سوتے تو مرنے کی باتیں
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کرتے
لڑتے لڑتے ہنس پڑتے (وہ بچے سیدھے سادے تھے)

جبروت،
چھوٹا سا بچہ ہے
اس کے لئے
میری بہنوں کی رائے غلط ہے
کہ وہ
جنگ، پاؤں میں موزے پہن کر لڑے گا (جنگ)

بچو!
اب تم کو اک اک ٹافی دے کر سو جاؤں گا
تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے
میرے بچے،
ننھی گڑیا
تم میرے ماں باپ کو دے کر
میرے گھر کی آگ میں مجھ کو گھیلا دوگے! (ایک چھوٹی سی لڑکی کے نام)

کبھی دوڑتے، کبھی سوچتے
کبھی دائروں کو غلاتے
کبھی غم کی غمی نکالتے
کبھی اپنی ای کرچتے

کبھی ان کی امی کو چومتے
کبھی ننھے بن کے پکارتے
ہمیں دودھ دو ـــــــ ہمیں دودھ دو (اون اگنارنس)

صلاح الدین پرویز کی نظموں سے، اتنے زیادہ اقتباسات نقل کرنے کا سبب اس مضمون کو طویل بنانا نہیں ہے، بلکہ پرویز کی نظموں میں سرایت کئے ہوئے، اس وژن کی نشان دہی مقصود ہے جس سے پرویز کی نظموں کو، پرویز کے اسلوب کو اور آہنگ کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کیا جا سکے۔ یوں تو پرویز نے بہت سی لوریاں بھی لکھی ہیں، لیکن یہ ایک الگ مضمون کا موضوع ہے۔ مجھے پرویز کے تخلیقی احساس کی اس عظمت اور اس منزل کی جانب متوجہ کرنے کی جستجو ہے، جو صلاح الدین کے فن میں اسم اعظم کا درجہ رکھتی ہے ـــــــ پرویز نے اپنے عہد سے سلگتے ہوئے سماجی، عصری، سیاسی اور تاریخی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں (مثلاً: گھر، یہ ضروری نہیں، پت جھڑ ایک اننت ٹوٹن ہے۔ پرائیوٹ وارڈ، فلسطینی مجاہدین کے نام۔ بیت المقدس۔ ہم پُر امن شہری ہیں۔ عربوں کے نام وغیرہ وغیرہ) ان نظموں میں ہمیں جو شعری کردار نظر آتا ہے، اس کی پیشانی درخشاں ہے، لیکن ہاتھ زخمی ہیں۔ اور قلب احساسِ اذیت سے پامال ہے ان نظموں میں رنج و مصائب ہیں، آج کے آدمی کی ABSURDITIES ہیں، اس کی عریانیاں ہیں۔ اعتماد اور خدشات کی تفصیلات ہیں، اِن نظموں کا دائرہ عمل WASTE LAND اور اس میں بسنے والے انسانوں کی پامال دنیا تک محدود ہے، لیکن وہ نظمیں، جو پرویز کے وژن کا وہ جوہر سمیٹے ہوئے ہیں، جن میں تخلیقی احساس، تمام مناظر، مظاہر اور کوائف سے معصومیت کی جانب سفر کرتا ہے، پرویز کی انفرادیت کے گہرے نقوش بناتی ہیں۔ پرویز کی شعری کائنات میں اِس معصومیت کا اپنا ایک نظام اور نظم ہے۔ ہر لحظہ بکھرتے ہوئے، اپنے مرکز سے کٹ کر زماں میں سرگرداں ہوتے ہوئے مناظر ـــــــ گل کے سراغ میں پھرتی ہوئی خوشبو۔ مختلف رفتاروں میں رواں رنگ، آفاق میں گم ہوتے ہوئے رنگ رنگ کے پکھیرو، دن اور رات کے ملاپ سے پیدا ہونے والے دمکتے ہوئے نغمے سے ابھرتی ہوئی تو میں، ان میں جذب ہوتے ہوئے انسانی جسموں کے خطوط، اور زندگی کا وہ حوصلہ اور متصادم ہونے کا وہ مجرد احساس جو معصومیت کو ایک مکمل، مثالی انسان کی سرشت بنا دیتا ہے اور جس کے لئے شاعر کہتا ہے کہ:

جبروت چھوٹا سا بچہ ہے اس کے لئے
میری بہنوں کی رائے غلط ہے

کہ وہ
جنگ، پاؤں میں موزے پہن کر لڑے گا (جنگ)

انسان کی فطری معصومیت پر یہ بھرپور ایقان، اور معصومیت کی پیہم جستجو، پرویز کی شاعری کا کلیدی منصب ہے۔ انھوں نے دانش حاضر کے اظہار کے لئے محض اس منظر نامے پر اکتفا نہیں کیا، جو ۱۹۵۰ء تک کے شعرا کی خاصیت رہا ہے، اور جس کی تعبیر و تشریح کا چسکا شمیم حنفی اور وارث علوی کو عمرانی توجیہات کا غیر ادبی اور غیر شاعرانہ اور غیر تخلیقی مواد فراہم کر دیتا ہے۔ پرویز اپنے عہد کے منظر نامے سے آگے بڑھ کر ایک نیا جہانِ امکاں تلاش کرنا چاہتے ہیں، اپنے عہد کی پژمردہ، بے کیف اور بے آرزو زندگی کو، اس بنیادی سرچشمے سے ہم کنار کرنا چاہتے ہیں، جہاں خدا اور انسان کی معصومیت ایک دوسرے کے شریک بن جاتے ہیں، اور ایک نئی دنیا کی تخلیق کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ پرویز کی یہی انفرادیت انھیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، اور ان کو وسیع تر امکانات کا شاعر بناتی ہے۔ اسی لئے میری کراسی کے خط کے تناظر میں، مجھے پرویز اس عہد کے سب سے اہم شاعر محسوس ہوتے ہیں۔

فطری اور غیر مکدر معصومیت کی جستجو دراصل اپنی ذات کے اعلیٰ ترین تخلیقی جوہر کی جستجو ہے، جرمن شاعر رلکے نے اپنے فن کو اسی معصومیت کی تخلیق کے لئے مخصوص کیا تھا ــــ بودلیئر کے نزدیک بھی، فن کا مقصد عہد معصومیت کی تخلیقِ مکرر ہے۔ ریمبو نے اپنی نظموں میں، اس MASK کے خلاف بغاوت کی۔ جو معصومیت کو یکسر ختم کر دیتے ہیں۔ اس نے کہا کہ فن کار کی ذات کی پہنائیوں میں، وہ طلسمات اور وہ اسطور موجود ہیں، جو شعور سے عاری معصومیت کے ذریعہ اپنا اظہار کر سکتے ہیں۔

اسپین کے عہد ساز جدید شاعر لورکا کی نظموں میں بھی، معصومیت کے اسی طمطراق کی جستجو ہے۔ مثلاً:

تم یہاں میرا خون پی رہے ہو، اور میں بے لطف بچے کے
معصوم غصے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔
مجھے اس دروازے سے گزرنے دو، جہاں تو اچونٹیوں کو کھاتی ہے
اور آدم حواس باختہ مچھلیوں کو زرخیز بناتا ہے،

میں چیخنا چاہتا ہوں، کیوں کہ اس سے مجھے راحت ملتی ہے، جیسے بچّے
اپنی دھن میں چیختے ہیں
کیوں کہ
میں آدمی نہیں ہوں، نہ میں شاعر ہوں، نہ میں برگ ہوں،
میں ایک زخمی جذبہ ہوں، جو اپنے مقابل سے نشتر زنی کا شکار ہے
اور میری پناہ گاہ، اور میرا استقرار، میرے اندر مہکتا ہوا
ایک پھول جیسا معصوم احساس ہے" (باغ عدن کی دوہری نظم)

صلاح الدین پرویز کی شاعری کا رشتہ، اپنی معصومیت کی ازلی اور ابدی جستجو سے ہے، جو لورکا، بودلیئر، ریمبو اور رلکے جیسے شعرا کے فن کی بنیاد ہے۔ پرویز نے اس عہد کے عالم آشوب میں، اس خوشبو کی جستجو کی ہے، جو شاعری کو پیغمبری کی روش سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ رنگ، خوشبو اور تخلیقی زبان، اور ایک ناتمام معصومیت کا حصول، یہی پرویز کا فنکارانہ مسلک ہے۔ ان کی نظم خوشبو، فطرت، کائنات، وقت اور تلاش و تجسس کے اس استعارے کا اور پرویز کی اپنی بوطیقا کا انتہائی مکمل اظہار ہے ــــــ

کوئی خوشبو سی
خلاؤں کے گہرے گھنے جنگلوں میں چھپی دیکھتی ہے
ضدی بچے کو جس کا کھلونا نری دھول میں اَٹ گیا ہے
اس کے چاند اور سورج مٹی میں رُل مل گئے ہیں
گھر میں سناٹا پھیلا ہوا ہے
کواڑوں کی باریک جھریوں کے پیچھے
کوئی
پاک معبود کی نرم آغوش میں جل رہا ہے
ابھی ایک سلے کے زیر اثر
یکایک کسی نے، زمین سے بہت دور۔ اونچائی والے مکان سے
اپنی آنکھوں کے شعلوں کو جھٹکا دیا ہے

میگھ کالے برسنے لگے ہیں
اور ضدی بچّہ
مٹی میں مچلا ہوا
تیکھلے، بھرے بازوؤں والی ماں کے بدن میں
بسنے لگا ہے ——
(خوشبو)

پرویز کے شعری اظہار کی یہ ایک نہج ہے، جس میں 'معصومیت، انسانی ضمیر، انسانی سرشت اور اس عہد کی کائنات کے مقابل خداؤں اور پیغمبروں جیسی پاکیزہ قوت کی طرح موجود ہے —— پرویز کے اس شعری اظہار کے آگے ایک اور دنیا ہے، جس کا تذکرہ اور جس کی جستجو ایک پوری کتاب کی متقاضی ہے۔ ◻

صلاح الدین پرویز

ایک نظم ___ فلسطینی مسافر کے لئے

(جو کئی بچوں کا باپ، ایک ماں کا بیٹا اور ایک خوبصورت عورت کا خاوند تھا)

میرے دل رستے میں تجھ کو کون ملا
ایک مسافر جس کا سینہ ہرا بھرا
تاروں کا آنگن کھلا ہوا

امی کا سینہ ابر بندھا
گڑیا سی بچی
گڈے کے

سینے پہ لیٹی ساحل سی
جب گجر بجا تو تم آئیں
میں تم سے بولا میں کیا ہوں
اک نیا تیرے دریا کی
اک خوشبو تیری چڑیا کی
اک موج تمھارے آنگن کی
اک بوند تمھارے جوبن کی
اک تتلی پھول ستاروں کی
اک بچی امی باہوں کی
میرے دل رستے میں تجھ کو کون ملا
جب چنری پھیلانے کو اس دن
میری بہن چھجے پہ آئی
دل پھیلائی
اس کی چنری ٹوٹ گئی
جب ہو کا پھیرا انگلیوں سے
امی کے دل تک آ پہنچا

امی کا سینہ ٹوٹ گیا
جب گڑیا اور گڈے کے دل سے
ایک زمانہ گذر گیا
دونوں نے اوپر چھت دیکھی
اور ایک ستارہ ٹوٹ گیا
میرے دل رستے میں تجھ کو کون ملا

میرے دل رستے میں تجھ کو کون ملا
ایک مسافر جس کا چہرا جدا ہوا
ایک مسافر جس کا سینہ کھلا ہوا
لیکن آنکھیں اس کی آنکھیں آج بھی دل میں مدفن ہیں
اس کا دل، اس کی دھڑکن آج بھی آنکھ میں روشن ہے

بولو بولو .....
کیسے بولو گی
ہونٹ سلے ہوئے .... کیسے کھولو گی
جو گن بھر یہ سینہ اپنا
جس پر اک پیغام لکھا
[میں ایک فلسطینی مجاہد ہوں اور
اپنی ساری جدو جہد تمھیں سونپے
جا رہا ہوں]
میرے دل رستے میں تجھ کو کون ملا

صلاح الدین پرویز

یہ ضروری نہیں

یہ ضروری نہیں
اک نئے موڑ کے آخری شبد پر
اک فقیروں کی ٹولی نظر آئے گی
تم سے پوچھے گی
تم نے کبھی آسمانی دعاؤں کے
سینے پہ
تماکوؤں کے
دھوئیں سے بنائی
ہے تصویر
تصویر، جو اک مقدر کے نقطے سے لپٹی نہ ہو
مجھ کو احساس ہے
میری سیدھی دِشا پر
کوئی ہاتھ
اپنی لکیروں کو پانی میں رکھتا ہے
ہنستا ہے
اور لال ہو کر
تھکے ہونٹاں ہونٹوں میں دے کر
بتاتا ہے کوئی مقدر کا بیٹا نہیں
سامنے راستے کا بڑا پیڑ ہے
اپنی جیبوں میں فیشن کے ٹکڑے لئے
ٹکڑے ٹکڑے ہوا
...... آدمی کی طرح کتنا لمبا ہے

تم بولتے کیوں نہیں
نیک مائیں تمھیں بولنے کے لئے
اپنی دونوں زبانیں عطا کر چکیں
اک زباں پر جو پرندے کا پتہ ہے
اور دوسری اپنے ہی گھر کے پتوں سے نکلی ہوئی
سوندھی مٹی کی پہلی اداسی 'نہیں' !
یہ ضروری نہیں ،
ہیٹ اپنے سروں پر جمائے
نئے اجنبی ریزروں کو چھپائے ہوئے بیٹھ میں
بارشیں اپنے کاندھوں پہ ڈالے ہوئے
سب نمازیں پہاڑوں سے لوٹیں
پرندے کے ہونٹوں پہ دونوں زبانوں کو روکیں
دعا کے لئے ہاتھ باندھیں
خدا !
تو ہمارے لئے عاجزی سے بڑا
دوستی سے ذرا چھوٹے قد کا نبی بھیج دے
یہ ضروری نہیں ....
سر گھوڑے کی ٹاپوں کو ٹاول سے باندھے ہوئے
صرف ناول پڑھو
اب انگور افسوس کی آہٹوں سے ٹپکنے لگے
یہ ضروری نہیں !!

صلاح الدین پرویز

بھیا! ساری بات تمھاری بالکل جاڑا جاڑا

جن باتوں سے ہم کو پہلے نفرت تھی
آج انہی کے جال سے ہم نے اپنے قدموں کو ناپا ہے
قصے کی اک ڈوری پر سب چلتے چلتے
تھک سے گئے ہیں
کیوں نہ پچھلے جنموں کی ہم پیاس بجھا دیں
کیوں نہ گیلے آدرشوں پر اپنا گیلا روپ بچھا دیں
اپنا کوئی گھر بار نہیں ہے
اپنا کوئی گھر بار نہیں ہے

میری بات سنی جب اس نے
تھوک سے اپنی دونوں آنکھیں
میرے سینے پر چپکا دیں
اور بڑھی پھر میری طرف اک بچی بھولی بھالی
جس کے گلے میں تھا اک بستہ اور ہاتھوں پہ جوانی
کئی لکیریں میں نے بنائیں
پگھلیں میری بلائیں
دور کہیں اک رنگ حنا پر پھیلی زرد ہوائیں
آسن بھیگا
دامن بکھرا
جاگ اٹھی انگڑائی
جانے اک لمحے نے کیسے میرے بدن کو توڑ دیا
آنکھ کھلی تو بوڑھی آنکھیں
تلسی کے پودے پر شبنم دیکھ رہی تھیں
ہلکے بدن کی لانبی لڑکی کیسا مجھ کو تول رہی تھی
بھیا! ساری بات تمھاری بالکل جاڑا جاڑا

(۱۹۷۱ء)

آشفتہ چنگیزی

"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

کچھ مجموعۂ اضداد سرپھرے اُن باتوں کے بھی قائل ہوتے ہیں جو BUSINESS نہیں ہوتی ہیں اور جن پر سر دھننا صرف انھیں دیوانوں کو خوش آتا ہے ..... بھلا اہل ثروت و نبیش ان فرسودہ اقدار کے دام میں کہاں آنے والے ؟ اب یہ اور بات ہے یہ حضرات اپنی دنیا سنوارنے میں اُلجھے رہتے ہیں تو دیوانے نئی دنیا کی تخلیق کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں ..... اور یہی آسائشوں سے بیزار نیز خساروں کی کاشت کرنے والے دیوانے کہانیوں داستانوں اور دیومالاؤں کا حصہ بنتے ہیں ـــــ کبھی کوئی دشوا مترا اپنی الگ ~~[illegible]~~ کی تخلیق کرتا نظر آتا ہے، کوئی طہارتِ رُوح کی بشارت دیتا ہے اور روح اللہ بن جاتا ہے، کوئی حقوق العباد کا علم بلند کرتا ہے، اخوت پر زور دیتا ہے اور جز و کل کے مابین ذریعۂ ترسیل بنتے بنتے رسولؐ کا درجہ پالیتا ہے تو کوئی HAVE NOTS کے استحصال پر نوحہ کرتا ہے، مساوات پر زور دیتا ہے اور رائج نظام سے ٹکرا کر پیغمبر انسانیت بن جاتا ہے

انھیں کشتگانِ زمانہ کی پیروی اور مفقود اقدار کی بازیافت جن لوگوں کا مسئلہ ہوتی ہے وہ اہلِ اقتدار کے نزدیک کتنے ہی معیوب کیوں نہ قرار پائیں، مگر سچ یہی ہے کہ بقائے دوام ان کا مقدر ہوتا ہے۔ وہ کسی کا قصۂ دار و رسن ہو ..... یا ابن تیمیہ کی قید تنہائی !..... یا کسی بچے کی، بہ حالتِ مرض، دوا نہ ملنے سے موت !..... تاریخ گواہ ہے کہ رائج نظام و اقتدار ہزار رکاوٹیں پیدا کرنے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا .....

کیا عوام کے حافظے میں یہ محفوظ ہے کہ ابن تیمیہ نے اپنی قید تنہائی کس فرماں روا کے زمانے میں کاٹی یا مارکس کے معاشی بحران کی ذمے دار طاغوتی طاقت کا نام کیا ہے ... شاید نہیں ! یہ سچ ہے کہ اقتدار، ظلم، ناانصافی، دولت و ثروت ایک دوسرے کے पर्यायवाची ہیں تو اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ ان میں ازلی بیر ہے او[illegible] آخر میں فتح سیلِ زمانہ کے حصے میں آتی ہے۔ جن کے دل میں یہ سچ گھر کر لیتے ہیں ان کا حشر

عثمان ہارونی ، ابن تیمیہ ، محی الدین ابن عربی ، معین الدین چشتی ، غزالی ، حافظ ، رومی ، سعدی نظام الدین اولیا ، خسرو ، کالی داس ، چنڈی داس ، امارو ، عطار ، غالب اور کامیو جیسی لازوال شخصیتوں کے ساتھ ہوتا ہے ..... ورنہ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات !

صلاح الدین پرویز اور اس کی تخلیقات پر قلم اٹھاتے وقت مجھے اس سارے سیاق و سباق کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ' جہاں تک میں سمجھتا ہوں ، پرویز کے تضادات ' حالات اور بحران کا احاطہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا ۔

صلاح الدین پرویز اس منتقل ہوتی ہوئی موروثی دانش کی ایک بوند ہے جس کا سلسلہ محی الدین ابن عربی سے نظام الدین اولیا تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا عملی شجرہ ان جانبازوں سے ملتا ہے جن کی تمنا حق ، جن کے مقاصد قلیل ، رجز پڑھنا جن کا معمول ، عورت اور خوشبو جن کی پسند ، انسانیت جن کا مذہب ' درگذر کرنا جن کی عادت ' رتجگے جن کی عبادت ، معاف کرنا جن کی فطرت اور لٹنا جن کا مذہب تھا ۔

پرویز نے جب किशोरावस्था میں قدم رکھا تو شفیق باپ اور مہربان ماں کا سایہ اس کے سر پر موجود تھا ..... لہٰذا اس کی کھلنڈری طبیعت کو کھل کھیلنے کا جواز فراہم کرنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ اس عمر میں معاشی استحکام اگر ایک طرف فالِ نیک ہے تو دوسری طرف احساس ذمے داری سے ناآشنا کر دیتا ہے ۔ لہٰذا صلاح الدین بھی عمر کے ایک خاص حصے تک ایک غیر ذمے دار اطراف سے بے پرواہ انسان کی طرح دنیا سے ٹھٹھول کرتا رہا ۔ اس کے پاس مواقع تھے سو اُس نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا ..... نئے نئے تجربات کئے ..... مختلف درس گاہوں سے کسب فیض کیا .... اَن گِنت عشق کئے ..... ہر طرح کی زندگی کا خود کو عادی بنایا ..... مگر اس کے اندر کہیں ایک कोलाहल موجود رہا ، اور اس कोलाहल کا علاج وہ لسترن ، نیرا اور رسیدہ میں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ تلاش کرتا رہا ۔ اس کی اس دور کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر بے پرواہ اور کھلنڈرا دکھائی دینے والا شخص ایک अन्तर द्वन्द्व کا شکار ہے اور یہ अन्तर द्वन्द्व اپنا بھرپور تخلیقی اظہار چاہتا ہے ۔ اس کے ادھ پکے تجربات و احساسات کی مبہم عکاسی اس زمانے کی نظموں بالخصوص " ڈرائڈ " اور " نگیٹو " میں ملتی ہے ۔ میں نے پرویز کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ راتوں کو کینٹروں کی طرح استعمال کرتا تھا

اور دنوں کی مہار تھامے دنیا دیکھنے نکلتا تھا۔ پرویز کے مزاج میں ایک خاص قسم کی بیقراری، بے کیفی، جھنجھلاہٹ اور یکسانیت کی اوب کی جھلکیاں ملتی تھیں لیکن اُن دنوں وہ ان کیفیات کو واضح تخلیقی اظہار دینے پر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ "تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں"۔ "ژاژ" کی اشاعت کے فوراً بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے جہاندیدہ ناقد نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ ابہام گزیدہ شاعر کوئی معمولی فن کار نہیں ہے، بلکہ اظہار کی ایک بے پناہ قوت کا مالک ہے اور جب وہ تجربات کا سرمایہ اکٹھا کر لے گا اور اس کے مشاہدے کے گیان چکشو وا ہوں گے تو دنیا پر ظاہر ہوگا کہ اپنے زمانے کے سب سے عظیم شاعر کا نام صلاح الدین پرویز ہے اور صلاح الدین پرویز نے ہجرتوں کے سرمائے کو تخلیقی کھاد کے طور پر خوب خوب استعمال کیا نیز پروفیسر نارنگ کی پیشین گوئی کو حرف بہ حرف سچ ثابت کر دیا..... دیکھتے دیکھتے نہ صرف ہندوستان اور اُردو بلکہ اپنے وقت کی ایک اہم آواز بن گیا۔

آج جب وہ اس بے آب و گیاہ اور لق و دق صحرا کی سیاحت پر نکلتا ہے تو اس کی نگاہوں کے سامنے وہ تمام بستیاں عیاں ہو جاتی ہیں جہاں کبھی اس کے قریش اجداد نے پڑاؤ ڈالے تھے اونٹنیوں کا دودھ دوہتی قریشی عورتیں اس سے اٹکھیلیاں کرنے لگتی ہیں.... اُسے یاد آنے لگتے ہیں اپنے جدِ امجد جو تلواروں کی چھاؤں میں سجدے کرتے تھے..... اس کے پورے وجود پر رقت طاری ہو جاتی ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ اُس نورِ مجسم نے کچرے کی بالٹیوں کا جواب بیمار کی عیادت کر کے کیسے دیا ہوگا..... اور پتھروں کی بارش میں جبرئیل امین کی درخواست ردّ کرتے ہوئے، دُعا کے لئے ہاتھ کیسے اُٹھا دیئے ہوں گے؟... کبھی وہ سوچتا ہے کہ اس کا پردادا عبدالعزیز نیپال کی ترائیوں میں "ओम नम : शिवाये" کہنے والی "نمرتا" کی زلفوں کا اسیر کیسے ہو گیا؟..... کبھی وہ ان زلفوں کا دھیان کرتا ہے کہ وہ کیسی گھنی ہوں گی جنھوں نے عبدالعزیز کی ہجرتوں کو سنگاہی میں قید کر دیا..... کبھی وہ سنگم پر بھبھوت ملے سادھوؤں کی ٹولی میں خود کو محسوس کرتا ہے..... کبھی رحمن یار خاں سے موہنی کا عشق کروا تا ہے اور مزے لیتا ہے.... اور ہنوز وہ تخلیق کی اونٹنی کی نکیل تھامے چراگاہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے.... مگر وہ جس چراگاہ میں بھی جاتا ہے، وہ چراگاہ "ژاژ" کی جھاڑیوں سے بھری ہوئی ملتی ہے اور اس کی بھوکی اُونٹنی جھاڑیوں کو سونگھ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

صلاح الدین کی شخصیت اتنی مبہم اور ہمہ جہت ہے کہ اگر ہر کس و ناکس اُسے پکڑنے کی

کوشش کرے تو اس کی اونٹنی کی نکیل تک بھی ہاتھ پہونچنا مشکل ہے۔

پھر بھی سیدھی سی بات یہ کہ اس کی چراگاہ اس کے اپنے اندر ہے اور ماضی کی بستیاں الہ آباد و علی گڑھ اس کے لاشعور میں اس قدر جڑ پکڑ چکی ہیں کہ جب وہ اُدھر سے گذرتا ہے تو "تمرتا" اور "ایک دن بیت گیا" جیسے عظیم ناولوں کی تخلیق کرتا ہے .... اور جب اپنے اجداد کی بستیوں سے گذر ہوتا ہے تو "محمد الرسول اللہ".... "بتول".... "اقراء".... "لے اڑ مجھے والے رستہ دے" جیسی وجود کو لرزا دینے والی نظموں کی رچنا کرتا ہے..... جب تصوف کی بھول بھلیوں کی سیر کرتا ہے تو "خسرو نامہ"..... "دو جا کوئی اور نہ پہچانا"..... اور "پیا میرے منڈیر کی چڑیاں ہیں" الاپنے لگتا ہے ..... اور جب عشق کی بے نام و نشان وادیوں میں بھٹکتا ہے تو اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا..... پھر وہ ہمیں "دھوپ سرائے" میں ٹھہراتا ہے .... "سمند آداء" کا تعارف کراتا ہے .... "میں اس بستی میں مکار رہا" سناتا ہے ..... اور جھکتے ہوئے پرش کی جانب سے اسکی بیوی کو ایک ایسا خط لکھتا ہے کہ اگر پوری دنیا کے تخلیقی پارے جمع کر لئے جائیں تو شاید ایسی تخلیق مشکل ہی سے ملے......

پرویز کی زیادہ تخلیقات میں ایک نوع کے تیکھے پن، جھنجھلاہٹ اور تضادات کی متعدد مثالیں بھری پڑی ہیں ...... میری اس بات کو تقویت اس کی دو الگ الگ نظموں کے اقتباسات پیش کرنے سے ملتی ہے ..... ان اقتباسات میں پرویز ایک طرف جبر مشیئت، حالات اور اپنی کسمپرسی پر تحقیر آمیز نگاہ ڈالتا ہے ......

پانچ بہنوں کا بھائی

اداسی کا بیٹا،

کمینہ!

ایک شاعر کو اسکول جاتے ہوئے تم نے دیکھا ہے کیا؟

("ٹداٹر" سے)

تو دوسری طرف وہ بھرپور خود اعتمادی، خود ستائی اور انا پرستی کا بھی شکار ہے۔ یہ انا پرستی اور خود ستائی ایک آدمی کی خود ستائی اور انا پرستی نہیں بلکہ — "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ" کے مصداق اس کا سلسلہ ایک عارف کی خود پرستی اور عرفانِ ذات سے جوڑ دیتی ہے ......

میں دن بہ دن عظیم ہوتا جا رہا ہوں
عظیم سے عظیم تر
اور عظیم تر سے عظیم ترین
بہت دنوں سے میرے دل میں،
نفرت کا کوئی درخت نہیں اُگا
میرا سینہ،
برملا اور فراخ ہو گیا ہے
مجھ پر،
مرتبۂ حال کا ظہور ہو گیا ہے

....

عشق کی کتڑیوں نے
مجھے اندر تلک کھٹکھٹا دیا ہے
میں دن بہ دن،
عظیم ہوتا جا رہا ہوں ....

میرے آج کے اس مضمون کا موضوع پرویز کی تخلیقات کا جائزہ لینا نہیں ہے .... بلکہ [اُن] کی شخصیت کی گتھیاں سلجھانا اور ان کھوٹوں کے اس پار والے صلاح الدین پرویز کو بے نقاب [کرنا] ہے۔ صلاح الدین کی شاعری اور ناول "نمرتا" کا میں اپنے گذشتہ دو مضامین میں حق المقدور [ذکر] کر چکا ہوں۔ آج میں اُن حالات کا جائزہ لوں گا اور اُن تجربات کا ذکر کروں گا جنھوں نے صلاح الدین پرویز کو اپنے دور کی اہم آواز بننے میں مدد کی۔

عشق صرف عشق ہوتا ہے اور کچھ نہیں! دعووں اور سوالوں کی نہ تو اس میں گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی یہ اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ تو صرف ایک کیفیت کا نام ہے اور اسے کسی परिभाषा میں قید کرنا اہل بینش، فرزانوں اور عالموں کا کام ہے .... آہ بیچارے فرزانے! جن کا کام صرف ~~परिभाषायें~~ بیان کرنا ہوتا ہے اور خود تا حیات اس لذت سے محروم رہتے ہیں جو دیوانوں اور عاشقوں کا حصہ ہوتی ہے .... یوں بھی اس افراتفری اور مادے کے زمانے میں جہاں رشتے تو رشتے کیفیتوں اور جبلتوں تک کا استعمال ہوتا ہے عشق کرنے، اُس سے حظ اٹھانے

اور اسے مقدم جاننے والے باقی ہی کتنے بچے ہیں ......

زوال کی سب سے بڑی پہچان ہی یہ ہے کہ معاشرے میں عشق عنقا اور عاشق مفقود ہو جائیں، الاؤ کے گرد داستانیں سنا کر راتیں بتانے والے بند کمروں، لحافوں اور ROOM HEATERS کی نذر ہو جائیں ...... اور یہ سب اس دور کی واضح پہچانیں ہیں ...... کب کیا ہو جائے، کچھ نہیں معلوم! اس غیر یقینی دور میں اگر ایک بھی صلاح الدین زندہ ہے تو سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیئے۔

صلاح الدین کی دیگر خصوصیات سے قطع نظر اگر صرف اس کی دو خوبیوں کا ہی ذکر کیا جائے تو دفتر سیاہ ہو جائیں۔ ان دو خوبیوں سے میری مراد ہے اس کی فراخدلی درگذر کر دینے اور معاف کر دینے کی عادت، اس نفسانفسی کے عالم میں اس کی ان خصوصیات کو SHARE کرنے والے رہ ہی کتنے گئے ہیں ....! وہ بڑی سے بڑی زیادتی کو درگذر کر دینے اور بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دینے میں یقین رکھتا ہے اور اپنے بڑے سے بڑے حریف کو نقصان کی بجائے دامے، درمے، قدمے، سخنے فائدہ پہونچا کر اسکی روح کو بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ پرویز سے فائدہ اٹھانا سب سے آسان کام ہے ... مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیوقوف ہے بلکہ اس کو جان بوجھ کر بیوقوف بننے میں مزہ آتا ہے۔ اُسے خوب اندازہ ہے کہ اُس سے ملنے والوں میں کتنے اُس کے اپنے ہیں اور کتنے صرف SYSOREX کے واسطے سے جان نثاری کا دم بھرتے ہیں ..... لیکن اللہ نے سے نقصان پہونچانے کی صلاحیت ہی سے محروم رکھا ہے ..... اُسے ماضی کے تلخ تجربات رشتے داروں کے رویّے، احباب کی کج ادائیاں، متعلقین کی موقع شناسیاں اور دوستوں کی بیوفائیاں اچھی طرح یاد ہیں [اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے ایک عزیز نے، ہزاروں روپیہ پاس ہونے کے باوجود، دس روپیہ دینے سے سختی سے انکار کر دیا تھا ..... اُسے اپنے ایک بزرگ کی وہ زیادتیاں بھی یاد ہیں جو بزرگ اور ان کے گھر والوں نے سائسورکس جوائن کرنے سے پہلے، سلمیٰ کے ساتھ روا رکھیں ..... اُسے ضرورت سے زیادہ ایماندار دوست کا وہ جملہ بھی یاد ہے جو انھوں نے "نمرتا" پر تبصرہ کرتے ہوئے سائسورکس کے پاکستانی ایجنٹ مسٹر حسین کی موجودگی میں بولا تھا کہ انھوں نے پرویز کی تخلیقات کی بابت اپنی رائے محفوظ کر لی ہے اور وہ اس کا اظہار ۱۹۸۳ء کے بعد یعنی سائسورکس چھوڑتے وقت

کریں گے .... اُسے اپنی ایک قریبی عزیزہ کے وہ سفّاکانہ رویّے بھی یاد ہیں جو انھوں نے صلاح الدین پرویز کے طالب علمی کے زمانے میں، اپنے علی گڈھ کے دوران قیام، روا رکھے اور اسے اچھی طرح یاد ہے ..... ۳ ار مئی ۱۹۸۲ء کے بعد وہ روحانی بحران اور اپنے قریب ترین عزیزوں کے تجارتی STATEMENTS ..... اسے خوب اندازہ ہے کہ اگر ایک دولتمند بزرگ اس کے موجودہ بحران کو خوش دلی سے WELCOME کرتے تو یہ تمام حضرات بھی آنکھیں بچھا دینے سے دریغ نہیں کرتے .... مگر کسی کو اپنے بھائی کو GENERAL MANAGER دیکھنے کی آس تھی، کسی کو اپنے عہدے کی بقا کا پاس تھا، کسی کو دولت مند بھائی کی خوشنودی مقصود تھی اور امریکہ کی شہریت کی فکر لاحق تھی کہ ہندوستان میں پچھڑا اور بیماریوں کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے کسی کا مقصد سعودی عرب سے بھیجے گئے ڈرافٹ کا استحکام تھا .....]

یاد آتا ہے مجھے
شہر اک بہتا ہوا

....

سارا عالم ایک رشتے دار ہے
کتنی بڑی یہ بھیڑ ہے
تنہائیوں میں !
پائمالی کی تمنا ہے مگر زندہ ہوں میں

(صلاح الدین کی ایک طویل نظم سے)

اسی سب کے باوجود صلاح الدین نے اپنی اعلیٰ نسبی اور اپنے علّقی شجرے کا پاس رکھا نیز روحانی پیشواؤں اور اولیا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے سب کو معاف کر دیا... صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ اپنی دریا دلی کا ثبوت بھی فراہم کرتا رہا، کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ شاید اُسے پچھلا کچھ یاد نہیں، دولت کی تحقیر کے جو مناظر میں نے صلاح الدین کے ساتھ رہ کر دیکھے ہیں اس سے ایسا لگتا ہے کہ شاید قرونِ وسطیٰ کے کسی چشتی صوفی کی روح اس میں حلول کر گئی ہے ...

عبدالرحیم خان خاناں کے شعر ——

पानी बाढ़े नाव मे, घर मे बाढ़े दाम
दोऊ हाथ उलीचिये यही सियानो काम

کو صلاح الدین نے اپنا مقصد بنا لیا ہے .... اور بقائے دوام کے دروازے کی طرف گامزن ہے ......

ہر شخص متعلقین، ارباب مزاج اور دوستوں کی ایک فہرست ترتیب دیتا ہے ... مگر جو اسے رکھ کر کہیں بھول جاتے ہیں کامیاب ہو جائے اس کی دنیا خوش رنگ راتیں پرکیف اور دن خمار آلو ہو جاتے ہیں ، مگر جو لوگ ہفتے عشرے میں اس فہرست کی دھول جھاڑتے رہتے ہیں ، اُسے بار بار طاق میں سجاتے ہیں ...... ان کے سینے گداز ، راتیں بے کیف اور دن پرسوز ہو جاتے ہیں ۔ اس ترتیب دی گئی فہرست کو ہر وقت سینے سے چمٹائے رکھنے والوں میں ایک بڑا نام صلاح الدین پرویز کا بھی ہے جب کبھی فرصت کے لمحے میسر آتے ہیں تو وہ فہرست پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ دوست سمجھوتوں کی نذر ہو گئے ، متعلقین आधार بھیڑ میں کہیں کھو گئے ، ارباب مزاج شاید کبھی تھے ہی نہیں ..... جانے پہچانے جز ایک کُل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ..... وہ بوکھلا جاتا ہے کہ اس اختلاط کا ماتم کرے یا اس کا جشن منائے اور اس کی شاعری بوکھلائے آدمی کا प्रलाप का स्व (MONOLOGUE) بن جاتی ہے ......

مر گئے ،
سب مر گئے ..... مرمر ہوئے
یا ہنی اب کون رکھے
گھر کی سوئیں ، مٹیاں ، کڑیاں
ماؤں ، بہنوں اور خالاؤں کے
گورے پاؤں سے ہلتے ہوئے
کپڑے کے پنکھے
سو گئے ۔ سب سو گئے ، سو یا ہو گئے
ہم اجنبی کیوں دکھتے ہیں ......
یہ زمیں کیوں دکھتے ہیں [فتح مبیں ، یٰسین ، طٰہٰ کوثری]
یہ لوگ لمبے لمبے ،
نو رتن پرانی سلک کے ملبوس پہنے

مذہب کے جوتوں سے ماضی کی زمین کو
غیر ملکی شرم گاہوں سے
اور دوسروں کی محنتوں کے عرق کو
تپتی ہوئی،
یا برہنہ مسجدوں سے پاٹتے ہیں ......!!

وہ بڑھا چلا جارہا ہے ..... انجانی اور کبھی نہ ختم ہونے والی منزلوں کی سمت ..... ایک ایسے دہکتے ہوئے الاؤ کی تلاش میں، جہاں کتھائیں کٹھن کر راتیں گذاری جاتی ہوں اور جہاں وہ اپنی آپ۔بیتی کو ایک کتھا کا روپ دے سکے، کسی دیو مالا کا حصہ بنا سکے اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی مسند کی جگہ کی نشان دہی کر سکے!

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

□

ثریا سعید
ڈائرکٹر اردو سروس، آل انڈیا ریڈیو
نئی دہلی

ایک شاہدِ معصوم

"مگدھ اور بدلیسہ کی بڑی سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی کٹیا کے سامنے بانس کے درختوں کے جھنڈ میں، پورنیما کی چاندنی میں، ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اور جب پون چلتی ہے، تو اس مجسمے کے گرد بانسوں سے ایسی آواز نکلتی ہے، جیسے بانسری پر کوئی میگھ ملہار بجا رہا ہے۔"

قدیم ہندوستان کی آبرو کو اپنے شکستہ کھنڈرات میں سمیٹے ہوئے تیرہ تو سس علاقوں کی خاموشی میں، نیل کنٹھ کی روح موجود ہے۔ یہی نیل کنٹھ، دیومالا کے بے شمار کرداروں کی روح کے ساتھ، ایک بار پھر مگدھ اور بدلیسہ کی بڑی سڑک کے اس پار بنی ہوئی چھوٹی سی کٹیا کے بجائے جدید عہد کی برق رفتار دنیا میں، ایک ہوائی اڈے پر نظر آیا۔

پالم: جو نئی دہلی کا بین الاقوامی مستقر ہے، صبح کے دھندلکے میں بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم صلاح الدین پرویز کو رخصت کرنے آئے تھے۔ وہ بمبئی کے راستے ریاض جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی لیکن خوبصورت سی اٹیچی تھی، جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ساری دنیا اور سارے ملکوں کی آب و ہوا اور موسموں کے ذائقے سے آشنا ہے۔ اپنے وطن سے دور جانے والوں کے پاس تو بہت سا سامان ہوتا ہے، لیکن پرویز کے پاس صرف اٹیچی کیس تھا اور کپڑے کے جزدان میں لپٹا ہوا ایک ستار اور ایک بانسری۔ میں نے پوچھا:

"پرویز بھیا! کیا اتنے لمبے سفر میں کپڑوں کی ضرورت بھی نہ ہوگی، آخر یہ ستار کیوں لے جا رہے ہو ــــ! اور یہ بانسری؟"

پرویز نے کہا:

"بہن یہ ستار ہی میرا اسم ہے۔ میں ریاض میں ہوتے ہوتے اپنی دھرتی سے الگ نہیں ہو پاتا۔

اس ستار کے گرد عود اور لوبان کی خوشبوئیں جلاتا ہوں ــــ اور عنبر و لوبان کی مہک میں بسی ہوئی ستار کو پہلو میں رکھ کر، رات کے لمحوں میں، تاروں کو چھیڑتا ہوں۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے، میں سو جاتا ہوں، لیکن سوتے میں بھی میری انگلیاں ان تاروں کو چھیڑتی رہتی ہیں اور اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں حضرت امیر خسرو کی بارگاہ میں موجود ہوں ــــ مجھے حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کے احساس سے بڑی طمانیت ملتی ہے۔ یہ عظیم شخصیتیں میرے وطن کی دھرتی کا وقار ہیں، اور اس وقار کا سلسلہ اس لازوال عظیم ترین شخصیت تک پھیلا ہوا ہے، جسے میرا وجود، مجسم عبادت بن کر محمدؐ رسول اللہؐ کے نام سے پکارتا ہے ــــ تب میں حضور مقبولؐ کے عشق میں نعتیں لکھتا ہوں اور خود اپنے وجود کو اس عشق کے بیکراں سمندر میں تحلیل کر دیتا ہوں۔

وہ عجیب صبح تھی۔ ایرپورٹ کے ہجوم میں، پرویز واحد شخص تھا۔ جس کی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ اور جو کسٹم کی جانب آگے بڑھتے ہوئے، اپنی لبریز آنکھوں سے ہم سب کو مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

صلاح الدین پرویز کی شخصیت کا یہ صرف ایک روپ ہے۔ ہم نے ان کے بیشمار روپ دیکھے ہیں۔ "ژاژ" اور "رنگیٹو" کی نظموں کا شوخ و شاداب اور کھلنڈرا شاعر، "جنگل" میں شامل نظموں کا گمبھیر فن کار، نمرتا کی تخلیق کرنے والا ایسا پُرش جس نے ہزاروں برسوں کی تہذیب کا رزمیہ تحریر کیا ــــ اور وہ پرویز جس کے گرد حاجت مندوں کا، خوشامد کرنے والوں کا، تعریفوں کے پل تعمیر کرنے والوں کا اور ایک پرویز کی ایک نگاہ التفات کے لئے خاموش رہنے والوں کا ہجوم رہتا ہے ــ ــ

پرویز کی سب سے مختلف اور محبوب شخصیت وہ ہوتی ہے، جب وہ اپنے عزیزوں کے درمیان ہوتے ہیں ــــ بہنوں سے چھیڑ چھاڑ، بچوں سے مذاق اور بزرگوں سے عقیدت ــــ خاص طور پر بہنوں کے لئے، ہر جملے میں دنیا جہاں کی مسرتوں کا نذرانہ سمیٹے ہوئے ــــ محبتوں سے سرشار القابوں سے پکارتے ہوئے ــــ پیاری آپا ــــ ثریا بہن ــــ آپا بی ــــ رضیہ آپی۔ جان سے پیاری باجی ــــ ان محبت بھرے جملوں کے علاوہ اپنے عزیزوں کو اپنا سب سے بڑا ناقد تصور کرنا ــــ اپنی نظمیں سنانا۔ ان سے داد وصول کرنا۔ اور ان کو اپنا بہترین سامع اور قاری تصور کرنا ــــ

کتنی عجیب بات ہے نا —! آج کے شاعر تو ادیبوں شاعروں کو اپنا سامع تصور کرتے ہیں۔ اور اپنی تخلیقات میں اپنے عزیزوں کو شامل کرنا، یا انھیں سنانا اپنی توہین سمجھتے ہیں لیکن صلاح الدین پرویز ان سب سے الگ ہیں نا۔

پرویز کے دوست احباب انھیں بھوت کہتے ہیں۔ ہندوستان ہو یا سعودی عرب، راتوں کو دیر تک جاگنا، دوستوں اور عزیزوں سے باتیں کرنا۔ اپنی شاعری کو سب کے ساتھ مل جل کر پڑھنا اور سنانا۔ خود جاگنا۔ دوسروں کو جگانا۔ اور پھر صبح کے پہلے لمحوں کے ساتھ اپنی فرم کے کاموں کے لئے مستعد ہو جانا — میں سوچتی ہوں — نہ جانے کون سی طاقت اور کون سا انوکھا پن ہے میرے بھائی میں — جو راتوں کو شاداب اور دنوں کو محنت اور عمل کا محور بنائے رکھتا ہے۔

دوست کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانہ میں بھی پرویز کی یہی روش تھی، ان دنوں علی گڑھ کے کچھ سرپھرے نوجوانوں نے "بوم کلب" بنا رکھا تھا۔ چونکہ بوم کی شب زندہ داری مشہور ہے، اس لئے ان لوگوں کو اپنی محفل کے لئے "بوم کلب" کا نام ہی مرغوب ہوا۔ "بوم کلب" کے باقی ماندہ سرپھرے اب نہ جانے کہاں کہاں زندگی کے TEMPTATION کے باعث آرام کی نیند سونے کے جتن کر رہے ہیں لیکن صلاح الدین پرویز اب تک شب زندہ داری کی وہ رسم نبھا رہے ہیں۔ ان کی نیندوں پر عشق رسول کی بیداریاں حاوی ہیں۔ اور وہ بدستور جاگ رہے ہیں — جاگ رہے ہیں، اور لکھ رہے ہیں — لکھ رہے ہیں اور سنا رہے ہیں۔

لکھنے کی بات آئی تو مجھے پرویز کی بیشمار نظموں کے علاوہ ان کے ناولوں "سارے دن کا تھکا ہوا پرش، اور ایک دن بیت گیا" کا خیال آگیا ہے۔ "نمرتا" نے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں کو جس طرح مبہوت بنایا ہے — اور بڑے بڑے چابک دست ناقد، اس ناول کی تخلیق پر جس طرح قلم بدنداں ہیں، اس سے اردو والے خوب واقف ہیں۔ وہ ابھی اس تحیر کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں، کہ پرویز نے آخر ہزاروں برسوں کی بساط پر پھیلی ہوئی دیومالائی تہذیب کو "نمرتا" اور نیل کنٹھ کے کرداروں کے روپ میں، کس طرح ابدی علامت بنا دیا ہے اور اس ناول سے کیسے کیسے جید افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی ذہنی حدود کا انکشاف ہوا ہے اور ایک اسرار یہ ہے کہ وہ پرویز جس کی بیشتر نظموں میں حضور مقبول کے بے محابا عشق کی کیفیات موجود ہیں اس نے دیومالا سے اپنی آگہی اور وابستگی کا اظہار کیوں کر کیا —؟

ایک دن میں نے بھی پوچھا: "پرویز بھیا ــــ اسلام تو دیو مالا کے خلاف ہے، پھر تم یہ دیو مالا کے چکر میں کیسے آ گئے؟"

پرویز نے مسکرا کر کہا: ــ

"میں مسلمان ہوں، اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ تم نے میری نظم سنی ہے۔ تازہ نظم جس کا عنوان ہے۔

"میں عظیم سے عظیم تر ہوتا جا رہا ہوں"

اس نظم میں میں نے اپنے احساس اور اپنی ذات اور اپنی شخصیت، اور اپنی ذات سے وابستہ تمام حادثات اور عوامل کا اعتراف کیا ہے۔ وہ نظم ایک طرح میرا CONFESSION ہے۔ میں مسلمان ہوں ــــ میں سنّی ہوں، میں شیعہ ہوں، میں عرب ہوں، عجمی ہوں۔ دنیا بھر کا شہری ہوں لیکن میری روح کے تاروں میں اس ہندوستان کے نغمے پیوست ہیں جنھیں حضرت امیر خسرو کی انگلیوں نے راگوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اگر میں شیعہ ہوں تو محض رسمی نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کا قائل نہیں ہوں۔ اس قربانی کی وقعت کو سمجھتا ہوں جو ایک بہت بڑے اصول کے لئے دی گئی۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنے خون سے اسلام کو سینچا، اپنی قربانیوں سے اسلام کو دوبارہ زندگی بخشی، اور اسلام ہر کربلا کے بعد پھر زندہ ہوتا ہے۔ امام حسینؓ ایک اور مسیحا تھے، یہ بات ہے کہ اس نیزے کو جس پر ان کا مقدس سر چڑھایا گیا، ہم ایک اور صلیب نہ بنا لیں۔ لیکن اس قربانی میں ہمارے لئے اتنی ہی روحانی اور جذباتی اپیل ہے جتنی کہ عیسائیوں کے لئے مسیحؑ کے مصلوب ہونے میں ــــ مسیح کی قربانی، فن مصوری اور ادب کا ایک بہت بڑا موضوع ہے جسینؓ کی قربانی ہمارے ادب کا بہت بڑا موضوع ہے۔ اسی لئے میں نے نوحے بھی لکھے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ نے جن اصولوں کو اپنی زندگی اور شخصیت کا حصہ بنایا، ان پر بھی نظم لکھی ہے۔ دیو مالا اور دیوی دیوتاؤں پر میرا ایمان نہیں ہے ــــ لیکن جب اپنے دیش کی تہذیب اور اپنے وطن کی روح کو شناخت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنا وژن VISION اپنی دھرتی کے وژن سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے اپنی دھرتی اور اس سے وابستہ تمام حکایتیں اپنے وطن کی الوہی خصوصیات سب اچھے لگتے ہیں ــــ اور ان سب چیزوں سے گذر کر، اپنے مذہب، اپنے خدا اور اپنے رسول میں میرا عقیدہ اور میری محبت اور زیادہ توانا ہو جاتی ہے!"

پرویز نہ جانے کون سی کتابیں پڑھتے ہیں، جب بولنا شروع کرتے ہیں تو لگتا ہے یہ یا تو

غیر معمولی تخلیقی ذہن کے مالک ہیں، یا پھر کسی گذشتہ جنم میں ادب اور ANTHRO POLOGY کے پروفیسر رہے ہیں۔ پرویز کی گمبھیر باتوں اور ان کی نظموں میں پیوست انوکھے، دبیز تر مفہوم رکھنے والے اشعاروں اور علامتوں سے زیادہ مجھے ان کی شخصیت، گفتار، انداز اور تخلیقات میں جو چیز سب سے زیادہ غیر متوقع، عجیب حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے وہ ہے ان کے احساس میں پیوست ازلی معصومیت ـــ ایسی REDICAL INNOCENCE جس پر اہاب حسین نے تو پوری ایک کتاب فکشن کے حوالے سے لکھ ڈالی تھی۔

پرویز کی معصومیت میں وہ تقدس ہے، جو زندگی اور نیچر سے پہلے پہلے پیار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جس میں نو دمیدہ کلیوں جیسی خوشبو اور پاکیزہ حسن ہوتا ہے، جس میں زندگی ہمہ گیر وابستگی ہوتی ہے ـــ اور جس میں اشیا اور انسانوں کو شناخت کرنے کا تجسس ہوتا ہے۔ جس میں زندگی کے کھٹے میٹھے ذائقوں سے لطف اندوز ہونے کی تڑپ ہوتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ پرویز دنیا کے بہترین ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ دنیا کے بہترین ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں، بہترین خوشبوئیں استعمال کرتے ہیں۔ ہزاروں نہیں لاکھوں خرچ کرتے ہیں اور امریکی بینکوں کے ویزا کارڈ اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے سینما ہاؤس کا فری پاس۔

لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ علی گڑھ سے دہلی آتے ہوئے، کسی چھوٹے سے بس اسٹینڈ پر کار کو روکا ـــ سامنے پانی کے بتاشے والا نظر آیا۔ اس کے پاس پہونچے۔ ڈھاک کے پتے کا دونا لیا اور سڑک پر کھڑے کھڑے، مزے لے لے کر پانی کے بتاشے کھائے۔ نئی دہلی کے اوبرائے ہوٹل کی ایرکنڈیشن فضا سے نکلے، حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں پہونچ گئے۔ گھنٹوں کسی پتھر پہ بیٹھے رہے۔

گرمی کی دوپہر ہے۔ اور اوبرائے کے کمروں میں ایرکنڈیشن چل رہا ہے، سردی لگ رہی ہے۔ کمبل اوڑھے لیٹے ہیں۔ اچانک اٹھے۔ ڈرائیور کو بلایا ـــ اور مرزا غالب کے مزار کے احاطے پر پہونچ کر جوتے اتارے ـــ تپتے اور سلگتے فرش پر ننگے پاؤں چل کر غالبؔ کے مزار تک پہونچ گئے۔ دیر تک محویت کے عالم میں کھڑے رہے۔ کسی نے کہا: "صاحب زمین جل رہی ہے، جوتے اندر مزار کے قریب تک لائے جا سکتے ہیں ـــ لیکن اس کی بات ان سنی کر دی، پسینے سے شرابور ہو کر اور غالبؔ سے دل لگا کر واپس لوٹے۔ کسی قریب کی دوکان سے ایک سو بیس تمر کے تمباکو والے پان لگوائے اور واپس ہوٹل پہونچ کر شام تک پان چباتے رہے۔

کسی نے یاد دلایا: "پرویز بھیا! آج دوپہر کا کھانا نہیں کھایا! یاد دلانے پر خود اپنے لئے تو نہیں، لیکن اس ہجوم کے لئے جو ان کے گرد جمع رہتا ہے، کھانا منگوالیا۔

ایک شام یوں ہوا۔ میں نے کہا: پرویز بھائی! آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں گے۔ ـــــ رات ہو رہی ہے ـــــ اب چلئے ـــــ کسی اور نے کہا کہ رات کے وقت حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ پر عجیب پر کیف منظر ہوتا ہے وہاں چلئے ـــــ پرویز نے دونوں مطالبات کو مانا۔ وہ بارگاہ محبوب الٰہی میں بھی حاضری دے آئے ـــــ اور ایک نادار بہن کے غریب خانہ پر پہونچ کر کچھ ایسی اپنائیت سے کھانا کھایا، جیسے برسوں پہلے وہ یہیں سے اٹھ کر پردیس گئے تھے۔ گھر کی خواتین اور بچوں کے درمیان بیٹھ کر نظمیں سنائیں ـــــ سب سے پہلے وہ نعت سنایا کرتے ہیں، اور پھر وہ دوسری نظمیں ـــــ انھوں نے دو تین لوریاں سنائیں۔ مجھے یوں لگا جیسے پرویز خود اپنی معصوم سرشت کیساتھ اس عہد کے انسانوں کو ان گذرے زمانوں کی یاد دلانا چاہتے ہیں۔

جب رات ایک کا پوز کی گولی نہ تھی، اور بوڑھی دادی ماں بچوں کے ہجوم میں بیٹھ کر انھیں پر اسرار کہانیاں سناتی تھیں، اور مائیں لوریوں کے ہلکوروں سے اپنے بچّوں کو کائنات کے خواب زار مناظر کی سیر کراتی تھیں۔ پرویز کی لوریوں میں معصومیت کے ساتھ ساتھ جدید عہد کا وہ منظر نامہ بھی تخلیق ہوتا ہے، جس میں اسرار بہت کم ہیں اور محبتوں کے نقوش کی تلاش زیادہ نمایاں ہے۔

دوستوں اور عزیزوں سے جدا ہوتے ہوئے پرویز کے چہرے اور ان کی تابندہ آنکھوں میں ہمیشہ ہی ایک عجیب سی اُداسی چھا جاتی ہے۔ بالوں کی لٹیں کچھ اس طرح پیشانی پر آجاتی ہیں جیسے وہ اپنے پورے وجود کی اُداسی کو چھپا نہ پا رہے ہوں۔

پرویز کی یہی لامحدود معصومیت کبھی کبھی انھیں اچھا خاصا مسخرہ بنا دیتی ہے۔ کوئی شخص آتا ہے، اور انھیں بیوقوف بنانے کے لئے کوئی عجیب سا منصوبہ ان کے روبرو پیش کر دیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس شخص کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ پھر بھی اس کی بات سنتے ہیں اور جو طلب کرتے ہیں اسے دیتے ہیں۔ علی گڈھ میں ان کے گھر کے کپڑے سینے والے درزی کو ان کے اس معصومانہ تجاہل کا خوب خوب تجربہ ہے، چنانچہ وہ ہر بار ان سے کہتا ہے ـــــ بھائی صاحب: دوکان لینی ہے۔ لیکن پیسوں کا انتظام نہیں ہو رہا ہے۔ اور پرویز ہر بار اسی مکالمے کے جواب میں اسے دوکان لینے کی تائید کرتے ہوئے خاصی بڑی رقم اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

اس تجاہل معصومانہ یا عارفانہ کی بہت سی مثالیں ہیں لیکن مجھے ان کا تذکرہ مقصود نہیں۔

خود پرویز بھی تو اس تجاہل کی روش کو چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔

پرویز کی وہ شخصیت جو ان کی شاعری میں ایک شعری کردار بن کر نمودار ہوتی ہے، اسکے بھی کرشن جیسے ہزاروں روپ ہیں۔ ان کی ہر نظم ایک زینہ پیچاں ہوتی ہے۔ لگتا ہے ہر نظم میں وہ ایک انسان اور ایک فن کار ہونے کی حیثیت سے، اپنی انا، اپنی خودی، اور اپنے وجود کے لامحدود عناصر کو اور زیادہ بلندی تک پہونچانے کے لئے نئے نئے استعارے اور نئے نئے اسالیب تلاش کر رہے ہیں۔ ان کی ہر نظم میں، عالم اشیا اور عالم محسوسات پر ان کا شعری کردار محیط ہوتا ہے۔ ہر نظم پرویز کی تخلیقی کائنات ہوتی ہے اور ہر مصرع انوکھے تیور والا ـــــ :

ہم اپنی آنکھیں کتابوں میں رکھ کے بھول گئے

مالی ترے گلشن میں سبھی رنگ کے ساون
لکھتے ہیں سراپا ترا جادو کے قلم سے

تو مدوجزر ہے اور موج میں چٹکی بھری لالی

نہا کے نکلی تھی بارش سُنا رہی تھی وہ

مری رات کی حیرت اوجھل کر
مری آنکھ کی دنیا بوجھل کر

اُردو کے تمام جدید شاعروں سے الگ، اپنا منفرد اور خالصتاً ذاتی اسلوب رکھنے والے پرویز سے ایک بار میں نے پوچھا :

" بھیا ـــ بعض نظموں میں عجیب سی باتیں ہوتی ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ـــ مثلاً
کبھی غم کی غمی نکالتے
کبھی اپنی امی کو چومتے
کبھی ان کی امی کو چومتے

یہ سب کیا ہے ؟

پرویز کا جواب ان مصرعوں سے زیادہ دلچسپ تھا۔ پرویز نے کہا۔

"سیدھی سادھی منطقی باتیں، ہوشمندوں کے اسالیب، ہزاروں بار کے پامال الفاظ اور سننے اور پڑھنے والے کو فوراً لبھا لینے والی شاعری تو سب ہی کرتے ہیں۔ میری شاعری ان سب کے لئے نہیں ہے۔ جو شاعری کو نقادوں کی گود میں بیٹھ کر سنتے اور پڑھتے ہیں۔ میں اپنے احساس اور اپنے مشاہدے کی لا محدود دنیاؤں کو تازہ، خود ساختہ اور ذاتی اسالیب میں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ تجربات بہت مشکل یا انوکھے ہیں تو پھر پاکستان کی EMI نے مختلف گلوکاروں کی آوازوں میں میری یہی نظمیں کیسٹس میں کیوں ریکارڈ کرائی ہیں اور یہ کیسٹس ہزاروں کی تعداد میں بک رہے ہیں اور پسند کئے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

پرویز کے اس سوال سے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے دوسرے سوالات کا جواب بھی مل گیا تھا، اور مجھے یہ احساس بھی ہو گیا تھا۔ پرویز اپنی شخصیت انفرادیت کیسا تھ' جو کچھ تخلیق کر رہے ہیں وہی اس عہد کا اسلوب ہے ——

پرویز کی نظموں میں جو گہرائی اور تصور ہے اس سے ہمیشہ کچھ ایسا تاثر ملتا ہے۔ جیسے شاعر کی روح جسم کی سرحد پر حیران کھڑی ہے، یہ روح وہ ہے جو مکمل ہے اور معصوم ہے۔ اس تکمیلی معصومیت کے تحرک کی پاکیزگی سب سے خوبصورت پیکر پرویز کی نظم "محمد رسول اللہ" ہے۔

یہ نظم صرف نعت رسول مقبول ہی نہیں۔ خود صلاح الدین پرویز کی اپنی داخلی شخصیت کا آئینہ بھی ہے۔ میں نے صلاح الدین پرویز کی شخصیت میں، ایسے عاشقان رسول کا عکس دیکھا ہے جن میں "محی الدین ابن العربی" جیسے عظیم الشان انسان موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز، بیسویں صدی کے انسان ہیں اور انھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے، اور زندگی بھی عزیز ہے کہ آج کے عہد میں حسن اور زندگی دونوں کے درمیان ہزاروں مقاصد کے فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔

پرویز نے ان فاصلوں کو مٹانے کے لئے، اس معصومیت کو اپنی شخصیت اور اپنی روح کا ایمان بنا لیا ہے جسے انسانی معاشرہ، دانشوروں کے ہجوم میں نہ جانے کب اور کہاں گم کر چکا ہے۔ اور جس کا حصول عام انسانوں کے لئے اب ممکن نہیں کہ ہمارے زمانے میں تو بچے بھی بالغ ہوتے ہیں۔ اور نوجوان اپنی عمر سے پہلے عمر رسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

ایسے ماحول میں پرویز کا وجود، خود ایک علامت ہے۔ زندگی اور زندگی کے وسیع تر مفہوم کی علامت!

جس کی بقا کے لئے دعائیں مانگتے ہوئے میں اپنی آنکھوں کی تمام روشنی قربان کر سکتی ہوں

[

فضا ابنِ فیضی

غزلیں

تجھے ادھورے ورق سے کتاب کر دے گا
زباں نہ کھول، کہ وہ لاجواب کر دے گا

نفس کو شہد، لہو کو شراب کر دے گا
یہ کیا خبر تھی وہ جینا عذاب کر دے گا

ہٹالے اپنی نگاہیں تو میرے چہرے سے
یہ آئینہ تجھے بے آب و تاب کر دے گا

ملو تم اس سے، مگر احتیاط شرط، کہ وہ
خراب خود تو نہ ہوگا خراب کر دے گا

مرے قلم کا لہو ہے، اسے ذرا چکھ لے
یہ شاخِ جاں کو بھی شاخِ گلاب کر دے گا

حقائق اپنی جگہ، جاگتے رہو، ورنہ
وہ شخص سارے حقائق کو خواب کر دے گا

خود کو سونپ اسے، یہ معاملہ ہے وقت
پلک جھپکتے برابر حساب کر دے گا

اس طرح نہ برت اس کو انکساری سے
وہ آندھیوں کو ترے ہم رکاب کر دے گا

اسے ملتے رہو، ہے بڑا ہنر والا
تمہیں بھی ایک مکمل نصاب کر دے گا

نہ تو ہم کو سدا مجہول لفظوں کا ہدف لکھ
ہماری لوحِ جاں پر بھی کوئی حرفِ شرف لکھ

بدن ہی بس ہمارے پاس ہے گوہر کی صورت
نفس اندر نفس ساری تہوں کو بے صدف لکھ

ہمارے دور کو ہے حاشیہ بینی کی عادت
بیاضِ ذات پر ہم کو کنارے کی طرف لکھ

ہوں وہ حرفِ بصیرت، ہر جگہ روشن رہوں گا
مجھے خاشاک پر لکھ، یا سرِ لوحِ خزف لکھ

تجھے ہر چند آتا ہوں نظر، صحرا بہ پہلو
جو ممکن ہو تو میری پیاس کو دریا بکف لکھ

پرندِ ناتواں ہوں، صید اپنے ہی انا کا
مجھے میری ہی درماندہ نگاہی کا ہدف لکھ

کھنگالے ہیں کئی قلزم لہو کے، ان کی خاطر
مرے الفاظ کو تو شمعِ دہلیزِ صدف لکھ

نفس کھینچوں اگر سینے کے باہر، مر ہی جاؤں
خموشی کو مری تو بھی بخطِ چنگ و دف لکھ

اٹھائی ہے ہزیمت عمر بھر، مہلت بھی دے کچھ
مرے بکھرے ہوئے لشکر کو اب تو صف بہ صف لکھ

جو ہوتے کام کے، کیوں زندگی کرتے اکارت
ادب کو آج تو بے کار لمحوں کا شغف لکھ

بجائے لفظ، کاغذ پر ابھرتی ہیں خراشیں
مجھے اب اے قلم! منصب سے اپنے برطرف لکھ

پرویز کا جواب ان مصرعوں سے زیادہ دلچسپ تھا۔ پرویز نے کہا۔

" سیدھی سادھی منطقی باتیں، ہوشمندوں کے اسالیب، ہزاروں بار کے پامال الفاظ اور سننے اور پڑھنے والے کو فوراً لبھا لینے والی شاعری تو سب ہی کرتے ہیں۔ میری شاعری ان سب کے لئے نہیں ہے۔ جو شاعری کو نقادوں کی گود میں بیٹھ کر سنتے اور پڑھتے ہیں۔ میں اپنے احساس اور اپنے مشاہدے کی لامحدود دنیاؤں کو تازہ، خود ساختہ اور ذاتی اسالیب میں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ تجربات بہت مشکل یا انوکھے ہیں تو پھر پاکستان کی EMI نے مختلف گلوکاروں کی آوازوں میں میری یہی نظمیں کیسٹس میں کیوں ریکارڈ کرائی ہیں اور یہ کیسٹس ہزاروں کی تعداد میں بک رہے ہیں اور پسند کئے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

پرویز کے اس سوال سے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے دوسرے سوالات کا جواب بھی مل گیا تھا، اور مجھے یہ احساس بھی ہو گیا تھا۔ پرویز اپنی شخصیت انفرادیت کیساتھ جو کچھ تخلیق کر رہے ہیں وہی اس عہد کا اسلوب ہے ــــ

پرویز کی نظموں میں جو گہرائی اور تصور ہے اس سے ہمیشہ کچھ ایسا تاثر ملتا ہے۔ جیسے شاعر کی روح جسم کی سرحد پر حیران کھڑی ہے، یہ روح وہ ہے جو مکمل ہے اور معصوم ہے۔ اس تکمیلی معصومیت کے تحرکی پاکیزگی سب سے خوبصورت پیکر پرویز کی نظم " محمد رسول اللہ " ہے۔

یہ نظم صرف نعت رسول مقبول ہی نہیں۔ خود صلاح الدین پرویز کی اپنی داخلی شخصیت کا آئینہ بھی ہے۔ میں نے صلاح الدین پرویز کی شخصیت میں، ایسے عاشقان رسول کا عکس دیکھا ہے جن میں " محی الدین ابن العربی " جیسے عظیم الشان انسان موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز، بیسویں صدی کے انسان ہیں اور انھیں حسن سے بھی لگاؤ ہے، اور زندگی بھی عزیز ہے کہ آج کے عہد میں حسن اور زندگی دونوں کے درمیان ہزاروں مقاصد کے فاصلے پیدا ہو چکے ہیں۔

پرویز نے ان فاصلوں کو مٹانے کے لئے، اس معصومیت کو اپنی شخصیت اور اپنی روح کا ایمان بنا لیا ہے جسے انسانی معاشرہ، دانشوروں کے ہجوم میں نہ جانے کب اور کہاں گم کر چکا ہے۔ اور جس کا حصول عام انسانوں کے لئے اب ممکن نہیں کہ ہمارے زمانے میں تو بچے بھی بالغ ہوتے ہیں۔ اور نوجوان اپنی عمر سے پہلے عمر رسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

ایسے ماحول میں پرویز کا وجود، خود ایک علامت ہے۔ زندگی اور زندگی کے وسیع تر مفہوم کی علامت!

جس کی بقا کے لئے دعائیں مانگتے ہوئے میں اپنی آنکھوں کی تمام روشنی قربان کر سکتی ہوں۔

□

فضا ابن فیضی

غزلیں

تجھے ادھورے ورق سے کتاب کر دے گا
زباں نہ کھول، کہ وہ لاجواب کر دے گا

نفس کو شہد، لہو کو شراب کر دے گا
یہ کیا خبر تھی وہ جینا عذاب کر دے گا

ہٹالے اپنی نگاہیں تو میرے چہرے سے
یہ آئینہ تجھے بے آب و تاب کر دے گا

ملو تم اس سے، مگر احتیاط شرط، کہ وہ
خراب خود تو نہ ہوگا خراب کر دے گا

مرے قلم کا لہو ہے، اسے ذرا چکھ لے
یہ شاخ جاں کو بھی شاخ گلاب کر دے گا

حقائق اپنی جگہ، جاگتے رہو، ورنہ
وہ شخص سارے حقائق کو خواب کر دے گا

نہ خود کو سونپ اسے، بدمعاملہ ہے وقت
پلک جھپکتے برابر حساب کر دے گا

تو اس طرح نہ برت اس کو انکساری سے
وہ آندھیوں کو ترے ہم رکاب کر دے گا

فضاؔ سے ملتے رہو، ہے بڑا ہنر والا
تمھیں بھی ایک مکمل نصاب کر دے گا

نہ تو ہم کو سدا مجہول لفظوں کا ہدف لکھ
ہماری لوح جاں پر بھی کوئی حرفِ شرف لکھ

بدن ہی بس ہمارے پاس ہے گوہر کی صورت
نفس اندر نفس ساری تہوں کو بے صدف لکھ

ہمارے دور کو ہے حاشیہ بینی کی عادت
بیاضِ ذات پر ہم کو کنارے کی طرف لکھ

ہوں وہ حرف بصیرت، ہر جگہ روشن رہوں گا
مجھے خاشاک پر لکھ، یا سرِ لوحِ خزف لکھ

تجھے ہر چند آتا ہوں نظر، صحرا بہ پہلو
جو ممکن ہو تو میری پیاس کو دریا بکف لکھ

پرندِ ناتواں ہوں، صید اپنے ہی انا کا
مجھے میری ہی درماندہ نگاہی کا ہدف لکھ

کھنگالے ہیں کئی قلزم لہو کے، ان کی خاطر
مرے الفاظ کو تو شمعِ دہلیزِ صدف لکھ

نفس کھینچوں اگر سینے کے باہر، مر ہی جاؤں
خموشی کو مری تو ہی بخطِ چنگ و دف لکھ

اٹھائی ہے ہزیمت عمر بھر، مہلت بھی دے کچھ
مرے بکھرے ہوئے لشکر کو اب تو صف بہ صف لکھ

جو ہوتے کام کے، کیوں زندگی کرتے اکارت
ادب کو آج تو بے کار لمحوں کا شغف لکھ

بجائے لفظ، کاغذ پر ابھرتی ہیں خراشیں
مجھے اب اے قلم! منصب سے اپنے برطرف لکھ

رشید امجد

ثمر سے بے ثمر پیڑوں کی جانب

ایک ذلیل سی، سر سے پیر تک دھند میں لپٹی صبح۔

ہائی وے پر ایک کار ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف دوڑے جا رہی ہے، دونوں شہروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ ان کے نام اور جغرافیے کیا ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر واقع ہیں؟ چونکہ یہ ہائی وے ہے اور یہاں ہر چیز اپنی انتہائی رفتار سے دوڑ رہی ہے، اس لئے یہ کار بھی جس کا رنگ ہلکا کتھئی ہے پوری رفتار سے دوڑے جا رہی ہے، جس شہر سے آئی ہے اور جس شہر کی طرف جا رہی ہے، دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، بلکہ اور بھی بہت سے شہروں میں کوئی فرق نہیں، اس لئے وہ جس شہر کی طرف جا رہی ہے اس کے بجائے کسی دوسرے شہر کی طرف بھی جا سکتی ہے،

کار میں چار شخص ہیں، جن میں سے ایک مر رہا ہے اور ایک پیدا ہو رہا ہے۔ باقی دو میں سے ایک گاڑی چلا رہا ہے، معلوم نہیں چلا بھی رہا ہے کہ نہیں، مگر اپنے طور پر وہ یہی سمجھتا ہے، دوسرا موجود ہے، یا شاید موجود نہیں ہے، اپنے طور پر اگرچہ وہ بھی خود کو موجود ہی سمجھتا ہے۔ کار میں گھمبیر چپ ہے اور ہائی وے پر دھند چہل قدمی کر رہی ہے۔ باقی دو میں سے اگلی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر گردن کو شانوں میں دبائے موت کے اشاروں سے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لفظ بارش کے قطروں کی طرح جھلمل کرتے ہیں، لیکن آواز نہیں آتی، اس کے بالکل پیچھے سیٹ پر بار بار اچھلتا، دھند میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا، خاموشی سے پیدا ہو رہا ہے۔

مرتا ہوا شخص نم آلود انگلیوں سے زندگی کے کلینڈر کو ٹٹولتا ہے۔ چند دن پہلے کوئی اس کے سارے لفظ اس سے ادھار مانگ کر لے گیا تھا، اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کچھ عرصہ وہ لفظوں کے بغیر اشاروں کنایوں سے کام چلاتا رہا، مگر جب چند دنوں کا دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا تو اشارے کنائے بھی ختم ہونے لگے۔ لفظوں کے بغیر دم گھٹنے لگا۔ وہ لفظ مانگنے والے کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر گیا، لیکن وہ نہ ملا، اس جیسے کئی تھے مگر وہ سب اصل کی نقل تھے اور سارے شہر ایک جیسے۔

نفظوں کے بغیر زندگی گزارنے کا تجربہ کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ دنیا کے کئی ملکوں میں لوگ لفظوں کے بغیر ہی رہتے ہیں لیکن اسے سمجھ نہ آیا کہ لفظوں کے بغیر اس کی خوشبو ختم ہو گئی ہے۔ اسے اپنا آپ کوڑا اڈرم لگتا ہے، جس میں سے بھانت بھانت کی سرانڈ اٹھتی رہتی ہے۔ اس کے نتھنوں میں خوشبو کے پھاہے رکھے گئے مگر اب اسے ذائقے میں سرانڈ کا احساس ہونے لگا۔ انھوں نے اس کے کھانے میں خوشبو شامل کر دی تو اسے آوازوں میں سرانڈ محسوس ہونے لگی، انھوں نے اس کے کانوں میں بھی خوشبو کے پھاہے رکھ دیئے تو اسے لمس میں سرانڈ آنے لگی، اور اب اسے خیالوں اور سوچوں میں بھی سرانڈ آنے لگی ہے، یہ دیکھ کر انھوں نے اسے مرنے کی اجازت دے دی ہے، لیکن موت تنی کنجوس اور خسیس ہو گئی ہے کہ حاملہ عورت کی طرح پھونک پھونک کر سیڑھیاں اترتی ہے۔ وہ اسے ناروں سے بلا رہا ہے، کنایوں سے کہہ رہا ہے، لیکن موت نہ آتی ہے نہ مکالمہ کرتی ہے،

کہتے ہیں موت مکالمے سے بہت کتراتی ہے،

اور وہ مکالمہ کرنا چاہتا ہے، لیکن مکالمے کے لئے لفظوں کی ضرورت ہے اور لفظ اس نے سی کو ادھار دے دیئے ہیں،

دوسرا شخص آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا ہے، اسے نہ مکالمے سے دلچسپی ہے، نہ لفظوں سے، سے معلوم ہی نہیں کہ اس کے پاس لفظ ہیں بھی کہ نہیں، بس وہ تو اچھل اچھل کر دھند میں لپٹی شبیہوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے نہ بو آتی ہے نہ خوشبو،

روشنی ہے تو ٹھیک، نہیں ہے تو بھی ٹھیک،

"میں کون ؟"

"عامل"

"تم کون ؟"

"معمول"

"جو کہوں گا مانو گے ؟"

"مانوں گا"

"گھوم جاؤ"

"گھوم گیا"

"ان اچکن والے صاحب کی جیب میں کیا ہے ؟"

ایک گہری چپ

"معمول ـــــ معمول ـــــ ارے او معمول، بھائی بول تو سہی ـــــ کچھ تو بتا"

ایک گہری گھمبیری چپ

کار چلانے والا ٹھنڈی آہ بھرتا ہے ـــــ "دھند بڑھتی ہی جا رہی ہے ـــــ عجیب بات ہے جوں جوں دھند چڑھتا جاتا ہے دھند کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

مرتا ہوا شخص خالی آنکھوں سے باہر دیکھنے کی سعی کرتا ہے اور شانے ہلا کر چپ ہو جاتا ہے۔

پیدا ہوتا شخص اچھل کر شیشہ کھولتا ہے، دھند کھنی مار کے اندر آنے کی کوشش کرتی ہے۔

وہ جلدی سے شیشہ چڑھا دیتا ہے اور غوں غوں کر کے سیٹ میں دبک جاتا ہے۔

یاد آیا اسی کار میں ایک چوتھا شخص بھی ہے، وہ چپ چاپ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہے، کار چلانے والے کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لئے اسے اور باقی دو کو دیکھتا ہے اور دوبارہ ونڈ سکرین پر نظریں جما دیتا ہے۔

کار چلانے والا پھر کہتا ہے ـــــ "عجیب بات ہے جوں جوں سورج بلند ہو رہا ہے، دھند کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے ـــــ مجھے تو لگتا ہے یہ سورج کی بجائے کوئی اور چیز ہے۔"

کوئی اس کی بات کا جواب نہیں دیتا،

ایک کے پاس لفظ ہی نہیں کہ اس نے اپنے لفظ کسی کو ادھار دے دیئے ہیں،

دوسرے کے پاس لفظ ہیں مگر جواب نہیں،

تیسرے کے پاس بھی ہیں اور جواب، لیکن وہ بولتا نہیں،

ایک عجیب قسم کی ذلیل اور بے غیرت خاموشی چاروں طرف چوکڑی مارے بیٹھی ہے اور کار چپ چاپ چاروں کو لئے ہائی وے پر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف دوڑے جا رہی ہے مگر۔

مگر یہ کسے یقین ہے کہ یہ ہائی وے ہی ہے؟

کیا معلوم ہو۔ ☐

شمس الرحمٰن فاروقی

بلراج کومل کے افسانے

اس چھوٹے سے مجموعے میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان افسانوں کا تنوع ہے۔ یہ تنوع موضوع کا بھی ہے، تکنیک کا بھی اور اسلوب کا بھی۔ تنوع کی یہ کثرت اگر ایک طرف رنگارنگی کا احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف افسانہ نگاری کی اس کوشش کی بھی نشان دہی کرتی ہے کہ زندگی کو، اس کے واقعات اور مفروضات کو، طرح طرح سے دیکھا جائے۔ بلراج کومل کی نظموں میں ایک شائستہ، دھیما اور خوش اسلوب آہنگ ملتا ہے، یہ آہنگ تمام نظموں میں کم و بیش مشترک ہے۔ اس کے برخلاف افسانوں میں نثر کا آہنگ ہر جگہ ایک جیسا نہیں، کہانی کہنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ افسانہ نگار اپنا آہنگ تلاش نہیں کر سکا ہے، بلکہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے، زندگی اس کے سامنے تجربے سے زیادہ مشاہدے کی شکل میں آتی ہے۔ تجربے کی شکل میں حاصل ہونے والی زندگی میں تجربے سے گزرنے والا شخص اپنے تاثرات اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ سب تجربے ایک دوسرے سے مماثل معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک فطری صورت حال ہے، اس سے گریز ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف، مشاہدے کی صورت میں حاصل ہونے والی زندگی میں مشاہدات کی بوقلمونی برقرار رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ بھی مشاہد کا محتاج ہوتا ہے، اس معنی میں کہ دیکھنے والا جو کچھ دیکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ہر منظر میں اپنی شخصیت شامل کر لیتا ہے، لیکن یہ شخصیت بہرحال دیکھنے والی شخصیت ہوتی ہے، تجربے کو انگیز کرنے والی شخصیت نہیں ہوتی۔ نطشے نے اشیا کی حقیقت کے معروضی نہ ہونے کا جو حکم لگایا تھا وہ اسی وجہ سے تھا کہ ہر حقیقت ہر دیکھنے والے کو اپنی ہی آنکھوں کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ نطشے سے بہت پہلے غالب اسی بات کی طرف اشارہ کر چکے تھے ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشاہدہ کی کوئی حقیقت، تجربہ کی ہوئی حقیقت سے زیادہ معروضی ہوتی ہے، اس لئے زیادہ متنوع بھی ہوتی ہے۔ (اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ جو حقیقت جتنی معروضی نظر آئے اتنی ہی سچی بھی ہو، لیکن یہ الگ بحث ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مشاہدہ کرنے والا تجربہ کرنے والے سے زیادہ دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ کھیل کے بارے میں تماشائی کو کھلاڑی سے زیادہ علم ہوتا ہے۔)

بلراج کومل کے ان افسانوں کا تنوع اسی نکتے میں مضمر ہے۔ وہ زندگی کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے بیانیہ تکنیک کے کئی طریقے استعمال کئے ہیں۔ ان کے بعض افسانے غائب اور سب کچھ جاننے والے راوی نے بیان کئے ہیں (کنواں، کرچیں، تصویر، وغیرہ) تو بعض میں راوی واحد متکلم ہے (تیسرا کتا، دل ناتواں)۔ بعض میں راوی واحد متکلم ہے لیکن وہ جن واقعات کو بیان کرتا ہے وہ خود اس پر نہیں گزرتے، بلکہ وہ اوروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتا ہے (سائے کے ناخن، ایک آدمی کا قتل)۔ کسی افسانے میں راوی غائب تو ہے، لیکن جو واقعات ہیں وہ محض ایک شخص کے تاثرات اور مشاہدات ہیں۔ (آنکھیں اور پاؤں۔) کسی میں افسانہ در افسانہ ہے، اور دونوں راوی واحد متکلم ہیں (روشنی روشنی)۔ کسی میں راوی بالکل مفقود ہے، اس کی جگہ تاثرات اور حافظے میں منتشر یادوں اور گذشتہ و آئندہ واقعات کی طرف علامتی اشاروں نے لے لی ہے (جیسی گڑیا پری کی رات)۔ جن افسانوں میں واحد متکلم کا کردار کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ ان میں بھی اس کی حیثیت مرکزی نہیں بلکہ مشاہد کی ہے (تیسرا کتا)۔ لیکن بعض افسانوں میں مشاہد کی شخصیت نمایاں ہونے کے باوجود خود سوانحی رنگ بھی موجود ہے (قلم کے ٹکڑے، ببول)۔ یہ سب افسانے ایک پائے کے نہیں ہیں لیکن فی الحال صرف اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ ان افسانوں میں بیانیہ کے مختلف طریقے کم و بیش کامیابی کے ساتھ برتے گئے ہیں لہٰذا ان کو پڑھتے وقت اس قسم کی تکرار کا احساس نہیں ہوتا جو ہمارے زمانے کے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر افسانے ایک ہی کردار یا ایک ہی شخص کے تاثرات پر مبنی ہیں، لیکن راوی کے تنوع کی وجہ سے اس بات کا احساس ناگواری کی حد کو نہیں پہنچتا۔

موضوع کے اعتبار سے دیکھئے تو تمام افسانوں میں معاصر دنیا بیان کی گئی ہے۔ لیکن بعض میں انسانوں کی بے حسی، نچلے متوسط طبقے سے ترقی کر کے متوسط طبقے تک پہنچنے والوں کی سطحیت اور اخلاقی دیوالیہ پن کا ذکر ہے (تیسرا کتا، کرچیں)۔ کسی میں جدید زندگی میں تشدد اور اس تشدد کے رو

ہم لوگوں کی بے پروائی کا بیان کیا گیا ہے (ایک آدمی کا قتل)۔ بعض میں دانشوروں کی لایعنیت اور کھوکھلے پن پر طنز ہے (قلم کے ٹکڑے، روشنی روشنی، ببول)۔ بعض میں ہمارے زمانے میں احتجاج برائے احتجاج اور ریاکاری اور تشدد پسندی اور بے حسی کی شدت پر افسوس اور برہمی اور طنز ہے (آنکھیں اور پاؤں، دل ناتواں)۔ کسی میں پوری زندگی کی بے معنویت کو موضوع بنایا گیا ہے (کنواں)۔ تو کسی میں زندگی کے غیر متوقع طور پر بھیانک ہو جانے کا ذکر ہے (سائے کے ناخن)۔ "کنواں" اور "تصویر" میں اسرار کی کیفیت نمایاں ہے، زندگی عجیب بھی ہے اور پراسرار بھی، بڑی حد تک ABSURD بھی ہے، کیوں کہ "تصویر" کے دو کرداروں میں سے ایک غریبی سے گزر کر کامیاب بزنس مین کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور اپنے ماضی سے آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن آزاد نہیں ہو سکتا۔ دوسرا ابھی بھی غریب ہے اور کامیاب بزنس مین بننا چاہتا ہے، لیکن دونوں اپنی شخصیت اور وجود سے بے خبر بھی ہیں اور اس کے بارے میں عجیب و غریب تاثرات بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ایک تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے ہیں، لیکن دراصل وہ کسی پرانے کیلنڈر سے کاٹی ہوئی مجہول تصویر ہے۔ اس طرح دونوں کی شخصیت اور وجود ایک طرف تو فرضی اور اشتہاری اور مصنوعی نظر آتے ہیں تو دوسری طرف پراسرار اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔

اسرار کی یہ کیفیت "کنواں" میں اور زیادہ نمایاں ہے۔ افسانہ جس واقعے کے فریم میں رکھ کر پیش کیا ہے وہ خود ناقابلِ فہم ہے۔ جب شہر میں جگہ جگہ پانی کے نل لگ گئے تو کنوئیں بے کار ہو گئے۔ پھر ایک شخص نے کنوئیں میں پھلانگنے کا مشغلہ تفریحاً اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اس فن میں طاق اور شہرہ آفاق ہو گیا۔ افسانہ غائب راوی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر راوی واحد متکلم ہوتا تو ممکن ہے ہمیں گمان گزرتا کہ واحد متکلم ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے یا کوئی طنزیہ بات کہہ رہا ہے۔ راوی کے غائب ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کی بات پر یقین کیئے ہی بنتی ہے، کیوں کہ بات کچھ ایسی ناقابلِ یقین بھی نہیں، ناقابلِ فہم ضرور ہے۔ ہم سوچتے ہیں آئندہ چل کر بات صاف ہو گی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں بات اور الجھ جاتی ہے۔ کیوں کہ کنواں پھلانگنے والا مشق اور ٹریننگ کی غرض سے (کیوں کہ اسے ایک مقابلے میں حصہ لینا ہے) کنواں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ ایک کنواں جو اس کی مشق کے لئے بہت مناسب ہے۔ ایک سوکھے مرتے شخص کی آماجگاہ ہے جو تمام دنیا سے بیزار ہے، اسے سب لوگوں نے اپنے جبر اور تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس کنوئیں پر خودکشی کے لئے آیا ہے۔ دونوں میں فلسفیانہ قسم کی تلخ کلامی ہوتی ہے، آخر کار کنواں پھلانگنے والا، سوکھے سڑے شخص کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ پہلے وہ کنواں پھلانگ لے۔ پھر

خودکشی کرنے والا خودکشی کرے۔ لیکن کنواں پھلانگنے والے کی پر زور جست ناکام رہتی ہے، وہ کنوئیں میں گر جاتا ہے اور خودکشی کرنے والا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

افسانہ ہمارے سامنے کئی سوال کھڑے کرتا ہے لیکن تشفی بخش جواب نہیں ملتے۔ کنواں پھلانگنے والا زندگی کا پرستار، رجائی اور مثبت فکر کا مالک ہے۔ زندگی اس کے لئے ایک مقابلہ ایک سماجی عمل ہے۔ خودکشی کرنے والا ہر چیز سے بیزار ہے۔ اسے کسی پر اعتبار و اعتقاد نہیں۔ کنواں پھلانگنے والا زندگی پر اصرار کرتا ہے تو خودکشی کرنے والا مرنے پر تلا ہوا ہے۔ لیکن موت کنواں پھلانگنے والے کی واقع ہوتی ہے، خودکشی کرنے والا بھاگ لیتا ہے۔ کیا زندگی اس طرح کے غیر متوقع، طنز، حادثوں کا نام ہے؟ کیا وہ خودکشی کرنے والا، کنواں پھلانگنے والے کی موت کا فرشتہ اور بہانہ تھا۔ اور جان بوجھ کر اس کام کے لئے متعین ہوا تھا؟ اگر ہاں، تو اسے متعین کرنے والا کون تھا؟ کیا خودکشی کرنے والے کا فرار اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے، ان لوگوں کو بھی، جو موت سے عشق اور زندگی سے نفرت کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ کیا کنواں پھلانگنے کے عمل میں کوئی تمثیلی اشارہ پنہاں ہے؟ اگر ہاں، تو کیا وہ اشارہ یہ ہے کہ کنواں پھلانگنے سے مراد AMBITION ہے اور زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے اور جن لوگوں میں AMBITION ضرورت سے زیادہ ہے وہ اس پل سے گر کر نیچے گہرے کنوئیں میں غرق ہو جائیں گے؟

سوالات کی اس کثرت اور ممکن جوابوں کی فراوانی کی بنا پر یہ افسانہ کافکا کی یاد دلاتا ہے۔ اس اور بعض دوسرے افسانوں میں راوی کا لہجہ جذبے سے عاری اور بڑی حد تک خشک اور غیر ڈرامائی ہے۔ یہ لہجہ افسانے میں بیان کردہ واقعات کے انوکھے پن کو نمایاں کرتا ہے۔ جہاں جہاں بلراج کومل نے کرداروں کے جذبات اور تاثرات کو براہ راست بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہاں استعجابیت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن اپنے بہترین لمحوں میں وہ اپنے خشک اور غیر جذباتی لہجے کو واقعات کے مقابلے میں ایک CONTRAST کے طور پر پیش کرنے اور اس طرح اسرار کے تاثر کو شدید کر دینے میں پوری طرح کامیاب رہتے ہیں۔

> جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیئے گئے تو شہر کے اکثر کنوئیں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصے تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد

اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا شغل باقاعدہ اختیار کر لیا تھا۔

(کنواں)

کمرے کی دھندلی روشنی میں اس نے آئینے کی سطح کا جائزہ لیا۔ آئینے پر بہت سی خراشیں
پڑی ہوئی تھیں اور وہ کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا عقب میں لٹکے ہوئے ایک پرانے کلنڈر
کا عکس آئینے میں دکھائی دے رہا تھا۔ خراشوں کی ایک دوسرے کو بے رحمی سے کاٹتی
ہوئی لکیروں میں اسے اپنا چہرہ ایک ایسی تصویر کی طرح نظر آیا جو کلنڈر کے ٹکڑوں
کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور جس میں ان لکیروں کو نمایاں کر دیا گیا تھا جہاں "یہ سب کیسے
ہو گیا؟ یہ کیا یہ میری تصویر کا قصور تھا" کارتک کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

(تصویر)

اس کے بر خلاف "جیسی گڑیا پری کی رات" میں سپاٹ بیانیہ کو مسترد کر کے واقعات کی منطقی ترتیب کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ترتیب کی جگہ حال اور ماضی کے ادغام سے مستقبل کی بھی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ پیکروں اور تشبیہاتی الفاظ کی کثرت ہے۔ اس طرح افسانے کا آہنگ نثری نظم کے آہنگ سے مل جاتا ہے۔ افسانے کی ابتدا ہی ایک نثری نظم سے ہوتی ہے جو پورے افسانے کی کلید معلوم ہوتی ہے۔

شبنم جیسی گڑیا۔ پری ...
آج پھر اس نے رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں اور تتلیوں کا خواب دیکھا۔
آج پھر وہ اس وادی میں اتری جہاں ایک روشن ستارے نے
اسے کئی برس پہلے اتارا تھا۔
آج پھر وہ اس ندی کے کنارے دیر تک بیٹھی
جہاں ایک شہزادہ، گھوڑے پر سوار، اس سے ملنے آیا تھا
——— لیکن یہ سب صرف ایک لمحے کے لئے ہوا۔
اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ درد و کرب سے ماورا چلی گئی تھی۔

یہ افسانہ ہمارے نام نہاد ترقی پذیر، روشن خیال سماج میں عورت کے استحصال کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ لیکن شعریت کی کثرت نے اسے پوری طرح افسانہ بننے نہیں دیا۔ بلراج کومل کا وہ اسلوب جہاں وہ مشاہد یا غیر متعلق راوی کی شخصیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے افسانوں

کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

لیکن یہ خاموش مشاہد یا غیر متعلق راوی بے حس نہیں ہے، وہ جذبہ جو انھیں افسانہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے، ہمدردی، کرب یا برہمی کا جذبہ ہے۔ برہمی کا نشانہ وہ عقل اور تہذیب سے عاری لوگ بھی ہیں جن کے دلوں سے ہمدردی کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، جو ایک پالتو کتے کے گھر سے نکالے جانے اور اسے گولی کا نشانہ بننے کا منظر تماشے کے طور پر دیکھتے ہیں اور یہ پوری زندگی بھی ہے جس میں تشدد اور غیر متوقع تصادم اور بے وجہ حادثات کی کثرت ہے، جس میں گھر سے بھاگنے والا لڑکا ایک بار تو سیر سپاٹا کر کے خوش و خرم لوٹ آتا ہے لیکن دوسری بار کسی قاتل کا شکار بن جاتا ہے۔

دہشت زدہ جانوروں میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جو انہیں مطلع کر دیتی ہے کہ ان کی موت قریب ہے۔ ریہو سہما ہوا جب گلی کے آخر تک پہنچ گیا تو بھیڑ نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ واپس مڑا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا گلی کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ جہاں ہجوم کی دوسری ٹکڑی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ پھر واپس مڑا، اس ڈھنگ سے کہ اس نے گلی کے چار پانچ چکر کاٹے اور پھر اسی سوگز لمبی لکیر کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔

(تیسرا کتا)

نشانہ چوک گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی ریہو کے کان کے قریب سے گزر کر ملبے کے ایک ڈھیر میں گھس گئی۔ ہجوم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

(تیسرا کتا)

ڈمپی میرے ذہن سے اتر گیا ہوگا گھر سے بھاگا ہوا کوئی لڑکا! میرے بچے میرے گھر میں مصروف تھے۔ صبح ہوئی۔ معمول کے مطابق بچے مسکراتے، ہنستے ہوئے بیدار ہوئے معمول کے مطابق... میں نے چائے کا پیالہ اٹھایا اور اخبار کھولا... ایک بچے کے قتل کی خبر۔ عمر ۱۲ سال... رنگ... میرے ذہن میں ایک انجانا بھیانک خیال کوندے کی طرح لپکا۔

(سائے کے ناخن)

ڈمپی جب پہلی بار بھاگا تھا تو لوگوں نے اس کے والدین سے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا ب وہ محفوظ اور خیریت واپس آگیا تو لوگوں کو ایک طرح کی ناراضگی اور جھنجھلاہٹ ہوئی۔ چناں چہ

جب وہ دوسری بار بھاگا تو طرح طرح کی طنزیہ باتیں کہی گئیں، فیصلہ کیا گیا کہ اب کی بار ڈمپی واپس آیا تو اپنے بچوں کو اس کے ساتھ کھیلنے سے روکیں گے۔ لیکن اس بار ڈمپی واپس نہیں لوٹتا، اس کی لاش بھی شاید سالم نہیں بچی۔ زندگی میں اس طرح کا تشدد PROBABILITY کی کمی اور غیر منطقی بے معنویت بلراج کومل کی برہمی اور رنج دونوں کو متحرک کرتے ہیں۔

> زمین سے آسمان تک ایک بھیانک شعلہ لپلپا رہا تھا جو اپنی خونیں زبان سے عمارت کا گوشت چاٹ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے تیزی سے دھندلے ہوتے ہوئے افق پر ایک پل کے لئے اس کے بچوں کے معصوم چہرے نمودار ہوئے۔ ایک اجنبی شور اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرایا مگر اس کے بعد ایک متبحر تاریکی اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اتر گئی۔

(آنکھیں اور پاؤں)

اس طرح ستیار تھی، جو اپنے بچوں کے لئے کاپی کتابیں خریدنے نکلا تھا، ایک جلوس کے بے ذہن وحشیانہ سیلاب میں بہہ کر اس تشدد کا شکار ہو گیا۔ جو اس جلوس نے برپا کیا تھا اور پھر جس کو ختم کرنے کے لئے پولیس نے جلوس اور تماشائیوں پر توڑا تھا۔ جو لوگ اپنے گھروں میں بند تھے وہ آگ کا شکار ہوئے اور جو لوگ سڑک پر تھے وہ گولیوں یا مار دھاڑ کا۔ حفاظت اور سلامتی کہیں نہیں ہے اسی طرح "سایہ" کا نرمل گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس سے بھاگ کر پہاڑ کے خوبصورت مقام میں پناہ لیتا ہے وہاں اسے اپنے ہوٹل کے پیچھے پانی گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اسے آبشار سمجھتا ہے اور رات بھر اس تصور میں مگن سوتا ہے کہ صبح کو آبشار کی سیر کریں گے۔ صبح کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آبشار نہیں بلکہ ہوٹل کے گندے پانی کا پرنالہ ہے۔ بدصورتی ہر جگہ ہے۔ بدصورتی سے بھاگ کر کہاں جاؤگے؟ گناہ اور جھوٹ ہر جگہ ہے، خود تمہارے اندر ہے، تمہارے گردوپیش میں ہے۔ یا شاید یہ افسانہ اس قسم کے کسی اخلاقی سبق کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ ابوالحسن تانا شاہ جیسے نازک مزاج لوگوں سے ہمدردانہ یا طنزیہ لہجے میں کہتا ہے کہ تمہارا دور ختم ہو گیا، اب جدید صنعتی دور ہے، ہر عمارت اور ہر فیکٹری سے گندا پانی بہتا ہے۔ یا شاید اس افسانے کا ماحصل یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نفاست اور نازک مزاجی دراصل حقیقت سے فرار ہے۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانے اپنے بظاہر سادہ رنگ میں اس طرح کی کئی پیچیدہ باتیں کہہ جاتے ہیں اور قاری کو زندگی اور انسان اور خود اپنے بارے میں طرح طرح کے شکوک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میں اسے بلراج کومل کی بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔ □


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت نزلہ
کھانسی زکام۔ نزلہ کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یوپی

(ڈاکٹر) عتیق اللہ
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مظفر حنفی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

غزلیں

اک ایسی بھی سازش اپنے ساتھ کروں
سجدے کرتے وقت کبھی تیرا نام نہ لوں
میری دعا ہے تیرے زیاں کا نظارہ
میں نہ کبھی آنکھوں سے اپنی دیکھ سکوں
لمس کی سرحد ختم یہاں پر ہوتی ہے
اس کے آگے تجھ کو بھی میں راہ نہ دوں
آنسو بے آواز رقم کرنا آئے
تو پھر اپنے نیچے کا چہرہ دیکھوں
تو انکار کی مہلت سر کرنے میں ہے
میں تیرا امکان تری قدرت میں ہوں
ہر لمحہ اک لمبی عمر کا خمیازہ
ساعت ساعت لاشوں کی دیوار چنوں
اس کے سارے لمس بدن میں زندہ ہیں
میں تو ان ہاتھوں کی اک اک شاخ پڑھوں

دردِ سر، دردِ سر، بیستوں کم نہیں
ڈوبنا ہو تو دریا سے خوں کم نہیں
آئینہ دار ہوں اس کی تکمیل کا
میں کہ جتنا بھی موجود ہوں، کم نہیں
ساتواں در نہ جانے کہاں کھو گیا
اک بیاباں سے اپنا جنوں کم نہیں
دور تک سارا منظر گلابی سا ہے
ایک ہی قطرۂ واژگوں کم نہیں
تم سفینے میں طوفاں اٹھاتے رہو
ہم کو طوفان میں بھی سکوں کم نہیں
تلخ حالات میں مجھ سے بدظن نہ ہو
میں بھی ایسے میں جو سوچ لوں کم نہیں
اے مظفر چٹکتی کلی کی طرح
تیرے شعروں میں سوزِ دروں کم نہیں

ایک اہم تصحیح

(افسانہ نمبر (جلد دوم) ظفر اوگانوی کا افسانہ "زہر"
قارئین تصحیح فرمالیں اور اس طرح پڑھیں:

صہ ۱۸۲ سطر ۱۱۔ "اور ایک میں ہوں، خالی، بالکل نہتا اور غیر مسلح کسی ریفرنس کے بغیر۔"
" سطر ۲۱۔ "لیکن وہ نہتا اور غیر مسلح آدمی اپنے جبڑوں سے ...." الخ
صہ ۱۸۲ سطر ۳ [illegible]

ساجد رشید

برف گھر

"باہر خوب گرمی پڑ رہی ہے!"

کھڑکی پر کسے براؤن شیشے سے باہر بنجر میدان کو دیکھتے ہوئے موٹے کھدر دھاری نے اپنی بغل میں نیم دراز گنجے صنعت کار سے کہا، جو اتنے احتیاط سے لیٹا ہوا تھا کہ کوٹ پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ کھدر دھاری کے لہجے میں باہر کی گرمی اور راجدھانی ایکسپریس کے اس کمپارٹمنٹ میں پھیلی ایرکنڈیشنڈ کی خنکی کے لئے اطمینان تھا۔

"ہاں جی گرمی کا مہینہ ہے تو گرمی پڑے گی۔ اچھا ہوا کہ ریلوے والوں نے راجدھانی کو مکمل ایرکنڈیشنڈ کر رکھا ہے۔" گنجے صنعت کار نے اپنے چکنے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بس یہی کارن ہے کہ میں ہمیشہ راجدھانی سے سفر کرتا ہوں۔ اس ٹرین میں کئی خوبیاں ہیں، اب یہی دیکھئے نا باہر چاہے جتنی دھوپ ہو رنگین شیشے سے باہر دیکھنے پر آنکھیں نہیں چبھتیں۔ دوسرا یہ کہ آس پاس کا علاقہ کتنا ہی سوکھا گرست کیوں نہ ہو بھیتر سے ہمیں سب کچھ بڑا اجلا دکھائی پڑتا ہے۔ اور پھر ہمیں باہر دیکھنا ہی کتنی دیر ہے دو گھنٹے بعد تو اندھیرا ہو ہی جاتا ہے اس کے بعد کھا پی کر سو رہنا ہوتا ہے۔ آنکھ جب کھلتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہم راجدھانی میں ہیں۔" کہہ کر موٹا کھدر دھاری بطخ کی طرح قی قی قی کر کے ہنسنے لگا۔

اس کی اس بے ہنگم ہنسی پر آگے پیچھے کے لوگ چونک پڑے اور گنجا صنعت کار جلدی سے بے تعلقی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں مرکیوری بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اے سی کی سرد ہوا میں ملی او ڈی کولن کی ہلکی مہک ہر طرف بکھری ہوئی تھی اور مائکروفون سے ہلکی ہلکی موسیقی پھوٹ رہی تھی ایسے ماحول میں باہر کی جھلسا دینے والی گرمی سے بے حال مسافر بڑی راحت محسوس کر رہے تھے۔ اس ٹرین سے سفر کرنے والے بیشتر لوگ اعلیٰ اور متوسط طبقے سے ہوتے ہیں جو عام ٹرین میں سفر کرنے والے عام لوگوں کی عام ذہنیت سے بچنا چاہتے ہیں یا پھر انھیں اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹرین کی تیز رفتار اور اس کے عملے کی عمدہ کارکردگی اور ڈسپلن بھی ان کے ذہن میں رہتا ہوگا!

مائکروفون سے نشر ہونے والی ہدایت کے مطابق تمام لوگوں نے اپنی سیٹ کے سامنے لگی فولڈنگ تپائی کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا تھا جس پر ویٹر نے چائے سے بھری تھرماس بوتل رکھ دی تھی۔ گنجے صنعت کار نے چائے پلاسٹک کے کپ میں انڈیل لی تھی اور ایک نظر پیالی سے اٹھتی بھاپ پر ڈال کر شیشے سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ تیزی سے پیچھے چھوٹتے بنجر میدانی علاقے میں دور ایک ہڈیوں کا سیاہ ڈھانچہ مردار بیلوں کو لے کر ہل جوت رہا تھا۔ بجھا بجھا سا سورج مغرب میں بس گرنے کو تھا۔

"ہمارے دیش کا کسان کتنا پچھڑا ہوا ہے۔" صنعت کار نے ڈھانچے کو گھورتے ہوئے کہا۔ کھدر دھاری نے چائے کا گرم گھونٹ بھر کر صنعت کار کی نظروں کا تعاقب کیا اور ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو اس کے مردار بیلوں سمیت جالیا۔

"ہماری سرکار ان کے بارے میں بہت سارے پلان بنا رہی ہے۔" کھدر دھاری کی آواز میں جوش تھا۔ "یہی لوگ تو ہماری اصل جنتا ہیں۔"

"پتہ نہیں ان کی سمجھ میں یہ سیدھی سی بات کیوں نہیں آتی کہ لکڑی کے ہلوں اور مرگھلّے بیلوں سے اب کھیتی باڑی پوسیبل نہیں ہے۔ انھیں تو ماڈرن طریقوں اور اوزاروں کو اپنانا چاہئے جیسے ٹریکٹر اور تھریشر وغیرہ ہیں۔" صنعت کار نے چائے کا پہلا گھونٹ لے کر پیچھے چھوٹ جانے والے کسان کی ناسمجھی پر اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

"بھئی انھیں کون سمجھائے، سمجھانے سے یہ کہاں سمجھتے ہیں۔ اگر سمجھ ہوتی تو تیس پینتیس برس بعد بھی ہمارا دیس اتنا پیچھے کیوں رہتا۔ ہمارا کام پلان بنانا اور ان کا کام پلان چوپٹ کرنا ہے۔" وہ ایک بار پھر بطخ کی آواز میں ہنسا۔ صنعت کار پھر باہر دیکھنے لگا۔ ان کے آگے بیٹھے ہوئے نوجوان نے جیمس ہیڈلے چیئز کی سنسنی خیز دنیا میں خلل پڑنے پر سر کو جھٹکا اور ان ہی سطروں کو دوبارہ پکڑ کر اسی ماحول میں اتر گیا۔

"میں سوچتا ہوں دیش کی اُنتی (ترقی) کے لئے ضروری ہے کہ دیش کے کونے کونے میں آپ جیسے حوصلہ مند اُدھیوگ پتی (صنعت کار) بڑے بڑے کارخانے قائم کریں۔" کھدر دھاری کے چہرے پر فکر کی لہریں گہری ہو گئیں۔

"لیکن یہ کارخانے کیا پروڈکٹ کریں گے؟" صنعت کار نے اس کی پلاننگ پر حیرت سے پوچھا۔

"پہلے کارخانے لگ جانے دیجئے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ ان میں کیا چیزیں بن سکتی ہیں۔" کھدر دھاری کے لہجے میں پورا سکون موجود تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر بڑے سونف چبانے لگے تو بچے گملے کی جانب سے دی گئی ٹافی چوسنے لگے۔ انھوں نے اپنے سرپرستوں کی ہدایت پر ٹافی کا ریپر سلیقے سے اتار کر کاغذ کی پلیٹ میں ڈال دیا تھا۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا جیسے وہ عرصۂ دراز سے اسی گاڑی میں سفر کرتے رہے ہوں اور اس کے ڈسپلن سے پوری طرح واقف ہوں۔

ٹافی گال میں دبائے، زیورات سے لدی گجراتن کی گود سے وہ اترا اور خراماں خراماں چلتا ہوا کمپارٹمنٹ سے دوسرے کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی وہی سب تھا جو پہلے کمپارٹمنٹ میں تھا۔ وہ کچھ نیا دیکھنے کے تجسس میں دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے کمپارٹمنٹ سے گذرتا ہوا کچن بوگی میں پہنچ گیا۔ کچن میں رات کے کھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کوکنگ ٹیبل پر ابلے ہوئے انڈوں، ٹماٹروں، آلوؤں چھلی ہوئی مرغیوں اور مچھلیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ریلوے کے باورچی آپس میں ٹھٹھول کرتے ہوئے کھانا تیار کر رہے تھے۔ ایک باورچی نے اپنے سپروائزر کی نظر بچا کر ایک ابلا ہوا انڈا منھ میں ڈال لیا اور سپروائزر نے اپنے ماتحتوں سے نظریں بچا کر مچھلی کا ایک تلا ہوا قتلہ پھانک لیا۔ ٹافی چوستے ہوئے اس نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور پتہ نہیں کس خواہش کے تحت اس سبزی خور گھرانے کے بچے نے بھی سب کی نظریں بچا کر اپنے ننھے ہاتھوں کو بڑھا کر ایک ابلا ہوا انڈا اٹھا کر منھ میں بھر لیا اور اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف دوڑ پڑا!

چائے ختم کرنے کے بعد نوجوان نے چینز کے ناول کو تپائی پر رکھ دیا اب اسے سگریٹ پینے کی زبردست خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکیٹ نکال کر سگریٹ کو ماچس سے جیسے ہی سلگایا آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ ماچس کی تیلی کی رگڑ سے پیدا ہونے والی کھچ کی آواز پر ایسے چونک پڑے جیسے انھوں نے ماچس کی نہیں بلکہ کسی کے پیٹ میں چاقو اترنے کی آواز سنی ہو۔ نوجوان نے بے خیالی میں ایک لمبا کش لیا اور ناول اٹھا کر دوبارہ چینز کی تحیر کی دنیا میں کھو گیا۔ اس کے منھ اور نتھنوں سے نکلا ہوا دھواں فضا میں دھیرے دھیرے اٹھا اور ایسے پھیلنے لگا جیسے وہ کوئی ٹھوس شئے ہو۔ کافی فاصلے پر بیٹھی ایک موٹی بھدی سندھی عورت ایسے کھانسی جیسے زندگی میں پہلی بار تمباکو کا دھواں اس کے حلق میں اترا ہو۔ اس کے کھانسنے کے انداز میں کھانسی کم اور دکھاوا زیادہ تھا۔ ابھی نوجوان نے تیسرا کش لیا ہوگا کہ پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے ایک ویٹر تیز قدموں سے اس کے قریب آیا اور جھک کر شائستہ لہجے میں بولا۔

"سارئی سر اندر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ وہ سامنے بورڈ پڑھ لیجیے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر نوجوان کی پشت پر دروازے کے اوپر لکھی ہدایت کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ہاں آپ باہر باتھ روم کے پاس جا کر پی سکتے ہیں۔"

نوجوان کو لگا جیسے سگریٹ کا ڈھیر سارا دھواں اس کے حلق میں پھنس کر پتھر ہو گیا ہے اور وہ اسے نگل نہیں رہا ہے۔ وہ چند ثانیوں تک کھردری نظروں سے ویٹر کو گھورتا رہا جیسے سگریٹ پینے کی ممانعت کا کارن وہی شخص ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر باہر نکل گیا۔ ویٹر کندھے اچکا کر مڑا تو ایک شاعر جیسے حلیے والا ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی سیٹ سے اٹھ کر ویٹر کے قریب پہنچ گیا۔

"سنو!" اس کی آواز پر ویٹر رکا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ باہر جا کر پی سکتے ہیں۔" اس نے قریب آ کر پھسپھساتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "تو کیا ڈرنک....."

"ہاں ہاں کیوں نہیں آپ اس طرف آئیے باتھ روم کے پاس ہم لوگ آپ کی سیوا کے لئے سوڈا واٹر اور ابلا ہوا انڈا بھی رکھتے ہیں گلاس بھی آپ کو وہیں مل جائے گا۔ اور اگر مال کم پڑ جائے تو مناسب ریٹ پر ہم آپ کو دو ایک پیگ بھی دے سکتے ہیں۔" ویٹر نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر زور سے کہا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ دوسرے خواہش مند حضرات بھی اس کی بات سن لیں۔ کچھ دیر تک تو کہیں سے کوئی ہلچل نہیں ہوئی شاعر اور ادیب جیسے حلیے والا آدمی تیر کی طرح باہر نکل گیا۔ اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے سات آٹھ آدمی ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ جیسے وہ کسی کی طرف سے پہل کے منتظر تھے۔ باتھ روم کے قریب وہ سب ویٹر سے گلاس اور سوڈا لے کر باتیں کرتے ہوئے پینے لگے۔ اس وقت ان کے چہروں پر بڑا سکون تھا۔ ان میں سے بیشتر للچائی نظروں سے کھڑکی سے لگ کر کھڑے ہپی جوڑے کو گھور رہے تھے جو ایک دوسرے میں سمائے جا رہے تھے۔ لڑکی کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور چرس کی بو سے فضا مکدر ہو گئی تھی۔

"یار یہ گجرات اسٹیٹ کا ڈرائی ایریا ہے یہاں قانوناً جرم ہے۔" ایک نے ویٹر سے سوڈا لے کر دوسرا پیگ بناتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے صاب۔" ویٹر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ راجدھانی ایکسپریس ہے کوئی کھٹارا میل نہیں۔ اس میں بڑے بڑے لوگ سفر کرتے ہیں پولیس اس میں گھسنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتی۔"

"بھائی پولیس کو کہاں جانا چاہئے اور کہاں نہیں۔ اسے خوب پتہ ہے۔" بھولے چہرے والے معمر آدمی نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ یہ اپنی سیٹ پر ہی شغل کرنے لگا تھا اور اب اسے اچھی خاصی کیک لگ چکی تھی۔

"یو نو میں کون ہوں میں میونسپل کونسلر ہوں ہا ہا ہا۔" کہہ کر وہ بلغمی ہنسی ہنسنے لگا۔

ویٹر نے مضحکہ خیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے قریب کھڑے پی رہے ایک نوجوان سے کہا۔

"یہ کاؤنسلر ہیں؟ ارے انھیں کیا پتہ اس گاڑی سے تو منسٹر سفر کرتے ہیں ابھی ابھی میں ایک منسٹر کو سرو کر کے آ رہا ہوں۔ وہ بھی اپنی سیٹ پر بیٹھے تھرماس سے پی رہے ہیں۔"

اچانک کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور دروازے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر ہتپی جوڑے کے علاوہ سبھوں کے ہاتھوں میں گلاس لرز گئے۔ یہ بندوق دھاری ریلوے پولیس کا نسٹبل تھا، جسے دیکھتے ہی ان کا نشہ اس تیز رفتار ٹرک ڈرائیور کے نشے کی طرح اکھڑ گیا تھا جسے کسی بھیانک حادثے سے بچنے کے لئے اچانک بریک لگانا پڑے۔ کانسٹبل نے تھیٹریکل انداز میں اپنے چہرے پر کھچاؤ اور آنکھوں میں غصے کے جذبات کو جگایا اور اس آدمی کا گلاس اپنے ہاتھوں میں لے کر سونگھا جس نے ابھی ابھی خود کو میونسپل کونسلر بتایا تھا۔

"ہوں، تو شراب چل رہی ہے۔" کانسٹبل نے کرختگی سے باری باری سب کو دیکھتے ہوئے سوال کیا میونسپل کونسلر کی سانس اس کے سینے میں ایک بگولے کی طرح چکرانے لگی اور اپنے سماجی رتبے کے بارے میں اس نے ایک لمحے میں اتنا کچھ سوچ ڈالا کہ اس کا خون نسوں میں سر پٹکنے لگا۔ میونسپل کونسلر نے بڑی بے چارگی سے اس ویٹر کی طرف دیکھا جس کا دعویٰ تھا کہ اس ٹرین میں ریلوے پولیس چڑھنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتی ہے۔ ویٹر نے خاموشی سے کندھا اچکایا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

"کیا آپ لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ یہ ڈرائی ایریا ہے۔ یہاں پینا اپرادھ ہے؟" کانسٹبل دیدے نچا کر کڑکا۔

"اب اگلے اسٹیشن پر پولیس اسٹیشن چلنے کے لئے تیار رہئے۔"

کہہ کر اس نے زور سے ڈنڈا پٹخا کہ سب چونک پڑے۔

"دے دے دیکھئے ہم سے غلطی ہوگئی ہے لیکن ہم لوگ کوئی چور چور اچکے تو ہیں نہیں کہ آپ اتنی سی بات کے لئے ہمیں پولیس اسٹیشن..... " میونسپل کونسلر نے تھوک نگلتے ہوئے کہنا چاہا۔

"ہوش میں تو ہیں آپ۔" کانسٹبل چیخا۔ "اسے آپ اتنی سی بات کہتے ہیں آپ کو پتہ بھی ہے کہ یہ گجرات کا علاقہ ہے اور یہ ڈرائی ایریا کیوں ہے؟ یہاں ایک مہان ہستی کا جنم استھان ہے جسے شراب سے سخت نفرت تھی اور......"

"ہاں ہاں ہم مانتے ہیں کہ ہم نے بڑا اپرادھ کیا ہے مگر آپ کچھ تو گنجائش نکالئے نہیں تو......" میونسپل کونسلر کا جملہ باتھ روم سے نکل کر ویٹر نے اُچک لیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے حولدار صاحب آپ تو بڑے اچھے آدمی ہیں اور یہ لوگ بھی کچھ کم اچھے لوگ نہیں ہیں لیکن اب آپ کو بھی گنجائش تو نکالنی پڑے گی۔" ویٹر ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔

"تم کہتے ہو تو رعایت کر دیتا ہوں ورنہ قانون توڑنے کا پھل مل جاتا ان سب کو۔" کانسٹبل نے اسی اکڑ سے احسان جتایا۔

..... اور پھر میونسپل کونسلر نے فوراً پچاس روپے میں ریلوے پولیس کانسٹبل سے گنجائش نکلوائی! جاتے جاتے کانسٹبل نے سمجھا دیا۔

"اطمینان سے بیٹھئے لیکن لوگوں سے بچاکر میں آگے کے ڈبوں میں چیکنگ کے لئے جارہا ہوں۔" ویٹر کے قریب سے گذرتے ہوئے کانسٹبل نے سب کی نظریں بچاکر اس کے ہاتھ میں ایک دس کا نوٹ دبا دیا۔

پی چکنے کے بعد سب کے سب اپنی اپنی سیٹوں پر جاکر پسر گئے۔ اے۔ سی کی خنکی سے شراب نے تعلق پیدا کرکے دو آتشہ کا کام کیا۔ ان میں سے بیشتر جھنجھلائے ہوئے تھے ریلوے پولیس کی اچانک آمد کی وجہ سے ان کی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی ـــــــــ دھیرے دھیرے جب نشہ اپنا رنگ جمانے لگا تبھی مائکروفون سے نشر ہو رہے والی مدھم سروں والی موسیقی اچانک بند ہوگئی اور اناؤنسر کی آواز ابھری۔

"ہمیں کھید ہے کہ آپ یہ مدھر سنگیت پورا نہ سن سکے اب سماچار سنئے۔"

اس اعلان نے سارے ماحول کو اچانک بدل دیا اور انھیں لگا جیسے کسی نے اونچائی پر سے دھکیل دیا ہو۔ ان کے چہروں کے عضلات تن گئے۔ وہ اس وقت خبریں سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ لوگ جو بغیر پئے ہی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے ان کے لئے بھی یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ ان کی اس بیزاری کا ایک سبب شاید مائکروفون سے انتظامیہ کی جانب سے بار بار دی جانے والی ہدایات تھیں۔

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے اب آپ اشوک باجپائی سے ......"

"یہ کیا تماشہ ہے جی۔" کھدر دھاری نے برابر میں بیٹھے صنعت کار سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا جو "اکنامک ٹائمز" میں خام لوہے کی بڑھتی قیمت کو پڑھ پڑھ کر نروس ہو رہا تھا۔

"سالا راجنیتی (سیاست) سے کہیں بھی چھٹکارا نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں کہیں بھی نہیں ....." کھدر دھاری ہاتھ جھٹک کر بڑبڑانے لگا۔

جیمس ہیڈلے کی پراسرار وادیوں کے نوجوان مسافر نے کتاب کو تقریباً پٹختے ہوئے کہا۔" وہاٹ نانسنس کس کو انٹریسٹ ہے سماچار پھماچار سے ہم کو نہیں سننا ہے سماچار۔"

"وردودھی پکش کی تمام پارٹیوں نے ایکتر ہوکر سارے دیش میں مہنگائی اور بھرشٹاچار کے وِرودھ میں آندولن چلانے کی گھوشنا کی ہے جس کی ......"

"سب بکواس ہے کس کو انٹریسٹ ہے ان کے آندولن سے؟"

"بکواس!"

"آل آر فراڈ!!"

پردھان منتری نے ویلیش کو چیتاونی دی ہے کہ وہ تھاکتھت سمیاؤں کے آندولن سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں اور اگر وکیشن......"

"آندولن سے نمٹو یا فائرنگ کرو ہم کو کیا مطلب ہے۔"

"بند کرو یہ بکواس۔"

کمپارٹمنٹ میں ایک بے چینی سی پھیل گئی۔ اس وقت وہ گیت سنگیت سننے کے موڈ میں تھے اور انھیں سماچار سننا پڑ رہے تھے۔ ان کی ناپسندیدگی کا اظہار مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے شور میں بدل گیا۔

ایک ویٹر نے کنٹرولر کے کیبن میں جاکر لوگوں کے غصے کی خبر دی تو وہ رم کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے اٹھ کر گلاس خالی کیا اور سر پہ کیپ جما کر نپے تلے قدموں سے چل پڑا۔ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر ایسے جذبات پیدا کر لئے جیسے وہ اس نئی صورت حال سے اور مسافروں کی شکایت سے کافی پریشان ہو۔

"ساری ڈیر پیسنجرز میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا یہ معاملہ تو سرکاری حکم کا ہے۔ سماچار ایک جاگروک (بیدار) جنتا کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

"بکواس ـــــ بکواس ہے یہ۔" وہ سب چیخے۔

"نہیں نہیں یہ میں نہیں کہتا۔ یہ تو سرکار کہتی ہے۔ اور ہم سرکار کے کہے کا پالن کرتے ہیں۔ یہی تو ہماری ڈیوٹی ہے سر۔ کنٹرولر نے فوراً پینترا بدل دیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے جاؤ اپنی ڈیوٹی کرو سالے....." اسی پھوڑے چہرے والے میونسپل کونسلر نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر غصے اور بیزاری سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں خبریں ختم ہو چکی تھیں اور رات کے کھانے کا اناؤنسمنٹ ہو رہا تھا۔ کھانے کے اعلان پر ان تمام لوگوں کے چہروں کا تناؤ کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ کنٹرولر کیپ اتار کر درباری مسخرے کی طرح جھکا اور کمپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

کھانا بھی اسی اہتمام سے شروع کیا گیا۔ کھدر دھاری نے کھانا پروسنے والے ویٹر کے کان میں سرگوشی کی۔

"کھانا پکانے والوں میں کوئی اچھوت تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں ساب سب کے سب برہمن ہیں۔" مسلمان ویٹر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر سارے کے سارے اپنی اپنی گدازسیٹوں پر پھیل کر جماہیاں لینے لگے تھے۔ مائکروفون سے ہلکی ہلکی موسیقی نشر ہونے لگی تھی۔ بچے گریاں موال چھوکر سو گئے تھے۔ اب کمپارٹمنٹ میں قدرے سکون تھا۔

مرکیوری بلب بجھا دیئے گئے تھے۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں ہپی جوڑا کچھ زیادہ ہی بے باک ہو چلا تھا۔

اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو بیشتر لوگ سو چکے تھے اور باقی ماندہ سونے کی کوشش میں پہلو بدل رہے تھے۔ کھدر دھاری کی آنکھ گاڑی رکنے کے خفیف سے جھٹکے سے کھل گئی اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا پلیٹ فارم پر بس اکا دکا مسافر نظر آ رہے تھے۔ کھدر دھاری نے پہلو بدلتے صنعت کار سے پوچھا "یہاں گاڑی کتنی دیر رکتی ہے"

"پانچ منٹ!" صنعت کار نے جماہی لے کر مختصر سا جواب دیا۔

"یہی تو اچھی بات ہے اس گاڑی کی!" وہ بڑا سا سر ہلا کر بولا۔ "کہ چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی ہی نہیں ہے اور بڑے اسٹیشنوں پر بھی زیادہ سمے نشٹ نہیں کرتی۔ اب دوسرا اسٹیشن تو شاید آدھی رات بعد ہی آئے گا۔"

گاڑی سیٹی دے کر رینگنے لگی!

کھدر دھاری کسی خیال میں گم خلا میں گھور رہا تھا کہ اچانک چونک پڑا اسے ایک لمحے کے لئے خود اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے اونگھتے صنعت کار کو کہنی ماری صنعت کار نے اپنی خمار آلود آنکھوں سے کھدر دھاری کو ایسے گھورا جیسے اس کی یہ حرکت اسے ناگوار گذری ہو۔

کھدر دھاری نے جو کچھ انہونی دیکھی تھی اسے اب صنعت کار نے دیکھا۔

پھر پھولے چہرے والے مسٹر میونسپل کونسلر نے دیکھا۔

پھر جیمس ہیڈلے چیز کے نوجوان قاری نے دیکھا۔

پھر ہپی لڑکے اور لڑکی نے دیکھا

پھر —— پھر —— پھر تمام جاگنے والوں نے دیکھا!

وہ ستر بہتر سالہ خشک لکڑی جیسے جسم والا بوڑھا تھا۔ گنجا سر لمبی ناک بڑے بڑے کان پوپلا منہ روشن آنکھوں پر کمانی دار چشمہ صرف ایک لنگوٹ نما دھوتی تھی اس کے جسم پر کمر سے ایک پرانی گھڑی لٹک رہی تھی۔ چوڑے بھدے پیروں میں گاؤدی چپلیں تھیں اور اس نے بغل میں دبا بوسیدہ اخبارات کا ایک پلندہ دبا رکھا تھا۔ وہ سیٹوں پر بیٹھے لوگوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے لئے جگہ تلاش کر رہا ہو۔

ان سبھوں کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بوڑھے کے وجود کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کے جسم سے نم مٹی اور پسینے کی ہلکی ہلکی باس آ رہی ہے۔ ان کی بغلوں اور کالروں پر چھڑکے ہوئے انٹی میٹ کی خوشبو پر یہ باس غالب آ گئی تھی۔ انھوں نے ناکیں سکوڑیں اور ناگواری سے ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگے جیسے وہ اس نئی مصیبت سے چھٹکارا چاہتے ہوں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بڈھا اندر کیسے آ گیا؟ کھدر دھاری آپ ہی آپ پھسپھسایا۔

یہی ایک بات وہ سارے لوگ سوچ رہے تھے۔ اس بڈھے کی موجودگی انھیں اپنی آنکھوں پر ہی نہیں دل پر بھی بوجھ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تمام لوگ پھسپھساتے ہوئے بوڑھے کے حلئے پر تنقیدیں کرنے لگے۔

"اس کی دھوتی تو دیکھو ایسا لگتا ہے جیسے لنگوٹی ہو۔"

"اس کا شریر دیکھو جیسے مہینوں سے روٹی نہیں ملی ہو۔"

"مجھے تو یہ کوئی چور نظر آتا ہے۔"

"ہاں ہاں چور بھی ہو سکتا ہے دیکھو تو بھلا اس کی آنکھیں کیسی چمک رہی ہیں۔"

"ارے بھائی مجھے تو یہ سرمہ منجن بیچنے والا دکھائی پڑتا ہے۔"

"لیکن یہ کوئی تھرڈ کلاس کا کمپارٹمنٹ تو ہے نہیں کہ یہ یہاں سرمہ منجن بیچنے لگے۔"

"پولیس کہاں ہے یہ ضرور بلا ٹکٹ ہوگا۔" ایک نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

"پولیس وہاٹ پولیس!" میونسپل کونسلر دھاڑا "پولیس سالا اس سے بھی رشوت لے کے اپنے سر پے بٹھا دے گا اس کو۔" اس نے رشوت کے اپنے تجربے کی روشنی میں جھنجھلا کر کہا۔

بوڑھا اپنے چوڑے مضبوط پنجوں سے دھیرے دھیرے دو رویہ سیٹوں کے درمیان سے گذرا تو انھیں محسوس ہوا جیسے بے شمار ہڈیاں آپس میں ٹکرا کر بج رہی ہوں۔ ان سبھوں نے اپنی اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔ بوڑھے کے جسم سے اٹھنے والی نم مٹی اور پسینے کی باس ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

"اے بڈھے۔" اچانک جیمس ہیڈلے کے نوجوان قاری نے اٹھ کر بوڑھے کو درشت لہجے میں مخاطب کیا۔ بوڑھا رک گیا اور دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے مڑا۔ "تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"ہاں" نوجوان کا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا تھا۔ "تم جانتے ہو یہ کون سی گاڑی ہے؟"

"مجھے نہیں پتہ مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ یہ گاڑی ہے اور یہ مسافروں کے لئے ہے۔" بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔

"وہاٹ نان سنس۔" نوجوان بوڑھے کے جواب پر فلمی انداز میں چیخا۔

"بیٹے غصے میں آدمی اپنا توازن کھو دیتا ہے۔" بوڑھے نے انگریزی گالی کے جواب میں بڑی ملائمت سے انگریزی ہی میں جواب دیا۔ فقیر جیسے حلیے والے اس بوڑھے سے انگریزی سن کر نوجوان کو سکتہ سا ہو گیا۔ آس پاس کے مسافروں کے بھی منہ حیرت سے کھل گئے۔

"دیکھئے میں آپ لوگوں کو زیادہ کشٹ نہیں دوں گا۔ مجھے بھی راجدھانی تک جانا ہے۔ سوچے

نو بجے تک ہم راجدھانی پہنچ جائیں گے۔ بس رات ہی کی بات ہے۔ میں باہر باتھ روم کے پاس اخبار بچھا کر پڑ رہوں گا۔" اس نے بلند آواز سے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

بوڑھے نے دیکھا کہ اس کے اس اعلان پر سب کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے جذبات ہیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اور لاٹھی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہوا بولا۔

"آپ لوگ ڈریئے نہیں میں آپ ہی جیسا ایک آدمی ہوں بیں تو آپ لوگوں کے لئے بہت اُپ یوگی فائدہ مند) ہو سکتا ہوں۔ میں برسوں سے سفر میں ہوں۔ سفر کی سمسیاؤں کا سمادھان ہے میرے پاس۔" اس نے بغل میں دبے اخبارات کے پلندے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی سمسیائیں ہیں نا آپ کی میں ان کا سمادھان دے سکتا ہوں آپ کو۔ میں اسی لئے تو راجدھانی جا رہا ہوں کہ میرے پاس برسوں کا تجربہ ہے اور ان کے پاس ویوستھا (انتظامیہ) ہے۔"

بوڑھے کی اس بات پر وہ کچھ چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ کھدر دھاری نے پہلو بدلتے ہوئے صنعت کار سے کہا۔

"یہ کوئی بہت بڑا فراڈ معلوم دیتا ہے۔ اسے ترنت گاڑی سے اتار دینا چاہئے۔ آج کل جتنے لوگ بھی سمسیاؤں کا سمادھان دے کر آرہے ہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ سب کے سب ویوستھا کے خلاف شڑینتر (سازش) کر رہے ہیں۔"

"رائٹ یو آر۔" صنعت کار نے مشکوک نظروں سے بوڑھے کو گھورتے ہوئے کھدر دھاری کی تائید کی۔

"آج کل سی۔ آئی۔ اے ہمارے ملک میں ایسے ادھو سنیاسیوں کو ایڈ دے کر ہماری اکنومی کو نقصان پہنچا رہی ہے۔"

"یہ فراڈ ہے اس کا مجھے پورا وشواس ہے دیکھو میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی ہے۔ مجھے میرے فیملی جیوتشی نے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے لئے یہ سفر کچھ اچھا نہیں ہے۔"

بوڑھے کی باتوں نے ان کے شبہے کو تقویت دے دی۔ بوڑھے کے چہرے پر ان کی سرگوشیوں اور ناراضگی سے بے نیاز ایک پر اعتماد مسکراہٹ تھی۔ اس نے پرسکون انداز میں کمرے لٹکتی گھڑی میں وقت دیکھا اور کمپارٹمنٹ کے دروازے کی طرف لاٹھی ٹیکتا ہڈیاں کھڑکاتا چل پڑا۔ اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ سامنے ٹی سی اور دو نوجوان کھڑے تھے۔ بوڑھے کو دیکھتے ہی ٹی سی کی آنکھوں میں حقارت عود کر آئی۔ اس نے بوڑھے کو سر سے پیر تک ایسے گھور کر دیکھا جیسے وہ کوئی مضر کیڑا مکوڑا ہو۔ بوڑھے نے ٹی سی کے تیور کو دیکھا اور مسکرا کر دھوتی کی ٹانٹ سے ٹکٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"میں نے ٹکٹ لے رکھا ہے ٹکٹ بابو۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے دیش کو نقصان پہنچے میں

تو کہتا ہوں کہ اگر ایک یاتری بھی بنا ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے تو ایشور کرے گاڑی ہی نہ چلے۔"

بوڑھے نے ٹکٹ ٹی سی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ٹکٹ کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھا اور مضحکہ اڑاتے ہوئے غصے سے بولا۔

"تم بس کا ٹکٹ خرید کر ہوائی جہاز میں سفر کرو گے بڈھے؟"

"لیکن ٹکٹ بابو یہ تو ریل ہی کا ٹکٹ ہے نا۔"

"دیکھو بڑے میاں یہ ٹکٹ جنتا ایکسپریس کے چالو ڈبے کا ہے اور یہ گاڑی راجدھانی ایکسپریس ہے مطلب یہ کہ یہ اسپیشل ٹرین ہے۔"

"یہ اسپیشل ٹرین کیا ہوتی ہے بھائی؟" بوڑھے نے گول فریم کے چشمے کے نیچے سے آنکھوں کو مچ مچا کر حیرت سے پوچھا۔"

"اسپیشل ٹرین وہ ہوتی ہے بڈھے۔" میونسپل کونسلر نے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔" جس میں ہمارے جیسے بڑے اور امپورٹنٹ لوگ سفر کرتے ہیں۔"

"مطلب یہ کہ اس میں دیش اور شہر کی بڑی بڑی ہستیاں سفر کرتی ہیں۔ جیسے نیتا۔ اُدھیوگ پتی فلم والے اور زر روپے پیسے والے۔" ٹی سی نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ زور سے کہا۔

"بھائی ہمارے زمانے میں تو ایسی کوئی ٹرین نہیں چلتی تھی۔" بوڑھے نے بڑے سادگی سے حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ لوگ بے کار میں اپنا ٹائم اور ہمارا دماغ خراب کر رہے ہیں۔ پولیس کو بلاؤ اور اس بڈھے کو اٹھا کر پھینکو کھڑکی سے باہر۔" کہیں سے آواز آئی۔

بوڑھے نے گھوم کر دیکھا یہ جینس ہیڈے کا وہی نوجوان تاری تھا۔

"نہیں نہیں کوئی ہنسا تمک (پر تشدد) کاروائی نہیں ہوگی۔ سیدھی سی بات ہے انھیں اگلے اسٹیشن پر اتارا جائے۔" کھدر دھاری جو اپنی سیٹ پر کسی ارنا بھینسے کی طرح پسرا ہوا تھا وہیں سے چیخا۔

اس دوران کسی نے ریلوے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس بھی اپنی رائفل سمیت وہاں آ پہنچی۔ یہ وہ کانسٹبل تھا جس نے میونسپل کونسلر کو شراب پیتے ہوئے پکڑا تھا۔

"کیوں بڈھے اترنے کا ارادہ ہے یا نہیں کہ ہم کو ہی کشٹ کرنا پڑے گا۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں غیر یقینی حالات سے اچانک سابقہ پڑ جانے والی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ اسے لگا جیسے وہ ان لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے۔

"اس گاڑی میں سفر کرنے کا جتنا ادھیکار تمہارا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔" بوڑھے کی آواز فرطِ جذبات سے لرزنے لگی۔

پولیس والے نے بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے الگ لے جا کر دھیرے سے کہا۔

"تم کیوں بحث کرتے ہو بڑے میاں۔ دھوتی میں سے کچھ مال ڈھیلا کرو میں ٹی سی کو پٹا لوں گا پھر چلے چلنا اطمینان سے راجدھانی تک پھر میں دیکھتا ہوں کون چھوتا ہے تمہیں۔"

پولیس والے کا یہ جملہ بوڑھے کی رگوں میں تیزاب کی طرح سب کچھ جلاتا ہوا اتر گیا۔ وہ یکبارگی غصے سے کانپنے لگا۔

"تم ــــ تم ــــ رشوت ــــ تم جنتا کے سیوک ــــ تم ہی بھرشٹ!" بوڑھا تقریباً چیخ پڑا۔

"چپ کر بڈھے۔" پولیس کانسٹیبل نے معاملہ ہاتھ سے نکلتا دیکھا تو زور سے گرجا۔ "ہم رشوت وشوت نہیں لیتے ایسا کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوگا۔ تم کو اترنا پڑے گا۔"

"خبردار بڈھے ہماری سرکار میں کرپشن بالکل نہیں چلے گا۔" کھدر دھاری نے پولیس کی وکالت کی۔

"اب تم کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنا ہی پڑے گا۔" کھدر دھاری کی حمایت پر پولیس کانسٹیبل شیر ہوتا ہوا بولا۔

"ایسے فراڈ لوگوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔" کھدر دھاری نے تائید کی۔

"اس بڈھے نے تو ہم سب کی نیند خراب کر دی ہے۔"

"اور آیا ہے ہماری سمسیاؤں کا سمادھان لے کر۔"

"ارے پتہ نہیں کہاں سے چلا آیا ہے دیہاتی کہیں کا۔"

"ہم سونا چاہتے ہیں اسے باہر پھینکو۔"

"ویسے بھی تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ مر بھی گیا تو کون سا نقصان ہو جائے گا۔"

وہ سارے کے سارے چیخنے لگے۔ ان کی آواز کے ننھے نوکیلے تیر بوڑھے کی نسوں کو چھیدنے لگے۔ بوڑھے کے لئے دکھ کی بس یہی بات تھی کہ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی بات سے اتفاق کرتا۔ حمایت میں بولتا یا اسے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ ان کے لئے ایک ناپسندیدہ شخص تھا۔ اس کا لباس اس کی بات چیت، اس کا رہن سہن انھیں ناگوار گذر رہا تھا۔

میں ان ہی جیسا ہوں اور یہ مجھ سے نفرت کر رہے ہیں۔ میرے اندر ایسی کون سی برائی ہے جو انھیں کھل رہی ہے۔ میں ان سے مختلف کیوں ہوں؟ بوڑھے کا دل بھر آیا۔ وہ دھواں دھواں چہرے اور خالی خالی

آنکھوں سے ان سبھوں کو باری باری حیرت اور حسرت سے دیکھنے لگا۔ ان کے چہروں پہ ناگواری اور آنکھوں میں سفاکی تھی۔

گاڑی کی رفتار کم ہو چلی تھی شاید کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ وہ سب یکبارگی چیخنے لگے ان کی آوازیں خوشی نمایاں تھی۔

"اسٹیشن آ رہا ہے۔ اسٹیشن آ رہا ہے۔"

"اتارو بڈھے کو۔ اتارو بڈھے کو۔"

ٹی سی اور پولیس والے اپنی جگہ مستعد ہو گئے تھے۔

"دیکھو یہ گاڑی اس اسٹیشن پر صرف دو منٹ رکتی ہے اتنی دیر میں تم کو اس بڈھے کو اتار پھینکنا ہے۔" ٹی سی نے پولیس کو ہدایت کی۔

"اتنی رات ہو رہی ہے یہ بوڑھا آدمی رات کہاں گزارے گا؟" ہپی لڑکے نے نشے سے بوجھل پلکیں اٹھا کر انگریزی میں سوال کیا۔ مگر اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ دوسری آوازوں میں کچل کر رہ گئی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم سے لگتے ہی بیشتر لوگوں نے بوڑھے کو گھیر لیا۔ کمزور بوڑھا بغل میں اخباروں کا پلندہ دبائے اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ ان سبھوں کی نظریں اس کے بوڑھے نحیف ہڈیوں پر چمڑا منڈھے جسم پہ ایسے جمی ہوئی تھیں جیسے وہ بوڑھے کی مزاحمت پر اس پر لوٹ ہی تو پڑیں گے۔

ٹی سی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کمپارٹمنٹ میں سناٹا چھا گیا۔

"چل اتر بڈھے۔" پولیس والا دانتوں کو بھینچ کر اندر کی نفرت اور سفاکی سے دھاڑا۔

بوڑھا چپ چاپ لاٹھی تھامے بغل میں اخبارات کا پلندہ دبائے کھڑا رہا۔ کمپارٹمنٹ کے سناٹے میں بوڑھے کی گھڑی کی ٹک ٹک اور ٹی سی اور پولیس والے کی آنکھوں کی تیز چمک شور مچا رہی تھیں۔ باہر پلیٹ فارم پر مکمل سناٹا تھا۔ دھندلی بتیاں اپنی ناکافی روشنی پھینک رہی تھیں۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا اسے لات مار کر باہر دھکیل دو۔" ایک آواز گونج سی گئی۔

پولیس والے نے رائفل کی نال بوڑھے کی ننگی کمر میں گڑا دی۔ وہ اپنے پوپلے منہ کو بھینچے ان کے ہر سلوک کو سہنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس کی جرات نے ایک بار پھر سناٹے کو سنگین بنا دیا۔ اب وہ بوڑھے کی کمر سے لٹکتی گھڑی میں وقت کو دوڑتے ہوئے سن سکتے تھے مگر ان کی توجہ تو اس وقت بوڑھے پر تھی۔ پلیٹ فارم پر اندھیرا اور سناٹا تھا جیسے اس حادثے کی سازش میں وہ بھی شریک ہوں پولیس والے نے بوڑھے کے ضدی رویے سے جھنجھلا کر دانتوں کو کٹکٹایا اور رائفل کی نال سے بوڑھے کو زور کا دھکا دے کر ٹرین سے نیچے ڈھکیل دیا! ـــــ اس کی لاٹھی اور

اخبارات کا پلندہ ٹرین ہی میں رہ گیا تھا۔ پلیٹ فارم کی کھردری سخت زمین پر گرنے سے بوڑھے کی پیشانی پھٹ گئی تھی اور خون کی پتلی سی لکیر چہرے پر بہہ آئی تھی۔ بوڑھے کی ایک چپل پلیٹ فارم سے نیچے پٹریوں پر گر پڑی تھی۔ بوڑھا اپنے نحیف جسم کو سمیٹ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

کمپارٹمنٹ کے لوگوں نے بوڑھے کے باہر گرتے ہی اطمینان کا سانس لیا جیسے ان کے سینے سے کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا ہو۔ وہ سب کے سب پولیس کانسٹیبل کو تعریفی نظروں اور کلمات سے سراہ رہے تھے۔ بوڑھے نے اٹھ کر پیشانی کا خون پونچھا اور گاڑی سیٹی دے کر چل پڑی اندھیرے میں ڈوبا پلیٹ فارم پیچھے چھوٹنے لگا۔ وہ کھڑکیوں کے شیشوں سے چہرے سٹا کر اندھیرے پلیٹ فارم پر اس بوڑھے کو ہزاروں سال پرانی روح کی طرح دھندلاتے دیکھتے رہے۔ پولیس کانسٹیبل نے اخبارات کے پلندے کو دروازہ کھول کر باہر اچھال دیا اور لاٹھی کو ران پر رکھ کر دو ٹکڑے کرکے نیچے پھینک دیا جو ٹرین کے وزنی پہیوں میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ پلندہ کھلا اور اخبارات کے ٹکڑے پٹریوں پر دور دور تک بکھر گئے۔

بوڑھا اب ان کے درمیان نہیں ہے۔ کھدر دھاری، صنعت کار، پولیس کانسٹیبل، ٹی سی، وٹیر میونسپل کونسلر اور اس نوجوان کے چہرے پر بڑا سکون ہے مگر پتہ نہیں کیوں انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے بوڑھے کی صدیوں پرانی گھڑی کی ٹک ٹک اب بھی کمپارٹمنٹ میں گونج رہی ہے اور پسینے اور نم مٹی کی بو اب بھی سارے میں بسی ہوئی ہے...... □

حمید سہروردی

زمیں پر آگئے ہو تم

کبھی تم اس طرح بھی سوچتے ہو
زمین کے پاؤں ہیں کہاں ؟
الوں سے پرے ہوکر
زمیں جب گھومتی ہے
تب درد زہ سے چیختی ہے
کراہیں اور نفرتیں
آرزوئیں اور تمنائیں
لا محدود خواہشوں کے بادلوں کی رنگ برنگی صورتیں
زمین پر آگئے ہو تم
زمین کے ہو رہے ہو تم
زمیں کے پاؤں ہیں کہاں ؟
زمیں کے پاؤں !
زمیں کے پاؤں !

کہاں سے آگئے ہو تم

ژاژ ژاژ نطق پر
آگ آگ جسم پر
الم الم کہانیاں
دعائیں لوٹ کر چلی گئیں
صبح کا وقت کون سا تھا
انگ انگ آتشیں
سڑک سڑک درخت درخت
سنگوں کھڑے رہے
دعا کی شب تھی
کیا تھی
زنگ زنگ معجزے
رات دن آسماں
زمیں و آسماں کے درمیاں
شراپ شراپ وسوسے
زخم زخم حوصلے
بکھرے بکھرے فاصلے
کہاں سے آگئے ہو تم ؟
کون ہو ؟
کون ہو ؟
کون !

محمد اسد اللہ

ایورسٹ سینیٹری ویئر، مین روڈ، وردڈ
پن کوڈ ۴۴۴۹۰۶

(انشائیہ)

جوتے

ایک ایسی اہم شے جس کے بغیر شرفا گھر سے باہر قدم تک نہ رکھ سکیں اور چور اچکے، جیب کترے سیدھی طرح ایک قدم نہ چل سکیں، جوتا کہلاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جنگل میں سکونت پذیر موروں کو اگر جوتوں کی ننھی ننھی خوبصورت جوتیاں میسر آجائیں تو وہ بھی اپنے پیروں کو دیکھ کر شرمانا اور شہروں سے گھبرانا چھوڑ دیں اور برسوں کی وضعداری کو ترک کر کے جنگلوں کو خیرباد کہیں۔ خیر، ہم اس مسئلے پر سر کیوں کھپائیں ہمیں کیا باٹا کی ایجنسی لینی ہے؟ سانپوں کی تلاش ایک نہ ایک دن ان موروں کو پا برہنہ ہی شہر کی طرف کھینچ لائے گی۔ بہرحال جوتے انسانوں کی ایک اہم ضرورت ہیں۔ جوتوں کے بغیر چلنا اور بعض صورتوں صحیح چلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دیہاتوں میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جانور اور انسان دونوں بغیر جوتوں کے سفر کرتے ہیں جب کہ انسان کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ "جوتے پہن کر چلنے والا جاندار ہے۔" کوئی سا موسم ہو جوتوں کی ضرورت مسلم ہے موسم سرما کے جوتے مخصوص، موسم گرما کے جوتے دیگر، بارش کے جوتے الگ نیز جوتوں کی بارش علٰحدہ۔

آسمانی کتابوں میں دنیا کی چیزوں کا جوڑے جوڑے سے بنوایا جانا مذکور ہے انھیں جوڑیوں میں جوتوں کی جوڑیاں بھی شامل ہیں جوتوں کے جوڑے حد درجہ وفادار ہوتے ہیں۔ اگر دو جوتوں کا جوڑا بچھڑ جائے تو دونوں ایک دوسرے کے فراق میں ناکارہ ہو کر سنیاس لے لیتے ہیں۔ انسانوں کی طرح "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" والا معاملہ انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ البتہ اس "ڈالڈا ایج" میں جب کہ گلی کے کتے تک وفادار نہیں ہوتے اب جوتے صاحبِ جوتہ سے پانچ چھ ماہ سے زیادہ کا پیمانِ وفا نہیں باندھتے بلکہ چند ایک کی ہستی موہوم تو مہینہ دو مہینے ہی میں اپنی فنا پر دلیل ہوتی جاتی ہے۔

پیر جوتوں میں ہوتے ہیں یا جوتا پیر میں یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے مرغی پہلے یا انڈا بہرحال پیروں اور جوتوں کے سمبندھ اٹوٹ ہیں۔ ابتدا میں نئے نئے جوتے مزے لے لے کر پیروں پر دانت تیز کرتے ہیں اس صورت میں چند لوگ جوائنٹ کا جواب پتھر سے دینے کے قائل ہیں یہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ جوتے نے آپ کو کاٹا ہے آپ بھی اسے کاٹ کھائیے۔ صاحب جوتہ اگر صبر سے کام لے تو رفتہ رفتہ مفاہمت ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم

کے جغرافیے میں پیر چونکہ نچلا طبقہ ہے اسی مناسبت سے جوتے پسماندہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے مسجد
مندر، مقدس مقامات، خلوت خانے، محفلیں وغیرہ وغیرہ ہر جگہ یہ دروازے سے باہر ہوتے ہیں۔ البتہ قانون
ساز اسمبلیوں الکشن کے اسٹیجوں اور شاعروں میں انھیں سر پر بٹھایا جاتا ہے (اپنے نہیں دوسرے کے
مفلسی و ناداری جرائم کی ماں ہے۔ یہ متامیلوں ٹھیلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ رنگ جم گیا تو گ
کے سینگ کی طرح جوتوں کو غائب پاکر صاحب جوتے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ ورنہ جوتے چوروں کی نا ا
انھیں رنگے ہاتھوں پکڑا دیتی ہے اس وقت ناظرین کرام اس تجربۂ روزگار کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں
اور پھر اس احساس سے کہ ہم تو پیٹ بھر کھائیں اور ہمارا بھائی بھوکا رہے۔ ہم باٹا کا جوتا پہن کر دنا
پھریں اور یہ سلیپر تک کو ترس جائے، ان کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ نیز دان پُن میں
کوتاہی کا پرائشچت ان کی گردنوں کو مزید جھکاتا ہی چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ان کی انگلیاں پیروں کو چھونے
لگتی ہیں تب وہ آہستہ سے جوتا نکالتے ہیں اور بطور کفارہ اس شخص کی خوب خاطر مدارت کرتے ہیں کہ
طبیعت خوش ہو جائے۔

بہت زیادہ مفلس آدمی جو پیروں میں جوتا اور گرہ میں دام نہیں رکھتا جوتے کی حسرت ہی پہن
کر پھرتا ہے۔ اور اپنے پیروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ مور کی طرح اداس ہو جاتا ہے۔ تب کوئی اندر سے کہتا ہے کیا
کبھی باٹا کا جوتا آئینے میں اپنی صورت بھی دیکھی ہے: اس مفلوک الحال شخص کے یہاں آئینہ بھی کہاں ہوتا ہے
چنانچہ کسی "صاحب" کے جیسی ملازم سے چمچماتے جوتے ہیں جھانک کر اپنا چہرہ دیکھ لیتا ہے اور اپنا سا
منہ لے کر رہ جاتا ہے۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ میدان حشر میں اعضائے جسمانی انسان کے خلاف گواہی دیں گے، اس صداقت
کے چند نمونے ہماری روزمرّہ کی زندگی میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ہم گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارا
بچہ ہمیں قرض دار کی آمد کا مژدہ جانفزا سناتا ہے۔ ہم اسے ٹرخانے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ "بیٹا جاکر کہہ دو ابا
گھر میں نہیں ہیں۔ بچہ خبر پہنچا دیتا ہے مگر اس وقت آنگن میں پڑے ہوئے ہمارے منحوس جوتے ہمارے
ہی خلاف زبان حال سے چیخ چیخ کر گواہی دیتے ہیں۔

پہلے جوتے ڈکٹیٹر شپ کی علامت سمجھے جاتے تھے مگر جمہوریت آئی تو معلوم ہوا یہ جمہوریت کی
نشانی ہے اور INDIRECT DEMOCRACY کے مزاج سے بہت قریب ہیں: اسی لئے جمہوری ممالک
میں جلسوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں جوتوں کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے۔ لیڈروں کے بھاشن

میں جب زبانی احتجاج بے سود ثابت ہوتا ہے، عوام لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے کہہ کر جوتے نکال لیتی ہے۔ اس صورت میں لیڈر موصوف کی طرف ہوائی رفتار سے سفر کرنے والا ہر جوتا عوام کی لاتوں کو REPRESENT کرتا ہے۔ البتہ اس مرض کا کیا علاج ہو کہ لیڈر موصوف "اس تجویز پر بھی غور کیا جائے گا" کہہ کر جوتا اپنی جیب میں ٹھونس لیں یا اسی وقت تجویز کا دوسرا جوڑا بھی مانگ بیٹھیں۔ ویسے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہے کہ ان ہی جوتوں کے طفیل جمہوریت بھی چل رہی ہے اور جوتے بھی۔ □

جعفر عسکری
۱/۱، نوراللہ روڈ، الہ آباد

اسلم عمادی
4/11-4-10، ہمایوں نگر، حیدرآباد (اے پی)

غزلیں

اپنا وجود زیر و زبر کر رہے ہیں لوگ
کس طرح شہرِ جاں میں بسر کر رہے ہیں لوگ
پڑتا نہیں ہے سرد کبھی شعلۂ طلب
صحرا میں بھی تلاشِ شجر کر رہے ہیں لوگ
شاداب منزلوں پہ پہنچنے کی آس میں
جاں سوز وادیوں کا سفر کر رہے ہیں لوگ
کیا پوچھتے ہو مجھ سے مرا حال، خود کہو
کیوں کر تباہ شام و سحر کر رہے ہیں لوگ
غم کی تمازتوں سے پگھلنے کے باوجود
روشن طرب کی راہ گذر کر رہے ہیں لوگ
لمحوں کے اس سراب میں پوچھو نہ کس طرح
اپنے لبانِ خشک کو تر کر رہے ہیں لوگ
ویراں جو خواہشوں کے جزیرے ہوئے تو پھر
آباد حسرتوں کے نگر کر رہے ہیں لوگ
ہستی کے ازدحام میں جعفر جو حق کہو
اک جنگ ہو کے سینہ سپر کر رہے ہیں لوگ

کھو گیا حرفِ تعلق، اب کہاں، یہ تو بتا
ریزہ ریزہ کیوں ہوئی دیوارِ جاں یہ تو بتا
کرب ہے تو کیوں مجھے رکھتا ہے اتنا مطمئن
اے لہو کے نور، اے گردابِ جاں یہ تو بتا
میرے پیکر میں بچا سایہ، مٹی بعدِ کثیف
کس طرف، کس سمت ہو جاؤں رواں، یہ تو بتا
سبز کشتی پر رواں، اک قافلہ امکان کا
سرد جنگل سے چلا، لیکن کہاں، یہ تو بتا
ٹوٹے پنکھوں کو لئے وہ نصف شب کا اک پرند
نخلِ خشک ذرز میں کیوں لے اماں، یہ تو بتا
اسلم اس قتال میں سب چشم و لب زخمی ہوئے
ذہن تجھ کو جان سے کیوں تھا گراں، یہ تو بتا

یوم راہی

گھن

تھوڑی دور سامنے مخالف سمت والے فٹ پاتھ پر جب اس نے جبار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں پھیر لیں اور یوں کترا کر تیزی سے دوسری سڑک پر مڑ گیا جیسے کوئی قرض دار اس شخص کو دیکھتے ہی گھبرا کر چھپنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس سے اس نے قرض لے رکھا ہو اور کئی بار سے ٹال چکا ہو۔

لیکن اس نے اپنے دوست جبار سے نہ تو کچھ قرض لیا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی لڑائی جھگڑا تھا اس کا۔ پھر بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت جبار سے آمنا سامنا ہو اور نوبت بات چیت تک پہنچ جائے ——— دراصل ان دنوں کچھ عرصے سے وہ ایک عجیب قسم کی بیزاری اور بے دلی کا شکار ہوتا جا رہا تھا جس کے باعث وہ تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔ جی ہی نہیں چاہتا تھا کسی سے ملنے کو، بات کرنے کو، سب باتیں کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہونے لگی تھیں حتیٰ کہ زندگی تک کا مقصد مشکوک ہو گیا تھا ——— وہ تو بس ان دنوں آگہی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اس منزل پر پہنچنے سے قبل اسے ایک لمبا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ اس سفر کے دوران حقائق کی روشنیوں نے اس کو بہت سے تاریک گوشوں سے روشناس کرایا تھا اور تب اس نے کتنے ہی لوگوں کے ظاہر و باطن کا تماشا دیکھا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر پہلے پہل اس کا خون کھولتا تھا اور کبھی کبھار وہ بے قابو ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا منافقت کے ہر ناگ کو سختی سے کچل ڈالے، نیست و نابود کر دے۔ لیکن جلد ہی جب اس کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا تو اس کے خیالات نفرتوں کی آنچ میں تپنے لگے، پھر رفتہ رفتہ اس نے لاتعلقی کا راستہ اپنا لیا۔ یہاں تک کہ تنہائیاں اس کا مقدر بن گئیں ——— گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ جو دو آنکھیں پہلے ایک آس کے ساتھ اس کو تکتی تھیں، پھر ان میں شکایت کی جھلک ہوتی تھی، اور اب مایوسی کے سائے ڈولتے تھے، اسے احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کے جائز مطالبات پورے نہیں کر پاتا ——— اس سلسلے میں اس نے مسلسل تگ و دو کی تھی، بڑے بڑے جتن کئے تھے،

تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خاصے تجربے اور اہلیت سے بھی مالا مال تھا۔ اور یوں کئی بہتر ملازمتوں کے لئے موزوں ترین فرد تھا۔ اس لئے اس نے مستقبل کے لئے خوش حال زندگی کے خواب دیکھے تھے، جن کے لئے وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ لیکن مسلسل نظر انداز ہونے کے باعث اس کے خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن تار تار ہو کر لامحدود فضاؤں میں بکھر گئے تھے۔ اور اس کی امیدوں کا محل مسمار ہو گیا تھا اور وہ کف افسوس مل کر رہ گیا تھا، حتیٰ کہ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی اور اس موضوع پر سوچنا یک ترک کر دیا تھا ـــــ گھر میں اس کی نگاہیں جھکی جھکی رہتی تھیں اور اکثر اس کے ذہن و دل میں دھواں سا پھیلنے لگتا تھا۔

چند دنوں سے اس کے مزاج کی تلخی اور بجھی بجھی سی کیفیت نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی، تب ہی سے اس نے خود کو تیاگ لینے پر مجبور پایا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں سے اس نے خود کو دفتری اوقات کے بعد گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں مقید کر لیا تھا اور اس کے منہ کو چپ سی لگ گئی تھی، گہری اور پراسرار چپ ـــــ بیشتر اوقات وہ طرح طرح حوصلہ شکن سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ کبھی کبھار اس کی بیوی نے اسے آہیں بھرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، ایک دوبار اس نے شوہر سے اس بارے میں دریافت بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے بے تکے جواب دے کر بیوی کو ٹال دیا تھا۔ چنانچہ بیوی کو بھی ٹھنڈ ـــــ سے سانس بھر کر خاموش ہونا پڑا تھا۔ رہا سوال بچوں کا تو وہ ان سے بھی کترایا کترایا رہتا تھا، الگ تھلگ جیسے کوئی واسطہ تعلق ہی نہ ہو ان سے، یوں بچے بھی اس سے بات کرتے ہوئے، اس کے سامنے جاتے ہوئے سہم جاتے تھے، اس لئے زیادہ وقت باپ کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے تھے۔ دوستوں اور دیگر ملنے والوں میں سے بھی گھر پر کوئی نہیں آتا تھا، پہلے ہمیشہ باہر ہی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ان کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، بلکہ بعض اوقات تو کوفت محسوس ہونے لگی تھی ـــ

چنانچہ گوشۂ تنہائی میں پناہ لے کر اس نے ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر لحظہ بے قرار اور مضطرب بلکہ ایک عذاب میں مبتلا رہتا تھا۔

لیکن آج اچانک ایک رو بہا کر اسے گھر سے "باہر" لے آئی تھی۔

جبار نے اس کو نہیں دیکھا تھا اس لئے جبار اپنی راہ پر گامزن رہا ـــــ اور وہ نئی سمت چلتا چلتا دور نکل گیا۔ آپ ہی آپ اس کے قدم کسی دوسری سڑک پر مڑ جاتے تھے، وہ ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ اس کو کدھر جانا ہے، کیوں جانا ہے۔ کیا کرنا ہے ـــ کشادہ سڑک پر مڑتے ہوئے اس نے دیکھا دور مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔

ایک دن زندگی کا بھی یہی انجام ہوتا ہے، اس نے گہرا سانس لے کر سوچا ——— فرق اتنا ہے کہ یہ سورج کل پھر طلوع ہو جائے گا، لیکن زندگی کا سورج ایک بار غروب ہو جائے تو پھر طلوع نہیں ہوتا۔

"یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں" قریب ہی کسی ریستوران میں رفیع کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔ اس نے یہ گانا کافی دنوں کے بعد سنا تھا ——— پہلے اسے اس کی دھن اور ساز پسند تھے، لیکن اب رفیع کی آواز سوز میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے دل، اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی تھی اور ایک ایک بول کا مطلب آپ ہی آپ اس پر عیاں ہوتا جا رہا تھا، فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سیگرٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے اس نے پورا گانا سنا اور اس کے سینے میں ایک شمع سی پگھلتی رہی۔

کیوں نا ایک پیالی چائے پی لی جائے ——— اس نے سوچا، اور اس کے قدم ریستوران کی جانب بڑھ گئے، اسے ایکا ایکی جماہی آئی، کتنی ہی راتوں سے وہ بے چین تھا، کبھی یوں ہوتا کہ رات گئے تک نیند نہیں آتی تھی، پھر تھوڑی دیر تک سوتا اور آنکھ کھل جاتی، طرح طرح کے پریشان کن خیالات اس کے حواس پر چھانے لگتے اور وہ انجانے خوف سے سہما ہوا، دم سادھے آنکھیں میچے سونے کی کوشش کرتا رہتا۔ آنکھیں کھولتا تو اسے بے کراں اندھیرے اور بے اماں سناٹے میں یوں لگتا جیسے وہ اپنے کمرے کی بجائے قبر میں لیٹا ہوا ہو۔ ——— کروٹیں بدل بدل کر تنگ آ جاتا حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھیں مند جاتیں ——— سوتے میں بھی اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ بے تکے، ڈراؤنے مایوس کن خواب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے ——— جب وہ ریستوران
ن سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ تھک چکا تھا۔ اور اب بیٹھنے کے بعد اس کو آرام ملا تھا فوراً ہی اُسے کئی دن قبل کی ایک دوپہر یاد آ گئی جب وہ مسلسل کئی گھنٹے برفیلے موسم میں دفتر کا کام مکمل کرنے کے بعد باہر دھوپ میں آیا تھا۔ کچھ اسی قسم کا آرام سے اس وقت ملا تھا۔ کافی دیر وہ دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

بیرے نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی تو اس کے خیالات کا دھاگہ ٹوٹ گیا
ج وہ ضرور آرام سے سوئے گا، اس نے جلدی جلدی گرم چائے پی ڈالی، گویا اسے کوئی اشد
ری کام یاد آ گیا ہو۔ پھر اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اس نے اس سڑک کا رخ کیا جس
ت سے سینما ہاؤس تھے، کافی دیر وہ وقت گزارنے کے لئے ایک ایک پکچر ہاؤس میں داخل

ہوتا رہا اور تصاویر کے سیٹوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے اسے فلم بینی کا بے حد شوق ہو ـــــــ جب وہ اس شغل سے اکتا گیا تو اسے بھوک محسوس ہونے لگی اور وہ ایک نان چھولوں والے کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ روٹی کھانے کے بعد وہ ایک ایسے راستے پر ہولیا جہاں بہت کم آمد و رفت تھی ـــــــ اس سڑک پر چلتے چلتے اسے ریلوے اسٹیشن کا خیال آیا اور وہ فوراً ہی ادھر چل پڑا۔

تکان کے باوجود وہ رات گئے تک گھومتا رہا، حتیٰ کہ اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ تب اسے گھر کی یاد آئی ـــــــ موسم گذشتہ ہفتے سے بہتر ہو گیا تھا، وہ پہلی سی ٹھنڈ نہیں تھی ـــــــ ادھر لگاتار چلنے کے باعث اس کا جسم گرم تھا۔

گلی سنسان تھی۔ محلے کے بازار کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سوائے ایک ریستوران کے جو عموماً دیر سے ہی بند ہوتا تھا ـــــــ اندر بھی سناٹا تھا اور باہر بھی خاموشی ـــــــ خاموشی اور ویرانی بھی ـــــــ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور ٹانگیں جسم کا بوجھ سہار نے پر احتجاج کر رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے کنڈی کھٹکھٹائی، اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــــ سب بچے سوئے ہوئے تھے۔

"کھانا لاؤں"؟ اس کی بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں"

وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کوٹھری میں چلا گیا۔

جب اس نے جوتوں میں سے پاؤں باہر نکالے تو کچھ ہوئی، دکھتی ہوئی انگلیوں کو آزادی ملی۔ انگلیوں کو حرکت میں لایا تو ان میں اسے ایک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ اس تکلیف میں اسے ایک انجانا سا، انوکھا سا لطف آیا ـــــــ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بری طرح بوجھل تھیں اور بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا ـــــــ اس نے دیکھا برابر والے پلنگ پر اس کی بیوی منہ ڈھانپے لیٹی تھی۔ اس نے کوئی بات کرنے کے بارے میں سوچا، لیکن تکان اور نیند کے باعث اس پر غنودگی کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی بتی بجھا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے لحاف اوڑھا تو وہ گرم تھا اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں، بھاری بھاری پپوٹے ـــــــ دکھتا ہوا گرا گرا جسم ـــــــ آج اسے بستر میں لیٹ کر بڑا آرام مل رہا تھا۔ نہ سوچوں کی یلغار، نہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنا ـــــــ بس چند ہی منٹوں کے بعد وہ گہری اور پُر سکون نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا۔ □

غزلیں

شفیع اللہ خان راز
ایس۔این کالج اٹاوہ

جس قدر بے کار ہیں بوڑھے درخت
وہ زمیں پر بار ہیں بوڑھے درخت
رات کچھ رنگین چڑیاں آئیں گی
خواب میں بیدار ہیں بوڑھے درخت
چوس لیتے ہیں پرندوں کا لہو
قاتلوں کا پیار ہیں بوڑھے درخت
آندھیاں اک دن اڑا لے جائیں گی
ریت کا انبار ہیں بوڑھے درخت
نوجواں پودے ہیں سرگرمِ سفر
قافلہ سالار ہیں بوڑھے درخت
زندگی کی دھوپ جتنی تیز ہے
اتنے سایہ دار ہیں بوڑھے درخت
راستے آپس میں مل سکتے نہیں
آہنی دیوار ہیں بوڑھے درخت
عکس پانی میں نظر آتا ہے راز
جھیل کے اس پار ہیں بوڑھے درخت

فرحت قادری
معروف گنج، گیا

آئی خزاں چمن میں، گئے دن بہار کے
شرمندہ سب درخت ہیں کپڑے اتار کے
اب اس کی یاد ہے کہ ستاتی ہے رات دن
مجھ کو کبھی سکوں نہ ملا 'خود' کو مار کے
میک اپ سے چھپ سکیں گی خراشیں نہ وقت کی
آئینہ ساری باتیں کہے گا پکار کے
انساں سمٹتا جاتا ہے خود اپنی ذات میں
بندھن بھی کھلتے جاتے ہیں صدیوں کے پیار کے
پھر کیا کرے گا رہ کے کوئی تیرے شہر میں
راتیں ہی جب نصیب ہوں راتیں گزار کے
سوچا ہے، اپنے زخموں کے آنگن میں بیٹھ کر
سجدے کروں گا نقشِ تمنا ابھار کے
تنہائیوں کا درد سمیٹے ہوئے کوئی
فرحت چلا ہے ٹھوکریں دنیا کو مار کے

خالد اگاسکر
مقابل پاور ہاؤس - پڈگھا
ضلع تھانہ - مہاراشٹر

کٹے ہوئے وقت کا ایک لمحہ

پچیس برسوں سے اس راستے پر چل رہا ہوں۔ کہاں جانا ہے۔ پتہ نہیں۔ کب پہنچوں گا معلوم نہیں سوچتا ہوں یہیں رک جاؤں۔ لیکن اوروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر اپنے ارادے پر قابو نہیں پاتا اور پھر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ کبھی کبھی تھک کر جی چاہتا ہے کہ کسی پیڑ کے سائے میں دم لے لوں لیکن اس راستے پر پیڑ بھی نہیں ہیں اور جو ہیں وہ اتنے گھنے نہیں ہیں کہ سایا دے سکیں کہیں کہیں کسی موڑ پر ایک آدھ گھنا درخت دکھائی دیتا ہے۔ وہاں پہنچتا ہوں تو ایک جم غفیر کو اس کے سائے میں سمٹا پاتا ہوں۔ بے شمار لوگ اس امید پر دھوپ میں کھڑے ہیں کہ کوئی چلا جائے تو وہاں پناہ لے لیں جنھیں جگہ ملی ہے وہ جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ میں نے اکثر اس امید پر رکنا چاہا کہ شاید کوئی مر جائے اور میں اس کی جگہ لے لوں۔ لیکن اس راستے پر چلنے والے مرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ بعض کے چہرے اتنے زرد اور سوکھے ہیں کہ انھیں مردہ تصور کیا جا سکتا ہے لیکن میرے تصور سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ خود کو مردہ تصور کریں تب نا! سالے مرتے بھی نہیں ہیں۔

شروع شروع میں اس راستے پر چلتے ہوئے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ تکلیف کی شدت کا احساس بھی ہوتا تھا۔ تلوؤں میں کتنے کانٹے، کنکر، کرچیاں چبھتی تھیں۔ بار بار ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر انھیں کھینچ کر نکالتا تھا۔ کافی خون بہا کرتا تھا۔ لیکن اب ـــــ اب ان تمام باتوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ پچھلی بار ایک بڑا کانٹا تلوے میں چبھ گیا تھا۔ کانٹا چونکہ بڑا تھا اس لئے نکالنا پڑا۔ نہ بھی نکالتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اس بات پر تعجب نہیں ہے کہ کانٹا نکالنے پر خون کیوں نہیں بہا۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ میرے تلوے میں کانٹے کی چبھن کا احساس کیوں نہیں ہوا۔ وہ تو کانٹا کافی بڑا تھا اور ساتھ میں چلنے والے بزرگ نے دیکھ لیا تھا اور ان ہی کے مشورے پر میں نے اسے نکال پھینکا تھا۔ ورنہ مجھے کیا پڑی تھی جو کانٹا نکالنے میں خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کرتا۔

کہتے ہیں کہ پرانے وقتوں کے لوگ راستہ چلتے کہیں کانٹے، کرچیاں، کنکر یا اس قسم کی کوئی چیز راستے پر پڑی پاتے تو اسے اٹھا کر کنارے کر دیتے یا تو کسی گڑھے میں ڈال دیتے۔ عجیب احمق تھے وہ........

اگر میں بھی یہ کام کرنے لگوں تو میرے احمق ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ سنا ہے اس راستے پر پہلے گڑھے نہیں ہوا کرتے تھے اور اگر ایک آدھ گڑھا مل بھی جائے تو مل جل کر پاٹ دیتے تھے۔ اب تو اس راستے پر اس قدر گڑھے ہو گئے ہیں کہ انھیں پاٹنا ناممکن ہو گیا ہے اور کیا ان گڑھوں کو پاٹنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ سالے، لوگ چلتے بھی اس طرح ہیں کہ قدم قدم پر گڑھا بن جاتا ہے۔ کتنے سارے لوگ ان گڑھوں میں گرتے ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ یہ گڑھا ان کی قبر بن جائے گا۔ مگر بڑے جی دار ہیں یہ لوگ۔ پھر سے کھڑے ہوتے ہیں اور چل پڑتے ہیں۔ ان ہی گرد آلود لباس کے ساتھ ——

ان لوگوں کے لباس کتنے میلے ہیں۔ دنیا بھر کی گندگی لپٹی رہتی ہے ان سے۔ بعض کے جسم پر تو صرف چند چیتھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ہر شخص کا لباس پسینے سے تر ہے۔ یہ گیلے گیلے اور بھیگے بھیگے سے جسم۔ کہیں مٹی کے مٹیالے داغ ہیں تو کہیں بیٹ اور گو کے کالے پیلے نشان۔ بعض مردوں نے ان چیتھڑوں سے تنگ آکر خود کو لباس سے آزاد کر دیا ہے۔ وہ بالکل مادر زاد برہنہ چل رہے ہیں۔ ان کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی چل رہی ہیں۔ کسی کے چہرے پر شرم وحیا کا کوئی گذر نہیں ہے۔ عورتیں بھی کافی بدحال اور پریشان ہیں۔ کچھ کی آستین پوری طرح پھٹ چکی ہیں اور بغل کے بڑھے ہوئے بے ترتیب بال پسینے سے چپک سے گئے ہیں۔ کچھ کے ہونٹ سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ جیسے انھیں لیموں کی طرح نچوڑا گیا ہو یا آم کی طرح چوسا گیا ہو .... بعض کا لباس بھی تار تار ہے۔ چھاتیاں ڈھل پڑی ہیں۔ لٹکی ہوئی سی۔ بے ڈول چھاتیاں۔ پیٹ پر چڑھی ہوئی تہیں۔ کمر کے گرد کھجلی اور داد کی بنا پر بنا ہوا سیاہ پٹا۔ رانوں اور کولھوں پر دانت کے نشان۔ جانگھوں سے بہتا ہوا پیپ اور.....

پچھلے پچیس برس سے اس راستے پر چل رہا ہوں۔ میرے ساتھ وہ بوڑھا بھی چل رہا ہے۔ جس کی عمر اسّی سال ہے اور اس قطار میں وہ دس سالہ بچہ بھی ہے۔ بوڑھا کھانس رہا ہے پھر بھی چل رہا ہے۔ ہانپ رہا ہے پھر بھی قدم بڑھا رہا ہے۔ کبھی کبھی لڑکھڑا کر گرنے لگتا ہے اور سہارے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ مارتا ہے کس کا دماغ خراب ہوا ہے جو اسے سہارا دے۔ وہ گر گیا —— پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلنے پر تیار اور یہ بچہ —— اسے تو اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں۔ اچھل اچھل کر چل رہا ہے۔ گویا چلنا بھی معجزہ ہو۔ چلتے چلتے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا لیتا ہے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے راستے پر اچھال دیتا ہے۔ اسے اس بات کی بالکل فکر نہیں ہے کہ اس کے اچھالے ہوئے پتھر سے کوئی زخمی بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اتنی سوجھ بوجھ ہوتی تو اس راستے پر چلتا ہی کیوں؟

مجھے واپس جانا چاہئے۔ شاید اسی میں نجات ہو۔ لیکن کہاں؟ کیا اب میں واپس جا سکتا ہوں میرے آس پاس کتنے چہرے جمع ہو گئے ہیں۔ یہ سب چہرے میرے اپنے ہیں۔ یہ سب یکساں ہیں۔ اُف ■

خدایا ــــــ یہ میں کہاں آپھنسا ہوں۔ وہ بڑھا تو میں ہی ہوں۔ کہاں گیا وہ بڑھا۔ ابھی ابھی تو یہاں تھا۔ اسے معلوم کہاں ہے؟ ابھی وہ بھی یہاں تھا۔ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟ پھر میں؟ میں تو بچہ ہوں۔ میں ــــــ بوڑھا ــــــ اور ــــــ بچہ؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ یہاں دم لے لوں ــــــ لیکن نہیں ــــــ مجھے اس موڑ تک پہنچنا ہے۔ جہاں وہ سایہ دار درخت ہے۔ مجھے اپنی رفتار تیز کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے ان بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی مرجائے اور مجھے سائے کی جگہ لے۔ □

یاد آوری کا شکریہ

● آپ کے خطوط میں کنتھا سرت ساگر سے متعلق میرے حقیر مضمون پر بھی ایک خط شامل ہے۔ مکتوب یس (فضیل جعفری صاحب) کی فہم کا کمال ہے یا میرا عجز بیان ہے کہ لکھا کچھ اور سمجھا کچھ اور گیا۔ جوش علم میں دصوف نے فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا نام بھی ٹیگور سے جوڑ دیا ہے اور اس طرح مجھ پر ایک دندان شکن اعتراض کا ہادہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس جملے میں فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا ذکر عمر خیام اور کالی داس کے سلسلے میں تھا۔ یے ٹس ٹیگور کے سلسلے میں۔ میں عرض صرف یہ کرنا چاہتا تھا کہ عمر خیام اور کالی داس تو پرانے وقتوں کے بزرگ تھے ، بگور تو عہد جدید کے مشرقی تھے ، انھیں بھی ہم نے خیام اور کالی داس کی طرح مغرب ہی کے واسطے سے پہچانا ر ان تینوں کی قدر و قیمت کا اعتراف ہمارے ملک میں بالترتیب فٹز جیرالڈ ، گیٹے اور یے ٹس کی سند کے بعد کیا یا۔ آپ کا رسالہ تو اہل علم کے لئے ہے جو اتنی معمولی سی بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ فٹز جیرالڈ خیام کا مترجم تھا، یٹے کالیداس کا عاشق اور یے ٹس نے ٹیگور کی داد دی ہے۔ تینوں مغربیوں اور تینوں مشرقیوں کے نام اسی تیب سے میں نے لکھے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ قارئین کے اس حلقے میں ایک ایسے مکتوب نویس بھی شامل ہوں گے راس عاجز البیان کی بات کا بتنگڑ بنائیں گے اور معلومات کی بوچھار شروع کر دیں گے۔ معلومات کی نمائش حق بہرحال اسی کو پہنچتا ہے جو واقعی عالم فاضل ہو۔ مجھے یہ خبط کبھی نہیں رہا۔ اچھا برا جو کچھ بھی لکھا صرف سوچ کر کہ اپنے تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کر سکوں۔ بہرحال میں مکتوب نویس کی محنت شاقہ کا معترف دں اور شکر گزار کہ انھوں نے وہ مضمون (جو دراصل ایک ریڈیو ٹاک ہے) اس توجہ کے ساتھ پڑھا۔ اگر اندیشہ ہوتا کہ قارئین الفاظ میں ایک آدھ اختصار کے بجائے صرف تفصیل کی زبان سمجھتے ہیں تو اس جملے تشریح بھی کر دی جاتی۔ باقی باتوں کے جواب میں صرف خاموشی اختیار کرتا ہو۔ خواہ مخواہ کاغذ کیوں خراب ا جائے۔

شمیم حنفی ، نئی دہلی

تازہ ترین شمارہ ہاتھ میں ہے۔ حیران ہوں کہ اتنی کم قیمت پر ایسا اور اتنا مواد آپ لوگ ں طرح پیش کر پاتے ہیں۔ خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔ پچھلے چند برسوں سے کہانیاں پڑھ پڑھ کر بیزار وتا رہا ہوں۔ سید محمد اشرف کی کہانی "منظر" پڑھ کر مسحور ہوں اور فکر مند ہوں کہ اس کہانی کے جادو سے کلنے کی کیا صورت ہوگی۔ یہ کہانی اعلان ہے کہ اردو میں کہانی کی بازیافت ہوگئی۔ "منظر" کہانی نہیں آج ، زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جسے زندگی سے چھین کر کاغذ میں سمو دیا ہے۔ تخیل اور تجربے کا اتنا خوبصورت متزاج میں نے آج تک کسی کہانی میں نہیں پایا۔

فاخر مرزا ، بھوپال

خدایا ـــــــ یہ میں کہاں آپھنسا ہوں۔ وہ بوڑھا تو میں ہی ہوں۔ کہاں گیا وہ بوڑھا۔ ابھی ابھی تو یہاں تھا۔ اسے معلوم کہاں ہے؟ ابھی وہ بھی یہاں تھا۔ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟ پھر میں؟ میں تو بچہ ہوں۔ میں ـــــ بوڑھا ـــــ اور ـــــ بچہ؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ یہاں دم لے لوں ـــــ لیکن نہیں ـــــ مجھے اس موڑ تک پہنچنا ہے۔ جہاں وہ سایہ دار درخت ہے۔ مجھے اپنی رفتار تیز کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے ان بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی مر جائے اور مجھے سانے کی جگہ ملے۔

□

یاد آوری کا شکریہ

● آپ کے خطوط میں کتھا سرت ساگر سے متعلق میرے حقیر مضمون پر بھی ایک خط شامل ہے۔ مکتوب
یں (فضیل جعفری صاحب) کی فہم کا کمال ہے یا میرا عجز بیان ہے کہ لکھا کچھ اور سمجھا کچھ اور گیا۔ جوش علم میں
صوف نے فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا نام بھی ٹیگور سے جوڑ دیا ہے اور اس طرح مجھ پر ایک دندان شکن اعتراض کا
ادہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس جملے میں فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا ذکر عمر خیام اور کالی داس کے سلسلے میں تھا۔ یے ٹس
ٹیگور کے سلسلے میں۔ میں عرض صرف یہ کرنا چاہتا تھا کہ عمر خیام اور کالی داس تو پرانے وقتوں کے بزرگ تھے،
یگور تو عہد جدید کے مشرقی تھے، انھیں بھی ہم نے خیام اور کالی داس کی طرح مغرب ہی کے واسطے سے پہچانا
ر ان تینوں کی قدر و قیمت کا اعتراف ہمارے ملک میں بالترتیب فٹز جیرالڈ، گیٹے اور یے ٹس کی سند کے بعد کیا
یا۔ آپ کا رسالہ تو اہل علم کے لئے ہے جو اتنی معمولی سی بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ فٹز جیرالڈ خیام کا مترجم تھا،
یٹے کالیداس کا عاشق اور یے ٹس نے ٹیگور کی داد دی ہے۔ تینوں مغربیوں اور تینوں مشرقیوں کے نام اسی
تیب سے میں نے لکھے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ قارئین کے اس حلقے میں ایک ایسے مکتوب نویس بھی شامل ہوں گے
و اس عاجز البیان کی بات کا بتنگڑ بنائیں گے اور معلومات کی بوچھار شروع کر دیں گے۔ معلومات کی نمائش
حق بہرحال اسی کو پہنچتا ہے جو واقعی عالم فاضل ہو۔ مجھے یہ خبط کبھی نہیں رہا۔ اچھا برا جو کچھ بھی لکھا صرف
سوچ کر کہ اپنے تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کر سکوں۔ بہرحال میں مکتوب نویس کی محنت شاقہ کا معترف
وں اور شکر گزار کہ انھوں نے وہ مضمون (جو دراصل ایک ریڈیو ٹاک ہے) اس توجہ کے ساتھ پڑھا۔ اگر
اندیشہ ہوتا کہ قارئین الفاظ میں ایک آدھ اختصار کے بجائے صرف تفصیل کی زبان سمجھتے ہیں تو اس جملے
تشریح بھی کر دی جاتی۔ باقی باتوں کے جواب میں صرف خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ خواہ مخواہ کاغذ کیوں خراب
ا جائے۔

شمیم حنفی، نئی دہلی

تازہ ترین شمارہ ہاتھ میں ہے۔ حیران ہوں کہ اتنی کم قیمت پہ ایسا اور اتنا مواد آپ لوگ
س طرح پیش کر پاتے ہیں۔ خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔ پچھلے چند برسوں سے کہانیاں پڑھ پڑھ کر بیزار
ہوتا رہا ہوں۔ سید محمد اشرف کی کہانی "منظر" پڑھ کر مسحور ہوں اور فکر مند ہوں کہ اس کہانی کے جادو سے
نکلنے کی کیا صورت ہو گی۔ یہ کہانی اعلان ہے کہ اردو میں کہانی کی بازیافت ہو گئی۔ "منظر" کہانی نہیں آج
زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جسے زندگی سے چھین کر کاغذ میں سمو دیا ہے۔ تخیل اور تجربے کا اتنا خوبصورت
متزاج میں نے آج تک کسی کہانی میں نہیں پایا۔

فاخرہ مرزا، بھوپال

خدایا ـــــ یہ میں کہاں آپھنسا ہوں۔ وہ بوڑھا تو میں ہی ہوں۔ کہاں گیا وہ بوڑھا۔ ابھی ابھی تو یہاں تھا۔ اے بچہ کہاں ہے؟ ابھی وہ بھی یہاں تھا۔ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟ پھر میں؟ میں تو بچہ ہوں۔ میں ـــــ بوڑھا ـــــ اور ـــــ بچہ؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میرا سر چکرا رہا ہے یہاں دم لے لوں ـــــ لیکن نہیں ـــــ مجھے اس موڑ تک پہنچنا ہے۔ جہاں وہ سایہ دار درخت ہے۔ مجھے اپنی رفتار تیز کرنی ہے۔ ہوسکتا ہے ان بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی مرجائے اور مجھے سمانے کی جگہ ملے۔

□

یاد آوری کا شکریہ

● آپ کے خطوط میں کتھا سرت ساگر سے متعلق میرے حقیر مضمون پر بھی ایک خط شامل ہے۔ مکتوب نویس (فضیل جعفری صاحب) کی فہم کا کمال ہے یا میرا عجزِ بیان ہے کہ لکھا کچھ اور سمجھا کچھ اور گیا۔ جوشِ علم میں موصوف نے فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا نام بھی ٹیگور سے جوڑ دیا ہے اور اس طرح مجھ پر ایک دندان شکن اعتراض کا بہانہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اس جملے میں فٹز جیرالڈ اور گیٹے کا ذکر عمر خیام اور کالی داس کے سلسلے میں تھا۔ ییٹس کا ٹیگور کے سلسلے میں۔ میں عرض صرف یہ کرنا چاہتا تھا کہ عمر خیام اور کالی داس تو پرانے وقتوں کے بزرگ تھے، ٹیگور تو عہدِ جدید کے مشرقی تھے، انھیں بھی ہم نے خیام اور کالی داس کی طرح مغرب ہی کے واسطے سے پہچانا اور ان تینوں کی قدر و قیمت کا اعتراف ہمارے ملک میں بالترتیب فٹز جیرالڈ، گیٹے اور ییٹس کی سند کے بعد کیا گیا۔ آپ کا رسالہ تو اہلِ علم کے لئے ہے جو اتنی معمولی سی بات یقیناً جانتے ہوں گے کہ فٹز جیرالڈ خیام کا مترجم تھا، گیٹے کالیداس کا عاشق اور ییٹس نے ٹیگور کی داد دی ہے۔ تینوں مغربیوں اور تینوں مشرقیوں کے نام اسی ترتیب سے میں نے لکھے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ قارئین کے اس حلقے میں ایک ایسے مکتوب نویس بھی شامل ہوں گے جو اس عاجز البیان کی بات کا بتنگڑ بنائیں گے اور معلومات کی بوچھار شروع کر دیں گے۔ معلومات کی نمائش کا حق بہرحال اسی کو پہنچتا ہے جو واقعی عالم فاضل ہو۔ مجھے یہ خبط کبھی نہیں رہا۔ اچھا برا جو کچھ بھی لکھا صرف یہ سوچ کر کہ اپنے تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کر سکوں۔ بہرحال میں مکتوب نویس کی محنتِ شاقہ کا معترف ہوں اور شکر گزار کہ انھوں نے وہ مضمون (جو دراصل ایک ریڈیو ٹاک ہے) اس توجہ کے ساتھ پڑھا۔ اگر یہ اندیشہ ہوتا کہ قارئین الفاظ میں ایک آدھ اختصار کے بجائے صرف تفصیل کی زبان سمجھتے ہیں تو اس جملے کی تشریح بھی کر دی جاتی۔ باقی باتوں کے جواب میں صرف خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ خواہ مخواہ کاغذ کیوں خراب کیا جائے۔

شمیم حنفی، نئی دہلی

تازہ ترین شمارہ ہاتھ میں ہے۔ حیران ہوں کہ اتنی کم قیمت پر ایسا اور اتنا مواد آپ لوگ کس طرح پیش کر پاتے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ پچھلے چند برسوں سے کہانیاں پڑھ پڑھ کر بیزار ہوتا رہا ہوں۔ سید محمد اشرف کی کہانی "منظر" پڑھ کر مسحور ہوں اور فکر مند ہوں کہ اس کہانی کے جادو سے نکلنے کی کیا صورت ہوگی۔ یہ کہانی اعلان ہے کہ اردو میں کہانی کی بازیافت ہوگئی۔ "منظر" کہانی نہیں آج کی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جسے زندگی سے چھین کر کاغذ میں سمو دیا ہے۔ تخیل اور تجربے کا اتنا خوبصورت امتزاج میں نے آج تک کسی کہانی میں نہیں پایا۔

فاخرہ مرزا، بھوپال

● تازہ ایشو میں ابنِ انشا پر تم نے بہت اچھے مضامین چھاپے ہیں۔ انشا میرا وطنی ہے اور بہت پیارا شاعر ہے۔
اپندر ناتھ اشک، الٰہ آباد

● میں ایک شعری تقریب کے وسیلے سے عظیم آباد گیا تھا۔ الفاظ کے افسانہ نمبر کا خاص طور سے ذکر رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ حضرات نے جس بصیرت وہوش مندی سے افسانے پر اپنے موقر رسالے میں بہترین مواد پیش کیا ہے اس نے افسانے کے قاری اور ناقد کو بے حد متاثر کیا ہے۔
فضا ابن فیضی، مئو ناتھ بھنجن

● الفاظ افسانہ نمبر جلد دوم موصول ہوا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ نمبر اس توقع سے کہیں زیادہ خوش آئند اور وقیع اور معیاری ثابت ہوا ہے۔ افسانوں پر مضامین کا گوشہ مختصر لیکن بہت بھرپور اور فکر انگیز ہے۔ گوشۂ انتظار بھی نہ صرف دلچسپ اور مفید بلکہ جامع تجزیاتی جائزوں پر مشتمل ہے۔ آپ کا جریدہ گو بہت مختصر ہوتا ہے لیکن اپنے مندرجات کے لحاظ سے بہت بڑے بڑے اور ضخیم رسالوں پر بھاری ہوتا ہے۔ یہ خاص نمبر ضخیم بھی ہے اور بہت معیاری بھی۔
ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی

● ادب کے تمام اصناف کے صف اول کے لکھنے والوں کا تعاون حاصل کرنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن آپ کے رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یہ مشکل کام سرانجام دے دیا ہے اور یوں اردو ادب کے قاری کے لئے الفاظ کی ہر اشاعت ایک معتبر حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ "الفاظ" کے پچھلے دو شمارے افسانہ نمبر ہیں۔ ان شماروں کے مضامین کے حصے میں اردو افسانہ کی تاریخ، ارتقار اور رجحانات سے بحث کی گئی ہے اور افسانوں کے حصے میں تقریباً سب ہی قابل ذکر پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس طرح الفاظ کے یہ دو شمارے اردو افسانے کے طالب علم کے لئے ایک دستاویز بن گئے ہیں۔
صبیح محسن، مدیر اعلیٰ "آہنگ"، کراچی

تبصرے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

مٹی کا دیا ○ میرزا ادیب ○ سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ○ قیمت

ناخن کا قرض ○ میرزا ادیب ○ امتزاج پبلی کیشنز ، لاہور ○ قیمت

میرزا ادیب کا ہمارے بزرگ ادیبوں اور فن کاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے قلم نے مدتوں مختلف اصناف ادب کی خدمت کی ہے۔ اس سال ان کی دو کتابیں شایع ہوئی ہیں ـــــ مٹی کا دیا اور ناخن کا قرض۔ مٹی کا دیا ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے اور ناخن کا قرض خاکوں کا مجموعہ جس میں متعدد شاعروں اور ادیبوں کے قلمی مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں ان کے عہد کا ادبی ماحول اور ماضی کا لاہور جاگ اٹھتا ہے اور خاکوں میں ان کے اپنے ماضی کا سراغ مل جاتا ہے اس لیے ان دونوں کتابوں پر ایک ساتھ ہی گفتگو کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

زیر تبصرہ دونوں کتابوں میں افسانوی انداز اختیار کیا گیا ہے اس لیے پڑھنے والا ان میں کھو کے رہ جاتا ہے۔ وہ جب کسی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے پورے ماحول پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں جس سے اس عہد کی پوری ادبی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ جس طرح بات سے بات نکلتی ہے اسی طرح میرزا کے یہاں ایک شخص کی بات ہوتے ہوتے دوسرے کی گفتگو چھڑ جاتی ہے اور یوں ضمنی طور پر کئی چھوٹی چھوٹی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ بعض شخصیتوں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ میرزا ادیب واقعات کے سہارے ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں جس سے ان شخصیتوں کے بہت سے ان دیکھے گوشے منور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے رفیقوں کی نجی زندگی میں ایک دردمند دوست کی حیثیت سے جھانکتے ہیں اور ان محرومیوں کا سراغ لگاتے ہیں جنھوں نے ان کی زندگیوں کا رخ ہی بدل دیا۔ شلاً جفاکش اور خاموش طبع شبلی بی۔کام۔ جو زندگی بھر پھٹا کوٹ پہنے ، میز پر سر جھکائے اپنے منصبی فرائض انجام دیتا رہا اس کی ابتدائی زندگی کے ایک چھوٹے سے حادثے نے اس کی ساری امنگیں چھین لی تھیں۔ اس طرح میرزا اپنے ناخن سے دوستوں اور رفیقوں کی نجی زندگیوں کی گرہیں کھولتے ہیں اور یوں دوستی کا حق ادا کر دیتے ہیں ، سارا قرض چکا دیتے ہیں۔ ابن انشا ، شبلی بی کام ، مولانا تاجور ، اختر شیرانی اور محمود سعدی کے

خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

آئینۂ شہباز

○ مرتبہ اقرار احمد عباسی ○ بزم شہباز، امروہہ ○ قیمت

آئینۂ شہباز میں جناب شہباز کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری پر متعدد طویل مقالات اور مختصر مضا[مین] شامل ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے اور اب بزم احباب کے زیر اہتمام ایک مجموعۂ مضامین کی شکل میں شا[یع] ہوئے ہیں۔ ان میں قمر بدایونی کا مقالہ سب سے طویل ہے۔ انھوں نے شہباز صاحب کو اکبر ثانی قرار دیا ہے اور کلام اکبر و کلام شہباز کی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ مگر یہ شہباز صاحب کی شاعری کا صرف ایک ر[خ] ہے اس لئے مطالعۂ شہباز کا یہ زاویہ نقص سے خالی نہیں۔ سرفراز عثمانی نے مولانا شہباز کے کلام کو جدید تنقید کے معیار پر پرکھا ہے اور اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔ شہباز صاحب کے کلام کو سمجھنے کی یہ پہلی بھرپو[ر] کوشش ہے۔ غیور حسن خاکہ نگاری میں خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے مولانا کی شخصیت پر ایک بہت عمدہ مضمون لکھا ہے جو شامل کتاب ہے۔

عہد حاضر کے مزاح نگاروں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں مولانا شہباز کے نام کو نمایاں مقام حاصل ہوگا لیکن جس شہرت کے وہ مستحق تھے ابھی تک وہ انھیں حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ ابھی تک شایع نہیں ہوا۔ آج کل نام و نمود کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جاتے ہیں مگر یہ چیزیں شہباز صاحب کی طبیعت سے میل نہیں کھاتیں۔ وہ مشاعروں میں بھی کم شریک ہوتے ہیں اور رسائل میں کلام چھپوانے کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے۔ بینائی زائل ہو جانے سے ان کی دشواریوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

مولانا کی شہرت کو ان کی علمیت سے بھی نقصان پہنچا۔ وہ ایک وسیع المطالعہ انسان ہیں۔ اور مختلف علوم پر انھیں عبور حاصل ہے جس کا ان کے کلام میں پوری طرح اظہار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے عام مشاعروں میں ایسے کلام کو سمجھنے والے اور سراہنے والے کم ہی ہوتے ہیں۔ ہلکے پھلکے مزاح کی وہاں خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ اس لئے مولانا کے قارئین اور قدردانوں کا حلقہ محدود ہے۔ شاید اس کا احساس انھیں خود بھی ہے چنانچہ انھوں نے ایسے اشعار بھی کہے جن کے مفہوم تک عام ذہنوں کی رسائی ہو سکے مگر یہ کلام ان کے رنگ طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔ اس لئے یہاں کوئی خاص بات پیدا نہ ہو سکی

یہ دلچسپ بات ہے کہ اکبر کے مقابلے میں مولانا شہباز کے موضوعات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ اکبر کی توجہ بالعموم ہنگامی موضوعات کی طرف رہی۔ شہباز صاحب عام انسانی کمزوریوں، فطری ناہمواریوں اور عالمگیر نقائص و معائب کو نشانۂ تمسخر بنا کر اپنے طنزیہ و ظریفانہ کلام کو دائمی زندگی بخشی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "ط۔ظ" کے نام سے عنقریب شایع ہونے والا ہے۔

(یہ تبصرہ طباعت کے مراحل میں تھا کہ اس کتاب کے کراچی سے شایع ہونے کی اطلاع ملی معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب بعض اضافوں اور شاعر کے انتخاب کے ساتھ جناب سید علی سید نے مرتب کی ہے اور بہت

اہتمام کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔ اس کتاب پر آیندہ کسی شمارے میں گفتگو کی جائے گی۔

تخلیقی ادب ○ مرتبین: پاشا رحمان، مشفق خواجہ، آمنہ شفق ○ عصری ادب کراچی ○ قیمت

تخلیقی ادب کی اشاعت ادب کے پرستاروں کے لئے ایک خوشخبری ہے۔ مرتبین نے اسے کتابی سلسلے کا نام دیا ہے اور اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ ہر سال دو کتابیں شایع کی جایا کریں گی۔ اس طرح اسے ششماہی مجلّے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن غالباً یہ احتیاط مدّنظر ہے کہ باقاعدگی کو قائم نہ رکھا جاسکے تو قارئین کو شکایت نہ ہو اور یہ بات ہے بھی مناسب۔ ۱۹۸۱ء کی دونوں جلدیں ۶۶۰ اور ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ممکن ہے اتنی تعداد میں معیاری، غیر مطبوعہ تخلیقات کی فراہمی میں دشواری پیش آئے اور طباعت کا مرحلہ مشکل تر ہے کیوں کہ یہ دونوں جلدیں نہایت عمدہ کتابت کے ساتھ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر آفسٹ سے شایع کی گئی ہیں۔ طباعت کے علاوہ مشمولات کا انتخاب بھی قابلِ ستایش ہے۔

پہلی جلد میں صفِ اول کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اصناف کے اعتبار سے بھی اسے مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظموں، غزلوں، مقالوں، انشائیوں، ڈراموں، خاکوں کے علاوہ ایک گوشہ عالمی ادب کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ محمد ہادی حسین نے بودلیر کی نظموں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن، شان الحق حقی اور عبدالعزیز خالد نے نامور نثر نگاروں اور شاعروں کی نگارشات کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ سلیم احمد کی مقبول کتاب "محمد حسن عسکری — انسان یا آدمی" کا مکمل متن یہاں پہلی بار پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد کے ایک حصے میں پچھلی دہائی کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں میرزا یگانہ کی شخصیت اور فن پر نامور اہلِ قلم اور معتبر نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔

اس شاندار کارنامے کے لئے ادارہ الفاظ "تخلیقی ادب" کے مرتبین کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ح خ (حلیے اور خاکے) ○ غیور حسن ○ انجمن ترقی اردو، امروہہ ○ قیمت:

اس کتاب میں غیور حسن نے اپنی، ہم عصر و ہم وطن شخصیتوں کے قلمی مرقعے پیش کئے ہیں۔ ان میں کچھ نامور بزرگ ہیں اور کچھ ہونہار نوجوان۔ شخصیت نگاری بڑا نازک فن ہے۔ یہاں نہ بت گری اچھی لگتی ہے، نہ بت شکنی۔ اس لئے معاصرین اور بالخصوص ان شخصیتوں پر جو بفضلہٖ بقیدِ حیات ہوں قلم اٹھانا خود کو آزمائش میں مبتلا کرنا ہے۔ جادۂ اعتدال سے ذرا ادھر قدم پڑا تو مدح خوانوں میں شمار ہوا اور ذرا ادھر تو بے ادبوں میں۔ مگر غیور حسن اس منزل سے سلامت گزر گئے ہیں کیوں کہ ان کا قلم بے باک بھی ہے، مصلحت ناآشنا بھی لیکن ساتھ ہی مشرقی روایات کا پاسدار بھی۔

ح خ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مشاہدہ قوی ہے اور زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ جن شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے انھیں مصنف نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ اس لئے

یہ قلمی تصویریں منہ سے بولتی نظر آتی ہیں۔ سخی حسن کا خاکہ دلچسپ ہے لیکن یہاں زرا زیادتی اور بے دردی سے کام لیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے سید سخی حسن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی صاف ستھری اور دلکش نثر کے ضرور معترف ہوں گے۔ ایسے شخص میں خود بینی کا پیدا ہو جانا فطری بات ہے۔ آخر حسینوں کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہی ہے۔ اس خاکے کو مصنف کی ذاتی رنجش سے نقصان پہنچا ہے۔ کہیں وہ تعریف بھی کرتے ہیں تو محمد حسین آزاد کی ہجو ملیح کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

خاکہ نگاری ذراسی بے تکلفی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے لائق احترام بزرگوں کی بہ نسبت بے تکلف دوستوں کے خاکے زیادہ دلچسپ ہیں۔ صاحب کتاب کا سیلف پورٹریٹ عرفانِ ذات فنی نقطہ نظر سے مکمل اور جاذبِ نظر ہے۔ یہاں مصنف نے اپنے چہرے سے ایک ایک کر کے ساری نقابیں اٹھا دی ہیں۔

رت جگے ○ ثمر نظامی ○ بزمِ ادب، کراچی ○ قیمت :

رت جگے ثمر نظامی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں کیا۔ بچپن میں جو ماحول انھیں میسر آیا اس میں علم، ادب اور سیاست تینوں کی عملداری تھی۔ ان کی ہنگامہ پسند طبیعت نے انھیں سیاسی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ شعر کہنا شروع کیا تو ابتداءً ہنگامی موضوعات پر توجہ مرکوز رہی لیکن شعور پختہ ہوا تو انھوں نے زندگی کو اس کی پوری وسعتوں کے ساتھ قبول کیا اور اسے اپنے شعروں میں جگہ دی۔ لیکن ابھی تک وہ روایت کے پابند تھے، یہاں تک کہ موجودہ صدی کی ساتویں دہائی کا نصف اوّل گزر گیا تب انھیں احساس ہوا کہ زندگی کا ورق الٹ چکا اور شعر و ادب کا کارواں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ اب انھوں نے اپنے کلام کو زندگی اور ادب کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شعور میں پختگی آچکی تھی اور شعر گوئی میں مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ ثمر نظامی کے تازہ کلام میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ جدید حسیت بھی موجود ہے اور ان کی غزل فنی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید فکر کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ رت جگے کے مطالعے سے ہماری رائے کی تصدیق ہوگی۔

بین السطور ○ صبیح محسن ○ مکتبہ جمال، کراچی ○ قیمت :

بین السطور صبیح محسن کے انشائیوں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کو وہ اپنی ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً رشوت کی گرم بازاری، افسران بالا کی مدح سرائی، شہرت کمانے کے گر۔ لیکن صبیح محسن کے مزاح کا انداز یہ ہے کہ وہ آپ ہی وار کرتے ہیں اور آپ ہی اس کی زد پر آجاتے ہیں یعنی اکثر انشائیوں میں ان کا اپنا کردار "میں" اور "ہم" کی شکل میں موجود ہے جو اپنی ناہمواریوں کے سبب سب سے زیادہ تضحیک و ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔ صبیح محسن کا اندازِ بیان شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ شائستہ بھی ہے۔ مطالعے کے دوران قاری کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم بار بار ابھرتا اور

مصنف کی کامیابی کی گواہی دیتا ہے۔ یقین ہے یہ انشائیے مقبول ہوں گے اور ہمیشہ دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے۔

اورینٹل کالج میگزین ○ مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی ○ اورینٹل کالج، لاہور ○ قیمت:

اورینٹل کالج میگزین نے اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور تخلیقی شعور کی تربیت کی ہے۔ اب یہ رسالہ اردو کے نقاد و محقق ڈاکٹر وحید قریشی کے زیر ادارت لاہور سے شایع ہو رہا ہے۔ اس وقت میگزین کا شمارہ نمبر ۲۲۴ پیش نظر ہے جس میں صرف متنی اور متنی تنقید سے متعلق مقالات شامل ہیں۔

غالب نے ایک دوست کی فرمائش پر اپنے اردو فارسی کلام کا ایک انتخاب تیار کیا تھا جس کے کئی نسخے ان میں موجود تھے ان میں سے ایک جناب مالک رام کے پاس تھا جسے انھوں نے ۱۹۷۰ء میں شایع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے ایک مضمون میں نسخۂ مالک رام کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اور بعض متنازعہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ افضل حق قریشی نے محمد حسین آزاد کے دو خطوط اور ڈاکٹر سلطان محمود حسین نے سرسید کا ایک غیر مطبوعہ خط اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے شبلی کے چند نوادر بشمول مکتوبات پیش کئے ہیں۔ سید نور محمد قادری کے توسط سے پطرس کی ایک نادر تحریر تک رسائی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مقالہ "دستاویزی تحقیق" کی پہلی قسط بھی اس رسالے میں شامل ہے۔ اس مقالے سے تحقیق و تدوین کے بعض اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

شعریاتِ اقبال ○ تبسم کاشمیری ○ مکتبہ عالیہ، لاہور ○ قیمت:

ہمارے جواں سال محقق تبسم کاشمیری ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ انھوں نے اپنے ادب کے کلاسیکی سرمایے کو تدوین کے جدید اصولوں کے مطابق مرتب کرکے ضروری حواشی اور مفید مقدمات کے ساتھ شایع کیا، بعض اہم تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان کی کتاب "جدید اردو شاعری میں علامت نگاری" اردو تنقید میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ "شاگردانِ مصحفی" ان کی تحقیقی نظر کا پتہ دیتی ہے۔

تبسم کاشمیری نے اقبال اور ان کی شاعری کو سمجھنے کی خاص طور پر کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر ان کی ایک کتاب "اقبال اور نئی قومی ثقافت" پہلے شایع ہو چکی تھی۔ "شعریاتِ اقبال" ان کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں کلامِ اقبال پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے اقبال کو ایک نئے کل کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں دو مضمون اقبال کی امیجری اور شعری علامتوں کے بارے میں ہیں مصنف نے اقبال کے کلام میں پنجابی شعرا اور جدید شعرا کے کلام میں اقبال کے اثرات تلاش کرنے اور ان مماثلتوں کا تجزیہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چار ناولٹ ○ قرۃ العین حیدر ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ ۳۰ روپے

آج اردو فکشن کا سب سے بڑا نام ہے قرۃ العین حیدر۔ انھوں نے اردو فکشن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ ہمارے افسانوی ادب میں جدید رجحانات کا آغاز انھی کے قلم کا رہین منت ہے۔ اور فن کار بھی ہیں جنھوں نے اردو ناول و افسانے کو اعتبار بخشا اور جس پائے کا قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے اس کی کوئی اور مثال ہمارے ادب میں موجود نہیں۔ ناول ہو، ناولٹ ہو یا افسانہ ان کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ دور تک پھیلی ہوئی زندگی کو چند صفحوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ ان کا پر تاثر اسلوب نگارش بھی قاری کی توجہ کو پوری طرح جذب کر لینے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

اس مجموعے میں چار ناولٹ پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ہیں: دلربا، سیتاہرن، چائے کے باغ، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔ آخری ناولٹ ۱۹۷۶ء میں لکھا گیا اور باقی اس سے پہلے۔ قرۃ العین حیدر کی تصانیف کا شمار اردو کی سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔ مگر ہماری کیسی بدنصیبی ہے کہ ان کی کتابیں بے حد خراب چھپتی رہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی کتاب کی اشاعت سے یہ سلسلہ ٹوٹتا ہے۔ خدا کرے یہ نیک فال ہو اور ان کی ساری تصانیف اسی سلیقے سے شائع ہو سکیں

امراؤ جان ادا ○ مرزا محمد ہادی ○ مکتبۂ الفاظ، علی گڑھ ○ بارہ روپے

اب سے تقریباً سو سال پہلے لکھا گیا یہ ناول عہد حاضر کے فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس وقت سے اب تک اسے یکساں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ مرزا محمد ہادی نے اس کے علاوہ دوسرے ناول —— شریف زادہ اور ذات شریف بھی لکھے لیکن یہ ان کا واحد کارنامہ ہے جسے معجزۂ فن کی حیثیت حاصل ہے اور جس کے سبب مصنف کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

امراؤ جان ادا آج بھی بے حد مقبول ہے اور مختلف نصابوں میں شامل ہے۔ اس پر تین فلمیں بن کر دا پا چکی ہیں۔ مکتبۂ الفاظ نے اسے سلیقے سے شایع کر کے اردو ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ تمکین کاظمی کا ایک دلچسپ مضمون بطور مقدمہ کتاب میں شامل ہے لیکن ان کے بعض بیانات پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ رسوا نہ محمد ہادی کا تخلص تھا اور نہ قلمی نام۔ یہ مصنف کا تخلیق کردہ وہ کردار ہے جو واحد متکلم میں گفتگو کرتا اور امراؤ کی کہانی سناتا ہے مگر اس کا نام مصنف سے کچھ اس طرح جڑ گیا کہ آخر اس نے بھی اسے گوارا کر ہی لیا۔ دوسری یہ کہ مرزا ہادی کے زمانے میں اس نام کی کوئی طوائف موجود نہ تھی، پہلے البتہ گزری ہے۔ یہ کردار مصنف کا گھڑا ہوا ہے اور اتنا سچا لگتا ہے کہ آج تو کیا اس ناول کی اشاعت کے فوراً بعد لوگ اکبری دروازے پر امراؤ کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ ضروری نہیں کہ فکشن میں بیان کیا گیا قصہ سچا ہو مگر یہ بہر حال ضروری ہے کہ اس پر جھوٹ ہونے کا گمان بھی نہ گزرے اور اس ناول کا یہی معاملہ ہے۔ مرزا کی حیات معاشقہ کے افسانے مبالغہ آمیز ہیں۔

اقبال بحیثیت شاعر ○ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ○ مکتبۂ الفاظ، علی گڑھ ○ ۲۵ روپے

فلسفی اقبال پر ہمارے ناقدین کی توجہ اس حد تک مرکوز رہی کہ شاعر اقبال بڑی حد تک نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ خود اقبال نے اپنے فلسفے پر اتنا زور دیا کہ اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا حالانکہ انھوں نے اپنے پیغام کو پر اثر بنانے کے لئے بڑا خون جگر صرف کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آگے چل کر فن کی طرف توجہ کم ہوتی گئی۔ مگر اس وقت تک مسلسل مشق نے ایسی مہارت بہم پہنچا دی تھی کہ اس طرف پہلی سی توجہ ضروری بھی نہ تھی۔ تاہم ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے نسبتاً کمتر کہا جا سکتا ہے اور صرف اس لئے زندہ رہے گا کہ وہ اقبال کی تخلیق ہے۔ بہرحال یہ ایک نیک فال ہے کہ اب اقبال کے فن کی طرف خاطر خواہ توجہ کی جا رہی ہے اور زیر تبصرہ کتاب اسی کوشش کی ایک مثال ہے۔ اس میں اقبال کے فن پر اکیس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں سے اکثر بہت پہلے شایع ہو چکے ہیں لیکن ان کو یک جا کر دینا بھی اردو ادب کی ایک اہم خدمت ہے۔ ان میں سید عابد علی عابد، وقار عظیم، وزیر آغا، سید عبد اللہ، انور سدید، عبد المغنی اور محمد زکریا کے مضامین خاص طور پر اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔

اقبال معاصرین کی نظر میں ○ مرتبہ وقار عظیم ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ○ پچاس روپے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مجموعے میں عہد اقبال کے ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ گویا اقبال کے فکر و فن پر اولین تنقید کی ایک جھلک یہاں نظر آجاتی ہے۔ ہمارے بزرگ تنقید نگاروں میں سے جن جن کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: شیخ عبد القادر، شیخ محمد اکرام، رشید احمد صدیقی، سید عبد اللہ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سید سلیمان ندوی، اسلم جیراج پوری اور ممتاز حسین۔

اس کتاب میں شامل مضامین میں سے چند کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اقبال کی نظر سے گزر چکے ہیں اور ان میں سے کئی کے بارے میں انھوں نے اظہار خیال بھی کیا تھا۔ بعض مضامین میں توازن کی کمی نظر آتی ہے لیکن یہ تنقید اقبال کا نقش اول ہے اور اس زمانے کی پیداوار جب ہماری تنقید ابتدائی مراحل میں تھی۔ تفہیم اقبال کے سلسلے میں اس کتاب کا مطالعہ بہرحال ضروری ہے۔

—— نورالحسن نقوی

کھل جا سم سم ○ مظفر حنفی ○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ○ ۱۸ روپے

"کھل جا سم سم" مظفر حنفی کی غزلوں کا نیا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا ہے۔ اس سے قبل بھی ان کے چھ سات شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں جن میں سے کچھ میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ اور کچھ مجموعے "طنزیہ غزلوں" کے لئے مخصوص ہیں۔ مظفر حنفی نے شاعری کے علاوہ افسانے بھی تخلیق کئے ہیں جو مجموعوں کی شکل میں اردو قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے تخلیق و تنقید اور ترتیب و تدوین کا کام بھی کیا ہے۔ اس طرح ادب کی مختلف جہات میں مظفر حنفی نے اپنی صلاحیتوں کو رستا

ہے۔ ان کی غزلیں ایک آزاد فضا کا احساس دلاتی ہیں جس میں زندگی کے مختلف تجربے ہماری آنکھوں کے سامنے تیرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

مظفر حنفی نے جس لب و لہجے کو اپنی غزلوں میں برتا ہے اس کا سلسلہ ظفر اقبال اور عادل منصوری جیسے شاعروں سے ملتا ہے۔ یہ لب و لہجہ غزل میں تجربے کے طور پر نمودار ہوا تھا جس میں نئے الفاظ زبان اور مختلف قسم کے موضوعاتی اور لسانی تجربوں پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ آج کی غزل کے مجموعی اسلوب میں نسبتاً زیادہ ٹھہراؤ اور روایت سے استفادے کی بو باس موجود ہے۔

"کھل جا سم سم" کی غزلیں اپنے اسلوب کے اعتبار سے اردو قارئین کے لئے نئی نہیں ہیں۔ پھر بھی تجربوں کا تنوع اور زبان کا خلاقانہ استعمال (تخلیقی نہیں) ایک تازگی کا احساس ابھارتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار سے مجموعے کے مزاج کا کسی حد تک احاطہ کیا جا سکتا ہے:

میں گنہگار اور ان گنت پارسا چار جانب سے یلغار کرتے ہوئے
جیسے شب خون میں بوکھلا کر اٹھیں لوگ تلوار تلوار کرتے ہوئے

عہد طفلی سے طبیعت ہے روانی میں بہت — ناؤ کاغذ کی بہائی ہم نے پانی میں بہت
ملا جو سایہ تو دیوار آ پڑی سر پر — جہاں کھلا تھا کوئی در، بلا کھلی ہے
کون یاد آیا کہ سارا شہر جاں روشن ہوا — اک ستارہ ٹوٹنے سے آسماں روشن ہوا

مظفر حنفی نے اپنے پچھلے مجموعوں کے مقابلے میں "کھل جا سم سم" کی شاعری کو نکھارا اور وسعت دی ہے۔

— اظہار ندیم

اسپارٹاکس

بادل سرکار، ترجمہ: انیس اعظمی، معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۸ روپے

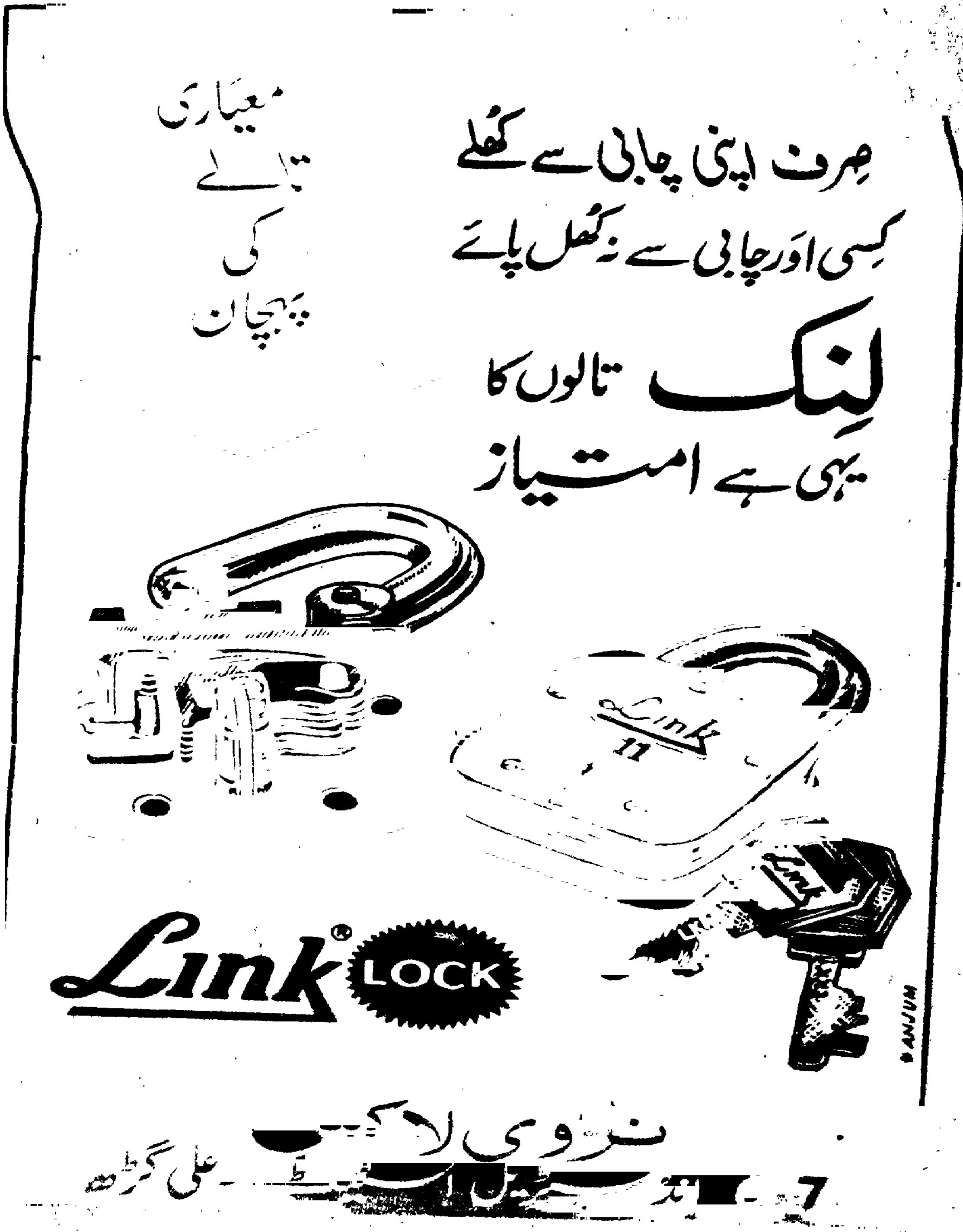
اسپارٹاکس دراصل ہاورڈ فاسٹ کا مشہور ناول ہے۔ اس ناول کی بنیاد پر ہالی وڈ میں فلم بھی بن چکی ہے۔ اس فلم کو بظاہر بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن بنیادی طور پر ہاورڈ فاسٹ اور ہالی وڈ کے مقاصد میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے اس لئے اس فلم کے ہاتھوں ہاورڈ فاسٹ کے ناول کی روح بڑی حد تک مجروح ہوئی اور شاید اسی خیال سے بادل سرکار نے اس ناول کو ناٹک کا روپ دینے کی ضرورت محسوس کی۔

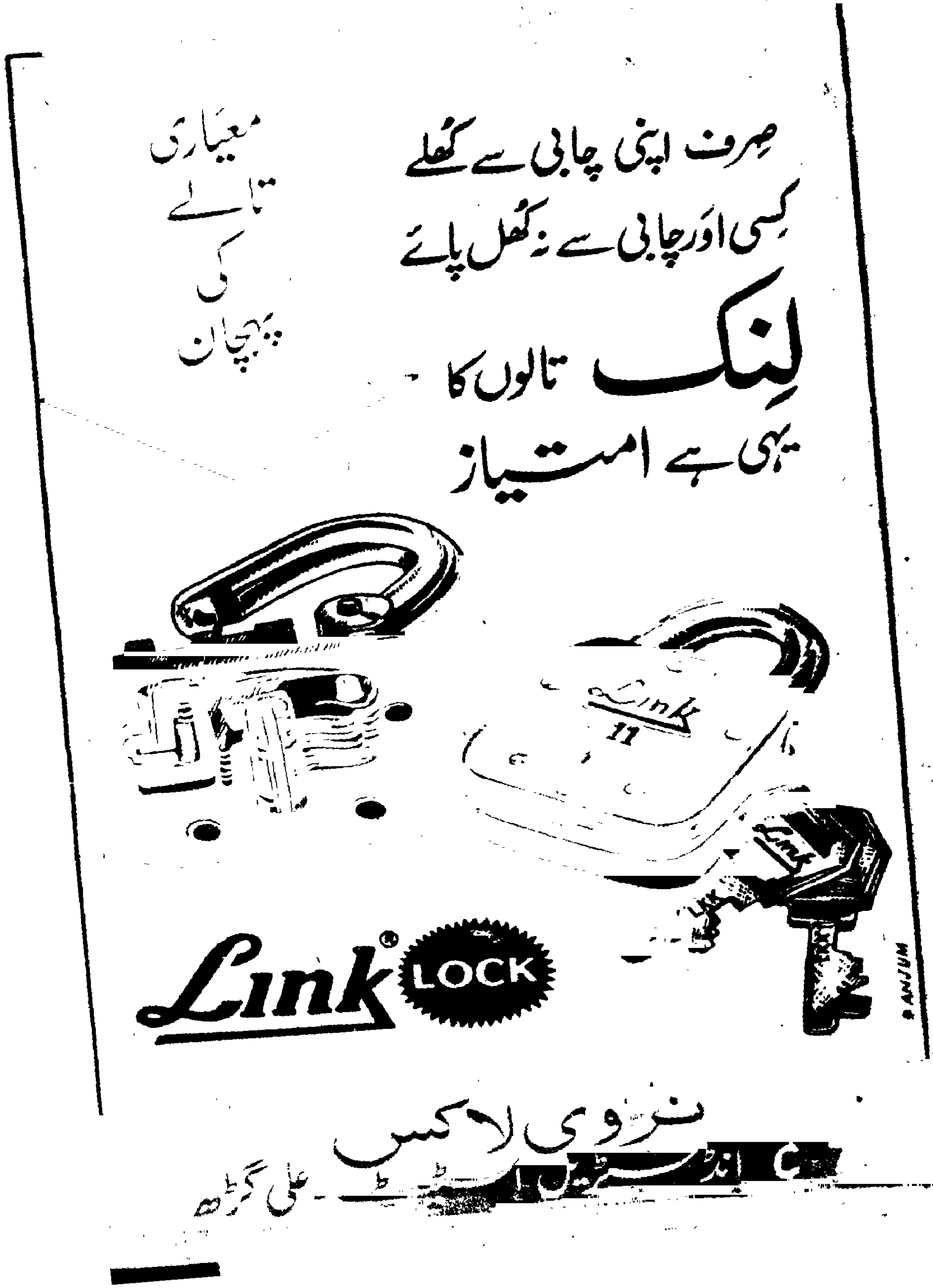
ایم۔ کے۔ رینا کی ہدایت میں بادل سرکار کا یہ ناٹک بھی کھیلا جا چکا ہے۔ اسپارٹاکس کی کہانی اگرچہ اکہتر سال قبل از مسیح کی کہانی ہے لیکن یہ کہانی آج ۱۹۸۲ء میں بھی اتنی ہی سچی لگتی ہے۔ آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل کے اسپارٹاکس نے سامراج وادی روم کے خلاف بغاوت کر کے اس کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اسی طرح شاید آج کا اسپارٹاکس بھی کسی ایسے ہی لمحے کا منتظر ہے۔

انیس اعظمی نے محض ایک قلم کار کی طرح اس ڈرامے کا ترجمہ کر کے نہیں رکھ دیا ہے۔ انھوں نے صحیح طور پر ڈرامے کی روح کو بلکہ اسپارٹاکس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے یہ کوشش اسپارٹاکس کے اسکرپٹ (SCRIPT) کے مطالعے کے ذریعے ہی نہیں بلکہ اسپارٹاکس کے سیٹ پر جا کر دو ہزار سال قبل کے رومن

سماج میں اپنے آپ کو مختلف حیثیتوں میں رکھ کر کی ہے۔ تھیٹر کے ساتھ ان کو پیشہ ورانہ مناسبت نہیں، بلکہ فن کارانہ مناسبت ہے اس لئے شاید وہ ناٹک کو کاغذ پر آتارنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ ایک تھیٹر کے کارکن ہونے کے ناطے ان پر یہ حقیقت روشن ہے کہ ناٹک بنیادی طور پر پڑھنے کی چیز نہیں بلکہ کر کے دکھانے کی چیز ہے۔ کسی بھی ڈرامے کی تخلیق یا اس کے ترجمے کا حق صحیح معنوں میں اسی شخص کو پہنچتا ہے جو اسٹیج کی تمام ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھتا ہو۔ انیس اعظمی اس سے قبل بادل سرکار کے ایک اور ناٹک "جلوس" کا بھی اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھیشم ساہنی کے ہندی ڈرامے "کبیرا کھڑا بجار میں" کا پوربیا میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ ان کی یہ کوشش اردو ڈراما ادب کے لئے یقیناً ایک فال نیک ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

—— اسلم پرویز


معیاری
تالے
کی
پہچان
صرف اپنی چابی سے کھلے
کسی اور چابی سے نہ کھل پائے
لنک تالوں کا
یہی ہے امتیاز
Link 11
Link
Link LOCK
ANJUM
علی گڑھ
7


صرف اپنی چابی سے کُھلے
کسی اور چابی سے نہ کُھل پائے
لنک تالوں کا
یہی ہے امتیاز
معیاری
تالے
کی
پہچان
Link
11
Link LOCK
نروی لاکس
علی گڑھ


معیاری
تالے
کی
پہچان
صرف اپنی چابی سے کھلے
کسی اور چابی سے نہ کھل پائے
لنک تالوں کا
یہی ہے امتیاز
Link
LOCK
ANJUM
نرو لاکس
علی گڑھ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نقش فریادی (نظم)

[illegible]

دستِ صبا (نظم)

[illegible]

دستِ تہِ سنگ (نظم)

[illegible]

[illegible]

Regd. No. L. ALG/91 Jan Feb

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123

دو ماہی

الفاظ



Regd. No. L. ALG/91 Jan. Feb. 1982

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/76

دوماہی

الفاظ



صلاح الدین پرویز کی کتاب "سارے دن کا تھکا ہوا پرش"

کی رسم اجرا کی چند جھلکیاں



سید حامد صاحب، کتاب کی پہلی جلد صلاح الدین پرویز کو پیش کر رہے ہیں۔



سید حامد صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تقریر کر رہے ہیں۔
تصویر میں پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور ڈاکٹر اطہر پرویز سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوماہی

الفاظ

علی گڑھ

جلد ۷ | مارچ، اپریل، مئی، جون ۱۹۸۲ء | شمارہ ۲، ۳

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی　　اطہر پرویز

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

سالانہ ـــــ ۱۶ سولہ روپے

ت ـــــ ۴ روپے

ٹر پبلشر ـــــ اسدیار خاں

طبوعہ ـــ جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی

تابت ـــــ ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق کی تصویر : اپندر ناتھ اشک

پتہ : دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

الفاظ

اداریہ

اردو رسمِ خط کو سہل بنانے کے لئے ایک عرصے سے مختلف تجویزیں زیرِ غور آتی رہی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اس مسئلے پر ایک معاصر "دائرے" نے اپنا اداریہ سپردِ قلم کیا کہ اگر حروف کو جوڑنے کے بجائے علیحدہ علیحدہ لکھا جائے تو لکھنے پڑھنے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی موضوع پر بعض حضرات نے ایک ہفت روزہ کے صفحات میں اظہارِ خیال بھی کیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ عام بول چال کی سطح پر تو ایک ہی زبان ہے جسے اردو، ہندی، ہندوستانی کوئی بھی نام دے لیجئے، اصل اختلاف رسمِ خط کا ہے۔ یہاں ہندی اس لیے اردو سے بازی لے جاتی ہے کہ اس کا لکھنا جتنا سہل ہے، اردو کا لکھنا اتنا ہی دشوار ہے۔ چنانچہ مختلف اوقات میں اسے آسان بنانے کے سلسلے میں طرح طرح کے مشورے دیے جاتے رہے ہیں۔ کسی زمانے میں حسرت موہانی نے صلاح دی تھی کہ ہمیں اپنی زبان کے لئے رومن رسمِ خط اختیار کر لینا چاہیے۔ لوگ حسرت کو دیوانہ بتاتے تھے۔ دیوانے کی بات سنتا کون۔ ورنہ یہ مشورہ اس قابل ضرور تھا کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا۔ رومن رسمِ خط کو معمولی رد و بدل کے بعد اپنایا جا سکتا تھا ممکن ہے اس کے سہارے ہماری زبان کی رسائی بیرونِ ملک کے علاوہ ہندوستان کے ان دور دراز گوشوں بالخصوص جنوبی ہند تک ہو جاتی جہاں آج تک ہماری قومی و ملکی زبان ہندی کو بھی دشواریوں کا سامنا ہے۔ اس سے ٹائپ اور طباعت میں آسانیاں پیدا ہوتیں مگر یہ نہ ہو سکا اور اب اس کا وقت بھی نکل چکا۔

آزادی کے بعد یہ آواز بلند ہوئی کہ اردو کو دیوناگری خط میں لکھا جانا چاہیے مگر اس تجویز کو بڑی سختی کے ساتھ رد کر دیا گیا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ آج اردو کا وجود باقی نہ ہوتا، بس کتابوں میں یہ لکھا رہ جاتا کہ ہندی کی وہ شیلی یعنی وہ طرزِ تحریر جو سہل اور شیریں ہے کبھی اردو کہلاتی تھی۔ یہ مطالبہ تو بہت پہلے سے کیا جا رہا ہے کہ جو آوازیں تقریباً یکساں ہیں مثلاً ا۔ع۔ ت۔ط، ذ۔ز۔ظ۔ض، س۔ص ان کے لیے صرف ایک ہی علامت کو باقی رکھا جائے۔ اس سے رسمِ خط آسان ضرور ہو جاتا مگر نئے املا کو سکھانے سے زیادہ پرانے املا کو ذہنوں سے محو کرنے پر محنت کرنی پڑتی اور اب یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ حروف کو ملا کر نہیں بلکہ الگ الگ لکھا جائے یعنی تجویز کے بجائے ت ج و ی ز۔

یہ تجویز بھی ناقابلِ عمل ہے۔ اس طرح لکھنے کے لئے زیادہ وقت اور زیادہ جگہ درکار ہے۔ اس کے علاوہ حروف کو جوڑ کر لکھنا زبان کی ارتقائی منزل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ترقی کو بہ یک جنبشِ قلم منسوخ کر دیا جائے۔ بلا شبہ یہ مشکل کام ہے۔ بلکہ یوں لکھیے ــــ ب ل ا ش ب ہ ی ہ م ش ک ل ک ا م ہ ے ــــ ذرا سوچیے کیا اس طرزِ تحریر کو رواج دینا آسان بات ہے۔ ہر لفظ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جس کی اپنی ساخت اور اپنی شخصیت ہوتی ہے اور اس کو بکھیر دینا یا فنا کر دینا ممکن نہیں۔ ماہرینِ تعلیم واقف ہیں کہ لفظ کو ہجّے کے ذریعے نہیں "شناخت" کے ذریعے سیکھا جاتا ہے۔ اس لیے موجودہ طریقِ تعلیم یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہجّے کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مختصر یہ کہ رسمِ خط میں معمولی تبدیلیاں تو ممکن ہیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی نسخہ تجویز کر دیا جائے اور راتوں رات اسے شرفِ قبولیت حاصل ہو جائے۔

دراصل اس طرح کی تجویزیں اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ اردو کی عدم مقبولیت کا سبب اس کے رسمِ خط کا مشکل ہونا ہے۔ آخر پہلے بھی یہی رسمِ خط تھا۔ دراصل تعلیم کی عدم سہولتیں اس کی ذمہ دار ہیں۔ یہ مسئلہ تو جب سے پیدا ہوا ہے جب سے حکومت نے اردو کو مدرسوں سے نکالا ہے۔ اگر حکومت اردو کے سلسلے میں ذرا بھی خلوص رکھتی ہے تو اس کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کر دے ـــ پھر دیکھیے یہی رسمِ خط چند کتنا حسین نظر آئے گا۔

ـــــ مجلسِ ادارت

آشفتہ چنگیزی
ریاض، سعودی عربیہ

غزلیں

دیوار و در کے بیچ سمندر بھی دیکھنا
اب کے برس جو آؤ یہ منظر بھی دیکھنا
کیا اور کھونا رہ گیا جو چاہتے ہیں ہم
اس روشنی کے پار اتر کر بھی دیکھنا
شہرِ گماں کی سرحدیں ملتی ہیں اس جگہ
اب جس سے بھی ملو اسے چھو کر بھی دیکھنا
رخ کب ہوا کا بدلے بھروسہ نہیں کوئی
مٹھی میں تھوڑی دھول اڑا کر بھی دیکھنا
باقی نہ اب کے کوئی بھی نام و نشاں رہے
اے سیلِ بے ثبات مرا گھر بھی دیکھنا
یہ سچ ہے کہ عمر بھر کا نبھانا محال ہے
ہاں تھوڑی دور ساتھ میں چل کر بھی دیکھنا

قلعۂ درد کے حکمراں کیا ہوئے
اے فلک صحرۂ بیکراں کیا ہوئے
باندھتے تھے جو سب سے امیدِ وفا
شہر ذی ہوش وہ خوش گماں کیا ہوئے
آج آنکھیں نمی کو ترستی ہیں کیوں
منھ چڑھاتے ہوئے بادباں کیا ہوئے
گنگناتے ہوئے کچے پکے بدن
آگ سے کھیلتے بے زباں کیا ہوئے
دھوپ میں سوکھتی گھر کی دھانی چھتیں
بارشوں میں ٹپکتے مکاں کیا ہوئے
ایک مدت سے کوئی خلش ہی نہیں
خوش لباں، گل رخاں، مہوشاں کیا ہوئے

پر سمیٹے دھوپ میں پھیلے ہوئے
شام کے سایوں کے قد لمبے ہوئے
پھر دھڑک اٹھے اندھیروں کے بدن
ڈر رہے ہیں آج گھر جاتے ہوئے
وہ افق کے اس طرف اٹھتا دھواں
سارے دریا بے سبب بہتے ہوئے
رات بھر جنگیں لڑیں خوابوں کے ساتھ
سو گئے آخر رجز پڑھتے ہوئے
ساتھ کے سارے مسافر کھو گئے
دور تک ہیں راستے بکھرے ہوئے
آسماں پر بادلوں کی ٹولیاں
شہر والے خوف سے سہمے ہوئے

ڈاکٹر قمر رئیس

اشک کے افسانے

اس صدی کی تیسری دہائی میں اردو کے جن ادیبوں نے افسانہ کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور جو آج بھی بقید حیات ہیں۔ وہ ہیں۔ اپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری اور پروفیسر مجیب صاحب۔ مجیب صاحب ۱۹۳۲ء میں افسانوں کا صرف ایک مجموعہ دے کر تاریخ اور ڈرامہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حیات اللہ انصاری کی تخلیقی صلاحیتوں کو ان کی دوسری سرگرمیوں نے دبا لیا (اگرچہ 'لہو کا پھول' ناول لکھ کر انھوں نے اس کی کچھ ضرور تلافی کی ہے۔) اپندر ناتھ اشک جو گذشتہ دسمبر میں ستّر سال کی عمر پوری کر چکے ہیں۔ کم و بیش گذشتہ پچپن سال سے پورے انہماک، شوق اور لگن سے لکھ رہے ہیں۔ اور آج بھی ان کے قلم میں روانی اور ذہن میں جولانی ہے۔ لکھنا پڑھنا ان کا مشغلہ بھی ہے اور پیشہ بھی، عبادت بھی اور مغفرت بھی۔ گذشتہ چند برسوں میں مجھے ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے محسوس ہوا کہ ان کے یہاں بچوں جیسی انرجی اور جوانوں جیسی بے چینی تو ہے، بوڑھوں جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کی جوشیلی باتیں اور لذت آفریں حکائتیں سن کر کبھی مجھے لگا جیسے میں ان سے کچھ بڑا ہوں، بزرگ ہوں۔ شاید یہ اس لئے کہ بچپن سے اب تک زندگی کے جن اکھاڑوں میں انھوں نے کشتیاں لڑی ہیں، جس سرد و گرم سے گذرے ہیں، جن کوچوں کی خاک اڑائی، جن گھاٹوں کا پانی پیا ہے، آج کے بہت سے بانکے ترچھے ادیب بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کے معرکوں میں انھوں نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ چنوتیوں کے سامنے ہار نہیں مانی۔ الجھنوں اور صعوبتوں میں گھبرائے نہیں۔ ہر آزمائش میں انھوں نے اپنی آن، اپنے بانکپن اور اپنی بے چینیوں کو زندہ رکھا ہے کہ یہی ان کے طویل تخلیقی سفر کا زادِ راہ تھا۔ ان کے افسانے، ڈرامے اور ناول ان کے اس سفر میں بے شمار منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پریم چند کی طرح اشک صاحب نے بھی اردو سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

ان کا ذہن اور ذوق اردو کے ماحول میں رچ بس چکا تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ پریم چند کی طرح ہندی میں بھی لکھنے لگے۔ میرے خیال میں تین طرح کی ترغیبات نے ان ادیبوں کو ہندی کی طرف مائل کیا۔ اول یہ کہ ہندی میڈیم سے وہ اپنے خیالات زیادہ وسیع حلقے تک پہنچا سکتے تھے۔ دوئم یہ کہ ہندی ناشرین نسبتاً زیادہ معاوضہ دیتے اور کتاب زیادہ آسانی سے شایع کر دیتے تھے اور سوئم یہ کہ ہندی میں وہ زیادہ آسانی سے اپنے تخلیقی جوہر کی دھاک بٹھا سکتے تھے۔

بظاہر اس میں اردو والوں کے لئے ملول ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اردو کا کوئی ادیب انگریزی، مراٹھی کسی زبان میں لکھے اس سے اردو ہی کا سر اونچا ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے اردو کے قارئین کو نظر انداز نہ کرے۔ لیکن ان دو ادیبوں کے معاملوں میں ہوا یہ ہے کہ ہندی کی ترغیبات زیادہ قوی ہوتی گئیں اور ایسے وقفے بھی آئے جب وہ اردو کی طرف سے بے نیاز ہو گئے۔ اور اس کے نتیجے میں اردو کے ناشرین بھی ان سے کچھ بے رخی برتنے لگے۔ تاہم بڑی بات یہ ہے کہ دونوں ادیبوں کے دل میں اپنے اظہار کی ادبی زبان اردو میں لکھنے کی تڑپ زندہ رہی اور انھوں نے اپنے بعض شاہکار ناول اور افسانے اردو ہی میں لکھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اردو میں ان کی اشاعت ہندی کے بعد ہوئی۔

آزادی سے پہلے اشک صاحب کی کہانیوں کے کئی مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کی صف میں اپنے لئے ایک منفرد جگہ بنائی تھی۔ میری دانست میں ان کے اس عہد کے نمائندہ مجموعے "ڈاچی" اور "کونپل" ہیں۔ ان مجموعوں میں ۱۹۲۸ء سے کم و بیش ۱۹۳۸ء تک کی کہانیاں شامل ہیں۔

اس عہد میں دنیا ایک بڑے اقتصادی بحران سے گذر رہی تھی اور فاشزم کا دیو استبداد اپنے دانت تیز کر رہا تھا۔ ہندوستان کے اقتصادی اور سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا۔ زرعی اجناس کی ارزانی اور سرد بازاری سے کسانوں کی حالت تباہ تھی۔ ستیہ گرہ، بائیکاٹ، اور لگان بندی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ انقلابی وطن پرستیوں کی خفیہ تحریک نے بھی سامراجی حکومت کے ایوانوں میں لرزہ پیدا کر دیا تھا۔ آزادی کی اس لڑائی میں آگے بڑھ کر قربانیاں دینے والے عوام کو یہ احساس اب شدت سے ہونے لگا تھا کہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں، ساہوکاروں اور بیوپاریوں کی اکثریت برطانوی راج کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ کھلے ہوئے غریب انسانوں کی محنت کا استحصال کرنے میں حکومت ان کی پشت پناہی کرتی ہے۔ اس طبقاتی بیداری نے عوامی

تحریکوں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اشک صاحب کی اس دور کی کہانیوں میں یہ روح عصر زندہ اور تابناک صورت میں ملتی ہے۔ ان کی ساری ہمدردی کسانوں اور ستم نصیب انسانوں کے ساتھ ہے۔ ان کی ازلی محرومیوں اور اتھاہ دکھوں کی داستان اشک صاحب نے اپنی شاہکار کہانی "ڈاچی" میں ایسی مہارت اور ایک ایسے احساس دردمندی سے بیان کی ہے جس کی مثال اس دور کی کہانیوں میں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ "لیڈر" احساس فرض' '۴۲۴' اور 'سیلاب' جیسی کہانیوں میں بھی ان کے سیاسی اور طبقاتی شعور کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

ان کہانیوں کی بیانیہ ٹکنیک، نثری اسلوب اور موضوع کے تئیں فنی رویّوں میں پریم چند کی بے مثل سادگی کے اثرات نمایاں ہیں۔ تاہم یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اشک صاحب نے پریم چند کی فنی حسّیت کے جذباتی پہلوؤں اور خاص طور پر ان کی تصور پرستی سے شعوری طور پر دامن بچانے کی کوشش کی ہے وہ فن کے جدید تقاضوں پر نظر رکھتے ہیں اور ان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے جس خلوص، انہماک اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے بھی وہ بہرہ ور ہیں۔

۱۹۳۹ء کے بعد ان کی تصنیفی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دور میں وہ داخلی اور خارجی طور پر جن حالات اور حوادث سے دوچار ہوئے انھیں وہ اپنی خودآگہی کے سہارے فکر و اظہار کی نئی راہوں کے متلاشی ہیں۔ ایک موقع پر اشک صاحب نے کہا ہے کہ:

> "۱۹۳۶ء میں میری پہلی بیوی کی موت کے بعد جب زندگی کی کئی کڑی حقیقتیں میرے سامنے آئیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ حقیقت نہیں۔ اس حادثے کے بعد زندگی کے متعلق میرا نقطۂ نظر یکسر بدل گیا اور ایک نئی نگاہ مجھے حاصل ہوئی"۔ (جان پہچان۔ ص ۳۶)

اس "نگاہ" نے انھیں انسانی وجود کی داخلی حقیقتوں کے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ اس حادثہ نے انھیں جس تنہائی اور احساس زیاں سے دوچار کیا اس سے انھیں محسوس ہوا کہ وہ زندگی جو انسان اپنے اندر بسر کرتا ہے زیادہ دوررس اور معنی خیز ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس دور میں ترقی پسند تحریک نے سماجی حقیقتوں کے مادّی اور معروضی شعور و ادراک پر زور دیا ہے۔ اور بتایا کہ اصل حقیقت وہ نہیں جو انسانی اعمال اور رشتوں میں نظر آتی ہے یہ تو اس کا ظاہری روپ ہے۔ اصل حقیقت تو وہ تاریخی قوتیں ہیں جو زندگی کو متحرک اور متلاطم رکھتی ہیں۔ وہ طبقاتی آویزشیں ہیں

جو ایک ہی معاشرہ میں سماجی اور اخلاقی قدروں کی میزان الگ الگ کر دیتی ہیں اور جن سے سماج میں بے رحمانہ اونچ نیچ تشدد اور استحصال کی قوتیں غذا حاصل کرتی ہیں۔ زندگی کے بارے میں بظاہر یہ دو متضاد رویے تھے۔ واقعہ نگاری کے تخلیقی عمل میں اس تضاد کو مٹانا گویا افسانہ کو ایک نئے جمالیاتی ذائقہ سے آشنا کرنا تھا۔ اشک صاحب نے متعدد کہانیوں میں یہی کارنامہ سر انجام دیا ہے۔

اس عہد میں اشک صاحب کے معاصرین میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے نام نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں بیدی کے علاوہ ہر افسانہ نگار کے یہاں رومانیت کی ایک لہر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ رومانیت کہیں موضوع کے انتخاب میں، کہیں اس کو برتنے میں، کہیں اظہار و بیان کی رنگینی میں اور کہیں کرداروں کے جذباتی وفور کو ابھارنے میں دکھائی دیتی ہے۔ بیدی پر چیخوف کی گرفت شروع سے مضبوط تھی، اس لئے وہ اپنی دردمندی کی دھیمی دھیمی آنچ سے کہانی کو اسی نزاکت سے ڈھالتے رہے، جیسے شیشہ گر آنچ کو دم دیکر بلور کے ظروف ڈھالتے ہیں۔ اشک صاحب کے ابتدائی دور کے افسانوں میں تخیلی اور رومانی طرز فکر کی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں، لیکن نہ تو وہ کرشن چندر کی طرح تخیل کی رنگینی میں بسے اور نہ بیدی کی طرح کہانی کے تانے بانے کو کسنے میں الجھے۔ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں میں ایسی سچائیوں کو تلاش کر رہے تھے جو اگر دوام نہیں تو کچھ ثبات ضرور رکھتی ہوں۔ جو انسان کو انسان سے جوڑتی ہیں۔ اس لئے اب ان کی نظر ظاہری واقعات سے گذر کر ان مادی عوامل اور نفسیاتی حقیقتوں تک پہنچنے لگی، جو انسان کے کردار و عمل پر دور رس اثرات ڈالتی ہیں انسان کے اندر کی آویزشیں اور پیچیدگیاں اب ان کی کہانیوں کو زیادہ تہ دار بنانے لگیں۔ اس نئی واقعیت پسندی نے ان کے فن کو گہرائی ہی نہیں۔ تازگی سے بھی ہم کنار کیا ــــ 'چٹان'، 'ناسور'، 'یہ۔ انسان' ! 'ٹیبل لینڈ'۔ اور 'بچے' اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان افسانوں کے بظاہر سیدھے سادے کردار اپنے آپ میں پر اسرار حد تک پیچیدہ اور پہلو دار ہیں ــــ چٹان کا شنکر، ناسور کا ایشور، اور 'یہ۔ انسان' کا پرسرام اپنی اپنی تنہائیوں کی قید میں جیتے ہیں۔ تہذیب، اخلاق اور انسانیت کے بلند آدرش انھیں عزیز ہیں، لیکن ان کے طبیعی وجود میں جو خواہشیں انگڑائیاں لے کر انھیں بے چین رکھتی ہیں، ان کی سچائی سے بھی وہ فرار حاصل نہیں کر پاتے۔ نتیجہ میں ان کے اندر ایک سنگھرش سا رہتا ہے۔ اشک صاحب کا یہ

انسان، پریم چند کے انسان کے مقابلے میں، زیادہ مکمل، زیادہ فطری اور بشری (human) اس لئے ہے کہ وہ اپنی جبلی خواہشوں کو حقارت سے نہیں دیکھتا اور ان کے ساتھ جینے کو بھی زندگی سمجھتا ہے۔

نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے اشک صاحب کی کہانی 'بچے' ان کی شاہکار کہانیوں میں سے ایک ہے۔

کہانی میں مسٹر کولارکر کا کردار دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ وہ اعلیٰ سرکاری افسر ہیں۔ بمبئی کی شامیں وہ کلب میں گذارتے ہیں، لیکن جب وہ دق کے عارضے کے سلسلے میں پنچ گنی میں بدلی کروا لیتے ہیں۔ جہاں نہ وہ حشر ساماں زندگی ہے، نہ وہ کلب اور نہ احباب، تو زندگی میں انھیں زبردست خلا اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ اب انھیں اپنی بیوی کی اہمیت محسوس ہوتی اور شام کو وہ اس کے ساتھ تاش اور سوپ کھیلنے میں وقت گذارنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا کمسن بچہ بار بار ان کے ساتھ تاش کھیلنا چاہتا ہے۔ ہار کر وہ اسے تاش کی گڈی تھما دیتے کہ جا ادھر بیٹھ کر کھیل ڈرافٹ کا بورڈ نکال کر بیوی کے ساتھ ڈرافٹ کھیلنے لگتے ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح کھیل شروع بھی نہیں کر پائے کہ بچہ تاش وہیں چھوڑ کر آجاتا ہے اور ڈرافٹ کی گوٹیوں کے لئے ضد کرنے لگتا ہے۔ جھنجھلا کر وہ اسے پیٹ دیتے ہیں اور بساط الٹ کر بستر پر جا پڑتے ہیں۔

ان کی بیوی روتے اور سسکیاں بھرتے بچے کو بڑی مشکل سے چپ کراتی ہے۔ اور بڑے پیار سے تھپک کر سلاتی ہے۔ اسے احساس ہے کہ اس کا شوہر بھی سویا نہیں اور بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہے۔ وہ اس کے پاس جاکر اسے تسلی دیتی ہے کہ بچے کو کبھی کبھار پیٹنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ اس کے دل میں کسی کا ڈر تو رہے .... اس کے باوجود مسٹر کولارکر کی بے چینی کم نہیں ہوتی۔ انھیں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ انھوں نے بچے کو بے کار پیٹ دیا۔ کہانی کے یہ آخری جملے دیکھئے:

"ایک گھنٹے بعد ان کی بیوی پھر ان کے کمرے میں آئی۔"

"سوئے نہیں کیا ؟"

کولارکر اچانک ہنس دیئے۔ "نیند نہیں آرہی۔"

"آپ تو ننھے سے بھی بڑھ گئے۔" وہ ان کے سرہانے آبیٹھی اور بڑے پیار سے ان کا سر دباتے ہوئے بولی۔ "اسے تو کچھ یاد بھی نہ رہے گا۔ دیکھ لیجئے گا۔ صبح اٹھتے ہی آپ کو گڈمارننگ بلائے گا۔ اور اب تنگ بھی نہ کرے گا۔ کبھی کبھی دو چار طمانچے لگانے میں کوئی حرج نہیں۔" اور اس طرح تسلی دیتے ہوئے

وہ ان کی کنپٹیاں سہلانے لگی۔ کننا کر مسٹر کولار کرنے سر اپنی بیوی کی گود میں رکھ دیا۔ دس منٹ بعد وہ خراٹے لینے لگے۔

آہستہ سے ان کی بیوی نے مسٹر کولارکر کا سر پھر تکیے پر ٹکا دیا۔ کسی طرح کی آواز کئے بغیر بستر سے اتری لمحہ بھر کے لئے انھیں سوئے دیکھتی رہی۔ پھر دوسرے کمرے میں جاکر اس نے بے ساختہ اپنے سوئے ہوئے بچے کو چوم لیا۔"

اپنے بچے کو چوم لیا جبکہ وہ اپنے شوہر کو بلاکر اسے چوم لینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے جاگ اٹھنے کا ڈر تھا۔ اس لئے اس کی بجائے وہ جاکر اپنے بچے کو چوم لیتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت وہ بیوی نہیں رہتی ـــــــ ماں بن جاتی ہے، اپنے بچے کے لئے بھی اور بچے کے باپ کے لئے بھی!

ایسی متعدد کہانیوں کی دھیمی دھیمی فضا اور انسان کے بے نام جذبات کی ترجمانی چیخوف کے افسانوں کی یاد دلاتی ہے۔

فکر ونظر کی یہی گہرائی اشک صاحب کی ان کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ جن کا موضوع نادار اور دبے کچلے طبقے کی پر عذاب زندگی ہے۔ وہ چند تفصیلات سے ایسے ماحول کی تخلیق کرتے ہیں، جن میں غریب اور مجبور انسان اپنی محرومیوں اور شکستوں، ذلتوں اور تنہائیوں کے آئینہ میں مٹی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹتے اور پامال ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ جو مہذب زندگی کی ساری آسائشوں اور نعمتوں سے ازلی طور پر محروم ہیں۔ جو حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گذارتے ہیں ـــــ ' کاکڑاں کا تیلی'، 'پیستن کی ماں'، 'بینگن کا پودہ' اور 'ابالی' ایسی ہی جاندار کہانیاں ہیں۔ فیض احمد فیض نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا ہے:

> " ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا تاثر تمام تر کہانی کے ایکشن یا واقعاتی عمل کی پیداوار ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کے کردار بہت ہی زندہ اور واضح ہونے کے باوجود انفرادی نہیں اجتماعی ہیں۔ جن کی زندگیاں ان کے طبقوں کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ گاؤں کی مفلس اور مجبور زندگی کی انتہاء مجبوری اور دکھ کو واضح کرنے کے لئے اشک نے ہلکے طنز اور سیدھی ساری واقعہ نگاری کے علاوہ اور کسی چیز سے کام نہیں لیا۔"

فیض نے یہاں کسی طرح کے مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ ترقی پسند اور اردو کے بعض دوسرے

ـــہ یہ افسانے اشک کی کہانیوں کے مجموعہ، "چٹان" (مکتبہ اردو لاہور) میں شامل ہیں۔

ناقدین نے بھی اشک صاحب کی واقعہ نگاری اور اس کی تہ داری کو سراہا ہے۔ وہ کہانی کی تکنیک کو پیچیدہ بنائے بغیر اپنے کرداروں کے منفرد خط و خال اور ان کے روحانی وجود کو اس طرح بے نقاب کر دیتے ہیں کہ قاری ان سے ایک احساس یگانگت کے ساتھ وابستہ ہوکر اپنے آپ کو ان کے دکھ درد میں شریک پاتا ہے۔ وہ سیدھی سادی انسانی واردات کے بیان میں بھی ڈرامائی حسن پیدا کر دیتے ہیں اور واقعاتی ماحول کو تحیر زار کیفیت سے معمور کر دیتے ہیں۔

آج جب اردو افسانہ سماجی واقعیت اور افسانویت کے احساس سے عاری ہوکر تمام قارئین میں نامقبول ہوتا جارہا ہے۔ اور بعض حلقوں میں کہا جارہا ہے کہ آج کا افسانہ زوال کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کی ضرورت ہے کہ اردو افسانہ کے معماروں کی خوبصورت اور شاہکار کہانیاں شایع کی جائیں تاکہ نئی پیڑھی کے سنجیدہ قارئین ان فنی بلندیوں کا اندازہ لگا سکیں، جہاں آزادی سے قبل کے تخلیق کاروں نے اسے پہنچایا تھا۔ اشک صاحب جلد ہی اپنے غیر مطبوعہ افسانے اردو میں شایع کرنے جارہے ہیں۔ یہ اردو ادب کے لئے نیک فال ہے۔

امید ہے کہ اشک صاحب کے ڈراموں اور افسانوں کے بعد ان کا عہد آفریں ناول 'گرتی دیواریں' (جو دراصل انھوں نے اردو میں ہی لکھا تھا) عنقریب اردو میں شایع ہوگا۔ اور اس طرح اردو کے قارئین اور نئی پود کے قارئین اپنے ایک کھوئے ہوئے ادیب کے تخلیقی جوہر کو نئے سرے سے دریافت کریں گے۔ ☐

کرشن چندر

ضدی

کرشن چندر مرحوم نے یہ مضمون آج سے پورے بیس برس پہلے اشک جی کی ۵۰ ویں سالگرہ کے موقعے پر لکھا تھا۔ یہ پہلی بار اردو میں شائع ہو رہا ہے۔ آج اشک ۷۰ کے ہو گئے ہیں، لیکن اس مضمون میں ایسا کچھ بھی تو نہیں جو بدلا جا سکے (ادارہ)

اشک سے میری ملاقات لاہور میں ایک عجیب طریقے سے ہوئی۔ میں ان دنوں لا کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور فائنل کی تیاری کر رہا تھا۔ میں، مہندر اور کنھیا لال کپور ہم تینوں کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ موخرالذکر دونوں اصحاب نے ابھی اردو میں لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور ادب کے میدان میں ابھی میں خود بھی نووارد تھا پھر بھی چند چیزیں قلم سے نکل چکی تھیں جنھیں ارباب ذوق نے پسند کیا تھا۔ ان دنوں طبیعت میں جھجھک زیادہ تھی۔ ایڈیٹروں سے بہت ڈرتا تھا اور اسی گھبراہٹ اور پریشانی کو چھپانے کے لئے ایڈیٹروں سے دور بھاگتا تھا۔ طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی چیز لکھ دی تو اُسے بذریعہ ڈاک کسی رسالے کے ایڈیٹر کو لاہور ہی میں بھیج دیا اور جب وہ چیز چھپ گئی تو اسے پڑھ کر خوش ہو لئے۔ اپنے افسانوں کے بارے میں ایسی راز داری سے کام لیتا تھا گویا کسی جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

ان دنوں میں ہندو ہوسٹل میں مقیم تھا۔ یہ ہوسٹل یونیورسٹی کے ضابطے سے باہر تھا۔ لہذا اس میں طلباء کی رہائش خلاف قانون سمجھی جاتی تھی۔ یہ کم سے کم اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی لیکن اپنا واسطہ زیادہ تر باغیانہ خیالات رکھنے والے طلباء سے رہتا تھا۔ ان کی ایک کیفر

تعداد اس ہوسٹل میں رہتی تھی لہٰذا میں نے اس ہوسٹل کو ترجیح دی۔ اس ہوسٹل میں ان دنوں مختلف کالجوں کے خطرناک سیاسی یا سماجی طور پر مشتبہ لوگ رہتے تھے جن کا مطالعہ میرے لئے بیحد دلچسپی کا باعث ہوتا تھا۔ ان دنوں میں نے اس ہوسٹل کے پس منظر کو لے کر ایک ڈراما لکھا تھا، جو غالباً 'ہمایوں' (لاہور) میں شائع ہوا تھا اور اس ڈرامہ میں میں نے ہندو ہوسٹل کا نام اور ایک کمرے کا نمبر تک دے دیا تھا جس میں ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ وہ ڈرامہ ہمایوں میں چھپ گیا اور ہم نے پڑھ لیا اور اپنا نام رسالے میں دیکھ کر خوش ہو لئے۔

اس ڈرامے کے چھپنے کے تین یا چار دن بعد میں اپنے کمرے کے سامنے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا شیو کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک صاحب دُبلے پتلے' لانبے سانولے' ایک چھوٹی سی نیکر اور قمیص پہنے ہوئے' پاؤں میں چپل اور منہ میں داتن لئے چلے آرہے ہیں اور ذرا ذرا سے وقفے کے بعد کمروں کے نمبر پڑھتے ہیں اور آگے چل دیتے ہیں۔ پھر وہ یکایک میرے کمرے کے سامنے آکر رُک گئے۔ کمرے کا نمبر پڑھا، مجھے دیکھا اور بولے۔

"کیوں جی؟ کیا آپ ہی کا نام کرشن چندر ہے؟"

میں نے شیو روک کر سیدھا ہو کر کہا: "جی ہاں!"

یہ سنتے ہی وہ اجنبی اس زور سے قہقہہ مار کر ہنسا کہ آس پاس کے کمروں سے چند طالب علم باہر نکل آئے۔ قہقہہ مارنے کے بعد ان حضرت نے میری ران پر ایک زور کا ہاتھ مارا اور بولے۔ "دیکھا پٹھے! کیسا پہچانا؟ اور اس کے بعد میرے قریب کی ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر بولے: "میرا نام اوپیندر ناتھ اشک ہے!"

چند لمحے تو میں حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے اشک کو دیکھتا رہا۔ کیونکہ اشک؟ بہت پہلے لکھنا شروع کر چکے تھے اور مقبولیت کے مدارج طے کر کے افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں آچکے تھے۔ ان دنوں سدرشن جی لاہور سے افسانوی ادب کا ایک بہت عمدہ رسالہ "چندن" شائع کرتے تھے اس میں اشک کی کہانیاں اکثر شائع ہوتی تھیں۔ اس ملاقات سے ڈیڑھ سال قبل صبح مجھے لا کالج کے دروازے ہی پر میرے کسی دوست نے ایک انتہائی خوش لباس طالب علم کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا: "وہ ہیں مسٹر اوپیندر ناتھ اشک! یہ ان دنوں لاء کر رہے ہیں۔" میں اُن دنوں فورمین کرسچین کالج میں پڑھتا تھا اور ابھی صرف اپنے کالج کے میگزین میں لکھتا تھا۔ لہٰذا میں اتنے بڑے ادیب کو دور سے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

جب میں نے اشک کو یہ واقعہ سنایا تو وہ اور زور زور سے ہنسا، اتنے زور سے ہنسا کہ ہندو ہوسٹل کی دیواریں لرز گئیں۔ اس میں ہنسی کی کوئی بات نہ تھی۔ مگر اشک اس وقت دراصل اس بات سے بے حد محظوظ ہو رہا تھا کہ اس نے میری جائے پناہ کیسے ڈھونڈھ نکالی تھی۔

جانتے ہو اتنا بڑا لاہور کا شہر ہے۔ پر میں نے تم کو ڈھونڈھ نکالا۔ جانتے ہو کیسے؟ یہ کہہ کر اس نے اب دوسری ران کو اس زور سے بجایا کہ میں نے فوراً تڑپ کر کہا "کیسے؟" —

"'ہمایوں' میں تمھارا ڈراما پڑھا تھا۔ اس میں ہندو ہوسٹل کا ذکر تھا اور کمرہ نمبر ۴۴ کا پس منظر تھا۔ بس میں نے سوچا ہو نہ ہو میرا یار اس میں رہتا ہے۔ آج صبح ہی صبح میں داتن کرتا ہوا جو نیلے گنبد سے چلا تو سوچا تمھیں دیکھتا چلوں۔ دو چار چیزیں تمھاری اب تک پڑھ چکا ہوں۔ بہت عمدہ لکھتے ہو اور بہت ترقی کرو گے اور بہت دم ہے تمھارے اسٹائل میں اور وہ جو کہا ہے کسی نے کہ 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' تو وہ بات ہے تم میں۔ مگر یہ تم کیا کرتے ہو کہ اپنے افسانوں کا معاوضہ نہیں لیتے۔ یہ بہت بُری بات ہے اور اس سے بُری بات کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک انسان اپنے کام کا معاوضہ نہ طلب کرے۔ چاہے چار لو چاہے پانچ لو مگر اپنے افسانوں کا معاوضہ ضرور طلب کرو۔ تم ان پبلشروں کو نہیں جانتے ہو۔ خون پیتے ہیں خون غریب ادیبوں کا! مگر ہم سب کو مل کر ان پبلشروں سے معاوضہ طلب کرنا چاہیے... باتھ روم کدھر ہے؟ میں تھوکنا چاہتا ہوں... داتن سے منہ بہت صاف ہوتا ہے۔ دانت بھی بہت مضبوط ہوتے ہیں.... مگر تم مجھے ایسے آدمی معلوم ہوتے ہو جو داتن کی بجائے ٹوتھ برش استعمال کرتے ہو گے۔ ہے نا؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے میری پیٹھ پر زور کا ہاتھ دیا اور اس سے بھی زور کا قہقہہ مارا۔

"ہا ہا ہا.... دیکھا، کیسے تمھیں جانے پہچانے بغیر تمھارے مزاج سے واقف ہو گیا ہوں!"

اشک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا جس ادیب میں یہ بات نہیں ہے، وہ ادیب نہیں ہے گھسیارا ہے گھسیارا!

انھیں بے تکان باتوں سے اشک نے بہت جلد میری اجنبیت، ڈر اور وحشت دور کر دی اور بہت جلد ہم دونوں گھل مل گئے۔ وہ کھلتے گئے اور میں ملتا گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد ایسا محسوس ہوا، جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں اور یہ تو اشک سے جو کوئی بھی ملے گا، اقرار کرے گا کہ اشک کے مزاج میں بیکار کی صاحبیت اور فرعونیت نہیں ہے،

جو اکثر ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔ اکثر ادیب اپنے آپ کو اس طرح لئے دیئے رہتے ہیں کہ ان کی گفتار میں کردار میں حتیٰ کہ چلنے تک کے انداز میں ایسی کیفیت ہوتی ہے جس پر گمان ہو کہ گویا ساری کائنات صرف اسی ادیب کے سہارے چل رہی ہے اور اگر یہ ادیب خدا نخواستہ سوچنا یا لکھنا بند کر دے تو زمین کی گردش رُک جائے گی یا چرخِ نیلی فام دھڑام سے زمین پر گر پڑیگا۔ اشک ایسے ادیبوں کو بجید بناتے ہیں اور مزے لے لے کر محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ سنجیدہ اور متین پھبتی بازی اور لطیفہ گوئی میں راجندر سنگھ بیدی کا کوئی جواب نہیں ہے لیکن عملی مذاق میں اشک کا کوئی مثل نہیں ہے۔ اگر وہ کسی فرعون مزاج ادیب کو بنانے میں شروع میں کامیاب نہ ہوں تو اور بھی زیادہ مستقل مزاجی سے اسے بنانے پر تل جائیں گے اور ایک کوشش کے بعد دوسری اس سے بھی شاندار کوشش کریں گے۔ ادیبوں کی ایک محفل بلا لیں گے۔ اپنے خرچ پر چائے پانی کا انتظام کریں گے اور ایک جعلی طنز یہ ایڈریس اس کی خدمت میں پیش کر دیں گے دو چار سو روپئے اپنے پاس سے خرچ کر دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے، جب تک اچھی طرح سے اس کی ٹانگ نہ کھینچ لیں۔ اشک کی باغ و بہار طبیعت کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس سے اکثر ادیب ان سے خائف رہتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ان کے مزاج کی ایک ضدی کیفیت یہ بھی ہے کہ وہ جس محفل میں بھی بیٹھے ہوں اپنی نشانی وہی اچھی طرح کرائے بغیر چین نہ لیں گے۔ میں سمجھتا ہوں زندگی میں ہر شخص ہر لحظہ اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے۔ اپنی زندگی اس کی افادیت اور اہمیت پر ہر لحظہ مصروف ہے۔ یہ زندگی اور اس کی چاہت ہے جو شاید اس سے ایسا کراتی ہے۔ مگر ہر انسان اس کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ اشک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی محفل میں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر ادبی محفل نہیں ہے اور اُردو ادب کے ذکر سے کام نہیں چل سکتا تو لطیفہ گوئی ہی پر اُتر آئیں گے۔ اس سے بھی کام نہ بنا تو دو آدمیوں کو لڑوا دیں گے اس سے کام نہ بنا تو بھری محفل میں اُٹھ کر بلا مطلب ایک زوردار قہقہہ لگا دیں گے، مقصد یہ ہوتا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی نشانی وہی ہو جائے۔ اس کے لئے مختلف ادیب اظہار کے مختلف طریقے ڈھونڈھتے ہیں۔ میں اکثر ایسی محفلوں میں نہایت سنجیدہ اور خبیث صورت بنا کر بیٹھ جاتا ہوں تاکہ اگر ادبیت کا نہیں تو صورت ہی کا رعب پڑے۔ بہت طنز آمیز، ہولے ہولے طنز آمیز، پھبتیاں کسے جاتے ہیں بنتو سیدھے سدھے گالیوں پر اُتر آتے تھے جمعت اور

عباس اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کوئی بحث چھڑے اور وہ مخالفت کریں۔ مہندر ناتھ شانے ہلا کر ہاتھاپائی پر اتر آتے ہیں۔ جاں نثار اختر اور محمد حسن عسکری ایسی عجیب صورت بنا کر بیٹھیں گے اس طرح کان لپیٹے، آنکھ موندے، کندھے جھکائے آپ کے سامنے زانوئے ادب تہ کریں گے اور بیچ بیچ میں نہایت مسکین لہجے میں "جی ہاں! بلاشبہ! بجا ارشاد فرمایا آپ نے" کہتے جائیں گے کہ آپ کو اپنی ہمہ دانی میں کوئی شبہ نہ رہے گا۔ بعد میں ان لوگوں کے تبصرے سے معلوم ہوگا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ساحر لدھیانوی محفل کے سب سے آخر میں اپنے دو چار مصاحبوں کو لے کر بیٹھیں گے، سردار جعفری سب سے آگے آ کے بیٹھیں گے اور سگریٹ سلگاتے مسکراتے چاروں طرف اس طرح دیکھیں گے گویا کہہ رہے ہوں۔ دیکھو تو آ گیا پہلوان اکھاڑے میں!! غرضیکہ ہر ادیب مجلس میں اپنی شخصیت کے اظہار کا ایک طریقہ رکھتا ہے اور اسے سلیقے سے برتنا جانتا ہے مگر کبھی کبھی اس کے اظہار میں اس وقت جھگڑا ہو جاتا ہے جب دونوں ادیبوں کے طریقہ کار یکساں ہوں۔ مثلاً منٹو کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ جس محفل میں بیٹھے سب سے اونچی جگہ پر نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہاں نہیں ہو سکتا تھا تو کرسی پر پاؤں اٹھا کر اکڑوں ہو کر غسل خانے کا پوز لے کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر اپنے تیز اور امرتسری لہجے میں باری باری سب کو ملاحیاں سناتا تھا۔ اشک کا لہجہ منٹو سے بھی تیکھا ہے اس لئے جس محفل میں یہ دونوں اکٹھے ہو جاتے تو چنگاریاں اڑتی تھیں۔

اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اشک کا مزاج ہر وقت برہم رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ بالعموم وہ اپنی زندگی میں نرم روی اور نرم کلامی کے عادی ہیں۔ انھیں صرف اس وقت غصہ آتا ہے جب وہ دیکھیں لیں کہ کوئی آدمی یا ادیبوں کا کوئی گروہ ان کی کاٹ پر آمادہ ہے یا ان کی حیثیت نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر وہ اپنی ضد پر اتر آتے ہیں اور اس فرد یا افراد سے پورا پورا انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔ جب تک وہ مخالف کو جھکا نہ لیں، اس سے اپنی بات منوا نہ لیں اس وقت تک وہ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی کھانا پینا حرام کر دیں گے۔ اگر نیت نیک ہے تو اپنے لئے بڑے سے بڑا مذاق برداشت کر لیں گے لیکن بدنیت مخالف کا ایک چبھتا ہوا جملہ معاف نہیں کریں گے اور جب تک اس کی طبیعت اچھی طرح صاف نہ کر لیں انھیں چین نہیں آئے گا۔

میں نے ایسا ضدی، مستقل مزاج اور دھن کا پکا ادیب بہت کم دیکھا ہے۔ جب اشک نے لکھنا شروع کیا اس وقت ادیبوں کے حالات قطعاً سازگار نہ تھے۔ وہ تو آج بھی نہیں ہیں، لیکن ان دنوں کی جدوجہد بہت ہی شدید تھی مگر اشک نے حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے نوکری کی نہ وکالت کی، بلکہ صرف ادب ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اس دھن میں انھیں ٹی۔بی ہو گئی۔ ان دنوں تپِ دق کا کوئی شافی علاج ہی موجود نہ تھا، مگر اشک حالات سے نہیں بھاگے نہ انھوں نے اپنی جدوجہد ترک کی، نہ تپِ دق کے آگے گھٹنے ٹیکے۔ مالی بدحالی اور انتہائی کمزور صحت کے باوجود وہ دانت پیس کر کہتے تھے، تم دیکھ لینا میں اس مرض کو بھی شکست دے دوں گا۔ برہمن کا بچہ ہوں چانکیہ کی اولاد ہوں میں۔ میں اس ٹی۔بی کا تیا پانچہ کر دوں گا۔ مجھے مارنا آسان نہیں ہے۔" آج سے بیس برس پہلے جب انھوں نے پہلے پہل ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا تو کسی نے انھیں طعنہ دیا تھا "آپ اُردو کے اچھے ادیب ہیں مگر ہندی کے ادیب نہیں بن سکتے۔" بس اس بات پر غصہ آگیا اور بلا تکان اس وقت سے ہندی میں لکھنے لگے اور اتنا اتنا لکھا کہ یاروں کو ان کی حیثیت تسلیم کرنی پڑی۔ کسی نے کہا کہ "آپ اچھے ڈراما نگار نہیں بن سکتے، تو بس پھر ڈرامے پر ڈرامے لکھتے چلے گئے۔" انھوں نے پہلا ناول "ستاروں کا کھیل" لکھا کسی نے کہہ دیا "یہ کیا ناول ہے؟ اس میں زندگی نہیں۔ ناول وہ جو ضخیم ہو اور زندگی سے بھرپور ہو۔" بس پھر آپ نے قسم کھالی کہ ضخیم ناول لکھیں گے جسے سبھی مانیں اور تب سے اب تک اسی ضخیم ناول کے پیچھے پڑ گئے[1]۔ ایک بار ٹیکسٹ بک لکھنے کا ارادہ کیا مگر یاروں نے مل ملا کر ٹیکسٹ بک کمیٹی سے ان کا پتّہ کاٹ دیا۔ اس پر اشک ایسے بھڑکے ایسے خفا ہوئے کہ جب تک چھ صوبوں میں اپنی کتابیں بطور ٹیکسٹ منظور نہ کرا لیں انھیں چین نہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ صرف طعنوں پر جیتے ہیں۔ اگر یار لوگ انھیں طعنے دے دے کر ان کا من نہ میلا کریں تو وہ شاید ٹھس ہو کر بیٹھ جائیں یا لکھنے ہی سے انکار کر دیں۔ بیشتر لوگ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ہر ایک کام کرتے ہیں۔ اشک محض دوسروں کو جلانے کے لئے اپنی زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔

---

[1] اشک کا ناول "گرتی دیواریں" انھوں نے اُردو میں لکھا تھا۔ چھپا ہندی میں اور اب تک اس کے پانچ حصے تقریباً تین ہزار صفحات چھپ چکے ہیں۔ آج کل اشک اس کا آخری حصہ لکھ رہے ہیں۔ (ادارہ)

اشک پر کبھی کبھی عاجزی اور خاکساری کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں مگر نہایت مخصوص محفل میں اور کبھی کبھی صرف دو ایک کے سامنے۔ ان کا یہ رنگ بھی میں نے دیکھا ہے۔ کہاں تو یہ دعویٰ کہ اپنے سامنے افلاطون کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے اور کہاں یہ رنگ کہ نہیں کچھ نہیں بھائی۔ زندگی کاٹ رہا ہوں۔ کچھ لکھا نہیں جاتا اور جو لکھا جاتا ہے وہ مزے کا نہیں ہوتا۔ بالکل ہیچ۔ جی چاہتا ہے کہ سب لکھے پڑھے کو آگ لگا دوں اور سنیاس لے کر ہمالیہ چلا جاؤں مگر کوشلیا کا خیال آتا ہے۔ وہ کیا کرے گی اور بچے بھی تجربہ کار نہیں اور دوست بھی سب الگ ہو چکے ہیں مجھ سے اور صحت ہے کہ سنبھلنے کا نام نہیں لیتی۔ کچھ کھایا پیا نہیں جاتا، کھانسی کے دورے الگ پڑتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تو اس وقت حرارت محسوس ہو رہی ہے۔ ذرا نبض دیکھنا مری ...... مگر اس قسم کے موڈ عارضی اور بے حد مختصر ہوتے ہیں اور غالباً محض منہ کا مزا بدلنے کے لئے طاری کر لئے جاتے ہیں۔

اشک کی گاڑی میں اگر انرجی دوستوں کے طعنوں سے آتی ہے تو اس کا انجن ڈرائیور ان کی بیوی کوشلیا ہیں۔ کوشلیا کو اشک کی طبیعت کے سارے کل پرزے معلوم ہیں۔ اکثر بیویوں کی عادت ہوتی ہے کہ ان کل پرزوں میں تیل دینے کے بجائے اس میں روڑے اٹکاتی رہتی ہیں اور اس طرح اپنی اہمیت کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ مگر کوشلیا نے اشک کے لئے اپنے آپ کو مٹا ڈالا ہے وہ صحیح معنوں میں ان کی مددگار ساتھی معاون دوست، محبوب، آقا اور جانے کیا کیا ہیں۔ اشک اپنی روزمرہ کی گفتگو میں اتنی بار کوشلیا کا نام لیتے ہیں کہ اگر سننے والا اجنبی ہو تو وہ غالباً اس تعریف کو غلو پر مبنی کرے گا مگر کوشلیا کے بارے میں اشک جو کچھ کہیں گے، اسے حقیقت ہی سمجھنا چاہئے۔ اشک اپنی مالی، ادبی و سماجی حیثیت میں جس مرتبے میں پہونچے اس میں کوشلیا کی انتھک محنت اور کاوش کا بھی بہت دخل ہے۔ کوشلیا کو اشک سے کام لینا آتا ہے اور یہ دونوں بزنس میں ادب میں اور سماجی زندگی میں اس قدر لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اس قدر گڈمڈ ہو چکے ہیں کہ اکثر اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کون اشک ہے اور کون کوشلیا۔ کون میاں ہے اور کون بیوی۔

اشک نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پبلیشروں کی زیادتیوں پر کڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اکثر اوقات انھوں نے مجھے، بیدی کو، عباس کو اور دوسرے دوستوں کو لے کر پبلشنگ ہاؤس کھولنے کی صلاح دی جسے ہم میں سے کوئی بھی اپنی سہل انگاری کی وجہ سے منظور نہ کر سکا، پبلیشروں اور مصنفوں کے باہمی مسائل سے ہم لوگ بخوبی آگاہ تھے مگر پبلشر بننے کے لئے جس دماغ سوزی اور جسمانی کاوش کی ضرورت ہے وہ ہم سب میں اشک سے بہتر موجود تھی۔ مگر وہ کڑھن ہم میں نہ تھی۔ وہ جلن

وہ شدید بیزاری، جذبے کی وہ انتقامی صورت جو ہماری کاوشوں کا دھارا نشر و اشاعت کی طرف موڑ سکتی۔ مگر اشک کی ضدی طبیعت نے یہ کام بھی ان سے کرا لیا۔ اگر وہ ملک کے وزیر اعظم ہوتے تو اب تک انھوں نے پبلشنگ کو قومیا لیا ہوتا اور ہر زبان میں ادیبوں کے باہمی اتحاد سے کوآپریٹو انجمنیں بنا ڈالی ہوتیں لیکن چونکہ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے اس لئے انھوں نے خود ہی پبلشنگ شروع کر دی اور آج ان کا شمار ہندی کے اعلیٰ پائے کے پبلشروں میں ہوتا ہے[1]۔ ادیبوں میں ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں جو اعلیٰ پائے کے ادیب بھی ہوں اور اعلیٰ پائے کے پبلشر جو برابر لکھتے بھی رہیں اور برابر کتابیں چھاپتے بھی رہیں اور چھاپ کر ان کی عمدہ نکاسی کا بندوبست بھی کرتے رہیں مگر اشک تو ہمیشہ چومکھی لڑائی لڑنے کے عادی رہے ہیں۔

●

اشک کی صحیح ادبی حیثیت کے بارے میں تو کوئی تاریخ کا مورخ ہی لکھے گا۔ مگر قیاس غالب ہے کہ اُردو اور ہندی کی افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری میں انھیں ہمیشہ صف اول میں شمار کیا جائے گا گو وہ کسی میدان میں بند نہیں ہیں۔ افسانہ، ڈرامہ، ناول، ہندی کویتا، تنقیدی مضامین، طنز و مزاح ہر شعبہ میں انھوں نے قلم کا زور صرف کیا ہے اور پوری کاوش و محنت اور اپنی صلاحیتوں کے بہترین استعمال سے بنایا اور سنوارا ہے۔ ہندی ناول نگاری میں انھوں نے "گرتی دیواریں" لکھ کر سماجی ناولوں میں ایک طرح نو کا اضافہ کیا ہے اور اب وہ اس طویل ناول کا دوسرا حصہ لکھ رہے ہیں[2] جو غالباً گرتی دیواریں کی طرح ضخیم ہوگا۔ اشک متوسط طبقے کے سب سے نچلے درجے کے لوگوں کی زندگی پر شدید گرفت رکھتے ہیں اور ان کے مسائل کو ہمدردی سے سمجھنے، دیکھنے، پرکھنے اور لکھنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ پُر پیچ عبارت آرائی میں یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ پریم چند کی طرح سادہ اور شگفتہ طرز بیان پر زور دیتے ہیں جس طرح وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں محنت اور کاوش سے کام لیتے ہیں اسی طرح ادب کے میدان میں بھی اپنی کامیاب صلاحیت کو اپنی انتھک کوشش سے عبارت کرتے ہیں۔ اپنی کسی تحریر کو بلا شبہ دس گیارہ بار لکھنا ان کے نزدیک معمولی سی بات ہے۔ یہ نہیں کہ قلم برداشتہ جو ایک بار لکھ گیا سو لکھ گیا۔ میرے خیال میں

---

[1] اشک نے دو سال پہلے الہ آباد میں اپنا اُردو ادارہ بھی قائم کر دیا ہے، جس سے دو برسوں میں انھوں نے سات کتابیں شائع کی ہیں اور اپنا ضخیم ناول "گرتی دیواریں" شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

[2] یہ بیس سال پہلے کی بات ہے اب تک وہ اس کے پانچ حصے لکھ چکے ہیں۔ (ادارہ)

تو وہ اپنے موضوع سے یوں لڑائی کرتے ہیں۔ "اچھا تو قابو میں نہیں آتا دیکھتا ہوں تو کیسے قابو میں نہیں آتا ہے! میں برہمن بچہ ہوں پرسرام کی اولاد ہوں پرسرام کی۔ جب تک تجھے چاروں خانے چت نہ کرلوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ سمجھا کیا تو نے ہے؟" خیال ہے وہ کسی موضوع اسکی افادیت، تاثر یا خیال آفرینی کی وجہ سے انتخاب نہیں کرتے بلکہ چاروں خانے چت گرانے کے خیال سے اٹھاتے ہیں۔ وہ اسے ایک بار لکھتے ہیں دو بار لکھتے ہیں دس بار لکھتے ہیں اور اس وقت تک لکھتے رہتے ہیں جب تک اس کے تمام پہلوؤں پر مکمل گرفت نہ حاصل کرلیں۔ بھلا ایسے میں موضوع کہاں بھاگ سکتا ہے۔ وہ خود بخود دستہ بدستہ ہوکر سامنے حاضر ہوجاتا ہے اور کہتا ہے —— "خاکسار حاضر ہے۔ آپ کا ملازم ہے حکم فرمایئے۔" بہت سے ادیبوں کے پاس جوالہ دین کا چراغ ہوتا ہے وہ اسے صرف ایک بار رگڑ کر اور جن کو حکم دے کر فارغ ہوجاتے ہیں۔ مگر اشک اپنے چراغ کو بار بار رگڑتے ہیں اور جب تک جن کو اپنی خواہش کی تمام جزئیات سے آگاہ نہ کرلیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ اس لئے آپ ان کی تخلیقات میں تفصیل نگاری کے حیرت انگیز مرقعے دیکھیں گے جو برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہیں۔ □

بلونت سنگھ

زندگی کے حسین پہلو کا سمبل : اشک

مختلف لوگوں سے ہماری اولین ملاقات مختلف وجوں سے یاد رہتی ہے۔ میں اشک سے اپنی پہلی ملاقات برسوں گذر جانے پر بھی نہ بھول سکا، اس لئے کہ وہ ملاقات میری شکست پر ختم ہوئی تھی۔

پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ دن میں دو ڈھائی کا وقت تھا، میں لاہور کی ایک جلتی تپتی سڑک پر شربت کی ایک دوکان کے سامنے کھڑا شربت کی ایک دوکان کے سامنے کھڑا شربت کے گلاس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں اشک وہاں آنکلے۔ میں ان سے متعارف تھا۔ فوراً پوچھا۔

"شربت پئیں گے ؟"

"پی لیں گے۔" انھوں نے کہا۔

پی گئے۔ اور پینے کے بعد انھوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا۔

میں نے پوچھا "اور پئیں گے ؟"

"پی لیں گے۔"

پی گئے اور پھر میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے اب یہ کیا پوچھے گا ؟

میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا "اور پیجیے گا ؟" جواب ملا "پی لوں گا۔" چنانچہ پی گئے ...

میں سمجھ گیا کہ انھیں صحیح الہام ہوا ہوگا، اس لئے یہ پوری تیاری میں ہیں .....

جہاں تک اشک سے میرا تعلق ہے، ان کے ہاتھوں یہ میری پہلی اور آخری شکست تھی ـــــ آخری اس لئے کہ بعد میں کبھی میں نے پھر اشک کو میدان میں للکارنے کی جرأت نہیں کی۔

●

سبھی ادیبوں کی طرح اشک کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ پہلا تو ان کی تخلیقات میں اُجاگر

ہوتا ہے، دوسرا ان کی اپنی شخصیت میں۔ پہلے رخ کے بارے میں کچھ بھی میں نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ مجھ سے زیادہ قابل لوگ ان کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور بہت کچھ کہتے بھی رہتے ہیں۔ پھر مشکل یہ بھی ہے کہ دورِ حاضر میں زندگی کی قدریں کھٹائی میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں حکم لگانا بھلے آدمی کے لئے ذرا مشکل ہوتا ہے۔ البتہ پیشہ ور نا قدوں کی بات الگ ہے ۔۔۔۔ مگر جہاں تک دوسرے رخ کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں پیٹھ پیچھے تو بہت کچھ کہا ہی جا سکتا ہے، لیکن اعلانیہ بھی کچھ باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل خود اشک کی پیدا کی ہوئی ہے ۔۔۔۔ سبھی جانتے ہیں کہ اشک کا بہت ہی دل پسند مشغلہ اپنے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا ہے۔ جب یہ غلط فہمیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو پھر وہ اپنے بارے میں خوش فہمیاں پھیلانے لگتے ہیں۔ اس تھیسس (THESIS) اور اینٹی تھیسس (ANTITHESIS) کی رگڑ سے ایک سنتھیسس ۔۔۔ (SYNTHESIS) پیدا ہوتا ہے۔ تھوڑا ہی وقت گذرنے پر یہ سنتھیسس غلط فہمی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اب پھر خوش فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ۔۔۔۔ غرض اس طرح 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد' والی کیفیت جاری رہتی ہے۔

اس مشکل کی کنجی یا کلید بھی اشک کے پاس ہے وہ یہ کہ خواہ کیسا بھی گورکھ دھندا کیوں نہ ہو، اس کی کوئی اصلیت نکال کر ہی چھوڑنی چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اصلیت بھی بعد میں غلط فہمی ـــــ یا تقدیر بہت اچھی ہوئی تو ـــــ خوش فہمی ثابت ہو۔ اگر مجھ سے پوچھئے تو میں اشک کی تمام خوبی و خامی کو نظر میں رکھتے ہوئے بھی انھیں بھیم، ارجن، رانا پرتاپ، رستم وغیرہ کی صف میں رکھوں گا۔ لیکن ان کے مقابلے میں اشک کی برتری اس امر میں ہے کہ اشک نے بقول میر زندگی بھر اپنی ناکامیوں سے کام لیا ہے۔ ادب کی دنیا میں اتنا ہی پیارا اور اتنا ہی بہادر شاید ایک ہی شخص پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ تھا آر۔ ایل۔ سٹیونسن۔

سٹگ ڈگرمین (STIG DAGERMAN) نے اپنی مختصر آپ بیتی میں لکھا ہے کہ بچوں کے اندر بہت تیز تخلیقی فکر ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ بڑے ہوتے ہیں یہ تخیل مدھم پڑتی جاتی ہے (تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں) کہ اشک نے بیشمار مشکلات کے باوجود اپنے اندر اس تخلیقی تخیل کو مرنے نہیں دیا۔ ایک پتے کی بات اور بتا دوں کہ یہ خصوصیات صرف ادب کی تخلیق تک ہی محدود نہیں ہے۔

• بائیبل میں ایک بہت بڑے بہادر سیمسن کا ذکر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ نہتا دشمنوں میں گھر گیا۔ اس وقت ایک مرے ہوئے گدھے کا جبڑا اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے اسی سے بیسوں دشمنوں کا منہ موڑ دیا۔ یہی بات اشک پر بھی لاگو ہوتی ہے صحت کی خرابی، بیماری اور غریبی کی وجہ سے اشک کی صورت حال بھی سمسن کی طرح ہی تھی اپنی اس مجبوری کی حالت میں جب کہ اشک کے پاس زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اچھی صحت اور دولت کے مضبوط ہتھیار نہیں تھے، انھوں نے سیمسن کا سا بے ڈھب ہتھیار اٹھایا اور زندگی کے کارزار میں کود پڑے اور پھر میدان جنگ میں انھوں نے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ٹھیکرے نے سوفٹ کی طرز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہی میں اشک کے سلسلے میں کہوں گا کہ اگر اشک کے پستول کی گولی خالی چلی جائے تو وہ پستول کی نالی تھام کر اس کی بٹ سے ہی دشمن کی کھوپڑی کھول دیتے ہیں پھر ان کا دشمن کوئی فرد ہو یا نامساعد حالات۔

اپنے بارے میں پھیلائی گئی اشک کی غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں کے دھندلکے سے میں نے اکثر جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ اس دھندلکے کے پیچھے بیٹھے ہوئے انسان کو دیکھا ہے تو ہمیشہ اشک کی بے مثال قوت عمل (ENERGY) اور کھرے پن (INTNEGRITY) کو گرد وغبار میں پڑے ہوئے ہیرے کی طرح دمکتے ہوئے پایا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اگر ان کا جانی دشمن بھی اچھی چیز لکھے گا تو سب سے پہلے وہ اشک سے ہی اس کی داد پائے گا۔ میرے خیال میں اشک کا ایسا کرنا ہمارے ادب کے موجودہ ماحول میں تازہ اور صحت مند خون کی ایک لہر دوڑا دینا ہے۔ ادب کی صحت پر اس کا اچھا ہی اثر پڑے گا۔

اشک کو دیکھ کر زندگی کے ایک بڑے حسین پہلو کا بھی بہت شدید احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر موت ایک اٹل حقیقت ہے تو زندگی بھی کم اٹل حقیقت نہیں ہے۔

ایک ٹوٹے سے مقبرے کے قریب ایک جیسی جوئے بار بہتی ہے
موت کتنا ہی اعتراض کرے، زندگی بے قرار رہتی ہے

اشک کو دیکھ کر مجھے برابر اس تڑپتی ہوئی ندی کی یاد آتی ہے۔ □

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ، الہ آباد

میرے ادب کی تحریک اور اس کے سوتے

گذشتہ تین دہائیوں سے نہ جانے یہ سوال کتنی بار کیا گیا ہے کہ میرے ادب کی بنیادی تحریک کیا ہے اور اس کے سوتے کون سے ہیں؟ کس ترغیب سے میں ادیب بنا اور کس انگیخت سے پچھلی آدھی صدی سے بے تکان لکھے چلا جا رہا ہوں۔

نہ جانے کتنی بار اور کتنی طرح سے میں نے ان سوالوں کے جواب دیئے ہیں۔ چونکہ گذشتہ تیس برسوں سے میں بیشتر ہندی میں لکھتا رہا ہوں اس لئے یہ سوال جواب بھی ہندی ہی میں ہوئے ہیں ــــ میرے ہندی قارئین یہ سوال اپنے خطوں میں، نقاد، ساتھی ادیب اور اخبار نویس باضابطہ ملاقاتوں میں کرتے رہے ہیں۔ (ان ملاقاتوں کے بھی تین مجموعے ہندی میں شائع ہو چکے ہیں) میں نے اپنے مقالوں، اپنی کتابوں کے دیباچوں اور مقدموں میں اس موضوع کے کسی نہ کسی پہلو پر بار بار لکھا ہے..... آج میں ۰۷ پار کر گیا ہوں میری ادبی زندگی کے پچپن برس میرے پیچھے کھڑے جھانک رہے ہیں۔ تیس برس بعد میں پھر اردو میں لکھنے لگا ہوں اور آج پھر مجھ سے یہی سوال کیا گیا ہے۔ تب مجھے بھی بہانہ مل گیا ہے کہ لگاتار آدھی صدی تک تخلیق کرتے رہنے کے بعد اس سوال کے جواب میں آج تک دی گئی توجیہات اور توضیحات کا جائزہ لوں اور ایک بار پھر خارجی طور پر اپنے ماضی میں اور داخلی طور پر اپنی دلی کیفیات پر ایک بھرپور نظر ڈالوں اور جو کچھ مجھے دکھائی دے اسے اپنے اردو دوستوں کے سامنے بے کم و کاست رکھ دوں۔

○

آج جب میں اپنے لڑکپن کے ان دنوں کی یاد کرتا ہوں، جب میں تک سے تک ملانے لگا تھا اور سوچتا ہوں کہ اس چھوٹی سی عمر میں لکھنا شروع کرنے کی تہ میں کون سی تحریک کارفرما تھی تو میں کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔ کوئی خاص امر یا واقعہ مجھے یاد نہیں آتا جس سے مجھے لکھنے کی تحریک ملی ہو۔

میں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شاعر کی حیثیت سے کی اور مجھے لگتا ہے کہ میری شاعری اچانک دھرتی پھوڑ کر بہہ نکلنے والے سوتے کی طرح ہی تھی۔ کوئی ذاتی یا معاشی تحریک اس کی تہ میں نہیں تھی۔ ایک ولولہ تھا —— ایک بے نام جوش، جو شاید دل میں سما نہ پار ہا تھا اور لفظوں اور سطروں کی صورت میں کاغذ پر بہہ نکلا تھا۔ کوئی یقینی سمت بھی اسے حاصل نہیں تھی۔ بے ساختہ دھرتی پھوڑ کر بہہ نکلنے والے سرچشمے ہی کی طرح میری شاعری کا جھرنا بھی ہر چہار طرف پھیل رہا تھا۔ سمت بھی اسے بہت بعد میں حاصل ہوئی، مختلف تحریکوں اور ترغیبوں کے سوتے اس میں آملے اور اسے گہرائی اور گیرائی دے گئے۔

میں اس مختصر سے مضمون میں ان سبھی تحریکوں اور ترغیبوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں دیئے گئے بیانات کو اپنی پچاس سالہ تخلیق کی روشنی میں یکجا کر کے انھیں واضح صورت دینے کی کوشش کروں گا —— میں کیوں کسی طرح کی چھٹی منائے بنا، آرام کئے بغیر، دنوں، ہفتوں، مہینوں، برسوں بے تکان لکھتا چلا جاتا ہوں، نہ اوبتا اکتاتا ہوں، نہ تھکتا ہوں، جب اس "فنامنا" کو میں خود ہی پوری طرح نہیں سمجھ پاتا تو آپ کو بھی سمجھا نہیں پاؤں گا۔ صرف اس سوال کے ضمن میں اپنے ماضی پر نظر ڈالنے کے بعد میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں، وہی میں اپنے اردو قارئین کے سامنے رکھدوں گا نہ مبالغہ سے کام لوں گا نہ جھوٹ اور ریاکاری سے۔ اس سے زیادہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

○

میں نے تُک سے تُک ملانا تو پانچویں جماعت میں شروع کر دیا تھا۔ دیانند اینگلو سنسکرت ہائی سکول جالندھر کی پرائمری برانچ —— پہلی سے چوتھی جماعت تک —— قلعہ محلہ میں واقع تھی۔ اس زمانے میں ہمارے اسکول کے قریب ہی چوک میں برلبِ سڑک میونسپل کمیٹی کا ایک رہٹ تھا۔ صبح اس میں بیل جوت دیئے جاتے۔ تازہ پانی ہمارے سکول کے سامنے چوڑی نالی میں بہنے لگتا ہم لوگ اپنی تختیاں دھوتے، انھیں پیلی مٹی سے پوتتے اور پھر ایک ہاتھ میں جھلاتے اور گیت گاتے ہوئے اسے سکھاتے:

تُک نی پھٹیے
لونگاں چٹیے
لونگ سپاری

اوپندر ناتھ اشک
۵۔خسرو باغ، الہ آباد

میرے ادب کی تحریک اور اس کے سوتے

گذشتہ تین دہائیوں سے نہ جانے یہ سوال کتنی بار کیا گیا ہے کہ میرے ادب کی بنیادی تحریک کیا ہے اور اس کے سوتے کون سے ہیں؟ کس ترغیب سے میں ادیب بنا اور کس انگیخت سے پچھلی آدھی صدی سے بے تکان لکھے چلا جارہا ہوں۔

نہ جانے کتنی بار اور کتنی طرح سے میں نے ان سوالوں کے جواب دیئے ہیں۔ چونکہ گذشتہ تیس برسوں سے میں بیشتر ہندی میں لکھتا رہا ہوں اس لئے یہ سوال جواب بھی ہندی ہی میں ہوئے ہیں ـــ میرے ہندی قارئین یہ سوال اپنے خطوں میں، نقاد، ساتھی ادیب اور اخبار نویس باضابطہ ملاقاتوں میں کرتے رہے ہیں۔ (ان ملاقاتوں کے بھی تین مجموعے ہندی میں شائع ہو چکے ہیں) میں نے اپنے مقالوں، اپنی کتابوں کے دیباچوں اور مقدموں میں اس موضوع کے کسی نہ کسی پہلو پر بار بار لکھا ہے ..... آج میں ۷۰ پار کر گیا ہوں میری ادبی زندگی کے پچپن برس میرے پیچھے کھڑے جھانک رہے ہیں۔ تیس برس بعد میں پھر اردو میں لکھنے لگا ہوں اور آج پھر مجھ سے یہی سوال کیا گیا ہے۔ تب مجھے بھی بہانہ مل گیا ہے کہ لگاتار آدھی صدی تک تخلیق کرتے رہنے کے بعد اس سوال کے جواب میں آج تک دی گئی توجیہات اور توضیحات کا جائزہ لوں اور ایک بار پھر خارجی طور پر اپنے ماضی میں اور داخلی طور پر اپنی دلی کیفیات پر ایک بھرپور نظر ڈالوں اور جو کچھ مجھے دکھائی دے اسے اپنے اردو دوستوں کے سامنے بے کم و کاست رکھ دوں۔

○

آج جب میں اپنے لڑکپن کے ان دنوں کی یاد کرتا ہوں، جب میں تک سے تک ملانے لگا تھا اور سوچتا ہوں کہ اس چھوٹی سی عمر میں لکھنا شروع کرنے کی تہ میں کون سی تحریک کارفرما تھی تو میں کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔ کوئی خاص امر یا واقعہ مجھے یاد نہیں آتا جس سے مجھے لکھنے کی تحریک ملی ہو۔

میں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شاعر کی حیثیت سے کی اور مجھے لگتا ہے کہ میری شاعری اچانک دھرتی پھوڑ کر بہ نکلنے والے سوتے کی طرح ہی تھی۔ کوئی ذاتی یا معاشی تحریک اس کی تہ میں نہیں تھی۔ ایک ولولہ تھا ـــــ ایک بے نام جوش، جو شاید دل میں سما نہ پا رہا تھا اور لفظوں اور سطروں کی صورت میں کاغذ پر بہ نکلا تھا۔ کوئی یقینی سمت بھی اسے حاصل نہیں تھی۔ بے ساختہ دھرتی پھوڑ کر بہ نکلنے والے سرچشمے ہی کی طرح میری شاعری کا جھرنا بھی ہر چہار طرف پھیل رہا تھا۔ سمت بھی اسے بہت بعد میں حاصل ہوئی، مختلف تحریکوں اور ترغیبوں کے سوتے اس میں آملے اور اسے گہرائی اور گیرائی دے گئے۔

میں اس مختصر سے مضمون میں ان سبھی تحریکوں اور ترغیبوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں دیئے گئے بیانات کو اپنی پچاس سالہ تخلیق کی روشنی میں یکجا کر کے انہیں واضح صورت دینے کی کوشش کروں گا ـــــ میں کیوں کسی طرح کی چھٹی منائے بنا، آرام کئے بغیر، دنوں، ہفتوں، مہینوں، برسوں بے تکان لکھتا چلا جاتا ہوں، نہ اوبتا اکتاتا ہوں، نہ تھکتا ہوں، جب اس "فنامنا" کو میں خود ہی پوری طرح نہیں سمجھ پاتا تو آپ کو بھی سمجھا نہیں پاؤں گا۔ صرف اس سوال کے ضمن میں اپنے ماضی پر نظر ڈالنے کے بعد میں جن نتیجوں پر پہنچا ہوں، وہی میں اپنے اردو قارئین کے سامنے رکھ دوں گا نہ مبالغہ سے کام لوں گا نہ جھوٹ اور ریاکاری سے۔ اس سے زیادہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔

○

میں نے تُک سے تُک ملانا تو پانچویں جماعت میں شروع کر دیا تھا۔ دیانند اینگلو سنسکرت ہائی سکول جالندھر کی پرائمری برانچ ـــــ پہلی سے چوتھی جماعت تک ـــــ قلعہ محلہ میں واقع تھی۔ اس زمانے میں ہمارے اسکول کے قریب ہی چوک میں برلب سڑک میونسپل کمیٹی کا ایک رہٹ تھا۔ صبح اس میں بیل جوت دیئے جاتے۔ تازہ پانی ہمارے سکول کے سامنے چوڑی نالی میں بہنے لگتا ہم لوگ اپنی تختیاں دھوتے، انہیں پیلی مٹی سے پوتتے اور پھر ایک ہاتھ میں جھلاتے اور گیت گاتے ہوئے اسے سکھاتے:

سُک نی پٹیئے
لونگاں چٹیئے
لونگ سپاری

کیسر کیاری[لہ]
اسی طرح بہت لمبی تک ہندی اور آخر میں
بات گئی مک
میری پھٹی گئی ٹنک[ٹہ]

دسمبر جنوری کی سردیوں میں لوڑھی[عہ] کا تہوار پڑتا ہے۔ پنجاب میں یہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ تہوار سے مہینہ مہینہ پہلے لڑکے ٹولیاں بنا کر لکڑیاں، اپلے، چندا اکٹھا کرتے لوڑھی کی رات کو محلوں کے چوکوں میں بڑے بڑے الاؤ جلتے، اگنی دیوتا کی پوجا ہوتی۔ مٹھی مٹھی بھر ریوڑیاں چیوڑے بانٹے جاتے۔ محلے کے نوجوان پکے گنّے آگ میں جھونک، ذرا سی پڑ پڑ کی آواز ہونے پر انھیں باہر نکالتے اور کنویں کی جگت پر یا مکانوں کی دیواروں سے مار کر ان کے زوردار پٹاخے بجاتے اور ان کا گرم رس چوستے۔ اور ساری ساری رات موج مناتے۔ میری زبانی تک بندی تو تختی صاف کرنے، پیلی مٹی سے اسے پوتنے اور سکھانے اور لوڑھی کے گیت گانے میں ہی شروع ہوئی میں ان گیتوں میں کچھ بند اپنی طرف سے جوڑ کر اور اپنی ٹولی میں اسے گایا کرتا۔

اس زمانے میں آریہ سماج کے سالانہ جلسہ میں اسکول کے تمام لڑکے ہماری برانچ میں اکٹھے جمع ہوتے اور وہاں سے قطار در قطار جلوس کی صورت میں بازاروں میں آریہ سماجی گیت گاتے ہوئے ہائی سکول جاتے جہاں زبردست جلسہ ہوتا۔ اس جلوس میں جو گانے گائے جاتے، وہ راجپال اینڈ سنز، لاہور سے چھپی آریہ بھجن پشپانجلی سے لئے جاتے۔ جب مجھے یہ پتہ چلا تو میں کتاب کا ایک نسخہ خرید لایا اور ان بھجنوں کی نقل میں بھجن لکھنے لگا۔

میں آٹھویں میں پہنچا کر پنجابی بیت مجھے بھانے لگے۔ جالندھر اس زمانے میں شاعری اور سنگیت کا مرکز تھا۔ میں نے ایک پنجابی استاد کی شاگردی قبول کر لی اور دھڑا دھڑ پنجابی میں بیت کہنے لگا۔ میں نے کہا تا کہ شروع میں میری شاعری کو کوئی سمت نہیں ملی تھی ــــ عشق کی حقیقت اور ماہیت کو جانے بغیر میں عشقیہ نظمیں لکھتا، غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے دکھ درد کا ذاتی تجربہ رکھے اور ان کے مسائل اور مصائب کو سمجھے بغیر، ان کی زبوں حالی اور کسمپرسی پر آنسو بہاتا، ہندو

لہ اے تختی تو سوکھ جا۔ تو نے لونگ چاٹ رکھے ہیں، سپاری کھائی ہے۔ کیسر کیاری تیری نذر۔
ٹہ بات ختم ہو گئی۔ میری تختی سوکھ گئی
عہ یوپی میں کرسنکرانتی کے دن کھچڑی کا تہوار ہوتا ہے۔ پنجاب میں لوڑھی کا۔

تہواروں کی تاریخ، اور معاشرے میں ان کی اہمیت کو سمجھے بغیر ہر تہوار پر ایک نہ ایک نظم دھر گھسیٹتا۔

مجھے یاد ہے ان دنوں تحریک آزادی کا زور شور تھا، ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ میں نے پنجابی میں لکھنا شروع ہی کیا تھا جب نوہریاں بازار جالندھر کے بڑے مندر کے احاطے میں ہولی کے تہوار پر ایک پنجابی کوی سمیلن ہوا۔ میں نے اس میں ہولی پر ایک لمبی مسدس پڑھی اور استاد آبر نے (جو پیشے کے لحاظ سے پنچ بند تھے اور اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے) مجھے چاندی کا ایک تحفہ دیا تھا۔

لیکن جلد ہی میں پنجابی کا دامن چھوڑ کر اردو میں غزل کہنے لگا۔ پنجابی شاعری اس زمانے میں نچلے اور ناخواندہ طبقہ میں مقبول تھی۔ دانشوروں کی زبان اردو تھی۔ ہمارے شہر کے بیشتر پنجابی شاعر شہر کے غنڈے بھی تھے اور نچلے پیشوں سے متعلق تھے ان کے شاگردان کے لونڈے کہلاتے تھے میں اسٹیشن ماسٹر کا لڑکا۔ برہمن۔ میری سفید پوش تنک مزاجی کو ان میں سے کسی کا لونڈہ کہانا پسند نہ ہوا۔ ان دنوں جالندھر میں دو اردو استاد بھی تھے۔ دونوں بستی غزان میں رہتے تھے ـــــ استاد آذر اور استاد رسا ـــــ میں نے آذر صاحب کی شاگردی قبول کر لی اور غزل پر غزل لکھنے لگا۔ بدقسمتی سے آذر صاحب بھی حسن پرست تھے اور میرے چہرے پر تو ان دنوں خاصی یتیمی برستی تھی۔ وہ میرے ہی ایک خوبصورت استاد بھائی ٹیک چند اختر کی تو غزلیں فوراً لکھ دیتے۔ بلکہ اپنی طرف سے ان میں کچھ اشعار بھی بڑھا دیتے، لیکن میری غزل کو گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیتے۔ ستم یہ ہے کہ اختر کی غزلیں بھی بیشتر ہی میری ہی لکھی ہوتیں۔ جب وہ ٹھیک ہو کر آجاتیں اور میں اپنی غزل کے لئے کئی کئی دن چکر لگاتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔ ایک بار جب انھوں نے میری غزل گم ہی کر دی تو مجھے بے حد غصہ آیا، میں نے طے کیا کہ میں کہانیاں لکھوں گا، جنھیں کسی کو دکھانے اور اصلاح لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ میری پہلی چیز ہی اردو پرتاپ، لاہور کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہو گئی اور جیسے میں پہلے دن رات غزلیں کہتا تھا، اب دن رات افسانے لکھنے لگا۔ اور وہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے پرتاپ کے ایڈیشنوں میں شائع ہونے لگے۔

○

میرے والد شمالی مغربی ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ اردو شاعری سے انھیں کوئی شغف نہ تھا۔ لیکن پنجابی قصے خوب پڑھتے اور کبھی کبھار کسی پنجابی لوک گیت کی کوئی سطر یا بند گایا کرتے

تھے۔ ان کے گلے میں امرت تھا۔ ان کی آواز میں بے پناہ سوز لوچ اور کھنک تھی۔ جب کسی سونے اسٹیشن پر مہینے کی آخری رات کو منتقل بناتے بناتے تھک کر کسی لوک گیت کی کسی لائن یا بندگا اٹھتے تو رات کے سناٹے میں ان کی سریلی آواز میلوں تک گونجتی چلی جاتی۔ کئی بار وہ آواز سننے کے۔ میں آدھی آدھی رات تک جاگا کرتا۔

جب انھیں معلوم ہوا کہ میں شاعری کرتا ہوں اور غزلیں لکھتا ہوں تو بڑے خوش ہوئے کبھی ریلونگ کے اپنے دوروں میں جالندھر آتے تو مجھے تازہ غزل سنانے کا حکم دیتے۔ غزلیں زدائیۃ عشق سے معمور ہوتیں۔ وہ کبھی نہ پوچھتے کہ کمبخت کس سے عشق کرتا ہے؟ بلکہ غزل سن کر میری پیٹھ ٹھونکتے اور میرے مستقبل کے بارے میں حوصلہ افزا پیشین گوئیاں کرتے۔ دوستوں میں میری شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اعلان کرتے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر ٹیگور اور شیکسپیئر کے کان کاٹے گا۔

ٹیگور اور شیکسپیئر کو انھوں نے پڑھ رکھا ہو، یہ بات نہ تھی۔ بس وہ یہ جانتے تھے کہ دونوں مشہور زماں نام ہیں۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو کر زمانے بھر میں مشہور ہو اور ان کا نام روشن کرے۔

اسی سلسلے میں، اپنے دوسرے بیٹوں کے ساتھ وہ مجھے بھی کچھ نصیحتیں دیتے — "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی" وہ کہتے "کوئی بھی پیشہ اپناؤ، مگر اس میں کمال حاصل کرو، تم دنیا میں ہر دل عزیز ہو جاؤ گے"... "ایک مائی کا لال جو کر سکتا ہے، دوسری مائی کا لال بھی وہ کر سکتا ہے" وہ کہتے " اے مین کین ڈو واٹ اے مین ہیز ڈن A MAN CAN DO WHAT A MAN HAS DONE " میرے والد ناممکن کو بیوقوفوں کی لغت کا لفظ مانتے تھے۔ اور سمجھاتے تھے کہ آدمی کے بچے کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ "عشق اور محبت، ثابت قدمی اور استقلال سے کام لو۔ ڈٹے رہو اور جٹے رہو تم یقیناً کامیاب ہوگے....."

میں سمجھتا ہوں تخلیق کے سلسلے میں شعوری تحریک والد کی انھیں نصیحتوں سے شروع ہوا اردو ہندی دونوں زبانوں کو نہ جاننے کے باوجود اگر میں متواتر عشق اور محنت سے ان میں کچھ استعداد پیدا کی ہے، اگر میں بار بار اپنی چیزوں میں کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کر کے انھیں بہتر بنا تا ہوں اور اگر میں گذشتہ پچاس پچپن برس سے لگاتار لکھتا چلا آرہا ہوں تو والد کی ان ہی نصیحتوں کے باعث۔

علاوہ مندرجہ بالا نصیحتوں کے ان کی دو تین اور باتوں نے میری ادبی زندگی پر گہرا اثر ڈالا "اچھی بری چیز میں تمیز پیدا کرو،" وہ بتاتے اور سمجھاتے کہ عظیم لوگوں کی سوانح حیات پڑھو ان کا

ربیاں اپنالو، خامیاں چھوڑ دو۔ پھر دنیا میں جو افسانے مشہور ہوئے ہیں، انھیں پڑھو اور دیکھو
ن میں کیا خوبیاں ہیں، ان سے سیکھو، یقیناً تم بہتر سے بہتر لکھنا سیکھ جاؤ گے ــــ چونکہ افسانہ
اری میں میں نے کسی استاد سے مدد نہیں لی۔ والد صاحب کی اس نصیحت ہی سے میں نے سیکھا خود
پی بری تخلیق کی تمیز پیدا کی اور بہتر لکھنے کی کوشش کی۔

ایک اور بات ہے جس پر وہ زور دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے حسد مت کرو رشک کرو
(DONT BE JEALOUS BE ENVIOUS اور کہتے کہ حسد کمزور آدمی کرتے ہیں۔
ہزور رشک کرتے ہیں۔ "اچھی چیز اگر دشمن بھی لکھے تو اس کی داد دو لیکن دل میں عہد کرو کہ تم اس
ے بہتر لکھو گے" سب سے آخری بات جو وہ کہتے تھے اور جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا وہ یہ ہے کہ چوٹی
ہمیشہ جگہ خالی ہوتی ہے" جائے استاد خالی است" وہ کہتے "ہمیشہ چوٹی، ہمیشہ استاد کی جگہ تمھارا
صب العین رہے۔ تم ایسی چیز لکھو جو کسی دوسرے نے نہ لکھی ہو۔"

میں اگر گذشتہ چالیس برسوں سے ایک ہی ناول لکھ رہا ہوں، جس کے چار ضخیم حصے (ایک
دسرے سے جڑے لیکن اپنے میں مکمل پانچ ناول) تقریباً تین ہزار صفحات میں، لکھ چکا ہوں۔
ر اس سال میں نے اس کا آخری حصہ شروع کیا ہے اور زندگی رہتے اسے ختم کرنے کی امید
کھتا ہوں تو اپنے والد کی اسی نصیحت کے باعث۔ ہندی اردو نقادوں کی تمام تر بے اعتنائی کے
وجود اگر وہ دیس بدیس کے قارئین میں مقبول ہو گیا ہے روس، امریکہ، جرمنی، اور اٹلی میں اس
ہ مقالے لکھے گئے ہیں اور میں اپنے ملک ہی میں نہیں غیر ممالک میں بھی اسی سے پہچانا جاتا ہوں۔
ر شاید والد کی اسی نصیحت کی وجہ سے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر میں اسے ختم کر لے گیا تو وہ
یسا ناول ہوگا جو ہندوستانی زبانوں میں ہی نہیں دنیا بھر کی زبانوں میں اپنی طرح کا اکیلا
ہوگا۔

○

میں دو ایک برس پنجابی میں کوِتا کرتا رہا۔ اتنا عرصہ ہی اردو میں غزلیں لکھتا رہا۔ پھر جیسا
ر میں نے کہا، استاد سے ناراض ہو کر میں افسانے لکھنے لگا۔ اس مرحلے پر دو اور ترغیبیں ملیں۔
یک لاشعوری طور پر پریم چند سے دوسری شعوری طور پر ماں سے۔

جن دِنوں میں نے افسانے لکھنے شروع کیے، چندر کانتا سنتتی اور جاسوسی ناول پڑھتے
ڑھتے میں سدرشن اور پریم چند کو پڑھنے لگا تھا۔ سب سے پہلے میں نے پریم چند کے اولین

افسانوں کا مجموعہ سوزِ وطن پڑھا۔ پھر رسائل و جرائد میں ان کے معاشرتی افسانے۔ لاشعوری طور پر ان کا اثر میری تحریروں پر ہوا۔ میری شروع کی کہانیاں اپنی تمام ترفنی ناپختگی اور تخیلی بیگانے پن کے باوجود قوم پرستی اور سماج سدھار کے جذبوں سے معمور ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں جذبے میری فکر اور سوچ کا حصہ نہیں تھے، محض پریم چند کی تقلید میں میرے ہاں آئے تھے لیکن انھیں دنوں ماں کی ایک بات میری تخلیق کو ایک شعوری افادیت دے گئی۔

میرے والد کھانے پینے اور موج اڑانے والے یارباش آدمی تھے۔ پھکڑ، بے پرواحال میں بلکہ گذرتے لمحے میں جینے والے، ظالم اور جابر۔ ایسا ماں برہمنوں کے مشر گھرانے کی دھرم پرائن نیک سیرت، پاک طینت اور خداترس عورت تھیں۔ وہ رسوئی گھر میں چولہے پر کھانا پکاتی تھیں اور ہم وہیں ان کے سامنے ایکہ کے آسنوں پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اس بیچ وہ اپنی دھیمی آواز میں آہستہ آہستہ کبھی گھر کی اور کبھی باہر کی باتیں کرتیں۔ اور کبھی نصیحتیں بھی دیتیں۔

میرے پتا نیکی بدی، گناہ اور ثواب میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، 'اول مارے سو گورو کا چیلا'، 'تیل طمع جس کو ملے ترت نرم ہو جائے' وغیرہ مقولوں میں ان کا یقین تھا۔ بیوقوفوں سے انھیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ دنیا کے ساتھ چلنے، مشکلوں سے پار پانے مخالفوں سے نبرد آزما ہونے اور ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے لئے وہ ہمیں ایسے ہی گر بتایا کرتے تھے... ان کے برعکس ماں بے حد صبر سنتوش والی تھیں، ان کا زور اخلاقی قدروں یعنی ثواب گناہ، دھرم ادھرم، بھلے برے پر رہتا۔ بارہا ان کے اُپدیش پتا کی نصیحتوں کے خلاف ہوتے۔ ایک بار وہی سب بتاتے ہوئے جیسا کہ میں نے کہا اس نے ایسی بات کہی جو میرے دل پر نقش ہو گئی۔ اس نے کہا "بیٹے، پیٹ تو کتے اور سور بھی بھرتے ہیں اور پیسہ تو بیسواؤں کے پاس بھی ہوتا ہے" یعنی پیٹ بھرنا اور دولت کمانا ہی کافی نہیں، یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ پیٹ کیسے بھرا اور دولت کیسے کمائی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، میرے ادب پر ہی نہیں میری طرزِ زندگی پر بھی ماں سے ملی اس پریرنا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر ڈسٹنکشن لینے اور فوجداری مقدموں میں رجحان ہونے کے باوجود میں وکالت نہیں کر سکا اور کسی جھجک اور تذبذب کے بغیر پلک جھپکتے اچھی سے اچھی نوکری چھوڑ سکا، اپنی زندگی کو ادب کی خدمت میں وقف کر سکا اور چند تخلیقات کو چھوڑ کر جو میں نے ایک دوست کی غلط ترغیب میں لکھیں، میری ایک بھی تخلیق افادیت سے عاری نہیں تو اس کا باعث میری ماں کی یہی نصیحت ہے۔ میری تخلیق کے اخلاقی پہلو کا سرچشمہ

بھی وہیں ہے۔

○

ان ہی دنوں کی بات ہے ۔ میں شاید تھرڈ ایر میں پڑھتا تھا۔ نیچے بیٹھک کے ساتھ لگی اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کہانی لکھ رہا تھا ـــــ کون سی، مجھے یاد نہیں، رات کافی ہو گئی تھی کہ ماں نیچے آئیں۔ وہ دراصل مجھے 'بس کرنے' اور 'اب سو جانے' کے لئے کہنے آئی تھیں۔ مجھے کہانی لکھنے میں مستغرق دیکھ کر وہ چپ چاپ میرے پاس بیٹھ گئیں۔ عام طور پر میں انھیں اپنے افسانے سنایا بھی کرتا تھا۔ اس دن جو لکھ رہا تھا، سنایا کہ نہیں، یہ مجھے یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ جب افسانہ لکھتے لکھتے میں نے سر اٹھایا تو انھوں نے لمبی سانس بھر کر کہا: "میں اگر لکھنا جانتی تو اپنے دکھ کی کہانی لکھتی۔"

"میں نے کہا تھا۔ ماں تم فکر نہ کرو، میں لکھوں گا۔"

اور میں نے لکھا۔ ماں کا دکھ ہی نہیں، اپنا اور دوسروں کا بھی۔ کبھی کسی ریسرچ اسکالر نے کہا تھا۔ "اشک جی آپ کی تخلیقات میں خواتین کرداروں کو جو ہمدردی ملی ہے، وہ مرد کرداروں کے حصے میں نہیں آئی، آپ کے تمام بڑے ناول پُرش پردھان نہ ہو کر ناری پردھان ہیں..."

میں سمجھتا ہوں، اس ریسرچ اسکالر کے الزام میں سچائی کا کچھ عنصر ہے۔ گرتی دیواریں (اس کے چاروں حصوں) میں ہی نہیں، میرے دوسرے ناولوں "ستاروں کے کھیل" "گرم راکھ" "بڑی بڑی آنکھیں" اور "نمشا" میں بھی ایسا ہی ہے۔ قارئین کی ہمدردی امرت رائے، چیتن، جگموہن، سنگت سنگھ اور گوبند کی بجائے، لتا، چندا، نیلا، ستیا جی، دانی اور نمشا (یہاں تک کہ مالا سے بھی) ہوتی ہے... میں سمجھتا ہوں کہ میرے افسانے ہوں، ڈرامے یا ناول، عورت کرداروں کے سلسلے میں اس ہمدردی کا راز ماں کو دیئے گئے اس وعدے میں ہے۔ میری تخلیقات میں عورتوں کے لئے جو گہری ہمدردی ہے، اس کا سوتا بھی وہیں ہے۔

○

۱۹۲۶ میں اس وقت جب میں نے قانون پاس کر لیا اور سب جج کے مقابلے میں بیٹھنے کی سوچ رہا تھا میری پہلی بیوی ایک لمبی تکلیف دہ بیماری کے بعد چلی گئی۔ اس کے انتقال سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی (شاید میں ویسی محبت کے قابل بھی نہیں)، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ میں اسے چاہنے لگا تھا ـــــ وہ نہایت سیدھی سادی، بھولی بھالی، ہنس مکھ، فراخ

دل اور الہڑ تھی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، لیکن میں اسے پڑھانے لگا تھا اور وہ شوق سے پڑھنے لگی تھی۔ اور میں اپنی مستقبل زندگی کے خوش آیند خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی لمبی بیماری کے ڈیڑھ دو برسوں میں میں نے جو زندگی دیکھی اور بھوگی، اس کی وجہ سے برسوں سے سوکھا میری شاعری کا سوکھا سوتا دوبارہ بہہ ہی نہیں نکلا، بلکہ مجھے ایسی باریک نگاہ مل گئی جو نہ صرف چیزوں کے آر پار دیکھ سکتی تھی بلکہ بظاہر دکھائی دینے والی حقیقتوں کے اندر نہاں حقیقتوں کی بھی نقاب کشائی کر سکتی تھی...... میں سمجھتا ہوں کہ میری بھولی بھالی بیوی کی موت ـــــ صرف موت نہیں بلکہ جن حالات میں وہ واقع ہوئی وہ سب ـــــ میرے ادب کی بنیادی تحریک اور ترغیب میں شامل ہو گیا۔ اس سانحہ نے میرے ادب کے سوتے کو گہرائی دی۔

○

ان ہی دنوں ایک نئی جانب سے ترغیب ملی۔ اس کا اثر بھی دائمی رہا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا، میرے اوّلیں افسانے پریم چند کے اثر کی وجہ سے لاشعوری طور پر افادی تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ادھر میری بیوی کا انتقال ہوا ادھر لکھنؤ کی طرف سے لاہور میں ترقی پسند تحریک کی ہوا کا پہلا جھونکا آیا۔ اس تحریک کے اثر کی وجہ سے نہ صرف میں نے کورے تخیل کا دامن چھوڑ دیا، بلکہ زندگی کی حقیقتوں سے اپنی تخلیقات کے بنیادی خیال لینا، اور اپنے ماحول کی برائیوں جھوٹ، ریاکاری، فرومائیگی خود فریبی، انانیت اور اس ماحول کے تمام نقائص کو گہری نفسیاتی نگاہوں سے دیکھنا اور افادیت بھرے طریق سے ان کی عکاسی کرنا سیکھا۔

چونکہ یہ افسانے میرے پہلے کے افسانوں کی بہ نسبت زیادہ پسند کئے گئے اور ہر دل عزیز ہوئے، اس لئے ترقی پسند تحریک کا اثر بھی دائمی رہا۔ اس تحریک نے مجھے جو ترغیب دی، وہ بھی میرے ادب کی بنیادی ترغیبات میں شامل ہوئی۔

○

ظاہرہ طور پر نظر آنے والے ان اثرات اور ترغیبات کے علاوہ زندگی میں کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جو غیر شعوری طور پر ادیب کو انگیخت کرتے ہیں اور اسے بہتر سے بہتر لکھنے کے لئے اُکساتے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں ان دو شادیوں کا ذکر کروں گا جو میں نے ۱۹۴۱ء کے ایک ہی سال میں یکے بعد دیگرے کیں۔

جس زمانے میں میری پہلی بیوی کی وفات ہوئی، ان دنوں ہمارے ہندو سماج میں اِدھر

مرحومہ کے پھول آتے تھے ادھر لڑکیوں والے سگائی لے کر آجاتے تھے۔ مجھے یہ رسم نہایت سنگدلانہ لگتی تھی۔ اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میں نے چار برس شادی نہیں کی۔ دوسری شادی کا میرا کوئی ویسا ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن کچھ معاشرے کے دباؤ اور کچھ دوسرے حالات کی وجہ سے میں نے ۱۹۴۱ میں دوبار شادی کی ——— دوسری بیوی سے فروری ۱۹۴۱ میں اور تیسری سے ستمبر ۱۹۴۱ میں۔

درحقیقت شادی تو میں اپنی موجودہ بیوی سے ہی کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ میری زندگی میں تب آئی جب ایک خاص واقعہ کی وجہ سے میری سگائی ہو چکی تھی۔ میں نے سگائی ختم کرنے کی لاکھ کوشش کی۔ کامیاب نہیں ہوا۔ کوشلیا سے کہا کہ چپ چاپ آریہ سماج مندر میں شادی کر لیتے ہیں، سگائی اپنے آپ ٹوٹ جائے گی۔ وہ اس طرح گپ چپ شادی کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ بہرحال دوسری شادی کی تلوار تو سر پہ لٹک ہی رہی تھی۔ وہ گر گئی اور فروری میں شادی ہو گئی۔ ڈیڑھ ماہ کی ازدواجی زندگی کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ اگر میں اس نیک بخت کے ساتھ رہوں گا تو لکھنا پڑھنا اور ادب ودب سب دھرا رہ جائے گا اور میں پانچ برسوں میں پانچ بچوں کا باپ بن جاؤں گا۔ روز کا لڑائی جھگڑا۔ سو الگ ——— میں نے نوکری چھوڑ دی، بیوی چھوڑ دی اور دِلّی بھاگ گیا، جہاں کرشن چندر مرحوم نے نہ صرف مجھے ریڈیو میں ملازمت دلادی، بلکہ تین مہینے بعد جب کو یا دِلی آئی تو بڑے بھائی کی طرح اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور باقاعدہ شادی کرادی۔

انگیجمنٹ ان دو شادیوں سے یوں ملی کہ میری دوسری بیوی ادب کے سلسلے میں میری کامل سپہ گی کو نہیں سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بدچلن آدمی ہوں اور محض بہلانے بناتا ہوں۔ سو میں نے لگاتار لکھا اور بہتر لکھا ——— اسے یہ دکھانے کے لئے کہ میں جو کہتا تھا، وہی سچ تھا اور اپنی جہالت میں وہ اسے سمجھ نہیں پاتی تھی۔

میری موجودہ بیوی لاہور کے ایک بڑے کھتری گھرانے سے متعلق ہے۔ اس کے متمول رشتے دار پریشان تھے کہ ان کی لڑکی نے کس آوارہ اور بدنام آدمی سے شادی کر لی ہے۔ سو میں اس کی ۲۶ ممیری اور موسیری اور پھپھیری بہنوں اور ان کے سرپرستوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ اس نے غلط چناؤ نہیں کیا تھا۔ ان دونوں شادیوں نے مجھے بہتر سے بہتر لکھنے اور اچھے متوسط طبقے کے رشتے داروں کے من میں شاعر اور ادیب کے لئے عزت اور قدر و منزلت پیدا کرنے کی زبردست ترغیب دی ہے ——— شعوری طور پر نہیں، غیر شعوری طور پر۔

○

ان سب سے بڑی انگمت اور حیرت (چیلنج) اس زبردست مخالفت نے دی۔ جس کا سامنا ہندی کے ادبی میدان میں قدم جماتے ہی مجھے کرنا پڑا اور آج تیس برس گزر جانے پر بھی جو اسی طرح برقرار ہے۔ میں اگر صرف ایک صنف میں لکھتا، یا محض شوقیہ لکھتا تو شاید کچھ مشکل نہ ہوتی۔ دوسرے ادیبوں کی طرح میں اپنا مضبوط گروپ بھی بنالیتا اور ہندی رسائل وجرائد کے ایڈیٹروں اور نقادوں کو بھی پٹالیتا۔ (جب میں ہندی کے مرکز الٰہ آباد سے دور لاہور دہلی اور بمبئی ــــ یعنی ہندی ادب کے حاشیے پر ــــ رہتا تھا تو میری تمام چیزوں کی بھی بھرپور تعریف ہندی نقادوں نے کی ہے۔ اور بعد میں میری اچھی سے اچھی تخلیق بھی رسائل و جرائد میں کسی طرح کے تبصرے اور تنقید کے بغیر رہ گئی۔ یہ بات دیگر ہے کہ نقادوں اور ساتھی ادیبوں کی خاموشی کے باوجود میرے قارئین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اور میری ان تخلیقات کے بارے میں روس جرمنی اور امریکہ میں مقالے لکھے گئے۔ جنھیں ہندی نقادوں نے قابلِ ذکر بھی نہیں سمجھا تھا)

قصور میری انا اور ضد کا بھی ہے، علاوہ ازیں جو ادیب محض شاعر یا افسانہ نگار ہی نہ ہو، بلکہ یک بابی ڈرامے بھی لکھے، مکمل سہ بابی ڈرامے بھی لکھے، بڑے بڑے ضخیم ناول اور تبصرے اور تنقید میں اور سرگذشتیں بھی قلم بند کرے، اس کے پاس نقادوں اور ایڈیٹروں کو پیارے پیارے خط لکھنے کا کہاں وقت رہ جاتا ہے ــــ خصوصاً اس وقت، جب کسی قسم کی ملازمت کے بغیر اس کے سامنے آزادانہ زندگی گذارنے اور اپنے گھر کو اچھی طرح تیل دی گئی مشین کی طرح چلانے کا بھی مقصد ہو اور جو اپنے بیٹوں کو ہی نہیں اپنے پوتوں کو بھی اپنی ذاتی نگہداشت میں پالنا اور پروان چڑھانا چاہتا ہو اور اپنی کتابوں کو خود چھاپنا اور ان کی نکاسی کرنا بھی ــــ پھر جسے خدا نے صحت بھی اچھی نہ عطا کی ہو اور جو لڑکپن سے بڑھاپے تک مہینوں پیچش، سنگرہنی، پرانے ملیریا، قولنج، دق، ای اوسنوفیلیا، یرقان، اکیوٹ گیسٹرائٹس۔ لیکوپلاکیا (کینسر کی پہلی سٹیج) اور آخر کار پرانے دمے کا بھی مریض ہو۔ لیکن ــــ

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت ہیں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر کے اس شعر میں میرا کامل اعتقاد ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میری زندگی کی ہر مصیبت عقوبت، سانحہ، بیماری، اور چیلنج مجھے ایک قدم آگے بڑھا گئے ہیں اور ان سب کے باوجود، اور غالباً ان ہی کی وجہ سے، میں متواتر لکھتا رہا ہوں اور کوشش کرتا رہوں کہ بہتر سے بہتر لکھوں۔

○

جہاں تک میں اپنے اندر اور باہر کھوج کر سکا ہوں، میری تخلیق کے سوتے تو یہی ہیں ـــــ لیکن یہ سب کہنے کے بعد میں اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ شاید میرے دماغ کا کوئی پرزہ خاصا ڈھیلا ہے، میں لاکھ کوشش کرنے کے باوجود اسے کس نہیں سکا اور میں نے صرف یہ کیا ہے کہ سولہ آنے پاگل ہو جانے سے بچنے کے لئے میں نے اپنے اس اوور ایکٹو (ضرورت سے زیادہ سرگرم کار) دماغ کو خوب چوبیسوں گھنٹے کسی نہ کسی ادبی کام میں لگائے رکھا ہے۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یاد رنہ کرنے کے باوجود میں سخت خود پسند، اَنا کا مارا ہوا آدمی ہوں اور میری یہ اَنا مجھے جھکنے نہیں دیتی اور خودداری سے سر اٹھائے رکھنے کے لئے مجھے لگاتار لکھنا اور بہتر لکھنا ضروری لگتا ہے۔

یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں ضرورت سے زیادہ حسّاس ہوں۔ میری کھال بے حد پتلی ہے۔ ناانصافی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ فرد کے ساتھ معاشرے کی بے انصافیاں یا معاشرے کے ساتھ فرد کی بے انصافیاں مجھے پریشان کرتی رہتی ہیں اور میں اپنے ماحول میں رچے بسے جھوٹ، ریاکاری فریب، چھل، بے حقیقی اور فرومائیگی کا پردہ فاش کرنے کے لئے لکھتا ہوں یا خود اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے بارے میں،

آج سے تقریباً تین دہائی پہلے ہندی کے ایک بہت بڑے شاعر نے میرے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا۔ جس کی مجھے خواب میں بھی توقع نہ تھی۔ میں ان سے ناراض ہو گیا۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھے، تاڑ گئے۔ انھوں نے مجھے خوش کرنے کے لئے بہت کچھ کیا۔ لیکن میرے من سے کدورت نہ مٹی۔ میں ان کے ہاں آنے جانے تو لگا، لیکن اپنے کردار کی اِسی خامی کے باعث اس واقعے کو بھلا نہ سکا ـــــ در اصل یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی کہ اتنا بڑا شاعر اتنی گھٹیا اور فرومایہ حرکت کیسے کر سکتا ہے لیکن ان ہی نے نہیں، دوسرے بڑے ہندی ادیبوں نے بھی مصیبت کے ان دنوں میں میرے ساتھ کچھ ویسا ہی سلوک کیا، میں انھیں بھی معاف نہیں کر سکا اور اپنے آپ کو انسانی نفسیات کا ماہر سمجھنے کے باوجود یہ باور نہیں کرا سکا کہ وہ لوگ کتنے ہی بڑے ادیب کیوں نہ ہوں، آخر ہیں تو انسان ہی اور اس ناطے ان میں بھی کمزوریاں ہیں۔ اور مجھے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن میں بھی انسان ہوں زود حس ہوں اور زیادتی برداشت نہیں کرتا۔

بہر حال ہندی کے وہ عظیم شاعر جیوتش اور پامسٹری میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ایک دن

میں کوشلیا کے ساتھ ان کے ہاں گیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ دیکھا اور مسکرا کر بولے ——— "ٹھیک ہی آج تو کوشلیا جی بیٹھی ہیں، ورنہ میں کچھ پتے کی باتیں بتاتا۔"

مجھے اس بات کا تجسس ہوا کہ نہ جانے انھوں نے میرے ہاتھ میں کیا دیکھا ہے جو میری بیوی کے سامنے نہیں بتا سکے۔ دوسرے ہفتے میں تنہا ان کے ہاں گیا اور ان سے وہ باتیں بتانے کے لئے کہا۔ انھوں نے کہا "آپ کا ٹھکر کمزور ہے، آپ کامی ہیں۔" میں نے کہا "جانتا ہوں اس لئے اپنے کام (سیکس) کو لگاتار لکھنے میں غرق کئے رہتا ہوں۔"

"دوسری بات یہ ہے" انھوں نے کہا "آپ بے حد بھاؤ پردن (حساس) آدمی ہیں۔ اگر آپ اپنی بھاو پرونتا (زودحسی) پر قابو نہیں پاتے تو لگاتار دکھ دیں گے اور دکھ پائیں گے"

میں نے کہا۔ "یہ بھی آپ بجا فرماتے ہیں، میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں، لیکن یہ میرے سرشت کا حصہ ہے اور اس پر قابو پانا میرے اختیار میں نہیں۔"

میں وہاں سے چلا تو اسی بات پر سوچنے لگا۔ دھیرے دھیرے ایک نظم میرے دماغ میں روپ پانے لگی۔ گھر پہنچا تو مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے اسے کاغذ پر اتار لیا۔

نظم ہندی میں ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لئے میں اس میں تھوڑا پھیر بدل کر کے لکھتا ہوں۔

اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور سر ہلا دیا
اتنی زودحسی، دنیا میں کیسے رہوگے
اس پر اختیار پاؤ ورنہ
لگاتار دکھ دوگے متواتر دکھ سہوگے

یہ ننگے گوشت سا ٹھکتا احساس
میں جانتا ہوں میری کمزوری ہے
ذرا سی چوٹ مجھے بہرا دیتی ہے
ایک ٹیس ہے، جو دل کی گہرائیوں تک دوڑتی چلی جاتی ہے
دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑا دیتی ہے

لیکن یہ احساس تو مجھے زندہ رکھے ہے
یہی تو میری شہزوری ہے
ورنہ کھال، جب موٹی ہو کر ڈھال بن جاتی ہے
جب ننھے بچے کے ہی نہیں،
آدمی بڑے بڑے وار ——
بے شرمی سے ہنس کر سہ جاتا ہے
جب اس کا ہر آدرش
دنیا کے ساتھ چلنے کی شرط میں بہہ جاتا ہے
جب دھن دولت اور خوشحالی اس کے قدم چومتے ہیں
وہ مزے سے کھاتا پیتا اور سوتا ہے
تب ہی ہوتا ہے
کہ وہ مر جاتا ہے۔
وہ جانتا نہیں
لیکن اپنے کندھوں پر اپنی لاش
آپ ڈھوتا ہے

اور میرے دل میں لگاتار ایک آگ سلگتی رہتی ہے وہی شاید میرے ادب کی بنیادی تحریک بھی ہے۔ میں نے لکھا بھی ہے۔

اک آگ ہے کہ دل میں سلگتی ہے ہر گھڑی
چاہو تو اس کو گیت غزل میں اتار لیں

اور گیت غزل میں، افسانہ، ڈرامہ، ناول، تنقید اور سرگزشت سب شامل ہیں اور میں بے تکان لکھتا ہوں۔ □

راجندر سنگھ بیدی

ترکِ غمزہ زن

سنہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے منشی پریم چند کی وفات کے سلسلے میں لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں تعزیتی جلسہ ہوا۔

میری ادبی زندگی کی شروعات تھی بمشکل سے دس بارہ افسانے لکھے ہوں گے جو کہ معمول کی دقتوں کے بعد آہستہ آہستہ ادبی رسالوں میں جگہ پانے لگے۔ ہم نئے لکھنے والوں کی کھیپ منشی جی سے اثر پذیر تھی، اس لئے ہم سب کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا مجازی باپ چلا گیا۔ چنانچہ اپنا غم دوسروں کو دکھانے۔ دوسروں کے غم کو اپنا بنانے کے لئے میں بھی جلسے میں پہونچ گیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ جائز اور حقیقی وارثوں سے ملیں گے جن سے غائبانہ تعارف تو تھا لیکن سامنے کی ملاقات نہ تھی۔

جلسہ شروع ہوا۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اچھا لکھنے والے اچھی تقریر بھی کر پائیں۔ کچھ لوگوں نے بہت ہی اچھی تقریریں کیں اور میں سمجھ گیا۔ اس جلسے میں ایسے بھی تھے جنھوں نے چھاتی پیٹ پیٹ کے محرم کا سماں پیدا کر دیا۔ یہ سب "پرچے بیچنے" والے تھے، جنھیں یوں الفاظ کے خاک و خون میں غلطاں دیکھ کر مجھے شرت چندر چٹرجی کے کردار دیو داس کی یاد آ گئی جو اپنے باپ کی موت پر گھر کے ایک کونے سے لگا رسمی آہ و بکا کرنے والوں کو اپنے دنیا دار بھائی کی طرف یہ کہہ کر بھیج دیتا ہے — "اُدھر!"

جلسہ میں کچھ لوگ اُدھر والے بھی تھے۔ اُن میں سے ایک اٹھا۔ سانولے رنگ کا دیوار کے ساتھ گڈی لگی، سلیٹ کا سا ماتھا۔ تشار کانتی گھوش کے سے بال، آنکھوں پر ہیرلڈ لائیڈ کا سا چشمہ۔ دھوتی کرتے میں اُوپر سجد، نیچے ٹھاکر دوار۔ تھکا تھکا مضمحل۔ مرنے سے برسوں پہلے مرا ہوا۔

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں!" اس نے اپنی ڈُنڈی انگلیوں کو انگوٹھے کے ساتھ لگاتے ہوئے ہاتھ صاحب صدر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

صاحب صدر نے اجازت دی بھی نہ تھی کہ اس نے میز پر پہونچ کر ایک کرخت آواز، ایک بھونڈے لہجے میں شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پنجابی ہتھوڑے سے ہندی اور اُردو کے کوبڑ نکال رہا ہے۔

ابھی لندن کے لئے روانہ ہوا. کلکتہ پہونچ گیا. پھر لوگوں نے دیکھا، یہ تو کو مٹیٹور میں گھوم رہا ہے، پھر دلی میں ہے، کبھی کسی خیالی جیٹ پر بیٹھ کر منزل پر پہونچ گیا. تقریر کیا تھی ایک ایسے آدمی کی چال تھی، جو غم کے مارے زیادہ پی گیا ہو. لیکن اسے کسی کی پرواہ نہ تھی. وہ "نالہ پابند نے نہیں ہے" کے سے انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ میز کے ایک طرف کھڑا وہ کل عالم کا باپ ہے اور اردگرد کے سب لوگ اس کے بچے بالے ہیں جو کھیل رہے ہیں اور انھیں کھیلنے دینا چاہیئے......

ان سب باتوں کے باوجود اس کی تقریر میں ایک اثر تھا کیونکہ وہ اُس دل سے آئی تھی جو صرف ونحو کے قواعد سے ناواقف ہوتا ہے. اس میں ایک درد تھا اور ایک کلبلاہٹ تھی جو صرف طباعوں کے حصے میں آتی ہے' اور جس کا غیر منطقی منطق "پرچہ بھیجئے" والوں کو حیران کیا کیا کرتا ہے. وہ ان خطوط کا حوالہ دے رہا تھا، جو منشی جی نے اپنی حیات میں اسے لکھے تھے اور جس میں رہنمائی اور عقدہ کشائی کی بہ نسبت اپنے ہم مشرب سے جذباتی یگانت کا اظہار زیادہ تھا اور جو خط اس ماتمی لمحے میں محض خط سے بڑھ کر اب ایک خزانہ ہو چکے تھے.

یہ اشک تھا. اس سے پہلے میری اشک سے ملاقات تک نہ ہوئی تھی. میں نے اُس کو سدرشن کے رسالے "چندن" میں پڑھا ضرور تھا لیکن دیکھا نہ تھا. یہاں تک کہ اس کی کوئی تصویر بھی میری نظر سے نہیں گذری تھی. جو لوگ اشک کو جانتے ہیں کہیں گے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا. اشک تو تصنیف وتالیف کے ساتھ تشہیر کا بھی قائل ہے اور اس لکھنے والے کو بیوقوف اور جاہل سمجھتا ہے جو صرف لکھنا ہی جانتا ہے. بعد میں میں نے بھی دیکھا اشک نہایت بے تکلفی سے اپنی کوئی اُلٹی سیدھی تصویر کسی ایڈیٹر یا کسی ناشر کے گلے منڈھ دیتا ہے جو اس غریب کو چھاپنی ہی پڑتی ہے اور کیا تصویر ہوتی ہے!— سامنا ایک چوتھائی، تین چوتھائی یا پروفائل جس میں زلفیں کاندھے پر بکھری ہوئی ہیں یا اگر شیو بنی ہے تو سر کے بالوں کو بڑی صفائی سے کنڈلوں میں ڈال رکھا ہے. کچھ دیر دیکھنے پر یقین ہو جاتا ہے — مرد ہے — ابھی ننگا ہے. ابھی ڈھاپے ہوئے.... ایک منٹ ایک پرچہ ایک کتاب! پہلے سر پر گاندھی ٹوپی تھی تو اب فلیٹ ہیٹ ہے. جو سر پر عمداً ٹیڑھی رکھی ہے اور بانکا لگ رہا ہے. اس پر ستم یہ کہ خود بھی مسکرا رہا ہے...... یا سر پر قرہ قلی ہے اور آنکھیں ادھ کھلی. ترکِ غمزہ زن معلوم ہو رہا ہے جو اس کے ہزاروں پڑھنے دیکھنے والوں کو کھل رہا ہے اس پر بھی جو دل میں گھر کئے ہوئے ہے. حافظ کے الفاظ میں دل کے نہاں خانے میں آرام کر رہا ہے. اور خلقت کو گمان ہے کہ وہ محفل میں بیٹھا ہے...... میں جو داڑھی کو کسی دشمن کے چہرے پر دیکھنا

چاہتا ہوں اور اس ڈر کے مارے آئینہ نہیں دیکھتا، اشک کے چہرے پر فرانسیسی طرز کی بکروٹ دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد اشک کی شکل کسی تصویر میں کیا ہوگی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ خود اشک کو نہیں معلوم، کیونکہ تلوار کی دھار کے سے مت، چانکیہ کی سی بدھی اور دور پہونچنے والی نگاہوں کے باوجود اشک اس لمحے کا پورا احترام کرتا ہے جس میں وہ اُس وقت جی رہا ہو۔ وہ صرف حواس ہی سے زندگی کا لطف نہیں لے رہا، اُس میں شعور بھی پورے طریقے سے شامل ہے معلوم ہوتا ہے حال اور تیل وقال کے سلسلے میں اگر کرشنا مورتی کو کسی نے غلط پڑھا ہے تو اشک نے۔ ہو سکتا ہے کہ اگلی تصویر میں وہ جوگیا نالپٹے ہوئے ہو۔ اور ایک ہاتھ سے دیکھنے والے کی طرف "چھو" بھی کر رہا ہو۔ یہیں پر بات ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ تصویر ایسے ناول کا بھی حصہ ہو سکتی ہے، جو سرتاسر پھول کی پتی ہو اور جس سے ہیرے کا جگر بھی کٹ سکے۔

شاید کوئی ازلی دوستی تھی یا ابدی رشتہ قائم ہونے والا تھا کہ اشک سے متعارف ہوئے بغیر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص اشک کے بغیر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس دور کے سب لکھنے والوں میں سے جو آدمی منشی جی کے قریب تھا اور ان سے ہم رنگ تھا وہ اشک تھا۔ منشی جی نے اپنی زندگی میں دوسروں کو بھی خطوط لکھے ہوں گے، لیکن جن خطوط کا اشک حوالہ دے رہا تھا ان کا مضمون ہم مشربی کی طرف اشارہ کرتا تھا..... جلسہ برخواست ہوا۔ میں ان دنوں پوسٹ آفس میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس لئے پبلک کی شکایتوں سے بہت ڈرتا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے میں اشک کے پاس پہونچ گیا۔ وہ ایک ایڈیٹر صاحب کے ساتھ بحث میں الجھا ہوا تھا۔ بحث کے خاطر بحث کرنا اشک کا آج تک شیوہ ہے۔ یہ بات نہیں کہ جو وہ کہنا چاہتا ہے اس میں وزن یا دلیل نہیں ہوتی۔ سب کچھ ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا لیکن اشک تو اس میں سے ایک خاص قسم کا چھندری مزا لیتا ہے اور اس سلسلے میں بحث و تمحیص کے سب حربے استعمال کرتا ہے۔ ایک آدمی ابھی ابھی مدلل گفتگو کر رہا ہے، لیکن اشک اسے یہ کہہ کر ہم شاید دو مختلف چیزوں کی بات کر رہے ہیں اسے ایسی سوچ، ایسی گھبراہٹ میں ڈال دیتا ہے کہ گفتگو کرنے والے کی ریل صاف پٹڑی سے اُتر جاتی ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ ایک بار ریل پٹڑی سے اُتر جائے تو کیا ہوتا ہے۔ مخالف تلملاتا ہوا رہ جاتا ہے۔ اگر وہ ہوشیار ہو اور غلط بحث ہونے دے تو آپ کو ٹھٹھا کا مار کر ہنستا ہوا اور کہتا ہوا ملے گا:"تم تو یار سنجیدہ ہو گئے...!" ابھی وہ پورے طریقے سے سمجھ بھی نہیں سکا کہ اشک اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہہ رہا ہے

دراصل جو بات تم کہہ رہے ہو، ذہن میں بھی کہہ رہا ہوں صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے ....
اس کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ دوسرا آنکھیں جھپکتا رہ جائے اور اپنے آپ کو بیوقوف سمجھنے لگے۔ یا پھر خفا ہو جائے کہ مجھ سے خواہ مخواہ زبان کی ورزش کرائی گئی۔ نتیجہ ہر دو صورت میں وہی ہوتا ہے۔ کوئی خفا ہو تو میدان اشک کے ہاتھ میں اور خوش ہو تو اشک کے ہاتھ میں۔ چت بھی اشک کی اور پٹ بھی اشک کی .... جب میں دھیرے دھیرے سرکتا ہوا اشک کے پاس پہونچا تو بحث کرنے والے ایڈیٹر کا بگل بج چکا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"اشک صاحب!"

ایک دم گھوم کر اشک نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑدیں اور میرے آر پار دیکھنے لگا۔ آپ اندازہ کیجئے۔ اگر میرے کمرے میں عام روشنی کی بجائے رونتجن شعاعیں (X-RAYS) ہوں تو بڑے سے بڑا رومانی منظر بھی کیا ہوگا۔ یہی نا کہ کھوپڑی سے کھوپڑی ٹکرا رہی ہے۔ ایک ڈھانچے کا بازو اٹھا اور دوسرے ڈھانچے کے گلے میں پیوست ہو گیا اور معلوم ہوا کہ صنفِ مخالف کو ہم آغوشی کے لئے نہیں گلا گھونٹنے کے لئے اپنی طرف کھینچا جا رہا ہے اور پھر گلا بھی کہاں؟ ..... میں نے کہا "بڑی مدت سے میری تمنا تھی کہ اشک صاحب ....."

"آپ ---؟ اور پھر اگلے ہی لمحے میں وہ کہہ رہا تھا "تم کہیں راجندر سنگھ بیدی تو نہیں؟"

ایکا ایکی جیسے میں اپنا نام بھول گیا یا کم سے کم یہ ضرور محسوس ہوا کہ راجندر سنگھ بیدی کوئی دوسری شخصیت ہے، جسے میں نہیں جانتا ہوں۔ جبھی اپنے آپ میں آتے ہوئے میں نے کہا "ہاں اشک صاحب میرا ہی نام راجندر سنگھ بیدی ہے"

انسان کی انا کہاں تک پہونچتی ہے۔ دراصل یہ دنیا کتنا بڑا جنگل ہے۔ کتنا بڑا صحرا جس میں وہ کھویا کھویا پھرتا ہے اور ہر دم یہی چاہتا ہے کہ کوئی بھی اسے پہچانے، کوئی بھی اس کا نام پکارے اور جب ایسا ہو جائے تو اسے کتنی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ایک بچہ تو دھیرے دھیرے اپنا نام سیکھتا ہے، اپنی ذات کو دوسروں سے الگ کر کے دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن بڑا ہو کر اپنے مجازی نام کو پالینے کے بعد اپنے حقیقی نام کے لئے کتنی دوڑ دھوپ کرتا ہے اور پہچانے جانے کے بعد وہ اپنے نام کو اسم اعظم سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا پھر اس میں جذب ہو جانے کی تمنا کے باوجود اپنی ایک انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ اگر میں نے اشک کو ملے بغیر اسے پہچان لیا تو اس نے بھی

ایک ہی نظر سے مجھے جان لیا ..... میں پھر ایک چھوٹا سا ادیب اور ایک اتنا بڑا ادیب مجھے میرے نام سے جانتا ہے ..... یہی نہیں اس نے میری ایک دو کہانیوں کا ذکر بھی کر دیا جو ان دنوں تھوڑے تھوڑے وقتی فرق کے ساتھ لاہور کے رسالوں میں چھپی تھیں .... وہ ان کی تعریف بھی کرتا تھا ..... کیا یہ سچ ہے ؟ اس لق و دق ویرانے میں مجھ بے بضاعت ڈاک خانے کے ایک بابو کے لئے بھی جگہ ہے ؟.....

جگہ تھی یا نہیں ۔ اِس وقت بھی ہے یا نہیں ، اس سے بحث نہیں ، اشک جسے پسند کرتا ہے اسے تسلیم بھی کرتا ہے اور نام و نمود کی اس دنیا میں اس کے لئے جگہ بنانے کی شعوری کوشش بھی ۔ یہ بات ہے جو میں نے اشک میں بدرجہ اتم پائی ہے ۔ آج جب میں اپنے پیچھے ادبی زندگی کے تیس سال دیکھتا ہوں تو ندامت سے اپنی گردن جھکا لیتا ہوں ۔ میں نے تو کسی نئے لکھنے والے کی مدد نہیں کی ۔ میں بھی اشک کی طرح ان کی تعریف کر سکتا تھا ۔ تنقید کر سکتا تھا اور ان کے لئے راستہ آسان کر سکتا تھا لیکن میں میں ہوں اور اشک اشک آج بھی جب میں اشک سے ملتا ہوں تو اسے کسی نئے لکھنے والے کا نام لیتا ہوا پاتا ہوں ۔ مجھے اچنبھا ہوتا ہے ۔ وہ محبت جو انسان چوبیس گھنٹے اپنے ساتھ کرتا رہتا ہے نفرت سے بدل جاتی ہے اور چونکہ آدمی ہر حالت میں اپنے آپ سے پیار کرنا چاہتا ہے اس لئے اشک سے آدمی چڑ جاتا ہے ۔ میری اس کمزوری کی وجہ کیا ہے ؟ شاید میرے لئے اسے سمجھانا مشکل ہے اور کسی کے لئے سمجھنا مشکل ۔ آسانی کے لئے صرف اتنا کہوں گا ..... مجھے شروع ہی سے ایک احساس کمتری ہے ۔ باوجود کوشش کے ، دوسروں کی تحسین و تسلیم کے ، میں اسے نہیں جھٹک سکا ..... جیسے مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں .... کیوں یقین نہیں ؟ اسے جاننے کے لئے کسی کو میری زندگی جینا پڑے گی اور اشک کو کیوں یقین ہے اس کے لئے اشک کی زندگی جینا پڑے گی ۔

اگلے ہی لمحے ہم دو دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے ، جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں ..... شاید گرمیوں کا موسم تھا اور آسمان پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا ۔ نیچے کی دھول اور گرد تھی ، جو کچھ علاقوں سے بیشمار گھوڑوں کی ٹاپ سے یا بے لگام ہوا کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی اور اب ریزہ ریزہ نیچے آ رہی تھی ۔ ہم پیدل چل رہے تھے ۔ اشک باتیں کر رہا تھا اور میں سن رہا تھا ۔ وہ بہت باتیں کرنا چاہتا تھا ۔ ایسا کیوں تھا ؟ اس کی وجہ مجھے بعد میں پتہ چلی ۔ اس وقت ہماری باتیں ایک نئے شادی شدہ جوڑے کی سی باتیں تھیں ۔ جو رات بھر

ایک دوسرے کو کچھ کہتے سنتے رہتے ہیں اور دوسرے روز اپنی ہی باتوں کا "تات پریہ"[۱] نہ پاکر حیران ہوتے ہیں۔ پیدل چلتے باتیں کرتے ہوئے ہم انارکلی کے قریب پہونچ گئے، جہاں اشک نے مجھے اپنا گھر دکھا دیا۔

اشک کا گھر انارکلی کے بازار سے ہٹ کر پیچھے ایک گنجان آباد گلی میں تھا، جس میں اکثر عورتیں اپنے مکان سے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے سنائی دیتی تھیں۔ "بھابو" آج تیرے کیا پکا ہے؟" اور وہ جواب میں کہتی "آج کچھ نہیں پکا۔ یہ باہر کھانا کھا رہے ہیں نا۔ تو دال ایک کٹوری میں بھیج دینا ....." اور کہیں آپ بے خبر جا رہے ہوں تو اوپر سے کوڑا گرتا ہے اور آپ کی طبیعت تک صاف کر دیتا ہے۔ گلی میں اتنی جگہ نہیں کہ کوئی اچھل کر ایک طرف ہو جائے کوئی لڑکا کوٹھے میں کھڑا سامنے کی کھڑکی میں جھکی ہوئی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلیاں کھجلا دیتا ہے، جو لاہور کا عام منظر ہے اور جس سے پتہ چلتا ہے کہ عشق کے لئے لاہور شہر سے بہتر دنیا میں کوئی اور جگہ نہیں ..... اور اسی گلی میں اشک رہتا تھا۔ اگرچہ اشک اور عشق کے ہجّوں میں فرق ہوتا ہے لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ بات گھوم پھر کر وہیں پہونچتی ہے۔ کیا خبر کب عشق اشک میں بدل جائے یا اس کا اُلٹا ہو جائے .... اشک کا مکان دو منزلہ تھا جس کی اُوپر کی منزل پر اشک کے دندان ساز بھائی ڈاکٹر شرما بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے اشک اور اس کا کتب خانہ۔ کام کرنے کی جگہ .... جہاں پہونچنے کے لئے دُبلے کی جنّت اور موٹے کے دوزخ قسم کی سیڑھیوں پر سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ ایک رسّہ تھا جو لوگوں کے ہاتھ لگ لگ کر میلا ہو چکا تھا اور جسے پکڑ کر نہ چلنے پر لڑھک جانے کا ڈر تھا۔ اس تنگ تاریک مکان میں اشک رہتا تھا۔ یہیں وہ آرٹسٹ کے وشی واشی (WISHY WASHY) انداز میں لکھتا۔ کاٹتا۔ پھر لکھتا۔ پہلے نقش کو مٹا کر دوسرے نقش بنانے لگتا۔ لکھنا اس کے لئے عادت تھی اور عبادت بھی، جو زندگی کے پرے تھی تو موت سے بھی پرے۔

اشک چھوٹی عمر میں اپنی روزی کمانے لگا۔ اس کے والد اسٹیشن ماسٹر تھے، جنھیں شراب پینے اور گھر سے بے پروا ہونے کی عادت تھی۔ وہ گھر کی طرف رجوع بھی کرتے تو کسی تادیبی کارروائی کے لئے۔ بیوی سے لڑ رہے ہیں، اس پر گرج رہے ہیں یا کسی بچے کو اُلٹا لٹکا کر اسے بید سے مارا جا رہا ہے۔ ان کی شکل جابر تھی اور عقل بھی جابر، جو فیصلہ ہو گیا اٹل ہے۔ اس زبردست شخصیت والے مرد کے ساتھ ایک گائے صفت عورت کی شادی ہوئی، جو اشک کی ماں تھی، اپنے

[۱] تات پریہ۔ مطلب

مرد کے ظلم نے جس کے چہرے پر ایک مظلومیت دوام کر دی تھی۔ اشک کی تحریروں میں گھریلو نزع کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ کے متضاد کردار بھی آتے ہیں۔ یہ اس زبردست شخصیت والے باپ ہی کی وجہ سے تھا کہ اشک نے زندگی میں اپنی جگہ پانے کے لئے باپ کی عاطفت کا سایہ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے چیلنج دیا، باپ نے قبول کیا اور دونوں جیت گئے۔ کیونکہ زندگی کی منقلب ہواؤں اور جھکڑوں سے ٹکر لینے والا خود دِق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر موت کا منہ چڑاتا ہوا بچ کر نکل آنے والا ناداری اور تِس پہ دوستوں اور عزیزوں کی بے رخی کے باوجود معاصرانہ تعصب سے بچتے ہوئے شہر الہ آباد میں نشر و اشاعت کے کاروبار کو مستحکم کرنے والا ایسے ہی باپ کا بیٹا ہو سکتا تھا۔

اشک کے ماں باپ چھ بیٹے اس دنیا میں لائے اور سب کے سب نے جالندھر جیسے مردم خیز خطے میں جنھوں نے پرورش پائی جہاں کا ہر آدمی شاعر ہے یعنی مغنی۔ جہاں سال کے سال ہر بلب کا میلہ ہوتا ہے اور پورے ہندوستان سے پکّا راگ گانے والے چلے آتے ہیں اور گاتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ اس شہر کا بچہ بچہ "پد پایان" ہے جو سیدھا کلیجے میں لگتا ہے۔ جانتا ہے کہاں کوئی سُر غلط لگ گیا۔ پھر وہ لحاظ تھوڑا ہی کرے گا جہاں کہیں بھی کونے میں بیٹھا ہے وہیں سے پکار اُٹھے گا اور برسوں اپنے یا اپنے استاد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے اور سنگیت سیکھنے کی دعوت دیگا سردیوں کی رات کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ بیت بازی کرے گا جو صبح تک چلے گی ..... اس شہر کا ہر بشر اپنے آپ کو طباع سمجھتا ہے اور اس کی طباعی کو تسلیم نہ کیا جائے تو ایک ہاتھ ہے جو سیدھا نہ ماننے والے کی پگڑی کی طرف آتا ہے پھر گالیوں اور مار پیٹ تک نوبت آ سکتی ہے .... یہ چھوٹوں بھائی اس شہر کی پیداوار تھے۔ اور یہ حیرت کی بات نہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایک مسلمہ فرد تھا۔ ایسے شخص کے حامل جس سے وہی انکار کرے، جس کی شامت آئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے گھونسہ بھی دلیل کا ایک حصہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ گھونسہ نہ تان سکے تو یونہی شور مچا رہا ہے۔ مکان سے "مر گیا" اور "مار دیا" کی آوازیں آ رہی ہیں اور لوگ اس کان سے سُن کر اس کان سے نکال دیتے ہیں۔ ایک دن کی بات ہو تو کوئی کچھ کرے بھی ہر روز اس مکان سے کوئی نہ کوئی گرج سنائی دیتی ہے۔ چھوٹوں کے چھوٹوں شیر۔ کوئی بڑا اپنے وزن سے دوسروں کو دبا لے، پیٹ ڈالے، لیکن چھوٹا بھی گرجنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ کچھ نہیں تو زخمی ہو کر چلا رہا ہے، شور مچا رہا ہے، شور کے بنا کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ چاروں طرف ایک ہڑبونگ س

بھی ہے - دو اِدھر آ رہے ہیں تین اُدھر جا رہے ہیں۔ کچھار سے نکل رہے ہیں کچھار میں داخل ہو رہے ہیں۔ خون بہہ رہا ہے مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ اس لئے مارا جا رہا ہے کہ مار کیوں کھائی ہے اور سب کی گرج اور ایک پاٹ دار آواز ایک اور بڑی گرج میں دب جاتی ہے "چپ" بس — یہ پتا جی کی آواز ہے۔ ایک شیر ببر کی گرج، جسے سن کر پورے جنگل میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس گیر کے بیلے (GIR FOREST) میں کوئی لومڑی نہیں ہے۔ گائے ماں کا پتلی رہ جاتی ہے۔ جبکہ پتا جی بوتل کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، برائی کرتے ہیں لیکن براہمن ہونے کے ناطے بھول بخشوانا بھی جانتے ہیں۔ گا رہے ہیں — "شاما جی میرے اَوگن چت نہ دھرو"

اشک کے پتا کو اپنے براہمن ہونے پر ناز تھا۔ وہ اس پرشرام کی اولاد تھے جس نے ہاتھ میں کلہاڑا لے کر اکیس بار کشتریوں کا ناش کیا تھا۔ کشتری، لڑنا اور مارنا جن کا پیشہ تھا اور جو کسی کے سامنے نہ دب سکے۔ آج بھی پرشرام کی اس اولاد سے دبتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اشک کے پتا کا شراب پینے کا عمل ایک دو بچوں کے بعد اور تیز ہو گیا۔ اچھے بھلے سریندر ناتھ۔ رویندر ناتھ کے سے نام رکھتے ہوئے سیدھے پرشو رام تک پہونچ گئے۔ جو ان چھ بھائیوں میں تیسرا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جالندھر کے اس محلے میں رہتے تھے جہاں کھشتریوں کی برہمنوں کے ساتھ ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ برسوں پہلے محلّے کے کھشتریوں نے مل کر سرپانڈا اشک کے پاگل بابا کو پیٹا تھا جبکہ ان کے ہاں کی عورتیں، جن میں اشک کی ماں بھی تھیں۔ سانس روکے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ جبھی سے ایک عزم تھا جو اشک کی بظاہر مرنجا مرنج ماں کے دل میں پیدا ہو گیا تھا اور یہ اس عزم کی وجہ ہی تھی جس کے کارن نئے پیدا ہونے والے بچے کا نام پرشو رام رکھا گیا۔ بچپن ہی سے اس بچے سے کہا گیا..... ارے! تو پرشو رام ہو کر روتا ہے جس نے کھشتریوں کے کل کا ناش کر دیا اور آنکھ تک نہ جھپکی، اور وہ بچہ روتے روتے خاموش ہو جاتا اور سوچنے لگتا وہ بڑا ہو کر کھشتریوں کی بیخ کنی کرے گا۔ اگلے بیٹے کا نام اشک کے ماں باپ نے اندر جیت رکھا۔ براہمن راون کا سپوت دیوتاؤں پر حکم چلانے ان کو جیتنے والا کھشتری لکشمن کو برچھا مار کر اسے مورچھا گت کرنے والا..... اشک کے ماں باپ کا بس چلتا تو وہ پوری رامائن نئے سرے سے لکھتے، جس میں ثابت ہوتا کہ راون ہیرو تھا اور رام چندر ایک ولین!

اشک کے والدین کے یہاں آٹھ اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے سات لڑکے تھے اور ایک بیٹی، جو پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اشک کی ماں کے بارے میں جوتشیوں نے کہا تھا کہ وہ

"ساتپوتی" ہے اول تو اس کے بیٹی ہو ہی نہیں سکتی، اگر ہو گئی بھی تو زندہ نہ رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لڑکے ہی لڑکے چلے آئے اور ایسی تعلیم کے سہارے ایک سے ایک دبنگ۔ ایک سے ایک لڑاکا۔ دنیا کی تاریخ میں پٹھانوں کی بدلہ کشی مشہور ہے کیونکہ وہ اپنی مخاصمتوں کو اولادوں تک منتقل کر دیتے ہیں لیکن اشک کے والدین ان سے کم نہ تھے۔ آخر ایک روز آیا جبکہ ان بھائیوں نے مل کر پورے محلے کو پیٹ پیٹ کر اسپتال میں بھجوا دیا۔ اکیلے پرشورام نے مار مار کر سب کے پرانچے اڑا دیئے، اگرچہ وہ خود بھی زخمی ہوا اور قانونی شکنجے میں پھنس گیا، لیکن سب کو خوشی اس بات کی تھی کہ پاگل بابا کی روح کہیں آسمانوں میں دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی!

سو یہ سب تھے اشک کے ڈرامے "چھٹا بیٹا" کے کردار، اشک ان بھائیوں میں سے دوسرا تھا۔ پھر تو گھر میں بھابیاں آنا شروع ہوئیں بچھیروں کے پاس بکریاں بندھنے لگیں۔ اب آپ ہی بتایئے وہ کیا کھاتیں کیا پیتیں؟ اس آپسی مار دھاڑ، گھر کے ہنگامے میں وہ کھا پی بھی لیتیں تو کیا بدن کو لگتا؟ انار کلی والے مکان سے پہلے اشک اور ان کے بڑے بھائی جنگمر دمحلے کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتے تھے، جس میں تازی ہوا کی بجائے وہ ایک دوسرے کی سانسوں پر جیتے۔ اس حیرت آباد میں عورتوں نے بہت کیا تو رو لیا، نہیں تو ——

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اشک کی بیوی شیلا جب بیاہی آئی تو گندمی رنگ کی ایک گول مٹول لڑکی تھی جو بات بات پر ہنستی رہتی تھی۔ اس گھر کے ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا، لیکن وہ اپنی پہلی فرصت میں کھلکھلا اٹھتی، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات بھی اس کی ہنسی کو نہ دبا سکتی۔ میں شیلا سے ملا تو نہیں، البتہ اشک کے لاہور والے کمرے اور بعد میں الہ آباد میں اشک کے گھر، اس کے بڑے بیٹے اُمیش کی خوابگاہ میں شیلا کی تصویر ضرور دیکھی ہے، جس میں وہ ہنس رہی ہے موت بھی اس ہنسی کو نہ دبا سکی...... جس زمانے میں یہ لوگ جنگمڑ محلے کے کمرے میں رہتے تھے تو شیلا بیمار ہو گئی اور ڈاکٹروں نے تپِ دق کی تشخیص کر دی۔

اشک ان دنوں بہت مشغول تھا۔ وہ اپنی تحریروں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا تھا انھیں بازار لے جا رہا تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ بکتی ہیں یا نہیں۔ کچھ بک سکیں اور کچھ نہیں کچھ پیسے وصول ہوئے بیشتر مارے گئے، لیکن اپنی تحریروں کے بل بوتے پر اسے روزانہ اخبار "ویر بھارت" اور پھر "بندے ماترم" کی سب ایڈیٹری مل گئی۔ فرصت کے لمحوں میں

وہ (GHOST WRITING) کیا کرتا۔ اس کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں بکے، لیکن چند ٹکیوں کے سوا اشک کے ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر گھر میں ایک اور واقعہ ہوگیا۔ شیلا کی ماں کو اپنی بیوگی نبھانے کے سلسلے میں لاہور کے کسی امیر کے ہاں گھر کے چوکا برتن کے لئے ملازم ہونا پڑا۔ جس سے شیلا کے جذبات بسمل ہوگئے اور اس کے کارن اشک کو جو ٹھیس پہونچی اس نے فیصلہ کرلیا کہ سماجی طور پر شیلا کو ایسا مرتبہ اور مقام دے گا، جس سے باقی لوگ رشک کریں گے۔ اس نے سشن جج بننے کی ٹھان لی۔

اب وہ وکالت پڑھتا تھا۔ دن کو ادبی مشاغل، لا کالج کی تعلیم اور رات کو قانون پڑھتا۔ کوٹھے کوٹھے جتنی بڑی کتابوں سے نبرد آزمائی۔ لیکن جس مٹی سے اشک کا خمیر اُٹھایا گیا تھا جس ہڈی سے اس کی پشت بنی کسی بھی محنت کے قابل تھی۔ اسی دوران میں شیلا نے اُمیش، اشک کے سب سے بڑے لڑکے کو جنم دیا۔ گھر کے ماحول خوراک کی کمی سے اسکی بیماری بڑھ گئی۔ اب اشک ایک طرف ادب تخلیق کرتا دوسری طرف قانون کی کتابیں پڑھتا اور تیسری طرف ہفتے میں دو تین بار سائیکل پر آٹھ میل کی منزل مار کر گلاب دیوی ٹی۔بی اسپتال میں شیلا سے ملنے جاتا۔ اسے دراصل یقین نہیں تھا کہ قدرت استہزا کو اس کمینہ حد تک لے جائے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شیلا اچھی ہو جائے گی۔ اتنی محنت، اتنی ریاضت سے اِدھر اشک ایک امتیازی شان سے قانون کے امتحان میں پاس ہوگیا، اُدھر شیلا چل بسی۔ قضا و قدر نے ایک ہاتھ سے دیا اور دوسرے سے سبھی کچھ چھین لیا۔ اب زندگی میں کوئی قاعدہ کوئی قانون نہ رہا۔ اشک نے سشن جج کے خیال کو بالائے طاق رکھ دیا۔ جس کے لئے وہ جج بننا چاہتا تھا وہ تو جا چکی تھی ..... اس نے رنج، بےحد تکان، بےحد اضمحلال کے عالم میں اپنا قلم اٹھایا اور ادب پیدا کرنا شروع کردیا۔ کیونکہ یہ ادب ہی تھا جس میں اپنے آپ کو غرق کر دینے سے وہ اپنی زندگی کے عظیم سانحے کو بھول سکتا تھا..... گھر بھر کے نزاع، حالات کی ابتری ہی تھی جسے اشک نے اپنے تحریروں کا مضمون بنایا۔ اس زمانے میں وہ اپنا نیم سوانحی ناول "گرتی دیواریں" شروع کر چکا تھا۔ جو اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ___ کونپل، ۴۲۰، گوکھرو، ڈاچی وغیرہ لکھیں، جن پر اشک کی عظیم اُداسی کی چھاپ ہے۔

شاید اشک میری اس بات کی شہادت دے کہ اس نے محبت صرف ایک عورت سے کی ہے اور وہ شیلا ہے، کیونکہ اس زمانے میں شعور رکھنے کے باوجود وہ نہ جانتا تھا محبت کیا

"ساتپوتی" ہے اوّل تو اس کی بیٹی ہو ہی نہیں سکتی، اگر ہو گئی بھی تو زندہ نہ رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لڑکے ہی لڑکے چلے آئے اور ایسی تعلیم کے سہارے ایک سے ایک دبنگ۔ ایک سے ایک لڑاکا۔ دنیا کی تاریخ میں پٹھانوں کی بدلہ کشی مشہور ہے کیونکہ وہ اپنی مخاصمتوں کو اولادوں تک منتقل کر دیتے ہیں۔ لیکن اشک کے والدین ان سے کم نہ تھے۔ آخر ایک روز آیا جبکہ ان بھائیوں نے مل کر پورے محلے کو پیٹ پیٹ کر اسپتال میں بھجوا دیا۔ اکیلے پرشورام نے مار مار کر سب کے پرانچے اڑا دیے، اگرچہ وہ خود بھی زخمی ہوا اور قانونی شکنجے میں پھنس گیا، لیکن سب کو خوشی اس بات کی تھی کہ پاگل بابا کی روح کیسی آسمانوں میں دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی!

سو یہ سب تھے اشک کے ڈرامے "چھٹا بیٹا" کے کردار، اشک ان بھائیوں میں سے دوسرا تھا۔ پھر تو گھر میں بھابیاں آنا شروع ہوئیں بچھیروں کے پاس بکریاں بندھنے لگیں۔ اب آپ ہی بتائیے وہ کیا کھاتیں کیا پیتیں؟ اس آپسی مار دھاڑ، گھر کے ہنگامے میں وہ کھا پی بھی لیتیں تو کیا بدن کو لگتا؟ انارکلی والے مکان سے پہلے اشک اور ان کے بڑے بھائی چنگڑ محلے کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتے تھے، جس میں تازی ہوا کی بجائے وہ ایک دوسرے کی سانسوں پر جیتے۔ اس حیرت آباد میں عورتوں نے بہت کیا تو رو لیا، نہیں تو ـــــ

؎ گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اشک کی بیوی شیلا جب بیاہی آئی تو گندمی رنگ کی ایک گول مٹول لڑکی تھی جو بات بات پر ہنستی رہتی تھی۔ اس گھر کے ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا، لیکن وہ اپنی پہلی فرصت میں کھلکھلا اٹھتی، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات بھی اس کی ہنسی کو نہ دبا سکتی۔ میں شیلا سے ملا تو نہیں، البتہ اشک کے لاہور والے کمرے اور بعد میں الہ آباد میں اشک کے گھر، اس کے بڑے بیٹے اُمیش کی خواب گاہ میں شیلا کی تصویر ضرور دیکھی ہے، جس میں وہ ہنس رہی ہے موت بھی اس ہنسی کو نہ دبا سکی ..... جس زمانے میں یہ لوگ چنگڑ محلے کے کمرے میں رہتے تھے تو شیلا بیمار ہو گئی اور ڈاکٹروں نے تپ دق کی تشخیص کر دی۔

اشک ان دنوں بہت مشغول تھا۔ وہ اپنی تحریروں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا تھا انھیں بازار لے جا رہا تھا یہ دیکھنے کے لئے کہ بکتی ہیں یا نہیں۔ کچھ بک سکیں اور کچھ نہیں کچھ پیسے وصول ہوئے بیشتر مارے گئے، لیکن اپنی تحریروں کے بل بوتے پر اسے روزنامہ اخبار "ویر بھارت" اور پھر "بندے ماترم" کی سب ایڈیٹری مل گئی۔ فرصت کے لمحوں میں

وہ (GHOST WRITING) کیا کرتا۔ اس کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں بکے، لیکن چند ٹکیوں کے سوا اشک کے ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر گھر میں ایک اور واقعہ ہوگیا۔ شیلا کی ماں کو اپنی بیوگی نبھانے کے سلسلے میں لاہور کے کسی امیر کے ہاں گھر کے چوکا برتن کے لئے ملازم ہونا پڑا جس سے شیلا کے جذبات بسمل ہوگئے اور اس کے کارن اشک کو جو ٹھیس پہونچی اس نے فیصلہ کرلیا کہ سماجی طور پر شیلا کو ایسا مرتبہ اور مقام دے گا، جس سے باقی لوگ رشک کریں گے۔ اس نے سشن جج بننے کی ٹھان لی۔

اب وہ وکالت پڑھتا تھا۔ دن کو ادبی مشاغل، لا کالج کی تعلیم اور رات کو قانون پڑھنا۔ کوٹھے کوٹھے جتنی بڑی بڑی کتابوں سے نبرد آزمائی۔ لیکن جس مٹی سے اشک کا خمیر اٹھایا گیا تھا جس ہڈی سے اس کی پشت بنی کسی بھی محنت کے قابل تھی۔ اسی دوران میں شیلا نے اُمیش، اشک کے سب سے بڑے لڑکے کو جنم دیا۔ گھر کے ماحول خوراک کی کمی سے اسکی بیماری بڑھ گئی۔ اب اشک ایک طرف ادب تخلیق کرتا دوسری طرف قانون کی کتابیں پڑھتا اور تیسری طرف ہفتے میں دو تین بار سائیکل پر آٹھ میل کی منزل مار کر گلاب دیوی ٹی۔بی اسپتال میں شیلا سے ملنے جاتا۔ اسے دراصل یقین نہیں تھا کہ قدرت استہزا کو اس کمینہ حد تک لے جائے گی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شیلا اچھی ہو جائے گی۔ اتنی محنت، اتنی ریاضت سے اِدھر اشک ایک امتیازی شان سے قانون کے امتحان میں پاس ہوگیا، اُدھر شیلا چل بسی۔ قضا و قدر نے ایک ہاتھ سے دیا اور دوسرے سے سبھی کچھ چھین لیا۔ اب زندگی میں کوئی قاعدہ کوئی قانون نہ رہا۔ اشک نے سشن ججی کے خیال کو بالائے طاق رکھ دیا۔ جس کے لئے وہ جج بننا چاہتا تھا وہ تو جا چکی تھی..... اس نے رنج، بیحد تکان، بیحد اضمحلال کے عالم میں اپنا قلم اٹھایا اور ادب پیدا کرنا شروع کردیا۔ کیونکہ یہ ادب ہی تھا، جس میں اپنے آپ کو غرق کردینے سے وہ اپنی زندگی کے عظیم سانحے کو بھول سکتا تھا.... گھر بھر کے نزاع، حالات کی ابتری ہی تھی جسے اشک نے اپنے تحریروں کا مضمون بنایا۔ اس زمانے میں وہ اپنا نیم سوانحی ناول "گرتی دیواریں" شروع کرچکا تھا۔ جو اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کہانیاں — کونپل، ۳۲۴، گوکھرو، ڈاچی وغیرہ لکھیں، جن پر اشک کی عظیم اُداسی کی چھاپ ہے۔

شاید اشک میری اس بات کی شہادت دے کہ اس نے محبت صرف ایک عورت سے کی ہے اور وہ شیلا ہے، کیونکہ اس زمانے میں شعور رکھنے کے باوجود وہ نہ جانتا تھا محبت کیا

ہوتی ہے اور نہ شیلا جانتی تھی ۔ وہ دونوں جی رہے تھے بلکن اپنے لئے نہیں ایک دوسرے کے لئے ۔ اور یہ محبت تھی جس کی ہر ادا والہانہ تھی جو نہ کسی صفت کی محتاج تھی اور نہ موصوف کی ۔ اس کے بعد بھی اشک نے محبت کی ، لیکن جنون اس میں سے غائب ہو چکا تھا ۔ اس میں ایک پختگی آ چکی تھی جس کے کارن وہ دوسری شادی کے کچھ ہی دنوں کے اندر مایا اپنی دوسری بیوی کو چھوڑ سکا اور کوشلیا اپنی موجودہ بیوی سے کہہ سکا ..... جان من ! میں زندگی کا سفر کرتے کرتے تھک گیا ہوں ۔ مجھ میں جوانی کی وہ لپک نہیں رہی ہے ۔ اگر تم مجھ سے اسکی اُمید رکھتی ہو تو بے کار ہے ۔ میں اس محبت کے قابل نہیں ، جو شعلہ جوالہ ہو ، ہاں وہ محبت میں تمہیں دے سکتا ہوں جو دھیمی آنچ ہو سکتی ہے اور اس لئے خوش ذائقہ بھی ہوتی ہے ۔

تو یوں مجھے اپنے گھر لا کر اشک نے میرے ساتھ سیکڑوں باتیں کر ڈالیں ۔ اپنا کھایا پیا سب میرے سامنے اُگل دیا ۔ آزمودہ کار آدمی عام طور پر اپنا سب کچھ نہیں کہہ ڈالتے اور یوں پھر اس آدمی سے جو اُن سے پہلی بار ملا ہو ۔ مگر اشک مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا ۔ یہ تو اچھا ہوا میں مل گیا نہیں تو وہ دیواروں سے باتیں کرتا ، سڑک پر گڑے کسی بجلی کے کھمبے کے سامنے اپنی داستان دہرا دیتا ..... جب کہ رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی ۔ غبار دب چکا تھا البتہ آسمان کچھ صاف نہ تھا کہیں کہیں کوئی ستارہ خود نمائی کے عالم میں دھند اور دھوئیں اور دھول کی قبائیں چیرتا پھاڑتا اپنا ٹمٹماتا ہوا حسن دکھانے لگتا ۔ اشک کی باتوں میں میں کئی بار ہنسا ، کئی بار میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اب میری طبیعت اوبنے لگی تھی ۔ کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اس وقت میری بیوی گھر میں انتظار کر رہی ہوگی ۔ جب تک مرد کے سیلانی ہونے کا یقین نہ ہو جائے ہر عورت اپنے میاں کے پیچھے کچھ گھوڑے دوڑا دیتی ہے ۔ ان میں کچھ گدھے نکل آتے ہیں جن میں میرا ایک عزیز تھا جو مجھے ڈھونڈھنے کے لئے بھیجا گیا ۔ اشک مجھے کچھ دُور چھوڑنے کے لئے مکان سے نیچے اُترا ۔ وہ دور نہ جا سکتا تھا کیونکہ جب تک اس نے دھوتی کرتے کو تہمد اور نبیائن سے بدل لیا تھا ۔ لیکن پھر باتوں کے نئے شوشے چھوڑتے ہوئے ہم انارکلی کے بڑے بازار سے نکل کر یا مجل سوسائٹی کے سامنے چلے آئے اور پھر وہاں سے ہوتے ہوئے مال روڈ پر ..... میرے گھر کی طرف ..... گول باغ ، جہاں میرا وہ عزیز جیسا کہ بعد میں پتہ چلا " چھٹے درد فراق والے " گاتا ہوا پاس سے گذر گیا اور ہم بے فکری کے عالم میں گول باغ کی ایک بنچ پر بیٹھ گئے ..... آہستہ آہستہ مجھ میں اپنی بیوی کی وجہ سے ایک گھبراہٹ پیدا ہو رہی تھی ۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اشک اپنی کتھا سناتا رہا ۔

چل دوگی کیٹیا سُونی کر، اسی گھڑی اس یام[۱] ٹِک ٹِک ٹک جلتے رہنے کا مجھ سونپ کر کام
اور میں اسکی داد دے رہا تھا۔ مجھے کوتا اچھی ضرورلگی لیکن گھر کا خیال بھی ستا رہا تھا اب میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا تھا لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ آخر میں نے جی کڑا کیا لیکن جو الفاظ میرے منہ سے نکلے معافی نامے کی حیثیت سے زیادہ نہ تھے میں اٹھا تو اشک بھی میرے ساتھ اٹھ گیا... باتیں کرتا ہوا وہ میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

بچے نے دروازہ کھولا اور میں جلدی جلدی اندر گیا۔ بیٹھک کھول کر بتی جلائی اور اشک کو اندر بٹھایا۔ اتنی گرمی کے باوجود ستونت میری بیوی نیچے میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ایک عام کلرک کی بیوی تھی جو دفتر سے چھٹی کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر شوہر کو اپنے گھٹنے کے پاس بیٹھا دیکھنا چاہتی ہے اور اب تو رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور "بُرے بُرے خیال میرے من میں آ رہے تھے"۔

"کہاں رہے اتنی رات تک؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"جہنم میں!" میں نے کہا "تم ذرا میرے ساتھ بیٹھک میں آؤ۔ ایک بہت بڑا ادیب مجھ سے ملنے آیا ہے..."

"ہاں مگر۔ اس وقت؟"

"ہاں۔ تم آؤ تو!"

اور میں ستونت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیٹھک کی طرف لے چلا۔ جب تک ستونت ادیبوں کی عزت کے قابل کوئی چیز سمجھتی تھی۔ جلدی جلدی ایک دو گھونٹ میں ستونت نے اپنا غصہ پی لیا اور اپنے چہرے کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کے نک شک سے سنوارتے ہوئے میرے پیچھے بیٹھک میں چلی آئی اور ایک کالے کلوٹے آدمی کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر ڈر گئی۔ اشک اس وقت بھاٹی دروازہ کا کوئی غنڈہ معلوم ہو رہا تھا، جس سے لاہور کی سب عورتیں ڈرتی تھیں اور اسے سامنے آتے دیکھ کر سڑک چھوڑتے ہوئے ایک طرف ہو جاتی تھیں۔ ستونت نے جلدی سے 'نمستے' کی اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہ لگا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں نے پہلے اشک کی طرف ہاتھ بڑھایا... "اوپندر ناتھ اشک" اور پھر بیوی کی طرف ـــ "ستونت، میری بیوی"۔

چھوٹتے ہی اشک نے میری بیوی کا نام پکارا "ستونت! بُرا مت ماننا۔ میں ایسے ہی چلا آیا ہوں" اس نے اپنی بنیائن اور تہبند کی طرف اشارہ کیا "بات یہ ہے کہ میں ذرا ملنگ آدمی ہوں..."

اور پھر وہ زور سے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنسا ـــ ایسی ہنسی میں جس سے پھیپھڑے پھٹ جائیں۔ ایک چڑیا جس نے اوپر کارنس کے قریب گھونسلا بنا رکھا تھا پھڑ پھڑا اٹھی۔ سامنے گھر کی بتی جلی اور کسی نے بالکونی پر سے جھانکا.... اس سے پہلے کہ میری بیوی کچھ کہتی اشک اس سے کہہ رہا تھا "کچھ کھانے کو ہے ستونت!.... بہت بھوک لگی ہے...." □

---
[۱] یام = پہر، وقت

کوشلیا اشک

کوئی بتلاؤ کہ ہم ——

عام طور سے ادیب چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں اپنے آپ اُن کے بارے میں سب کچھ جان بوجھ لیں۔ ان کے طور طریقے، ان کی سنک، ان کے موڈ اور موڈ کی مختلف کیفیات، ان کی خواہشوں، خوابوں..... چھوٹے سے چھوٹے اشاروں کو سمجھ لیں۔ اگر شوہر کہے کہ آج شدت کی گرمی ہے تو بیوی سمجھ لے کہ فن کار کا گلا سوکھ رہا ہے، وہ اُٹھے، دھیرے دھیرے قدم بڑھا کر باورچی خانے جائے اور شربت کا ٹھنڈا گلاس لا کر اس کے سامنے پیش کر دے۔ تیز نہ چلے کیونکہ تیزی گرمی بڑھتی ہے

اگر فن کار کہے کہ قیامت کی سردی ہے تو وہ جلدی سے اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے جا کر سوکھے میوے کی پلیٹ سجا لائے۔ وہ میسر نہ ہو تو چائے یا کافی کا پیالہ بنا کر فن کار کے سامنے حاضر کر دے۔ فنکار اگر لکھنے میں محو ہے تو اس کی رفیقہ کو چاہئے کہ پورا خیال رکھے اور اس کی کسی بات کا برا نہ مانے۔ ادیب شوہر بلاوجہ چڑ جائے، بڑبڑائے یا چلّانے لگے تو اسکی بیوی خاموش رہے.....

لیکن یہ تو میں چالیس سال بعد آج بتا رہی ہوں۔ پہلے مجھے ان باتوں کا علم نہ تھا۔ ہمارے گھر میں کوئی ادیب نہ تھا کسی ادیب سے میرا پالا نہ پڑا تھا اس لئے جب بار بار پوچھنے پر بھی یہ جواب نہ دیتے تھے تو ظاہر ہے مجھے خاصی کوفت ہوتی۔

کئی بار مجھے سیر کرانے لے جاتے۔ گھر سے اچھے بھلے تیار ہو کر نکلتے، لیکن باہر جا کر ایسے چلتے جیسے تنہا آئے ہوں۔ یہ تیز تیز قدم بھرتے آگے نکل جاتے۔ میں پیچھے پیچھے گھسٹتی چلی جاتی۔ کافی آگے نکل جانے پر معاً انھیں خیال آتا کہ میں پیچھے رہ گئی ہوں۔ یہ رک جاتے۔ میرے پہونچنے پر پھر چل پڑتے میں پوچھتی۔

"کدھر چلیں گے؟"

یہ اپنے دھیان میں کھوئے رہتے۔

میں پھر پوچھتی ہوں "کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟"

یہ پھر چپ۔

"ارے کبھی میں آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں"

یہ جیسے نیند سے چونکتے "کچھ مجھ سے کہا؟"

لکھتے لکھتے کہیں اٹک جاتے تو آگے سوچنے کے لئے یہ مجھے ایسی سیر کراتے۔ میں نے جس خاندان میں پرورش پائی وہاں ایک دوسرے کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا۔ باہر جانے پر پوری پوری رواداری برتی جاتی لیکن انھیں جب اپنی ہی شدھ بدھ نہ ہوتی تو میری فکر کیا کرتے۔ میں کبھی ناراض ہوتی تو یہ الٹی مجھ ہی سے شکایت کرنے لگتے "تمھیں سمجھ لینا چاہیئے تھا میں کچھ سوچ رہا ہوں"

کھانے میں کبھی چار چیزیں بنا لیتی تو کہتے "تم اعلیٰ طبقے سے آئی ہو کہاں اس غریب مصنف کے چکر میں پھنس گئیں۔ سیدھا سادہ کھانا پکاتی تو شکایت کرتے ....." یہ کیا گھاس پوس پروس دیا ہے۔ اس غریب ادیب کا تمھیں ذرا بھی خیال نہیں"

●

یہ اشک جی کی پرانی عادت ہے کہ جب یہ کوئی چیز لکھتے ہیں تو سنانا چاہتے ہیں۔ سناتے سناتے اصلاح بھی کرتے جاتے ہیں۔ پہلے میرے پاس بہت وقت تھا میں سنتی بھی تھی اور مشورہ بھی دیتی تھی ان کی تخلیقات ٹائپ کرتی تھی۔ فائلوں کو ترتیب دیتی اور ان کے خطوط کے جواب تک دیتی۔

پھر ہمارے ہاں بچہ آگیا۔ ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ جدوجہد دو چند ہوگئی اور اتنا وقت بھی نہ مل پاتا تب بھی بیچ بیچ میں وقت نکال ہی لیتی۔ اب عمر بڑھ گئی ہے کنبہ بڑھ گیا ہے اور مصروفیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ گھر میں دو دو بہوئیں بھی آگئی ہیں۔ چار چار پوتے ہوگئے ہیں۔ پھر آنے جانے والا مہمانوں کی خاطر مدارات، شادی بیاہ میں شرکت، لینا دینا، کوئی بیمار ہو جائے تو تیمارداری کے فرائض سرانجام دینا۔ غرض ایک ننھی سی جان اور سو جنجال۔ میں اب وہ سب نہیں کر پاتی اور ان کی شکایتیں بدستور قائم ہیں بلکہ بڑھ ہی گئی ہیں۔

اشک جی ۷۰ کے ہو گئے لیکن اپنے بزرگ ہونے کا انھیں بالکل احساس نہیں۔ پچھلے دس سال سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ آپ دو دو بہوؤں اور چار چار پوتوں کے دادا ہو گئے ہیں یہ تسلیم کرنے لگے کہ یقیناً ضعیف ہو گئے ہیں لیکن بے چینی اور بھی بڑھ گئی ہے ..... "میں بوڑھا

ئیا ہوں مجھے اپنا ناول پورا کر لینا چاہیئے۔ ڈرامے بھی سوچ رکھے ہیں کہانیوں کے بنیادی خیال بک
ے ہیں۔ جلد جلد یہ سب کاغذ پہ اتار لینا ہے ....." اور لکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انھیں کسی
بز کا دھیان نہیں رہتا۔ نہ کھانے کی فکر نہ نہانے کا ہوش۔ شاید یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ گھر میں
رکھی لوگ ہیں۔ لکھتے لکھتے اگر کوئی حوالہ دیکھنا ہو تو فائلوں پہ فائلیں کھولتے اور میز پر بچھاتے
ائیں گے۔ الماری سے لغت اٹھائیں گے اس سے لفظ دیکھ کر وہیں میز پہ رکھ دیں گے۔ پھر کوئی
دوسری ڈکشنری اٹھائیں گے اور پھر تیسری...... وہ سب میز پر بھی جمع ہوتا جائے گا اور یہ
لکھنے میں محو رہیں گے ...... کھانے کی میز پہ ناشتہ رکھ کر میں ان کے کمرے میں جاتی ہوں اور انھیں
مہ آتی ہوں کہ بچے انتظار کر رہے ہیں لیکن یہ نہیں آتے۔ میں دوبارہ جاتی ہوں ....." حضور والا
اب اٹھئے، لڑکیوں کو دفتر جانا ہے بہوؤں کو گھر کے دوسرے کام بھی دیکھنے ہیں" اور انھیں ان کی
میز پر سے اٹھا لاتی ہوں۔ یہ مجبور ہو کر چپ چاپ آ بیٹھتے ہیں اور ناشتہ کرنے لگتے ہیں۔ بہو کہتی ہے
....." پاپا جی یہ لیجئے!" اور وہ پلیٹ ان کی طرف بڑھاتی ہے، لیکن یہ تخیل کی اپنی دنیا میں اس
قدر محو رہتے ہیں کہ ادھر نہیں دیکھتے۔ نہ بہو کو کوئی جواب دیتے ہیں نہ پلیٹ سے کچھ اٹھاتے ہیں،
کچھ دیر وہ پلیٹ بڑھائے انتظار کرتی ہے پھر قدرے مسکرا کر خود ہی ان کی پلیٹ میں ناشتہ رکھ
دیتی ہے ..... چھوٹا بیٹا کوئی بات پوچھتا ہے، لیکن یہ بدستور اپنی تخیل کی دنیا میں محو رہتے ہیں،
وہ جھلا جاتا ہے لیکن اپنے اوپر قابو رکھ کر پھر پوچھتا ہے "پاپا جی میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں"
یہ جیسے نیند سے چونکتے ہیں" میں وہ ڈراما لکھ رہا ہوں نا، اس میں فلاں کردار کو اس طرح
پیش کیا ہے، یا کردار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ٹھیک بن جائے گا۔ تم ذرا
سن لینا....." اس کی بات کا جواب یہ پھر نہیں دیتے۔ وہ ہلکے سے سر ہلا کر اپنی جھنجھلاہٹ جھاڑ
دیتا ہے ....." اب دفتر کا وقت ہو گیا ہے، شام کو سنیں گے، آپ لکھ لیجئے"۔ وہ کہتا ہے اور اپنی
بات دہراتا ہے، تب یہ اس کی بات پوچھتے ہیں اس کا جواب دیتے ہیں۔ کھانے کی میز پہ لوٹ آتے
ہیں اور ناشتہ ختم کر کے فوراً چلے جاتے ہیں۔

مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے تین بار بلانے گئی تب جا کر آئے اور دودھ ویسے ہی چھوڑ گئے!
لیکن ادیب ادبی خدمت میں اتنا محو ہو تو اس کی بیوی کو اس کی خدمت کرنا ہی چاہیئے میں دودھ
کا گلاس اٹھاتی ہوں اور ان کے کمرے میں لے جاتی ہوں" کیوں مہاراج، ہم سے کیا گناہ ہو گیا ہے
جو آپ نے دودھ نہیں پیا ....." میں کہتی ہوں۔ یہ قدرے سر اٹھا کر ہنستے ہیں" میں بھی سوچتا تھا کہ

آج کیا بات ہے ناشتہ کرنے پر بھی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

"یہ آپ نے پہلے ہی سوچ لیا ہوتا تو مجھے چکر نہ لگانا پڑتا۔" میں کہتی ہوں لیکن وہ جواب نہیں دیتے۔ دودھ کا گلاس لے لیتے ہیں.... غٹ غٹ غٹ........ اور خالی گلاس مجھے تھماتے ہوئے شکایت کا تیر میری طرف چھوڑتے ہیں۔" دودھ لائی تھیں تو ایک بیڑا پان بھی لے آتیں۔ تم میرا ذرا بھی خیال نہیں رکھتیں۔ گھر اور بچوں میں اس قدر مگن رہتی ہو۔ سب کی ننھی ننھی ضرورت کا تمھیں خیال رہتا ہے، نہیں ہے تو مجھ غریب کا۔"

میں چپ چاپ واپس جاتی ہوں اور پان کی طشتری لا کر ان کے سامنے رکھ دیتی ہوں ان کی اسٹڈی بنگلے میں ذرا ہٹ کر دائیں طرف ہے مجھے کبھی چائے، پان یا پھر کچھ پوچھنے ادھر جانا پڑتا ہے۔ میں تھک بھی جاتی ہوں لیکن یہ اپنے سارے ماحول سے بے نیاز ادبی تخلیق میں مشغول وہیں میز پر جمے رہتے ہیں۔

اچانک اپنی اسٹڈی میں بیٹھے بیٹھے یہ وہیں سے زور زور سے آوازیں دینے لگتے ہیں اور جواب کا وقت ہی نہیں دیتے۔ لگاتار آوازیں دیئے چلے جاتے ہیں اور فضا میں آوازیں ہی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر میں بھاگی جاتی ہوں۔" آپ آوازیں دیئے جاتے ہیں دوسروں کو جواب کا موقع ہی نہیں دیتے......" اور سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی ہوں۔

"ناول کا ایک باب میں نے پورا کر لیا ہے۔" ان کے چہرے پر سکون و مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

لمحہ بھر ان کی طرف دیکھتی ہوں پھر پوچھتی ہوں۔" آپ نے مجھے بلایا تھا۔"

"میں نے سوچا تمھیں بتا دوں۔ سال کب کا اٹکا ہوا تھا میں نے پورا کر لیا۔" لمحہ بھر رک کر ہنستے ہوئے کہتے ہیں۔" تم نہیں جانتیں۔ تمھارا پتی کتنا مہان لیکھک ہے۔..."

"جانتی ہوں۔"

"خاک جانتی ہو۔ دنیا بھر کے فضول کاموں میں مصروف رہو گی لیکن میری طرف دھیان دینے کا تمھیں ذرا وقت نہیں۔ آج میری میز تک کسی نے صاف نہیں کی۔"

"صبح جو آئی تھی تو آپ ہی نے کہا تھا میری میز کو چھونا نہیں!"

"اب تم سب کام چھوڑ کر پہلے میری میز ٹھیک کر دو۔ سب چیزیں پھیلی ہوئی ہیں

س بے ترتیبی سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے۔"

اور گھر کا سارا کام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ میں میز ٹھیک کرنے لگتی ہوں دوران کی کم خرامی چلتی رہتی ہے" یہ فائل اس خانے میں رکھ دو، وہ نیلی والی فائل ادھر رہنے والے خانے میں۔ ڈکشنریاں شیلف پر لگا دو۔ یہ پن پھیلی ہوئی ہیں اس کو ڈبیہ میں رکھ دو..... مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی ہے لیکن میری اس جھنجھلاہٹ کی پرواہ کئے بغیر یہ مسلسل دلے جاتے ہیں۔

موٹی موٹی ڈکشنریاں اُٹھاتی ہوں تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک پلیٹ اور دو چمچے دبے رکھے ہیں۔ انھیں دکھاتی ہوں تو جواب ملتا ہے" ایسے یہاں آدمی دب جائے۔ تو خیریت ہو، تم پلیٹ چمچوں کی بات کرتی ہو۔ ایک مہان لیکھک کی میز ہے کسی چیڑ قناتیے کی نہیں۔"

بچے مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ میں انھیں پڑھاتی ہوں۔ کہانیاں سناتی ہوں اُن کی باتیں سنتی ہوں، گھمانے لے جاتی ہوں" دادی ممی" کہتے وہ چھوٹی سی چھوٹی بات بتانے یا پوچھنے آجاتے ہیں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ دونوں بڑے پوتے اب خاصے بڑے ہو گئے ہیں۔ جب وہ چھوٹے تھے اشک جی انھیں بھی گھمانے لے جاتے تھے ان کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ وہ کچھ بڑے ہوئے۔ اسکول جانے لگے تو تیسرا پوتا ٹکو آگیا۔ یہ اُسے پرم (PRAM) میں بٹھا کر سیر کرالاتے۔ لیکن وہ مجھ ہی سے زیادہ ہلا ہوا تھا 'ممی ممی' کہتا میرے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا۔ ان کی سٹڈی میں بھی آجاتا۔ یہ کام میں مشغول ہوتے تو کہتے " تم بھاگ جاؤ" اور وہ ہنستا ہوا بھاگ جاتا اور توتلی زبان میں بتاتا " پاپا جی کہتے ہیں تم بھاگ جاؤ"۔ صبح یہ ورزش اور یوگا بھیاس کرتے تو وہ بھی آ لیٹتا اور کبھی ٹانگیں اُوپر اور کبھی نیچے کرتا رہتا۔

ایک دن انھوں نے اسے کسی بات پر چڑایا تو کھسیا کر اس نے کہا۔

" پاپا جی گندے!"

" تم گندے!" انھوں نے اسے جھڑک دیا۔ وہ رونے لگا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ پاپا جی کو ایسے نہیں کہتے۔ جاؤ انھیں پیار کر لو اور اس نے اپنی ننھی ننھی باہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ انھوں نے بھی اسے پیار کیا۔ تب میں نے کہا " آپ تو

بچوں سے بھی گئے گذرے ہوگئے"۔ بولے" تم خود ہی تو کہتی ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں بوڑھے اور بچوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس نے مجھے گندا کہا میں نے بھی اسے گندا کہہ دیا..." اور ہنسنے لگے۔

ٹلّو اسکول جانے لگا۔ دونوں بچوں کو یہ پڑھاتے ہی تھے اب اسے بھی پڑھاتے۔ گھمانے لے جاتے۔ اس کے ساتھ گلی ڈنڈا یا کیرم بھی کھیلتے۔ سینما تو شاذ ہی جاتے لیکن جب سرکس آتا یہ بچوں کو دکھانے ضرور لے جاتے۔ پھر سب سے چھوٹا گوگی آگیا۔ وہ چلنا اور بولنا سیکھ گیا تو ان کی سٹڈی ہی میں چلا جاتا۔ یہ کام کر رہے ہوں تو کہتے "میں کام کر رہا ہوں تم جاؤ" وہ کہتا "ہم چلے جاتے ہیں لیکن پہلے ہمیں ایک بار جھولا جھلا دیجئے" اور ان کی روالونگ کرسی (REVOLVING CHAIR) کی طرف بڑھتا اور ان کی گود میں جا چڑھتا ہے۔ انھیں جھنجھلاہٹ ہوتی لیکن یہ کرسی کو دائیں بائیں گھما کر جھلا دیتے۔

...... یہ ناشتہ کرتے تو وہ چپ چاپ ان کی کرسی کے پاس آکھڑا ہوتا اور ان کی پلیٹ سے انگور یا سیب اٹھا کر ٹونگنے لگتا۔ لمحہ بھر تو یہ اس کی طرف دیکھتے لیکن وہ ان کی طرف دیکھے بغیر ان کی آدھی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ ایک پیلا سا انگور کا دانہ اٹھا کر ان کے منہ میں ڈالتا "پاپا جی بہت میٹھا ہے آپ کھائیے!" یہ ہنس پڑتے اور پیار سے چوم لیتے۔ تینوں بڑے پوتے تو ان کے رعب سے ڈر جاتے لیکن گوگی ان کی ایک نہیں چلنے دیتا۔

...... کھانا یہ کبھی پیٹ بھر نہیں کھاتے۔ رات میں دیر تک کام کرتے ہیں اور آدھی رات کے وقت انھیں بھوک لگتی ہے۔ ایسے وقت کے لئے میں ان کی سٹڈی سے ملحق کمرے کی الماری میں بسکٹ اور سوکھا میوہ وغیرہ رکھ دیتی ہوں۔ گوگی بچپن سے ہی دودھ نہیں پیتا۔ پھل میوے کھا لیتا ہے۔ اُسے بھی دیتی ہوں۔ جب کبھی اس کا دل کاجو کشمش کھانے کو ہوتا ہے تو وہ میری انگلی پکڑ کر مجھے اس طرف لے آتا ہے' دادی ممی' پاپا جی کی کشمش کاجو چرا لائیں ......" میں نکال کر اسے دیتی ہوں وہ بھاگا بھاگا ان کی سٹڈی میں جاتا ہے۔ "پاپا جی ہم آپ کی کشمش کاجو چرا لائے ہیں"

لمحہ بھر یہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہیں پھر اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے اس کی طرف لپکنے کا ناٹک کرتے ہیں "ٹھہرو تمھیں بتاتا ہوں!"

وہ ہنستا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

......کبھی وہ ان کی میز کے پاس آکھڑا ہوتا ہے" پاپا جی ہم بھی پڑھیں گے"
"کیا پڑھوگے!" یہ پوچھتے ہیں۔
"آپ ہمیں بٹھائیے (یعنی اپنی گود میں) ہم آپ کو اے۔ بی۔ سی لکھ کر دکھاتے ہیں" اور وہ ان کی طرف بڑھتا ہے یہ اُسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیتے ہیں۔ وہ ان کی تختی اپنے سامنے کر کے پنسل اُٹھا لیتا ہے" اس پر لکھیں؟"
"ارے ٹھہر و یار، میں دیتا ہوں تمھیں کاغذ!"
وہ 'ٹھہرو یار' دُہراتا ہوا ہنستا ہے اور شرارت سے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ اسے پیار کرتے ہیں اور پھر اسے لکھنا سکھاتے ہیں۔

●

کبھی ان کا کوئی کام نہ ہو پائے یا کوئی چیز رکھ کر بھول جائیں تو یہ ہماری طرف آ کر چلّانے لگتے ہیں ــــ" ادھر کیو کا رپن ختم ہو چکا ہے۔ تم نے منگایا نہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں۔"
" منگایا ہے حضور والا۔ گھر میں چار چار بچّوں کی دیکھ بھال میں رکھنا بھول گئی ہوں!"
جہاں چار بچوں کا خیال کرتی ہو تم لوگ وہاں اس پانچویں بچے کا بھی خیال رکھا کرو۔ ارے بھئی آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ تو پھر سے بچہ بن جاتا ہے۔ ادھر تیل کسی نے نہیں رکھا، کپڑوں میں بٹن ندارد ہیں، میلے کپڑے ویسے ہی پڑے ہیں کسی نے نہیں اُٹھائے..... اس بچے کو تو تم لوگوں نے یتیم بنا رکھا ہے
(تم لوگوں میں میرے ساتھ دونوں بہویں بھی شامل ہیں)
برسوں میں انھیں سمجھا پائی ہوں کہ یہ بزرگ ہو گئے لیکن بزرگی کو بڑھاپے کا ہم معنی مان کر اب یہ پھر بچے بن گئے ہیں۔ □

اوپیندر ناتھ اشک
۵۔ خسرو باغ روڈ، الٰہ آباد

کارٹونوں کا ہیرو

[۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک ۴۰ برس کی افسانوی زندگی میں اشک نے بلامبالغہ صدہا کرداروں کی عکاسی کرنے والے کئی رنگوں، جہتوں اور پہلوؤں کے افسانے لکھے ہیں۔ روسی نقاد بورودِک نے ان کے روسی افسانوں کے مجموعہ 'ریگستان' کا تبصرہ لکھتے ہوئے کہا کہ اشک کے ہاں کرداروں کا حیران و ششدر کر دینے والا ہجوم ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا کوئی کردار ادھورا نہیں۔

ان چالیس پینتالیس افسانوں کو چھوڑ دیں جو اشک نے اسکول اور کالج اور اس کے بعد کچھ برسوں میں لکھے، تو ان کے ہاں پانچ طرح کے افسانے نظر آتے ہیں:-

۱۔ افسانے جو لطیفوں جیسے ہیں ـــــ سیاہ حاشیے کے افسانچوں جیسے ـــــ فرق یہی ہے کہ یہ ان سے ڈیڑھ دو دہائی پہلے لکھے گئے۔

۲۔ دو سے چار صفحوں تک کے چھوٹے افسانے ہیں، جو اپنے طور پر ہر طرح مکمل ہیں۔

۳۔ عام لمبے افسانے، جن میں اشک کے بیشتر مشہور افسانے ـــــ ڈاچی، کونپل، کاکڑاں کا تیلی، ابال، پٹھان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ افسانے پھر ۴ طرح کے ہیں:

(الف) طبقاتی استحصال کا شکار لوگوں کے افسانے ـــــ ۳۲۴، ڈاچی، کاکڑاں کا تیلی، تہذیب، قفس، ناسور وغیرہ۔

(ب) سماجی اور گھریلو افسانے ـــــ تنہا، سنگدل، جنم کا انتخاب، ٹھہراؤ وغیرہ۔

(ج) فرد کی نفسیات کی تصویرکشی کرنے والے افسانے ـــــ یہ انسان، کھٹک، ٹیرس پر بیٹھی شام وغیرہ۔

(د) افسانے جو سیکس کے کسی نقطے کے گرد گھومتے ہیں اور اپنے طور پر نہایت گہرے اور بلیغ ہیں۔

(۴) اوسط لمبائی کے ——— افسانے جن کی بڑی خوبی ان کا بے پناہ طنز اور مزاح ہے —— خالی ڈبہ، چارہ کاٹنے کی مشین، ٹوپیاں اور ڈاکٹر وغیرہ۔

(۵) کئی شیڈز اور پہلوؤں کے طویل افسانے، جو اشک نے اپنی افسانوی زندگی کے آخری دور میں لکھے ہیں۔ یہ افسانے زیادہ نہیں صرف تین ہیں —— کہانی، لیکھکا اور جہلم کے سات پل، آکاش چاری اور اکثر۔ یہ افسانے بے حد ممتاز و منفرد ہیں اور اشک انھیں اپنے افسانوں میں خاص مقام دیتے ہیں۔

اشک جی نے اپنا ایک افسانہ "کارٹونوں کا ہیرو" ہمیں مرحمت فرمایا ہے۔ یہ افسانہ ہم ان کی ۷۱ ویں سالگرہ کے موقع پر شایع کر رہے ہیں۔ یہ مندرجہ بالا اقسام میں چوتھی طرح کے افسانوں کے تحت آتا ہے۔ امید ہے اردو قارئین اس کے تیکھے طنز اور لطیف مزاح سے بخوبی لطف اندوز ہوں گے۔]

—— ادارہ

کھڑکی کے باہر دور تک ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے کی سیٹ پر بیٹھا کمل کھڑکی کے باہر پھیلے، جیسے اس سونے سحر زدہ ماحول سے لطف اندوز ہو رہا تھا —— ایک دوسرے کو کاٹتی، کہیں کہیں چمکتی، دور تک گورکھ دھندے بناتی ریل کی پٹریاں، بائیں طرف ذرا دور پر بوگیوں سے چپ چاپ کھڑے ریل کے ڈبے، سامنے اندھیرے میں چمکتے بجلی کے تار، اسٹیشن کے احاطے کے باہر پیڑوں کے جھنڈ میں سے جھانکتی مکانوں کی کھڑکیاں، بائیں طرف کہیں دور سے دھول اور دھویں کو چیر کر، پیڑوں پر، تاروں پر، ریل کی پٹریوں اور خاموش کھڑے گاڑی کے ڈبوں پر پڑتی فلڈ لائٹس کی روشنی، اور ابھی دور کہیں شنٹ کرتے انجن کی شوں شوں —— اندھیرے روشنی، سناٹے اور انجن کے شور سے ملا جلا کچھ عجیب سا ماحول .... وہ اپنے ڈبے میں بیٹھا ہوا بھی جیسے اس ماحول کا جزو بن گیا تھا، جبھی کسی نے نہایت درشت لہجے میں، جیسے سوال کا ایک ڈھیلا سا اس کی گدی پر دے مارا:

"یہ نیچے کی سیٹ کیا خالی ہے؟"

مڑ کر کمل نے دیکھا —— چوڑے چکلے تندرست و توانا جسم اور اتری ہوئی عمر کے باوجود باکسر ٹائپ کے ایک کھدر دھاری نیتا ڈبے کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ پیچھے قلی ان کا بستر اٹھائے ہوئے

ڈبے میں بہت گرمی تھی۔ کمل بے حد تکان محسوس کر رہا تھا۔ وہ باہر کے ماحول سے اپنے کو پوری طرح علیحدہ نہیں کر پایا تھا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے نظروں سے ہی سامنے ٹ پر رکھے بستر کی طرف اشارہ کر دیا کہ دیکھ لیجئے سیٹ خالی نہیں ہے۔

"آپ کا ہے ؟" انھوں نے بستر کی طرف انگلی اٹھائی۔

"جی نہیں ۔ یہ سیٹ "نگڈ" ہے ۔ وہ صاحب بستر رکھ کر ابھی باہر گئے ہیں"۔ اس نے بادلِ استہ جواب دیا۔

LOWER

"میں نے لوئر (LOWER) برتھ بک کرنے کو کہا تھا ؟"

کمل کو لگا جیسے وہ اس کی شکایت کر رہے ہوں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ نہیں صاحب آپ مجھ سے نہیں کہا۔ لیکن اس کی بات سننے کو وہ رُکے نہیں۔ انھوں نے قلی کو بستر اوپر کی برتھ پر ھنے کا حکم دیا اور لپکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

کمل نے پھر اپنا منہ کھڑکی کے باہر کر لیا۔ لیکن نہ جانے کیسے سارے ماحول کا حسن ختم سا گیا۔ گرمی کے دن تھے۔ جون کا مہینہ، ڈبہ تو خیر بھٹی بنا ہی ہوا تھا، لیکن باہر کے خاموش ماحول ے آنکھوں کو جو ٹھنڈک پہلے محسوس ہو رہی تھی، وہ بھی نہ جانے کیسے ہوا ہو گئی۔ باہر سب ہ ویسا ہی تھا لیکن کمل کی آنکھیں وہ سب دیکھ کر بھی جیسے نہ دیکھ رہی تھیں۔ وہاں اس کھدر ش جابر نیتا کی صورت آ بیٹھی تھی۔ کمل کو لگا جیسے اس نے انھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ تبھی سے یاد آیا کہ اس نے وہ صورت ٹائمس آف انڈیا میں لکشمن کے کارٹونوں میں دیکھی ہے۔ لکشمن ب بھی کسی ایسی جابر نیتا کے کارٹون بناتا ہے۔ جو اپنے ساتھیوں کو پیٹ یا پچھاڑ رہا ہو تو س کا ڈیل ڈول، آستین چڑھی بالوں بھری مضبوط باہیں لٹکا ہوا جبڑا، موٹے پھیلے ہونٹ، لے میں بھنچے ہوئے دانت تقریباً سب کچھ ویسا ہی ہوتا ہے۔ ضرور ہی کارٹونسٹ نے اس لیڈر و کہیں دیکھا ہے، ورنہ ایسی عجیب مماثلت کیسے ممکن ہے! کمل نے دل میں سوچا اور لکشمن کے کئی ارٹون اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔

کمل سفر کے معاملے میں بڑا نروس تھا۔ دو تین دن پہلے ہی سفر اس کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ اگر اس کی سیٹ محفوظ ہو تو بھی وہ ایک گھنٹہ پہلے ہی سٹیشن پہنچ جاتا۔ تقسیم کے بعد الہ آباد ئے ہوئے اسے دو ہی سال ہوئے تھے پنجاب میں اس کے والد کا اچھا خاصہ کاروبار تھا اور وہ

مرنے سے شاعری کیا کرتا۔ لیکن تقسیم میں نہ صرف سب کچھ برباد ہوگیا، بلکہ والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اور گھر کی ذمہ داری اس کے سر آن پڑی۔ الٰہ آباد میں پسنے کے سلسلے میں کسی ضروری کام سے اسے لکھنؤ جانا تھا۔ طبیعت اس کی خراب تھی، اس لئے اس کی بیوی نے دس بجے رات کو الٰہ آباد اسٹیشن سے چھوٹنے والی گاڑی میں اس کی سیٹ بک کرا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس زمانے میں فرسٹ سکنڈ، انٹر اور تھرڈ ـــــ چار طرح کے ڈبے ہوتے تھے۔ جب وہ اسٹیشن پر سیٹ بک کرانے گئی تو اس کو معلوم ہوا کہ اب سکنڈ کلاس میں سیٹ بک نہیں ہوتی۔ سرکار نے فرسٹ کلاس ختم کر دی ہے سکنڈ کو فرسٹ کر دیا۔ اور اس کا کرایہ تھوڑا بڑھا دیا ہے۔ چونکہ انٹر کو سکنڈ بنا دیا ہے اس لئے اس میں ریزرویشن کا سوال نہیں اٹھتا۔ لکھنؤ جانا ضروری تھا، اس لئے مجبوراً اس کی بیوی فرسٹ کلاس میں ہی سیٹ بک کرا آئی تھی۔ تنگی کے دن تھے۔ کمل کو سکنڈ کلاس میں ہی سفر کرنا بار گذرتا تھا، لیکن جب اس کی بیوی نے اس کو آکر سمجھایا کہ کچھ ہی زیادہ پیسے لگے اور نیچے کی سیٹ مل گئی ہے تو اس کو اطمینان ہوگیا۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور سیٹ محفوظ ہونے کے باوجود وہ پون گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کی بیوی کا خیال تھا کہ سیٹ تو محفوظ ہے اسٹیشن بھی بہت دور نہیں پونے دس بجے بھی گھر سے چلا تو آرام سے پہنچ جائے گا۔ لیکن وہ شام ہی سے شور مچانے لگا تھا۔ سامان وغیرہ باندھ کر۔ ضروری کاغذات سنبھال کر وہ آٹھ بجے ہی تیار ہوگیا تھا۔ نو بجے اس نے کھانا کھایا۔ اور سوا نو بجے رکشا کر کے وہ اسٹیشن چلا آیا۔ اتنی دیر تک گاڑی چلنے کے انتظار میں بیٹھی بیوی بور ہوگی، اس خیال سے اس نے اسے زبردستی گھر پر ہی روک دیا تھا۔

گاڑی چھ نمبر کے پلیٹ فارم پر لگی تھی، جسے شہر والے گدھا لائن کہتے تھے۔ گھنٹہ بھر پہلے آجاتی تھی۔ حالانکہ اسے کسی دوست نے بتایا تھا کہ سکنڈ کلاس کے ہی ڈبوں پر چاک سے فرسٹ لکھ دیا جاتا ہے۔ مگر جس ڈبے میں کمل کی سیٹ محفوظ تھی وہ فرسٹ کلاس کا ہی ڈبہ تھا ـــــ پرانے ڈھنگ کا ـــــ اس بات کا علم اسے ڈبے میں داخل ہوتے ہی ہوگیا تھا۔ سامنے ہی کی سیٹ کا ریکسین کسی نے پورے کا پورا کاٹ لیا تھا اور سیٹ کا طلاٹ نہایت بھدے ڈھنگ سے اپنی برہنگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جب نمبر پڑھنے پر معلوم ہوا کہ سیٹ اسی کی ہے تو اس نے سوچا کہ دوسری صحیح سالم سیٹ خالی ہو تو اس پر اپنا بستر لگا لے۔ ڈبے کے باہر چپکے ہوئے کارڈ پر نظر ڈالنے پر اسے معلوم ہوا کہ کوئی سیٹ خالی نہیں۔ تب اس نے سوچا کہ دیکھیں شاید کسی دوسرے ڈبے میں سیٹ خالی ہو، لیکن اتنی دور آتے آتے ہی تھک گیا تھا۔ اس لئے اس نے قلی سے سیٹ پر بستر بچھانے کو کہا ـــــ

ربچھ جائے گا تو ٹاٹ ڈھک جائے گا، کسے معلوم ہوگا کہ سیٹ کی ریکسین پھٹی ہے۔ اس نے
پا۔ بستر بچھ گیا اور وہ آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تو اسے گرمی کا احساس ہوا۔ جون کا مہینہ
ا۔ دن بھر لو چلتی اور رات میں حبس ہو جاتا۔ کمرہ بھٹی بنا ہوا تھا۔ قلی کے جانے کے بعد اس
پنکھے کا سوچ گھمایا۔ ذرا بھی نہیں ہلا۔ اٹھ کر اس نے زوروں سے اسے جھٹکے دیئے۔ تب اسے
لوم ہوا کہ سکنڈ کے پیسے دے کر (کچھ زیادہ ہی صحیح) فرسٹ کلاس میں سفر کرنا آسان نہیں جس
سیٹ کا ریکسین پھاڑ دیا تھا، اس نے پنکھے کو بھی بے کار کر دیا تھا۔ معاً اس نے سوچا کہ سکنڈ
ں جا کر دیکھیں اگر کوئی سیٹ خالی ہو تو وہیں چلے جائیں۔ اور دل ہی دل میں اس نے اپنی
ٹھ ٹھونکی کہ اچھا ہوا وقت سے پہلے آگیا۔ اگر وقت پر ہی آتا تو اسے اسی ڈبے میں سفر کرنا پڑتا
... لیکن سکنڈ کے ڈبے میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انٹر کا ڈبہ ہے۔ چاک سے انٹر کاٹ کر
لنڈ لکھ دیا گیا ہے۔ اگرچہ گاڑی چلنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ تو بھی ڈبہ ٹھسا ٹھس بھر گیا
ا۔ پنکھے کے نیچے ہی سہی لیکن ساری رات بیٹھ کر سفر کرنے کی سکت کمل میں نہیں تھی —— وہ
پنی سیٹ پر لیٹ جائے گا، گاڑی چلے گی تو فر فر ہوا آئے گی اور کسی طرح کی پریشانی نہ ہوگی——
س نے سوچا اور واپس اپنے ڈبے میں آگیا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ گاڑی چلنے تک باہر پلیٹ فارم
ر گھومے، لیکن جسم میں طاقت نہیں تھی۔ اس لئے صراحی سے پانی کا گلاس پی کر وہ سیٹ پر جا
یٹھا۔ کچھ دیر بعد دوسری سیٹ والے صاحب بھی آگئے اور بستر سیٹ پر رکھ کر باہر چلے گئے۔
ڑھنے کا موڈ نہیں تھا۔ یوں بھی ڈبے میں روشنی گاڑی چلنے پر ہی تیز ہوتی ہے، اس لئے سیٹ
ر تکیہ دوہرا کر اس پر کہنی ٹکا، وہ نیم دراز ہو کر ڈبے کے پیچھے کی طرف دور تک بچھی ہوئی پٹریوں
کے جال دیکھنے لگا۔

.... اس وقت اس منظر نے اس کی ساری کوفت کو مٹا دیا تھا اور ڈبے کی گرمی کو بھلا کر
سے اپنے میں منہمک کر لیا تھا لیکن ان کانگریسی نیتا کے جھلا کر باہر جانے کے بعد جب اس نے اس
منظر سے لطف اندوز ہونا چاہا تو اس کا جادو مٹ چکا تھا —— یہ شخص جو شکل و صورت
سے کسی جوے اڈے کا مالک معلوم ہوتا ہے، غنڈوں کا سردار لگتا ہے، کسی بدنام ہوٹل کا مالک
دکھائی دیتا ہے، کانگریس میں کیسے ہے؟ بار بار یہی بات اس کے ذہن میں آنے لگی—— مضبوط
اتھ پاؤں اور جسم کے علاوہ بائیں طرف قدرے لٹکا ان کا جبڑہ، موٹے موٹے پان رنگے ہونٹ،
ور بائیں طرف کے ہونٹوں سے جھانکتے دانت جن کی وجہ سے ان کے ہونٹ مستقل طور پر ٹیڑھے

میٹرے لگتے تھے ـــــ سب کچھ مل کر ان کی شخصیت خاصی ڈراونی تھی۔ اور باہر کی طرف دیکھا ہوا بھی کمل جیسے انہی کو دیکھ رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر منہ کیے وہ ان خیالات میں گم تھا کہ وہ نیتا دھڑ دھڑاتے ہوئے پھر ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے کنڈکٹر تھا۔

ڈبے میں آکر کنڈکٹر نے ہاتھ کے چارٹ میں سیٹ کا نمبر دیکھا اور اوپر کی برتھ کی طرف اشارہ کر دیا ـــــ "یہ برتھ آپ کی ہے"

"لیکن میں نے تو لوئر برتھ مانگی تھی"۔

"اس میں تو اپر (UPPER) ہی لکھی ہے"

"دوسرے ڈبے میں کوئی لوئر برتھ نہیں مل سکتی ہے؟"

"کوئی گنجائش نہیں"۔

اور کنڈکٹر اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی اترے، تبھی لوئر برتھ والے صاحب چڑھے اور انھوں نے نیتا جی کو نمسکار کیا۔ لیکن ان کے نمسکار کی طرف دھیان دیئے بغیر نیتا جی کنڈکٹر کے پیچھے لپکے چلے گئے اور باہر پلیٹ فارم پر جاکر اس سے بحث کرنے لگے۔

سامنے کی برتھ والے صاحب چپ چاپ اپنا بستر کھولنے لگے۔

"کیوں صاحب یہ کون ہیں؟" کمل نے ان سے پوچھا۔

"کل تک تو آٹے کی چکی اور کٹی کی مشین چلاتے تھے اب تو نیتا جی ہیں"۔

"کانگریسی ہیں؟"

"ان کے بھائی کانگریس تحریک میں برسوں جیل میں رہے۔ آزادی ملتے ہی یہ بھی ہو گئے۔ بھائی کو تو کوئی پوچھتا نہیں مجبوراً پی۔ ایس۔ پی۔ میں چلے گئے۔ مگر یہ کانگریس میں ہیں کوئی لیڈر آئے یہ آگے آگے رہتے ہیں۔ کئی کمیٹیوں میں ہیں۔ بیسوں ٹرک اور بسیں ان کی ہیں۔ آنے والے الکشن میں ٹکٹ لینے کی کوشش میں ہیں۔ جیت گئے تو ان کا خیال ہے کہ پھر انھیں کوئی نہیں روک سکتا"۔

عین اسی وقت قریب ہی سے کہیں گارڈ کی سیٹی سنائی دی کنڈکٹر کا پیچھا چھوڑ کر ہوئے ڈبے میں آئے اور اوپر کی برتھ پر بستر بچھانے لگے ـــــ پرانا سا ہولڈال، گندی سی کھیس اور مٹ میلی سی کھدر کی چادر۔ بستر بچھا کر وہ پنکھے کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اتنی گرمی ہے صاحب پنکھا آپ نے کیوں نہیں چلایا؟"

وہ اس طرح کمل پر گرپے جیسے وہ ان کا نوکر یا خدمت گذار ہو۔کمل کے جی میں آیا کہہ دے کہ پنکھا خراب ہے لیکن وہ خاموش رہا۔

آگے بڑھ کر انھوں نے پنکھے کا سوئچ ادھر ادھر گھمایا جب اس میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو انھوں نے اسے نیچے سے پکڑ کر زور سے ادھر ادھر جھٹکا دیا۔ جب اس مضبوط ہاتھ اور لوہے کی سی کلائی کا جھٹکا کھا کر وہ بے شرم ٹس سے مس نہ ہوا تو انھوں نے جالی میں انگلی ڈال کر اسے حرکت دینے کی کوشش کی لیکن جالی باریک انگلی موٹی .... تبھی، جب وہ سوچ نہ پارہے تھے کہ کیا کریں اچانک ان کی نظر گاڑی کے باہر کھڑے گارڈ پر گئی جو دائیں ہاتھ میں ہری جھنڈی لئے اسے اونچا کرکے ہلا رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے سیٹی ہونٹوں سے لگا کر بجانے والا تھا.... وہ دروازے کی طرف لپکے۔

"دیکھئے میں فرسٹ کلاس میں ٹریول کر رہا ہوں، پنکھا خراب ہے، اسے ٹھیک کرا لیجئے۔"

گارڈ نے سیٹی بجائی، جھنڈی والا ہاتھ ہلایا اور سیٹی منہ سے نکال کر بولا "اب ٹائم ہو گیا ہے۔ اگلے اسٹیشن پر ہی ٹھیک ہو سکے گا۔"

گاڑی ہلی۔گارڈ پیچھے کو مڑ گیا۔گرم ہوا کا ہلکا سا جھونکا ڈبے میں آیا کمل تکیے کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گیا اور ٹانگیں اس نے کھڑکی کے باہر پھیلا دیں۔

نیتا جی لمحہ بھر باہر کھلنے والے دونوں دروازوں کے بیچ کی جگہ میں چپ چاپ کھڑے رہے۔فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں بیٹھنے کے لئے ایک آرام کرسی ہوا کرتی تھی، لیکن یہ فرسٹ کلاس کا اصلی ڈبہ نہیں تھا، بلکہ سکنڈ کا کام دینے والا فرسٹ کا ڈبہ تھا۔اس لئے اس میں سے کرسی اٹھالی گئی تھی۔

لمحہ بھر اسی طرح کھڑے رہ کر وہ کمل کی طرف ایک قدم بڑھے۔"آپ تو کچھ پہلے سے آگئے تھے؟"

"میں ہمیشہ پون گھنٹہ پہلے آتا ہوں"۔ کمل نے کہنی کے بل اٹھ کر کہا۔ جیسے پہلے آکر اس نے کوئی خاص تیر مار لیا ہو۔

"آپ نے پنکھا نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا"

"تو آپ نے ٹھیک کیوں نہیں کرایا؟"

"میرا خیال تھا، کوئی مستری ادھر سے گذرے گا تو کہوں گا۔چونکہ گاڑی گدھا لائن پر کھڑی ہے، شاید ادھر کوئی نہیں آیا۔"

اگرچہ ڈبے کے پیچھے کی طرف کا نظارہ کرنے میں کمل مستری کی بات یکسر بھول گیا تھا تو بھی لُدھالائن کی بات اس نے اپنی صفائی میں کہی تھی، اس کا خیال تھا کہ ان الفاظ کے استعمال سے وہ اسے اپنے شہر کا رہنے والا سمجھیں گے اور ان کے لہجے میں کچھ نرمی آئے گی۔ لیکن وہ اسی طرح جھنجھلائے ہوئے بولے۔

"آپ کو اسٹیشن ماسٹر سے جا کر کہنا چاہئے تھا..... فرسٹ کلاس کا ڈبہ اور اس میں پنکھا نہ ہو۔"

"میں بیمار ہوں، اتنی دور جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہوئی" کمل نے کہا "پھر جب میں یہاں آیا تھا تو ڈبہ خالی تھا۔ سامان کس کے سہارے چھوڑ کر جاتا؟"

لیکن ان کے تیور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس ڈبے میں پنکھے نہ چلنے کا سارا قصور اسی کا ہے۔ بیزاری سے سر کو جھٹکا دے کر انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک تقریر جھاڑ دی کہ ہندوستانیوں میں یہی خرابی ہے، اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنا انھوں نے نہیں سیکھا۔ اس کی جگہ کوئی انگریز ہوتا تو بغیر پنکھا ٹھیک کرائے کبھی چین سے نہ بیٹھتا، کہ اس کے پاس تو لوئر برتھ ہے، اسے ہوا مل جائے گی۔ اسے اوپر کی برتھ پر سونے والوں کا خیال کرنا چاہئے تھا..... "ہم لوگ اتنے دنوں تک غلام رہے ہیں انھوں نے تقریباً گرجتے ہوئے کہا" کہ اپنی خود غرضی کے تنگ گھیرے کے باہر ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایک شہری کے کیا حقوق اور کیا کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں ہم نہیں جانتے۔ ہر قسم کے استحصال کو ہم برداشت کر لیتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ محض آزادی ملنے سے کچھ نہیں ہو جاتا۔ ہمیں اپنے حقوق کے لئے قدم قدم پر لڑنا ہوگا۔ نوکر شاہی کی مشینری میں مخالفت کا تیل دینا ہوگا۔ اب دیکھتا ہوں کہ کس طرح یہ لوگ پنکھا ٹھیک نہیں کرتے۔"

نہ جانے کمل کو کیا سوجھی۔ وہ دھیرے سے بولا "بات ایسی نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہماری سرکار عوام کی سرکار ہے اور وہ اتنی چھوٹی چھوٹی سہولتیں فرسٹ کلاس میں چلنے والوں کو نہ دے کر انھیں یہ سمجھانا چاہتی ہے کہ تھرڈ کلاس کے عوام کیسے سفر کرتے ہیں"۔ اور اس نے اپنے بستر کے نیچے کا ٹاٹ دکھایا کہ چاہے پھٹا ہے لیکن تھرڈ کی سیٹ سے تو بہتر ہے۔ "میں نے تو یہ بھی سنا ہے" اس نے کہا "کہ سرکار تھرڈ کلاس میں پنکھے لگائے گی اور فرسٹ کلاس سے ہٹائے گی!"

نیتاجی لحہ بھر اس کے سر پر کھڑے ہو کر اسے گھورتے رہے کہ وہ کہیں ان کا مذاق تو نہیں اُڑا رہا ہے۔ لیکن کمل بھولا سا منہ بنائے بالکل سنجیدہ بنا بیٹھا رہا۔

"آپ نے غلط سنا ہے"۔ انھوں نے منہ کو اور بگاڑ کر کہا "سرکار اونچ نیچ کا فرق ضرور مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں کہ فرسٹ کلاس سے پنکھے ہٹائے گی۔ ہم لوگوں کو فرسٹ کلاس کا کرایہ وہ

کیا اسی لیے سوچتی ہے کہ ہم لوگ اس گرمی میں ہفتے کمیٹیوں کی نشستوں میں شریک ہوں۔ پنکھے کے بغیر تو تھرڈ میں بھی ہم لوگ سفر کرتے تھے۔"

کمل کہنا چاہتا تھا کہ مہاتما گاندھی تھرڈ کلاس میں ہی سفر کر کے معمولی کمیٹیوں میں نہیں، بڑی بڑی کانفرنسوں میں جاتے تھے لیکن تبھی اس کی نگاہ ان کے غصے سے بگڑتے ہوئے چہرے پر چلی گئی اور اسے خیال آیا کہ نہ جانے یہ کبھی منسٹر ہو ہی جائیں اور اس کے سامنے لکشمن کے کارٹونوں کا پارٹی باس آگیا اور اسے لگا کہ وہ ابھی اسے ڈبے کے فرش پر اسے گرا کر اس کی چھاتی پر کودنے لگیں گے اور وہ چپ ہو گیا۔

○

یک اسٹیشن پر گاڑی ان کی تقریر کے دوران ہی نکل گئی۔ پھاپھا موئر گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی تو ہ دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ گاڑی رکی تو وہ پلیٹ فارم پر کودے اور گارڈ کے ڈبے کی طرف ھاگے۔ لیکن وہ شاید ابھی گارڈ کے ڈبے تک پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ انجن نے سیٹی دے دی دوسرے نٹ وہ بھاگتے ہوئے واپس آئے گاڑی حرکت میں آچکی تھی، جب وہ ڈبے میں آسوار ہوئے۔ در آکر انھوں نے بتایا کہ یہاں گاڑی دو ہی منٹ رکتی ہے وہ اگلے اسٹیشن پر گارڈ سے کہیں گے۔

گاڑی کے چلنے پر فر فر ہوا آنے لگی تھی، کمل کو دوپہر میں آرام کرنے کی عادت تھی، مگر جب بں سفر کرنا ہوتا تو گھبراہٹ کی وجہ سے وہ دوپہر کو آرام نہ کر پاتا۔ گیارہ بجنے والے تھے اس لئے ، پھر لیٹ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر بتی بجھا دے۔ کانجی ہاؤس کے باڑے میں بند بپھرے ہوئے چھٹے سانڈ کی مانند وہ گھوم رہے تھے اس لئے آنکھوں پر اس نے رومال رکھ لیا تاکہ نیند آنے ں خلل نہ پڑے۔ لیکن تبھی دوسری سیٹ والے صاحب جو باتھ روم گئے تھے، نائٹ سوٹ پہن کر پڑے کندھے پر لٹکائے آئے۔ انھوں نے چپ چاپ انھیں کھونٹیوں پر ٹانگا اور بتی کی سوئچ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "حضور میں بتی بجھا رہا ہوں آپ اپنی برتھ کا سوئچ جلا لیجئے۔"

یقیناً انھوں نے اپنے نمسکار کی طرف دھیان نہ دینے کا بدلہ چکا دیا تھا۔

نیتا جی ہڑبڑا کر واپس لوٹے۔ اپنی برتھ کی زنجیر پکڑ کر ایک پاؤں نچلی سیٹ پر رکھ کر اوپر چڑھ گئے۔ ویسے ہی کہنی کے بل لیٹ کر انھوں نے اپنی برتھ کا نائٹ بلب جلا دیا۔

سامنے والے ساتھی ڈبے کی بتیاں بجھا کر اپنی برتھ پر دراز ہو گئے۔

لیکن اوپر کی برتھ پر سخت گرمی تھی۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے کرتا اتار دیا۔ کمل کے

دل میں آیا کہ ان سے کہے ——— صاحب آپ پنکھے دیکھنے کا چکر چھوڑیئے۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔ صاف دھلا، چوڑا فرش ہے۔ یہیں، نیچے، تو دونوں دروازوں کے بیچ کی کھلی جگہ میں بستر لگا لیجئے۔ دونوں کھڑکیوں سے فرفر ہوا آئے گی۔ آرام سے سو جائیے ——— لیکن سیدھے یہ بات کہنے کی ہمت اس میں نہیں ہوئی۔ تب انھیں سنا کر اس نے کہا "ایک بار، کچھ سال پہلے میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا اوپر کی برتھ تھی، یہی گرمیوں کے دن تھے کہ پنکھا خراب ہو گیا۔ مجھ سے تو اوپر لیٹا نہ گیا۔ تب میں نے وہاں دونوں دروازوں کے بیچ فرش پر بستر لگا لیا اور آرام سے سو گیا۔۔۔ فرسٹ کلاس میں یہی خوبی ہے سیٹیں محفوظ رہتی ہیں۔ باہر سے کسی کے آنے کا ڈر نہیں ہوتا، فرش چوڑا اور صاف، ضرورت پڑنے پر آدمی آرام سے بستر لگا سکتا ہے"۔

انھوں نے لمحہ بھر اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ لیکن اس کا چہرہ تو اندھیرے میں تھا۔ ان کی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں ——— 'کیسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو۔ فرسٹ کلاس کے پیسے اسی لئے خرچ کئے ہیں کہ کھڑے فرش پر سوئیں ——— لیکن یہ سب انھوں نے کہا نہیں ——— سیدھے لیٹ کر جیسے چھت کو سناتے ہوئے کہا "یوں تو ایسی بات نہیں"۔ زندگی بھر تھرڈ کے ڈبوں میں اوپر کی برتھ پر سوئے ہیں۔ کل ایگریکلچر منسٹری کی ایک ضروری میٹنگ میں حصہ لینا ہے۔ نیند آ جاتی تو اچھا تھا۔

کمل نے کہا "صاحب آپ بڑے نیتا معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ریلوے منسٹر سے کہہ کر اس دھاندلی کو کیوں نہیں رکوا دیتے۔ گرمیوں کا سفر۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اور پنکھا خراب"۔۔۔۔

بظاہر وہ اپنی طرف سے ان کی جھنجھلاہٹ دور کرنا چاہتا تھا۔ "آپ گھبرائیے نہیں۔ میں اگلے ہی سٹیشن پر اس گارڈ کو جا کر پکڑوں گا"۔ انھوں نے کہا کمل کہنا چاہتا تھا ——— 'آپ نہ گھبرائیے۔ میری سیٹ پر تو فرفر ہوا آ رہی ہے' لیکن وہ چپ رہا۔

ہوا کے جھونکے، گاڑی کے ہچکولے، نڈھال جسم کمل نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گیا۔

O

اچانک آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا ——— گاڑی کسی چھوٹے سٹیشن پر کھڑی ہے ڈبے کے دروازے میں کھڑے نیتا جی نیچے پلیٹ فارم پر کھڑے کسی شخص سے الجھ رہے ہیں۔

فوراً اٹھ کر کمل نے کھڑکی سے دیکھا ——— گارڈ ہے ——— سکھ ہے ——— اور انجن کو ہری بتی دکھا رہا ہے پتہ نہیں نیتا جی نے کیا کہا تھا۔ گارڈ یہی جملے کمل کو سنائی دیئے۔

"پرتاپ گڑھ میں سٹیشن ماسٹر سے کہئے گا۔ یہ فلیگ سٹیشن ہے۔ یہاں کوئی مستری نہیں۔ آپ

ہر سٹیشن پر میرے پاس بھاگے آتے ہیں۔ میں مستری نہیں گارڈ ہوں۔"

گاڑی چل دی تو دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا، لاک لگا وہ اپنی برتھ پر چلے آئے۔ حبس اتنا تھا کہ چلتی گاڑی میں بھی ہوا کے جھونکے مشکل سے پوری نچلی سیٹ پر آتے تھے۔ کمل کھڑکی کے ساتھ چپٹا لیٹا تھا اور کبھی کبھی پیر کھڑکی کے باہر کر لیتا تھا۔ اوپر کی برتھ پر تو ہوا کی رمق تک نہ تھی کرتہ جو انھوں نے پھر پہن لیا تھا، اتار کر پھر کھونٹی سے ٹانگ دیا۔ اور لیٹ گئے۔

O

رات کا ایک بجا ہوگا۔ جب گاڑی کے باہر کچھ شور سن کر کمل اٹھا۔ تبھی کوئی دھڑدھڑاتا ہوا گاڑی میں چڑھا۔ بجلی جلی۔ سامنے والے صاحب پیچھے کی طرف کروٹ کر کے لیٹے رہے۔ کمل نے دیکھا۔ نیتا جی کے پیچھے پیچھے سٹیشن ماسٹر اور ایک مستری ہے۔

مستری نے پنکھے کا سوئچ گھمایا۔ اس کی جالی کھولی۔ ہلایا ڈلایا۔ کہیں سے کچھ تار ملا کر اسے جلانے کی کوشش کی پھر بولا "صاحب یہ پنکھا خراب ہے۔ بدلا جائے گا۔ یہ کام یہاں نہیں ہو سکتا ورکشاپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈبہ تو کنڈم معلوم ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگا دیا گیا ہے۔"

اور مستری اوزار لئے ہوئے اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سٹیشن ماسٹر۔ گارڈ نے سیٹی دی دروازے میں کھڑے ہو کر نیتا جی چلائے۔

"لیکن میں فرسٹ کلاس کا پسنجر ہوں۔ اتنی گرمی میں بغیر پنکھے کے سفر نہیں کر سکتا۔ میں گاڑی کو چلنے نہیں دوں گا۔ میں گاڑی کی زنجیر کھینچ دوں گا۔"

سٹیشن ماسٹر نے کہا "صاحب اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ آپ کو وہیں الہ آباد میں کہنا چاہیے تھا۔"

تبھی گارڈ بتی ہلاتا ہوا آگیا۔

نیتا جی اس پر گرجے "میں نے آپ سے الہ آباد ہی میں کہا تھا کہ پنکھا ٹھیک کرائیے۔ آپ نے کان نہیں دیئے۔"

"گاڑی چلنے کے وقت آپ نے کہا، تب کیا کرتا" گارڈ بے رخی سے بولا "پہلے آپ کہاں سوئے ہوئے تھے۔ اب آرام سے جا کر بیٹھ جائیے۔ گاڑی پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہے۔"

"میں گاڑی چلنے نہیں دوں گا۔ آپ نے سمجھا کیا ہے۔ میں نے فرسٹ کلاس میں اس لئے سیٹ ریزرو کرائی ہے کہ گاڑی میں بھنتا جاؤں۔"

ل میں آیا کہ ان سے کہے ـــــــ صاحب آپ پنکھے وبکھے کا چکر چھوڑئے۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔ صاف دھلا، چوڑا فرش ہے۔ یہیں، نیچے، دونوں دروازوں کے بیچ کی کھلی جگہ میں بستر لگا لیجئے۔ دونوں کھڑکیوں سے فرفر ہوا آئے گی۔ آرام سے سو جائیے ـــــــ لیکن سیدھے یہ بات کہنے کی ہمت اس میں نہیں ہوئی۔ تب انھیں سنا کر اس نے کہا "ایک بار، کچھ سال پہلے میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا اوپر کی برتھ تھی، یہی گرمیوں کے دن تھے کہ پنکھا خراب ہو گیا۔ مجھ سے تو اوپر لیٹا نہ گیا۔ تب میں نے وہاں دونوں دروازوں کے بیچ فرش پر بستر لگا لیا اور آرام سے سو گیا۔۔۔ فرسٹ کلاس میں یہی خوبی ہے سیٹیں محفوظ رہتی ہیں۔ باہر سے کسی کے آنے کا ڈر نہیں ہوتا، فرش چوڑا اور صاف، ضرورت پڑنے پر آدمی آرام سے بستر لگا سکتا ہے"۔

انھوں نے لمحہ بھر اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ لیکن اس کا چہرہ تو اندھیرے میں تھا۔ ان کی آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں ـــــــ "کیسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو۔ فرسٹ کلاس کے پیسے اسی لئے خرچ کئے ہیں کہ کھڑے فرش پر سوئیں ـــــــ لیکن یہ سب انھوں نے کہا نہیں ـــــــ سیدھے لیٹ کر جیسے چھت کو سناتے ہوئے کہا۔ "یوں تو ایسی بات نہیں"۔ زندگی بھر تھرڈ کے ڈبوں میں اوپر کی برتھ پر سوئے ہیں۔ کل ایگریکلچر منسٹری کی ایک ضروری میٹنگ میں حصہ لینا ہے۔ نیند آ جاتی تو اچھا تھا۔ کمل نے کہا "صاحب آپ بڑے نیتا معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ریلوے منسٹر سے کہہ کر اس دھاندلی کو کیوں نہیں رکوا دیتے۔ گرمیوں کا سفر۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اور پنکھا خراب"۔۔۔۔

بظاہر وہ اپنی طرف سے ان کی جھنجلاہٹ دور کرنا چاہتا تھا۔ "آپ گھبرائیے نہیں۔ میں اگلے ہی سٹیشن پر اس گارڈ کو جا کر پکڑوں گا"۔ انھوں نے کہا کمل کہنا چاہتا تھا ـــــــ "آپ نہ گھبرائیے۔ میری سیٹ پر تو فرفر ہوا آ رہی ہے" لیکن وہ چپ رہا۔

ہوا کے جھونکے، گاڑی کے ہچکولے، نڈھال جسم کمل نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گیا۔

O

اچانک آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا ـــــــ گاڑی کسی چھوٹے سٹیشن پر کھڑی ہے ڈبے کے دروازے میں کھڑے نیتا جی نیچے پلیٹ فارم پر کھڑے کسی شخص سے الجھ رہے ہیں۔

ذرا اٹھ کر کمل نے کھڑکی سے دیکھا ـــــــ گارڈ ہے ـــــــ سکھ ہے ـــــــ اور انجن کو ہری بتی دکھا رہا ہے پتہ نہیں نیتا جی نے کیا کہا تھا۔ گارڈ یہی جملے کمل کو سنائی دیئے۔

"پرتاپ گڑھ میں سٹیشن ماسٹر سے کہئے گا۔ یہ فلیگ سٹیشن ہے۔ یہاں کوئی مستری نہیں۔ آپ

ہر سٹیشن پر میرے پاس بھاگے آتے ہیں۔ میں مستری نہیں گارڈ ہوں۔"

گاڑی چل دی تو دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا، لاک لگا دہ اپنی برتھ پر چلے آئے۔ حبس اتنا تھا کہ چلتی گاڑی میں بھی ہوا کے جھونکے مشکل سے پوری نچلی سیٹ پر آتے تھے۔ کمل کھڑکی کے ساتھ چمٹا لیٹا تھا اور کبھی کبھی پیر کھڑکی کے باہر کر لیتا تھا۔ اوپر کی برتھ پر تو ہوا کی رمق تک نہ تھی کرتہ جو انھوں نے پھر پہ[illegible] اتار کر پھر کھونٹی سے ٹانگ دیا۔ اور لیٹ گئے۔

O

رات کا ایک بجا ہوگا۔ جب گاڑی کے باہر کچھ شور سن کر کمل اٹھا۔ تبھی کوئی دھڑ دھڑاتا ہوا گاڑی میں چڑھا۔ بجلی جلی۔ سامنے والے صاحب پیچھے کی طرف کروٹ کر کے لیٹے رہے۔ کمل نے دیکھا۔ نیتاجی کے پیچھے پیچھے سٹیشن ماسٹر اور ایک مستری ہے۔

مستری نے پنکھے کا سوئچ گھمایا۔ اس کی جالی کھولی۔ ہلایا ٹٹولا۔ کہیں سے کچھ تار ملا کر اسے چلانے کی کوشش کی پھر بولا "صاحب یہ پنکھا خراب ہے۔ بدلا جائے گا۔ یہ کام یہاں نہیں ہو سکتا ورکشاپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈبہ تو کنڈم معلوم ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگا دیا گیا ہے۔"

اور مستری اوزار لئے ہوئے اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سٹیشن ماسٹر۔ گارڈ نے سیٹی دی دروازے میں کھڑے ہو کر نیتاجی چلائے۔

"لیکن میں فرسٹ کلاس کا پسنجر ہوں۔ اتنی گرمی میں بغیر پنکھے کے سفر نہیں کر سکتا۔ میں گاڑی کو چلنے نہیں دوں گا۔ میں گاڑی کی زنجیر کھینچ دوں گا۔"

سٹیشن ماسٹر نے کہا "صاحب اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ آپ کو وہیں الہ آباد میں کہنا چاہئے تھا۔"

تبھی گارڈ بتی ہلاتا ہوا آ گیا۔

نیتاجی اس پر گرجے "میں نے آپ سے الہ آباد ہی میں کہا تھا کہ پنکھا ٹھیک کرائیے۔ آپ نے کان نہیں دیئے۔"

"گاڑی چلنے کے وقت آپ نے کہا، تب کیا کرتا" گارڈ بے رخی سے بولا "پہلے آپ کہاں سوئے ہوئے تھے۔ اب آرام سے جا کر بیٹھ جائیے۔ گاڑی پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہے۔"

"میں گاڑی چلنے نہیں دوں گا۔ آپ نے سمجھا کیا ہے۔ میں [illegible] فرسٹ کلاس میں اس لئے سیٹ ریزرو کرائی ہے کہ گاڑی میں بھنتا جاؤں۔"

"آپ اتھارٹیز سے شکایت کیجئے گا۔"

"آپ دوسرا ڈبہ لگوایئے۔ میں گاڑی کی زنجیر کھینچ رہا ہوں"۔

"آپ زنجیر کھینچیں گے تو میں آپ کو پولیس کے حوالے کردوں گا"۔

"آپ کا نام کیا ہے؟ میں آپ کی رپورٹ ریلوے منسٹر سے کروں گا"۔

"آپ اتنے بڑے لیڈر ہیں تو ریلوے منسٹر سے یہ بھی کہیئے گا کہ وہ جو سے دن جو نئی اسکیمیں لاگو کرتے ہیں، تو یہ بھی دیکھ لیا کریں کہ انھیں عملی جامہ کیسے پہنایا جائے گا۔ ان سے آپ جیسے تنک مزاج مسافروں کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

"آپ بڑے بدتمیز ہیں" نہیں جی آپے سے باہر ہو گئے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟ میں آپ کو برخاست کرادوں گا"۔

"میرا نام سردار نیتا سنگھ ہے۔ آپ نوٹ کر لیجئے۔ میں کسی منسٹر و نسٹر کو نہیں جانتا۔ ڈی۔ ایس۔ کے ماتحت ہوں۔ اور وہ میرے کام کو جانتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کی شکایت سے بھی واقف ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی باتیں سننے لگیں تو پورے کا پورا ریلوے اسٹاف ہی برخواست ہو جائے۔ آپ شوق سے مجھے برخواست کرا دیجئے۔ لیکن اس وقت آپ مہربانی کر کے آرام کیجئے۔ ایک بج چکا ہے۔ دوسرے مسافروں کا خیال کیجئے"۔

اور اس نے زور سے سیٹی دی۔ بتی ہلائی، گاڑی چل دی۔ بھنبھناتے ہوئے نیتا جی دروازہ بند کر کے بتی بجھا کر اپنی سیٹ پر جا چڑھے۔ اس بار انھوں نے بنیائن بھی اتار دی۔

○

کمل پھر سو گیا۔ زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے ہوا میں کچھ خنکی آگئی تھی۔ نیتا جی کی پریشانی کا خیال اس کے دماغ سے یکسر نکل گیا۔ رائے بریلی پر انھوں نے پھر جا کر جھگڑا کیا ہو تو اسے نہیں معلوم، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی لکھنؤ کے یارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈبے کی بتی جلی تھی سامنے والے ساتھی بستر سمیٹ رہے تھے۔ نیتا جی کی برتھ بالکل خالی تھی۔ کمل اٹھا تو اس نے دیکھا۔ بائیں طرف باہر کے دروازوں کے درمیان فرش پر نیتا جی بستر بچھائے ننگے بدن سو رہے ہیں۔ ان کی دھرتی ادھر ادھر ہو گئی ہے اور ان کے خراٹے صبح کی خاموشی کو بُری طرح جھنجھوڑ رہے ہیں۔ □

ڈاکٹر عطیہ نشاط
شعبۂ اردو ، الہ آباد یونیورسٹی

اوپندر ناتھ اشک کی تصانیف

اوپندر ناتھ اشک کی تخلیقات ۲۸ - ۱۹۲۶ سے مسلسل چھپ رہی ہیں اور آج انہیں لکھتے ہوئے ۵۴ - ۵۳ سال ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا اور ان کا ناول "پتھر البتھر" اسی سال الہ آباد سے چھپا ہے ۔ حالانکہ اشک صاحب کی کافی تخلیقات اردو زبان میں شایع ہوتی ہیں ۔ ان کے افسانے اور ڈرامے کافی مشہور ہوئے ہیں اور انھوں نے مقبولیت بھی حاصل کی ہے لیکن اردو دنیا میں جو مقام ان کو دیا جانا چاہئے تھا وہ کچھ ناقدروں کی بے اعتنائی ، کچھ مصنف کی بے نیازی اور ادبی گٹ بندیوں کی وجہ سے نہیں دیا گیا ۔ ۲۰ سال تک اردو زبان میں لکھتے رہنے کے بعد اور صف اول کے افسانہ نگار قرار دینے کے باوجود ۱۹۴۷ء میں اشک صاحب اچانک ہندی کی طرف متوجہ ہوئے تو ۳۰ برس تک متواتر اسی زبان میں لکھتے رہے ۔ ہندی میں ان کی ۶۵ سے زیادہ تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کا نام ملک کے حدود پار کرکے مغربی ممالک میں بھی مقبول ہو چکا ہے ۔

میں نے الہ آباد یونیورسٹی لائبریری اور الہ آباد پبلک لائبریری کی مدد سے ان کی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے ۔ اشک صاحب کے کچھ اردو ناول مختصر ہو کر پاکٹ بک سیریز میں بھی شایع ہوئے ہیں اور افسانوں کے دو ایک مجموعے بھی ۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "ازلی راستے" ۱۹۴۶ء میں سلطانی بک ڈپو بھنڈی بازار بمبئی سے شایع ہوا تھا ۔ یہ کتابیں یہاں دستیاب نہیں ہو سکیں اس لئے مندرجہ ذیل فہرست میں شامل نہیں کی گئیں ۔

تصانیف کی فہرست اور مندرجات

افسانے

۱ ۔ **نورتن** ۔ جالندھر ۔ شام کتیا بک ڈپو ۔ ۱۹۳۰ء ۔ ص ۹۳

مندرجات :- (۱) دیباچہ نظم میں ۔ قیس جالندھری ۔ ص ج (۲) طالب امن ص ۳ - ۱۴ ۔

"آپ اتھارٹیز سے شکایت کیجیے گا۔"

"آپ دوسرا ڈبہ لگوایئے۔ میں گاڑی کی زنجیر کھینچ رہا ہوں۔"

"آپ زنجیر کھینچیں گے تو میں آپ کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟ میں آپ کی رپورٹ ریلوے منسٹر سے کروں گا۔"

"آپ اتنے بڑے لیڈر ہیں تو ریلوے منسٹر سے یہ بھی کہیے گا کہ وہ چوتھے دن جو نئی اسکیمیں لاگو کرتے ہیں، تو یہ بھی دیکھ لیا کریں کہ انھیں عملی جامہ کیسے پہنایا جائے گا۔ ان سے آپ جیسے تنک مزاج مسافروں کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

"آپ بڑے بدتمیز ہیں" نہیں جی آپے سے باہر ہوگئے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟ میں آپ کو برخاست کرادوں گا۔"

"میرا نام سردار نیتا سنگھ ہے۔ آپ نوٹ کرلیجیے۔ میں کسی منسٹر ونسٹر کو نہیں جانتا۔ ڈی۔ ایس۔ کے ماتحت ہوں۔ اور وہ میرے کام کو جانتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کی شکایت سے بھی واقف ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی باتیں سننے لگیں تو پورے کا پورا ریلوے اسٹاف ہی برخاست ہوجائے۔ آپ شوق سے مجھے برخاست کرادیجیے۔ لیکن اس وقت آپ مہربانی کرکے آرام کیجیے۔ ایک بج چکا ہے۔ دوسرے مسافروں کا خیال کیجیے۔"

اور اس نے زور سے سیٹی دی۔ بتی ہلائی، گاڑی چل دی۔ بھنبھناتے ہوئے نیتاجی دروازہ بند کرکے بتی بجھاکر اپنی سیٹ پر جا چڑھے۔ اس بار انھوں نے بنیائن بھی اتار دی۔

○

کمل پھر سو گیا۔ زیادہ رات ہوجانے کی وجہ سے ہوا میں کچھ خنکی آگئی تھی۔ نیتاجی کی پریشانی کا خیال اس کے دماغ سے یکسر نکل گیا۔ رائے بریلی پر انھوں نے پھر جاکر جھگڑا کیا ہو تو اسے نہیں معلوم، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی لکھنؤ کے یارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈبے کی بتی جلی تھی۔ سامنے والے ساتھی بستر سمیٹ رہے تھے۔ نیتاجی کی برتھ بالکل خالی تھی۔ کمل اٹھا تو اس نے دیکھا۔ بائیں طرف باہر کے دروازوں کے درمیان فرش پر نیتاجی بستر بچھائے ننگے بدن سو رہے ہیں۔ ان کی دھوتی ادھر ادھر ہوگئی ہے اور ان کے خراٹے صبح کی خاموشی کو بری طرح جھنجھوڑ رہے ہیں۔ □

ڈاکٹر عطیہ نشاط
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

اوپندر ناتھ اشک کی تصانیف

اوپندر ناتھ اشک کی تخلیقات ۲۸-۱۹۲۶ سے مسلسل چھپ رہی ہیں اور آج انہیں لکھتے ہوئے ۵۲-۵۴ سال ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا اور ان کا ناول "پتھر الپتھر" اسی سال الہ آباد سے چھپا ہے۔ حالانکہ اشک صاحب کی کافی تخلیقات اردو زبان میں شایع ہوئی ہیں۔ ان کے افسانے اور ڈرامے کافی مشہور ہوئے ہیں اور انھوں نے مقبولیت بھی حاصل کی ہے لیکن اردو دنیا میں جو مقام ان کو دیا جانا چاہیے تھا وہ کچھ ناقدوں کی بے اعتنائی، کچھ مصنف کی بے نیازی اور ادبی گٹ بندیوں کی وجہ سے نہیں دیا گیا۔ ۲۰ سال تک اردو زبان میں لکھتے رہنے کے بعد اور صف اول کے افسانہ نگار قرار دینے کے باوجود ۱۹۴۷ء میں اشک صاحب اچانک ہندی کی طرف متوجہ ہوئے تو ۳۰ برس تک متواتر اسی زبان میں لکھتے رہے۔ ہندی میں ان کی ۶۵ سے زیادہ تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کا نام ملک کے حدود پار کر کے مغربی ممالک میں بھی مقبول ہو چکا ہے۔

میں نے الہ آباد یونیورسٹی لائبریری اور الہ آباد پبلک لائبریری کی مدد سے ان کی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے۔ اشک صاحب کے کچھ اردو ناول مختصر ہو کر پاکٹ بک سیریز میں بھی شایع ہوئے ہیں اور افسانوں کے دو ایک مجموعے بھی۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "ازلی راستے" ۱۹۴۶ء میں سلطانی بک ڈپو بھنڈی بازار بمبئی سے شایع ہوا تھا۔ یہ کتابیں یہاں دستیاب نہیں ہو سکیں اس لئے مندرجہ ذیل فہرست میں شامل نہیں کی گئیں۔

تصانیف کی فہرست اور مندرجات

افسانے

۱۔ **نورتن**۔ جالندھر۔ شام کتیا بک ڈپو۔ ۱۹۳۰ء۔ ص ۹۳

مندرجات:- (۱) دیباچہ نظم میں۔ قیس جالندھری۔ ص ج (۲) طالب امن ص ۳-۱۴۔

(۳) وہ روز ہی تھی ص ۱۵-۴۱ (۴) اتنے نزدیک ص ۴۲-۴۳ (۵) شکنتلا ص ۶۵-۸۲ (۶) انتقام ص ۸۳-۹۳

۲- عورت کی فطرت۔ لاہور۔ چمن بک اسٹال۔ ۱۹۴۳ء۔ ۲۰۹ ص

مندرجات :- (۱) تعارف پریم چند ص ۷-۸ (۲) تقریب۔ ہری چند اختر ص ۱۱-۱۶۔ (۳) عورت کی فطرت۔ ص ۱۷-۳۸ (۴) نئی زندگی ص ۳۹-۵۸ (۵) تانگہ والا ص ۵۹-۸۰ (۶) ناکام تقاصہ ص ۸۱-۹۶ (۷) جاہل بیوی ص ۹۷-۱۱۴ (۸) گودڑ کا لعل ص ۱۱۵-۱۳۰ (۹) ایرو ما ص ۱۳۱-۱۵ (۱۰) بہشتی کی بیوی ص ۱۵۱-۱۷۲ (۱۱) کفارہ ص ۱۷۳-۲۰۹

۳- ڈاچی۔ لاہور۔ اردو بک اسٹال۔ ۱۹۳۹ء۔ ص ۲۰۸

مندرجات :- (۱) پیش لفظ۔ اشک ص ۱۲-۱۶ (۲) ڈاچی ص ۱۷-۳۲ (۳) ۳۳۴- ں ۳۳-۶۴ (۴) امن کا طالب ص ۶۵-۷۷ (۵) لیڈر۔ ص ۷۹-۹۳ (۶) احساس فرض۔ ص ۹۵-۱۱۴ (۷) خاموش شہید۔ ص ۱۱۵-۱۱۹ (۸) مایا۔ ص ۱۲۱-۱۳۳ (۹) زندگی کا راز۔ ص ۱۳۵-۱۵۴ (۱۰) سیلاب۔ ص ۱۵۵-۱۶۴ (۱۱) ڈاکو۔ ص ۱۶۵-۱۸۱ (۱۲) حربہ۔ ص ۱۸۲-۱۹۰ (۱۳) محبت۔ ص ۱۹۱-۲۰۸

۴- کونپل۔ لاہور۔ مکتبہ اردو۔ ۱۹۴۰ء۔ ۲۳۴ ص

مندرجات :- (۱) افسانے کا فن اور ترقی پسندی۔ ص ۹-۲۸ (۲) کونپل۔ ص ۲۹-۵۲۔ (۳) سنگدل۔ ص ۵۳-۷۱ (۴) تہذیب۔ ص ۷۳-۸۸ (۵) گوکھرو۔ ص ۸۹-۱۰۹ (۶) موتی۔ ص ۱۱۱-۱۲۷ (۷) یہ مرد۔ ص ۱۲۹-۱۴۳ (۸) زندگی۔ ص ۱۴۵-۱۶۱ (۹) راجکمار۔ ص ۱۶۳-۱۸۰ (۱۰) دولو۔ ص ۱۸۱-۱۹۰ (۱۱) ماں۔ ص ۱۹۷-۲۱۳ (۱۲) قفس۔ ص ۲۱۵-۲۳۴

۵- چٹان۔ لاہور۔ مکتبہ اردو۔ ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۶۰

مندرجات :- (۱) چٹان۔ ص ۱۱-۲۹ (۲) بینگن کا پودہ۔ ص ۳۱-۳۸ (۳) ابال۔ ص ۳۹-۵۳ (۴) بیداری کے خواب۔ ص ۵۵-۶۶ (۵) ناسور۔ ص ۶۷-۸۰ (۶) کاکڑاں کا تیلی۔ ص ۸۰-۹۶ (۷) چھلکے۔ ص ۹۷-۱۰۶ (۸) کالو۔ ص ۱۰۷-۱۲۰ (۹) چیتن کی ماں۔ ص ۱۲۱-۱۳۶ (۱۰) یہ انسان۔ ص ۱۳۷-۱۵۰ (۱۱) کھلونے۔ ص ۱۵۱-۱۶۰

۶- ناسور۔ دلّی۔ ساقی بک ڈپو۔ ۱۹۴۳ء۔ ص ۲۰۷

مندرجات :- (۱) تعارف۔ وقار عظیم۔ ص ۷-۲۰ (۲) تلاش۔ ص ۲۱-۲۲ (۳) جدائی کی شام کا گیت۔ ص ۲۳-۳۵ (۴) نشانیاں۔ ص ۳۶-۴۶ (۵) وہ میری منگیتر تھی۔ ص ۴۷-۷۰

(۶) پیول کا انجام۔ص ۷۱-۷۴ (۷) بجتیا۔ص ۷۵-۷۵ (۸) بدری۔ص ۸۶-۱۰۰ (۹) مغرور ساحرہ۔ص ۱۰۱-۱۰۵ (۱۰) جہنم کا انتخاب۔ص ۱۰۶-۱۲۳ (۱۱) سراب۔ص ۱۲۴-۱۳۴ (۱۲) راجکمار۔ص ۱۳۵-۱۴۹ (۱۳) تار بابو۔ص ۱۵۰-۱۵۹ (۱۴) ترغیب گناہ۔ص ۱۶۰-۱۹۰ (۱۵) ناسور۔ص ۱۹۱-۲۰۷

۷۔ قفس۔ دلی۔ ساقی بکڈپو۔ ۱۹۴۳ء۔ ص ۱۷۸

مندرجات:۔ (۱) حرف آغاز (اشک)۔ص ۵-۸ (۲) قفس۔ص ۹-۳۱ (۳) کالو ص ۳۲-۳۶ (۴) بگولے۔ص ۳۷-۴۰ (۵) وہ میری منگیتر تھی۔ص ۴۱-۵۷ (۶) آرٹسٹ۔ص ۵۸-۶۰ (۷) ایک جھلک۔ص ۶۱-۷۱ (۸) ہار جیت۔ص ۷۲-۸۷ (۹) ۳۲۴۔ص ۸۸-۹۷ (۱۰) زندگی۔ص ۹۸-۱۰۹ (۱۱) شاعر کی شکست۔ص ۱۱۰-۱۲۹ (۱۲) مایا۔ص ۱۳۰-۱۳۸ (۱۳) ترغیب گناہ۔ص ۱۵۱-۱۷۸

۸۔ کالے صاحب۔ دلی۔ مکتبہ جامعہ۔ ۱۹۵۶ء۔ ص ۱۸۷

مندرجات:۔ (۱) پیش لفظ۔ محترمہ صالحہ عابد حسین۔ص ۷-۱۴ (۲) کالے صاحب ص ۱۵-۲۸ (۳) تکلف۔ص ۲۹-۵۲ (۴) ٹیبل لینڈ۔ص ۵۳-۷۶ (۵) رواقی۔ص ۷۷-۱۰۲ (۶) خلش۔ص ۱۰۳-۱۲۰ (۷) نیچے۔ص ۱۲۱-۱۴۲ (۸) مسٹر گھمنٹ پانڈے۔ص ۱۴۳-۱۶۴ (۹) کیپٹن رشید۔ص ۱۶۵-۱۸۷

ناول

۹۔ ستاروں کے کھیل۔ دلی۔ ساقی بک ڈپو۔ ۱۹۴۲ء۔ ص ۲۵۸

۱۰۔ پتھر الپتھر۔ الہ آباد۔ نیا ادارہ۔ ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۷۲

مندرجات:۔ (۱) پیش لفظ (اشک)۔ص ۷-۱۴ (۲) مقدمہ اشک کے ناول اور پتھر الپتھر۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط۔ص ۱۷-۴۰ (۳) ناول۔ص ۴۱-۷۲

طویل ڈرامے

۱۱۔ قیدِ حیات۔ لاہور۔ مکتبہ اردو۔ ۱۹۴۷ء۔ ص ۱۴۳

مندرجات:۔ (۱) یہ دو ڈرامے۔ فکر تونسوی۔ص ۷-۱۲ (۲) قیدِ حیات۔ص ۱۳-۸۶ (۳) شکاری۔ص ۸۷-۱۴۳

۱۲۔ پینترے۔ الہ آباد۔ نیا ادارہ۔ ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۲۴

۱۳۔ چھٹا بیٹا۔ الہ آباد۔ نیا ادارہ۔ ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۱۲

مندرجات:۔ (۱) پیش لفظ ڈاکٹر اطہر پرویز۔ص ۹-۱۹ (۲) چھٹا بیٹا۔ص ۲۱-۱۱۲

۱۴۔ گرداب ۔ الہ آباد ۔ نیا ادارہ ۔ ۱۹۸۱ء ۔ ص ۹۶

مندرجات :۔ (۱) پیش لفظ ۔ ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص ۹ ۔ ۳۰ (۲) گرداب ۔ ص ۳۱ ۔ ۹۶

یک بابی ڈرامے

۱۵ ۔ پاپی ۔ لاہور ۔ مکتبہ اردو ۔ ۱۹۴۱ء ۔ ص ۱۹۶

مندرجات :۔ (۱) دیوتاؤں کے سائے تلے ۔ ص ۱ ۔ ۱۶ (۲) بیوہ ۔ ص ۱۷ ۔ ۴۲ (۳) حقوق کا محافظ ۔ ص ۴۳ ۔ ۶۶ (۴) پاپی ۔ ص ۶۷ ۔ ۸۶ (۵) کراس ورڈ ۔ ص ۸۷ ۔ ۱۰۲ (۶) لکشمی کا سواگت ۔ ص ۱۰۳ ۔ ۱۲۲ (۷) باہمی سمجھوتہ ۔ ص ۱۲۳ ۔ ۱۴۴ (۸) جونک ۔ ص ۱۴۵ ۔ ۱۹۶

۱۶ ۔ چرواہے ۔ لاہور ۔ مکتبہ اردو ۔ ۱۹۴۲ء ۔ ص ۱۷۲

مندرجات :۔ (۱) چرواہے ۔ ایک مطالعہ ۔ مختار صدیقی ص ۸ ۔ ۲۴ (۲) چرواہے ۔ ص ۲۵ ۔ ۴۵ (۳) میمونہ ۔ ص ۴۶ ۔ ۶۴ (۴) مقناطیس ۔ ص ۶۶ ۔ ۹۲ (۵) معجزے ۔ ص ۹۳ ۔ ۱۰۸ (۶) چلمن ۔ ص ۱۰۹ ۔ ۱۲۴ (۷) کھڑکی ۔ ص ۱۲۵ ۔ ۱۳۹ (۸) سوکھی ڈالی ۔ ص ۱۴۰ ۔ ۱۷۲

۱۷ ۔ تولیے ۔ الہ آباد ۔ نیا ادارہ ۔ ۱۹۷۹ء ۔ ص ۱۵۶

مندرجات :۔ (۱) تولیے ۔ ص ۱۰ ۔ ۴۳ (۲) نیا پرانا ۔ ص ۴۵ ۔ ۷۰ (۳) کیسا صاب کیسی آیا ۔ ص ۷۱ ۔ ۹۲ (۴) پرسرام ۔ ص ۹۳ ۔ ۱۱۴ (۵) پکا گانا ۔ ص ۱۱۵ ۔ ۱۵۶

تذکرے

۱۸ ۔ منٹو میرا دشمن ۔ الہ آباد ۔ نیا ادارہ ۔ ص ۱۲۳

مندرجات :۔ (۱) گزارش احوال ، اشک ص ۹ ۔ ۱۶ (۲) منٹو میرا دشمن ص ۱۷ ۔ ۱۲۳

□

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

اردو کی طرف اربابِ اقتدار کی نگاہِ التفات ہوئی تو مرکز میں 'ترقی' اردو بورڈ قایم کیا گیا اور کئی ریاستوں میں اردو اکیڈیمیاں وجود میں آئیں۔ اترپردیش، بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں یہ اکیڈیمیاں کئی برسوں سے کام کر رہی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کے کام کی نوعیت یکساں نہیں۔ شاید اکیڈیمیوں کے مقاصد بھی پوری طرح واضح اور متعین نہیں ہیں۔ آندھرا پردیش، اترپردیش اور بہار کی اردو اکیڈیمیاں اردو کی بنیادی تعلیم اور اردو تحریک کے مطالبات کی یکسوئی کی بھی ایک حد تک کوشش کر رہی ہیں ــــ بہار اور اترپردیش میں اردو زبان کو کچھ مبہم سی سرکاری حیثیت بھی دی گئی ــــ اس اقدام کی تحسین و قصیدہ خوانی میں اردو اکیڈیموں اور بعض اداروں اور افراد نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن اس "اظہارِ جوشِ عقیدت و امتنان و تشکر" میں سب یہ بھول گئے کہ اس طرح کا اعلان آندھرا پردیش میں آج سے تقریباً پچیس سال قبل، جب ہمارے موجودہ صدرِ جمہوریہ نیلم سنجیوا ریڈی، وہاں چیف منسٹر تھے ہو چکا تھا۔ اس پر اور پھر اب ان نئے اعلانات پر عمل درآمد کس حد تک ہوا یا ہو سکتا ہے؟ ــــ اور اس سے کس حد تک اردو کی بے وطنی اور اردو والوں کے بچوں کی مادری زبان میں تعلیم کے مسائل حل ہو گئے، یہ معاملہ اب تک 'صیغۂ راز' میں ہے ــــ اکیڈیمیاں ان معاملات میں کہاں تک اردو عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہی ہیں؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ کچھ اردو سند یافتگان کے لیے ملازمتوں کی صورت تو نکل آئی ہے۔ ان ریاستوں میں جہاں اردو 'اسکول باہر' اور 'دفتر باہر' کر دی گئی تھی کہیں کہیں اردو کا ایک آدھ نام لیوا بھی نظر آنے لگا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس معاملے میں بہار کی انجمن اردو اور حیدرآباد کی اردو اکیڈیمی نے مثبت اقدامات کیے اور ان کے اچھے نتائج بھی نکلے ہیں ــــ لیکن دوسری اکیڈیمیوں کے نامۂ اعمال میں کتنی نیکیاں لکھی جا سکتی ہیں اس کا علم یا تو 'کاتبانِ اعمالِ حسنہ' کو ہوگا یا 'مقربانِ سرکار و دربار' کو۔

میں نے آج سے بارہ سال قبل ایک نظم "زبان کی موت" کو اس بند پر ختم کیا تھا۔

ہمارے بعد آنے والی نسلیں
ہمارے الفاظ اور معانی کی قبر کو دیکھ کر
اک نئی زباں کے انوکھے لفظوں میں یہ کہیں گی
کہ آج سے چند سال پہلے یہ لفظ و معنی بھی بولتے تھے
صلیبِ جمہوریت پہ لفظوں کی موت آئی
کہیں کتابوں کے مقبروں میں ابھی تلک بے صدا معانی بھٹک رہے ہیں

اس کے بعد ایک مرثیہ میں 'قطع و قتلِ زباں' کی بھی مرثیہ خوانی کرتے ہوئے کہا تھا ؎

زنجیر جب سے قید فرنگی کی ہے کٹی — یہ قید ہر مقام سے آزاد ہو گئی
آئین نے کہا کہ ترا گھر ہے بے گھری — لفظ و معانی مرتے تھے، یہ دیکھتی رہی
غیروں نے اس کے دفن کا فرماں ادھر دیا
اپنوں نے اس کی ہستی سے انکار کر دیا

اس سلسلے کے کچھ متفرق اشعار ہیں ؎

جو آشنا تھے شکل بھی پہچانتے نہیں — اپنے ہی گھر کے بچے اسے جانتے نہیں
زخم اب بھی ہیں ہرے کہ زباں لال ہو گئی — تحریر کی جو شان تھی پامال ہو گئی

اور پھر ؎

دیکھا ہے اقتدار نے جو التفات سے — اس کی مجاوری کو سبھی اٹھ کھڑے ہوئے
جتنے تھے گونگے بہرے وہ اہلِ زباں بنے — منکر تھے اس سے جو، وہی اس کے گلے پڑے
لے کر سندِ مقربِ دربار آگئے
ترکے میں حصہ لینے کو حقدار آگئے

اس پر یہ اندیشہ اور سوال ع

ڈرتا ہوں مصلحت کی نہ بن جائے یہ زباں؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے زندہ رہنے کے امکانات اس وقت کے مقابلے میں اب روشن تر ہو گئے ہیں۔ لیکن التفات و مصلحت کے سوالیہ نشانات اب تک اردو کے گلے میں لٹکے ہوئے ہیں۔ انہی سے منسلک کمیٹیوں اور اکیڈمیوں کی کرسیوں اور منصبوں پر فائز حضرات کے تحفظات و تعصبات اور آپسی اختلافات کا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے اردو کو مبینہ سرکاری مراعات

کے باوجود وہ فیض حاصل نہیں ہو رہا ہے جو اس کا جائز حق ہے۔ اس بات کا احساس انھیں بھی ہے جو اردو سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس سال پھر ساہتیہ اکیڈمی کی اردو کمیٹی نے اردو کی کسی کتاب کو انعام کا حقدار نہیں قرار دیا جس پر ایک انگریزی روزنامے میں اداریہ بھی لکھا گیا ــ اور یہ سوال بجا طور پر اٹھایا گیا کہ ان زبانوں کی کتابیں تک، جن کی حیثیت اب بھی بولی سے زیادہ نہیں یا جن کا ادب اردو سے کہیں کمتر ہے ساہتیہ اکیڈمی انعام کے معیار پر پوری اترتی ہیں، مگر اردو کی کوئی کتاب (گزشتہ تین سال میں شایع ہونے والی) اس معیار کی تکمیل نہیں کرتی۔ اصل مسئلہ معیار کا ہے ہی نہیں اور نہ ساہتیہ اکیڈمی بحیثیت مجموعی اردو کو نظر انداز کرنے کی ملزم ہے۔ دراصل اردو کی کمیٹی کے ارکان کا اختلاف باہمی اردو سے اس ناانصافی کا ذمہ دار ہے۔ اگر ساہتیہ اکیڈمی کے انعامات کی مکمل فہرست سال بہ سال دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو کے ساتھ کئی بار یہ ظلم خود اردو والوں نے کیا ہے ــ

ساہتیہ اکیڈمی انعامات آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل جب شروع کئے گئے تو ان کی رقم ۵ ہزار روپے رکھی گئی تھی ــ آج ۵ ہزار کی قیمت اس وقت کے مقابلے میں پانچ سو ہی شاید رہ گئی ہو۔ ساہتیہ اکیڈمی انعام قومی اعزاز ہے، اس لئے اس کی اہمیت ہے ورنہ اس وقت کئی ریاستی اکیڈمیاں رقم کے لحاظ سے اس سے بڑے انعامات دے رہی ہیں ــ ایک تو یہ کہ ساہتیہ اکیڈمی انعام کی رقم کو کم از کم پانچ گنا کرنا چاہیے تاکہ اس قومی اعزاز کے کوئی مادّی معنی بھی ہوں ــ دوسرے یہ کہ اردو کی حد تک اس بات کی ضمانت ہونی چاہیے کہ بار بار اردو کے اچھے ادیبوں اور شاعروں کو محض دو یا تین افراد کی ذاتی پسند یا ناپسند یا اختلاف کے نتیجے میں اس قومی اعزاز سے محروم نہ رکھا جائے۔

ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن، یا اردو کے سرکاری، نیم سرکاری ادارے، ہر جگہ اردو سرکار سے زیادہ خود اپنوں کے ظلم کا شکار رہتی ہے اور غیر اردو دنیا کے سامنے بار بار اس کے معیار کا سوال مصنوعی طور پر آجاتا ہے ــ اس طرح اردو کو اردو دشمن بدنام نہیں کرتے بلکہ ہم خود اسے رسوا کرتے ہیں۔

ساہتیہ اکیڈمی انعامات کی اردو فہرست پر ایک نظر ڈالی جائے تو ایک اور حقیقت سامنے آئے گی۔ باوجودے کہ یہ انعام بنیادی طور پر تخلیقی ادب کے لئے ہے لیکن اسے پانے والوں میں محققوں اور نقادوں یا غیر ادبی کتابوں کے نام افسانے، ناول اور شاعری لکھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ نظر آئیں گے ــ جنھیں انعام دیا گیا ان سے اگر ان چند ناموں کا موازنہ کیا جائے جن کو یہ انعام نہیں ملا تو اور عبرت ہوگی۔ محرومین کی فہرست میں یاس یگانہ، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، اثر لکھنوی،

اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، احتشام حسین، سجاد ظہیر، سردار جعفری، کرشن چندر، جمیل مظہری، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، اختر انصاری، جذبی، پرویز شاہدی اور ایسے کئی نام نمایاں ملیں گے۔ مخدوم کو انعام دینے کا خیال ان کی موت کے بعد آیا۔ کرشن چندر موت کے بعد بھی مستحق اعزاز نہ ٹھہرے۔ اس حقیقت سے ہمارے 'ارباب فیصلہ' کا جو رویہ سامنے آتا ہے وہ تخلیقی ادب کی طرف اگر اہانت کا نہیں تو بے توجہی کا ضرور ہے۔

یہ رویہ صرف ساہتیہ اکیڈیمی سے مخصوص نہیں، بعض ریاستی اردو اکیڈیمیاں بھی اس کی آئینہ دار ہیں۔ میں نے ابتدا میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اردو اکیڈیمیوں کو زبان کی تعلیم و ترویج کے لئے جو کام کرنا چاہئے، وہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیڈیمیوں کے اصل کام صرف دو ہیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے مصنفوں کو مالی امداد دینا، اور ان پر انعام تقسیم کرنا۔ یہ کام بھی جس طرح انجام پا رہا ہے وہ ان ادیبوں کے لئے جو ادب میں بڑا یا بھلا مقام رکھتے ہیں اہانت آمیز ہے۔ اکیڈیمیاں مسودہ طلب کرتی ہیں۔ اس میں نئے اور پرانے، مسلم الثبوت اور ناپختہ کی تمیز و تخصیص نہیں۔ بہت سے ایسے نامور ادبا و شعرا جنہیں نام نہاد مالی اعانت کے مقابلے میں اپنی عزتِ نفس زیادہ عزیز ہے اپنے مسودے اس لئے نہیں بھیجتے کہ اکیڈیمی کی مالی امداد کمیٹی کے صاحبان نظر کی نگہ انتخاب پر یہ اگر پورے نہ اتریں تو ادبی شہرت و عزت کا بھرم تک باقی نہ رہے گا۔ پھر جو امداد ملتی ہے وہ دس برس پرانے تخمینے کے حساب سے کل تخمینے کا نصف ہوتی ہے۔ ہماری اکیڈیمیوں کے ذمہ داروں کو شاید یہ بھی خبر نہیں کہ گزشتہ چند برس میں کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد سازی کی شرحیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ رزاقوں کی اس بخیلی میں مصلحت یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لکھنے والوں یا لکھنے والوں کا بھیس بنا کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے والوں کو نواز سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے ادیب و شاعر شاذ و نادر ہی مالی اعانت کے خواستگار ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں اتر پردیش اکیڈیمی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ اکیڈیمی جو کتابیں شایع کرتی ہے وہ یا تو کلاسیکی ہیں یا مرحومین کی۔ زندہ ادیبوں پر نگاہ کم ہی پڑتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی مرنے کے بعد کسی کسی کا جنازہ کاغذی پیرہن میں دھوم سے نکال دیا جاتا ہے۔ بعض دوسری ریاستی اکیڈیمیاں زندوں کو مردوں سے زیادہ حق دے رہی ہیں، حیرت ہے کہ ان پر مردہ پرستی کے آسیب کا اثر اب تک کیوں نہیں ہوا!

گذشتہ سال اردو اکیڈیمی اتر پردیش کے ایک صاحب اقتدار نے انعامات کی فہرست جاری کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس سال کسی کتاب کو بڑے انعام (یعنی تین ہزار کی معمولی سی رقم) کا مستحق نہیں

سمجھا گیا جب کہ اس فہرست میں قرۃ العین حیدر کا بھی نام تھا۔ اسی سال اسلوب احمد انصاری کو ساہتیہ اکیڈیمی انعام ملا لیکن اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے ان کی کتاب کو اپنے بڑے انعام کے قابل نہ سمجھا۔ سوال یہ ہے کہ کس کا معیار حق بجانب تھا؟ اور یہ کہ اس طرح کے ادبی فیصلے صادر کرنے کا حق کمیٹی کے ارکان اور اکیڈیمی کے اربابِ اختیار کو کس نے دیا؟ ـــ ادبی مقام کا تعین انعامات سے نہیں ہوتا۔ پہلا نوبل پرائز دیا گیا تو ٹالسٹائی زندہ تھے۔ انھیں یہ انعام نہ ملا۔ اس سے کیا ٹالسٹائی انعام یافتہ ادیب سے کمتر ہو گئے؟ ژاں پال سارتر نے نوبل انعام واپس کر کے لیے تمام اداروں اور افراد کو جو اپنے تئیں انعام دے کر کسی کا ادبی مرتبہ متعین کرتے ہیں، مناسب جواب دیا ـــ اکیڈمیوں کی انعام نواز کمیٹیوں میں جو حضرات بیٹھتے ہیں ان میں سے اکثر اپنے ادبی مرتبے یا شہرت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عہدے کی بنا پر EX-OFFICIS ممبر ہوتے ہیں ـــ اتر پردیش کی تمام یونیورسٹیوں کے صدور شعبۂ اردو، صدر شعبہ ہونے کی وجہ سے خود بخود اکیڈیمی کے رکن ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے اکیڈیمی کی کمیٹیوں میں ان کا انتخاب ہوتا ہے۔ صدور شعبۂ اردو کو اکیڈیمی کی مجلس عام میں ضرور ہونا چاہیے لیکن یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ عموماً اساتذہ یونیورسٹی کی بنائی ہوئی شرائطِ لیاقت کے مطابق تحقیق کو تخلیق پر فوقیت دیتے ہیں۔ اساتذہ اور محققین میں تخلیقی ادب کو تحقیق سے کمتر سمجھنے کا رویہ خاصا عام ہے ـــ یہ رویہ اکیڈمیوں کی فہرست انعامات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس سال پھر اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے جو فہرست انعامات شایع کی ہے اس میں بڑے انعام صرف تین کر دیئے گئے۔ قرۃ العین کو یہ انعام گذشتہ سال ہی ملنا چاہیے تھا۔ چونکہ انھوں نے پچھلے برس احتجاج کرتے ہوئے انعام واپس کر دیا تھا اس لئے کفارے یا 'عذرِ گناہ' کے طور پر انھیں افسانوں کے مجموعے پر اس سال بڑا انعام دیا گیا جو بالکل درست ہے لیکن ان کے علاوہ صرف دو محققین اس کے مستحق قرار پائے۔ جب کہ بڑے انعامات ۸ کی تعداد میں دیئے جا سکتے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں اصناف کے ذیل میں یہ انعام دیا جانا چاہیے ـــ لیکن نظم و غزل کے تمام وقیع مجموعوں کو کم تر درجے کے انعامات ہی کے قابل سمجھا گیا۔ موازنہ و مقابلہ مقصود نہیں، لیکن پھر آپ بڑے اور چھوٹے انعام پانے والوں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اکیڈیمی کے معیار 'نقد و ادب' اور مسلّمہ ادبی شہرت و عزت کے معیار میں کتنا تضاد ہے۔ اس کے لئے قصور وار وہ رویّہ ہے جو تیسرے درجے کے گمنام اور فراموش شدہ شعرا و ادبا پر تحقیق کو تو اعلیٰ ادبی کارنامہ گردانتا ہے اور وہ جن کی تخلیقات کی بنیاد پر تحقیق کی یہ کاغذی عمارت حروف اور لفظوں کے شمار، سال و سنین کے حساب، نسخوں کے اختلاف اور

ایسے ہی فروعی مسائل کی اینٹوں اور گارے سے کھڑی ہوتی ہے ، کم تر سمجھے جاتے ہیں۔

اتر پردیش اردو اکیڈیمی کے انعامات اسی بنا پر جن ادیبوں نے واپس کئے ہیں ان میں سے چند نام یہ ہیں ۔ صالحہ عابد حسین، عتیق حنفی ، شمیم حنفی ، قرۃ العین حیدر ـــ دوسرے بہت سے نامور ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو اکیڈیمی کے حضور کتاب بدست ، جاتے ہی نہیں ـــ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ کتاب بھیجنے والوں سے جو اقرار نامہ لکھوایا جاتا ہے اس میں یہ اقرار بھی شامل ہے کہ اکیڈیمی سے چھوٹے سے چھوٹا انعام پانے والا کسی دوسرے ادارے یا اکیڈیمی کا بڑے سے بڑا انعام بھی قبول کرنے کے جرم کا مرتکب نہیں ہوگا ۔ یعنی اگر اتر پردیش اردو اکیڈیمی کسی کو پانچ سو یا سات سو کا انعام بھی دے دے تو پھر اسے ساہتیہ اکیڈیمی سے لے کر مخدوم ایوارڈ، وحشت ایوارڈ اور گیان پیٹھ ایوارڈ تک لینے سے انکار کرنا پڑے گا ـــ جن دیدہ وروں نے اقرار نامے میں یہ شق اضافہ فرمائی ہے ان کی ادب اور ادیب نوازی کی داد دینی چاہیے ـــ آخر اس شرط کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ؟

آخر میں ایک اشارہ اور کر دوں کہ ادب ، خصوصاً اردو ادب میں کسی قسم کا امتیاز خواہ وہ استاد غیر استاد کا ہو ، تحقیق یا تخلیق کا ہو ، مسلم یا غیر مسلم کا ہو ، اس کے جمہوری اور سیکولر کردار کے منافی ہے ـــ اور ادب کی شریعت و آئین میں گناہِ کبیرہ ـــ

اردو اکیڈیمیاں بجائے اس کے کہ ہر بری بھلی نا پختہ کتاب کو مالی اعانت دیں اور زیادہ سے زیادہ مصنفوں کو اپنی فہرست انعامات میں ٹانکتی رہیں ۔ اگر اردو کے حقوق اور اس کی تعلیم اور نصابی کتب کی اشاعت ایسے ٹھوس کاموں کی طرف توجہ کریں تو اردو کا بھی کچھ بھلا ہوگا اور انھیں سال بہ سال ادیبوں اور کتابوں کے مرتبے متعین کرنے کے صبر آزما کام سے بھی نجات مل جائے گی ـــ اور اگر کتابوں کی مالی اعانت اور انعامات دینا اکیڈیمیاں ضروری سمجھتی ہیں تو پورے طریقۂ کار اور رویے کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے ۔ ☐

شبھاش مکھرجی

یہ سرزمیں

یقیں الفاظ پر میرا نہیں ہے
ثبوت اک چاہئے مجھ کو
توقع یہ نہیں مجھ کو
کہ میری بات کو تسلیم کر لیں گے جہاں والے
اسے ترجیح دوں گا میں
کہ اس کو آزمائیں وہ
لہو کی، آگ کی، جہدِ مسلسل کی کسوٹی پر
اندھیرا ہے :
نظر آتے ہیں چہرے پُر فریب ان کے
جنھوں نے فتح پائی مجھ پہ لفظوں سے
تشدّد، نام جو رکھ لو،
لڑائی، روپ جو دھارے
اجل، کتنی حسیں بھی ہو
کبھی جچتی نہیں میری نظر میں
سمندر سے پہاڑوں تک
مرے ایقان کی وسعت
مگر پھر بھی
نہ کوئی فتح کر سکتا ہے لفظوں سے مجھے
نہ میری یہ زمیں ہی چھین سکتا ہے

شمس الرحمٰن

بنگلہ سے ترجمہ : علقمہ شبلی

جانب داری

رینگتا ہے گھاس میں زہریلا ناگ
اس سے الفت ہے مجھے
زہر اس میں دوستِ شاطر سے زیادہ تو نہیں،
وہ نابینا سا چمگادڑ،
جو پیتا ہے لہو
مجھ کو الفت اس سے بھی ہے
کم نظر نقاد سے ہے یہ زیادہ رحم دل،
ڈنک سے بچھو کی الفت ہے مجھے
سوزشِ پیہم میں اس کی
بے وفا عورت کے بوسوں سے ہے لذت کچھ سوا،
مجھ کو الفت خوبصورت شیر سے ہے
کالے جنگل میں چھپا رہتا ہے جو
ایک آمر کی طرح یہ جان تو لیتا نہیں!

اطہر عزیز

غزلیں

اشک ہوں، آہ ہوں، آتش ہوں کہ اخگر دیکھو
کیا ہوں میں دوستو آؤ مجھے چھو کر دیکھو
سوچ کے غار سے اک شور اٹھا ہے تو سہی
اب کہاں جاکے ٹھہرتا ہے یہ لشکر دیکھو
میں نے مانا کہ گگن پھول کی کشتی ہے مگر
اپنی دھرتی پہ بھی کچھ دور تو چلکر دیکھو
چوٹ کیسی بھی ہو یہ خود ہی چمک اٹھتے ہیں
کتنے مانوس ہیں کہسار سے کنکر دیکھو
میں نے جو سنگ اچھالا وہی سورج نکلا
ڈوبتی رت کے دہکتے ہوئے تیور دیکھو
دل کہ دیپک تھا کبھی آج ہے داغوں کا کھنڈر
کتنے رنگ اور دکھاتا ہے مقدر دیکھو
گل سے خوشبو ہی اگر روٹھ گئی ہو اطہر
پھر تو بس ایک مہکتا ہوا پتھر دیکھو

کہنا ہے جو بھی کہہ دو یہیں میرے کان میں
دیکھو، بلائیو نہ مجھے سائبان میں
خوابوں کی سیڑھیوں پہ نظر رکھ کے کیا کریں
رہتی ہے اب تو یاد بھی اونچے مکان میں
لہجہ میں ایک بار تو شبنم بھی گھول لو
یہ کیا کہ لے کی بات، لہو کی زبان میں!
سورج کی خودکشی کا بھی منظر عجیب تھا
بکھرا جو دائروں میں تو سمٹا چٹان میں
فکرِ جمیل جانے کہاں جاکے سو گئی
ہم ڈھونڈتے ہیں گیت غزل کی دکان میں
سانسوں سے پوچھتی تھیں یہی لب کی آہٹیں
یہ تو بتاؤ کیسا کیا امتحان میں
آہوں کے تیر اشک کے نیزے تو بٹ گئے
شعلے سمٹ کے رہ گئے لیکن کمان میں

سنتوش کمار گھوش
بنگلہ کہانی

مترجم : ایس - ایم - حیات
تامل ناڈو پبلک سروس کمیشن
انا سلائی، مدراس ۲

لذّت بخش لمس

"تم گھبرا تو نہیں گئیں ؟" نین موہن نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا
ملیگا نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور خاموش کھڑی رہی۔

"وہ اب آتی ہی ہوگی !" نین موہن نے کہا۔

"میں جانتی ہوں وہ نہ آئے گی !" اس نے زیر لب کہا۔

اس جواب پر وہ ہنس پڑا۔ اور ساتھ ہی ملیگا کی جرأت کو دل ہی دل میں سراہنے لگا
لڑکی بیباک ہی نہ تھی چالاک بھی تھی۔ فراست اور زیرکی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ بالائی منزل پر اس کمرے میں انتہائی اطمینان کے بعد ہی داخل ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا وہاں اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

نین موہن کے مُصر ہونے کے باوجود کہ وہ اس کی بغل میں بیٹھ جائے وہ کھڑی ہی رہی اور س کے بلاؤز پر کاڑھی ہوئی سنہری تتلی سے ادائے دلفریبی کے ساتھ کھیلنے لگی۔ تتلی اسی طرح بلاؤز پر ئی رہی۔ اس کے رنگ کافی گہرے اور دیدہ زیب تھے۔ ملیگا نے دروازے پر معنی خیز نگاہیں ڈالیں۔ سی بھی وقت یہ عورت اس کمرے میں داخل ہو سکتی ہے۔ اس کا سب کو علم تھا لیکن درحقیقت وہ آنہیں سکتی۔ ملیگا نے اسے کچن میں کام میں منہمک اور پسینے میں شرابور دیکھا تھا۔ پھر بھی ایک تذبذب کا احساس اسے ملامت کرتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کا اور ایک سفارتی عملے کے افسر کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ ان کا دوسرا نام کمزوری ہے۔

نین موہن نے دیکھا وہ پسینے میں شرابور کھڑی ہے۔ کسی انجانے ہلکے سے خوف کے زیر اثر وہ ہوا کے ایک لطیف جھونکے سے کانپتے کسی چمکدار پتے کی طرح لرزاں تھی۔ وہ اس خوف کی بنیاد کی ٹوہ لگانے لگا۔ کیا یہ کسی خطا کا احساس تو نہیں ؟ یہ میرے پاس اس لیے آئی ہے کہ یہ میرے پاس آئے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ سوچنے لگا۔ میں تو اس کی خواہش اور اس کی آمادگی پر ہی اسے چھوتا ہوں۔ وہ کچن

کہ پار کرتے ہوئے جہاں اتاسی اپنے کام میں منہمک ہے پورے زینے پار کر کے میرے پاس اوپر چلی آئی ہے تاکہ میں اسے چھولوں۔ میرا چھونا یقیناً اچھا لگتا ہے مجھے بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس کے لمس سے مجھے بھی ایک گونہ لذّت محسوس ہوتی ہے۔ اس لذّت کے پیشِ نظر میں یہ سوچتا بھی نہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔ ایک مشترک خواہش ہم دونوں کو ایک سنہرے دھاگے میں باندھ چکی ہے۔ یہ ایک صفائی کا کام ہے۔ جیسے کسی کو دھوکہ دے کر اس کا حق غصب کر لیا جائے۔ ہم خوب سمجھتے ہیں ہماری حرکات اور ہمارا عمل سراسر غلط ہے۔ اور یہ ایک طرح کی چوری ہی ہے۔

چھت سے آویزاں برقی پنکھا پوری رفتار سے گھوم رہا تھا۔ گلی سے کسی خوانچے والے کی آواز سنائی دے رہی تھی جب کہ یہ ملیگا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے اس لمس کی لذّتوں میں کھویا اور ساتھ ہی اپنی ناروا حرکات کا جائزہ بھی لینے لگا تھا۔

درحقیقت وہ آج کافی خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ اس خوش گوار دوپہر کا لطف تباہ کر دینے کے لئے یہ اضطراب اور خوف کافی تھے۔ پھر بھی شیفتگی کسی شراب کے جام کی طرح اس کے جذبات میں آگ لگا چکی تھی۔ کیا وہ آرزؤں کی اس بھڑکتی ہوئی آگ کو اس طرح کی اخلاقی قدروں کے تصور سے سرد کر دے؟

"آؤ نا۔ یہاں بیٹھو!" اس نے سرگوشیوں کے انداز میں کہا۔

ملیگا نے دروازے کی طرف شوخ اور شریر نظروں سے دیکھا۔

"اب نہیں۔ پھر کسی وقت!"

اس نہیں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دن کبھی نہ آئے گا۔ اتاسی ہمیشہ وہیں رہتی ہے۔ آج اور ہر روز ـــــ اپنا ازدواجی حق جتاتی ہوئی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہوئی۔ اپنی مانگ میں خوبصورت سیندور سجائے اور اپنے ہاتھوں میں ہری کانچ کی چوڑیاں کھنکھناتی وہ کچن روم میں اتنی مصروف رہتی کہ اس کی دوپہریں، شام میں تحلیل ہو جاتیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے شوہر کے پاس چلی آتی۔ کسی نئے پکوان کا ذائقہ پوچھنے کے بہانے۔

نین موہن اس سے جھگڑا بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیوں کہ وہ اس کی محبت کا ایک نرالا انداز تھا۔ لیکن نین موہن کی فطرت کا تقاضہ اس سے کچھ اور طلب کرنا چاہتا تھا۔ اتاسی کے بالکل برعکس یہ شرمیلی سی کمسن لڑکی تھی جو دوسری منزل پر رہتی تھی اور کبھی بہانے سے نیچے اتر آتی، اضطراری کیفیت

کے زیر اثر ادھر ادھر چکر کاٹتی۔ دیوار پہ آویزاں اس کی تصویر کو ایک خاص انداز سے دیکھتی۔ اس کی میز پر رکھے کاغذات کو کبھی انگلیوں سے الٹ پلٹ دیتی اور جب وہ دفتر کے لئے نکل پڑتا اپنے دریچے سے وہ اس کی طرف جھانکتی نظر آتی۔ ایک دن اس نے اپنی ساری کے پلو کو کمر میں اڑستے ہوئے کسی ننھی سی خوف زدہ چڑیا کی طرح اس سے بات بھی کی تھی اور پھر وہ پھر سے اڑ گئی۔ لیکن نین موہن اس کے غمزوں اور اس کی اداؤں سے یہ سمجھ چکا تھا کہ وہ غیر رضامند نہیں ہے۔ وہ کالی سی کمسن لڑکی آتی اور چلی جاتی۔ اس کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی جسے وہ آج تک پا نہ سکا تھا اور جسے وہ پا بھی نہ سکتا تھا۔ زینے پر ہلکی سی قدموں کی چاپ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے دور کھڑے ہو جاتے اور ادھر ادھر کی رسمی باتوں میں مصروف دکھائی دیتے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اس لڑکی کی موجودگی اور اسے پا لینے کے مواقع پر اتاسی کڑی نگاہ رکھنے لگی تھی۔ پھر نین موہن کو ایک بہترین موقعہ ہاتھ آیا۔ اس کی منہ مانگی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ اتاسی کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہی تھی۔ سامان باندھتے ہوئے اس نے کہا۔ "دیکھو! یہ بچوں کی سی حرکت اچھی نہیں۔ چند ہی ہفتوں کی تو بات ہے۔ ماما کو ریلوے کے رعایتی ٹکٹ ملے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اس رعایت سے فائدہ اٹھاؤں۔ تم تو کئی جگہ ہو آئے ہو۔ کیا میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بھی مفت!"

"جاؤ بھی!" نین موہن نے ایک شاطر فنکار کی طرح اپنے حقیقی جذبہ تسکین کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔ "اتاسی! تمہارے بغیر یہ گھر مجھے کاٹنے کو دوڑے گا اور میری ضرورتیں کون پوری کرے گا؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ تو بہتر ہوگا!"

اتاسی کے خوبصورت چہرے پر شدت سے چاہی جانے والی بیوی کا غرور مسرت بن کر چھا گیا۔

"یہ کیسی پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو؟"

اپنے ابروؤں کو عشوہ طرازانہ انداز سے خمیدہ کرتے ہوئے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ملیکا کی موجودگی کے احساس کے ساتھ ہی اس نے اپنا انداز بدل دیا۔

"ملیکا! ذرا سنو تو! یہ بالکل پریشان ہو گئے ہیں کہ میں چند ہفتوں کے لئے باہر جا رہی ہوں یہ کیا سمجھ بیٹھے ہیں پتہ نہیں کیا ہماری ہنی مون کی جوڑی تھوڑی ہے؟"

ملیکا کے چہرے پر مسرتوں کی قوس قزح ابھر آئی۔

اتاسی کے ماتھے پہ سیندور کی بندیا پسینے سے پھیلنے لگی تھی۔ اس نے پھیلے ہوئے رنگ کو مٹا کر ایک خوش نما دائرہ کی شکل دی۔

"دیکھا تم نے ؟ یہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دودھ پیتے بچے کی طرح! اگر میں چلی گئی تو یہ کیا کر سکیں گے۔ کیوں ؟ کھانا تو تم باہر بھی کھا سکتے ہو یا اپنے بھائی کے ہاں انتظام کر لو۔ صبح اور شام کی چائے ملیکا بنا کر دے دے گی۔ کیوں ملیکا ؟"

"کیوں نہیں ؟" ملیکا نے آہستگی سے کہا۔

اتاسی ہنس پڑی

"دیکھا تم نے۔ ملیکا سب کچھ دیکھ لے گی۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں ذرا اپنے کمرے میں ہو کر آتی ہوں۔ مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔ ماما آتے ہی ہوں گے!"

وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

اس دوران نین موہن نے ملیکا کو ایک خاص معنی خیز انداز سے دیکھا۔

ملیکا خاموش رہی۔ لیکن اس کی شوخ نگاہیں بول رہی تھیں۔ جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتی تھی اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

اتاسی کمرے میں پھر داخل ہوئی۔ چابی کے گچھے سے دو چابیاں نکال کر ملیکا کے حوالے کر دیں

"یہ چابی تو صندوق کی ہے اور یہ رہی دروازے کی۔ یہ اپنے پاس رکھو۔ جب دوپہر کو نوکرانی آئے گی تو دروازہ کھول دینا۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوتے۔"

ملیکا نے چابیاں چپ چاپ لے لیں۔ اس نے نین موہن کو عجیب نظروں سے دیکھا دونوں پر ہلکی سی پریشانی طاری تھی۔ جبھی ماما ٹیکسی پر آ پہنچے "جلدی کرو۔"

زینے پار کرتے وقت اتاسی نے اپنے شوہر کے پیر چھوئے۔

نین موہن اظہار عقیدت کے اس مخلصانہ انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے رویّہ پر وہ منفعل ہو اٹھا۔ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"مجھے تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟"

"کیوں ایسی باتیں کرتے ہو ؟" اس نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

اس کے ماتھے پر سرخ بندیا چمکنے لگی تھی۔ اس کی ساری کے سرخ حاشیہ کی طرح!

"ڈر کس بات کا ؟" اس نے پوچھا۔

گناہ کے احساس سے وہ گھبرا گیا۔ اتاسی کے اظہار عقیدت نے اسے بے حد متاثر کر دیا تھا۔ اس کے ضمیر نے کچوکے لگائے تھے۔ اور وہ بڑبڑانے لگا۔

"میں اور ملیکا۔ میرا مطلب ہے۔ کیا تمھارے دل میں کسی طرح کا شک نہیں پیدا ہوتا؟"

وہ اسے گہری نظر سے دیکھتی رہ گئی جیسے اس کی بات کا مفہوم اس کی سمجھ سے باہر ہو۔ ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ زرد سا ہو گیا۔ پھر اس کے کھلے ہوئے چہرے پر خوشیاں برسنے لگیں اور وہ مسکرا اٹھی۔ "تم مجھے ستارہے ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ میں چلی جاؤں۔ اسی لئے —— میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ میں اتنی گری ہوئی نہیں ہوں کہ تم پر شک کروں مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ سمجھے! مجھے اب جانے بھی دو نا، دیر ہو رہی ہے!"

زینے کی بالائی حصے پر کھڑی ملیکا یہ سب باتیں سن رہی تھی۔

پھر ——

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کے بعد دوسرے کئی سگریٹ جلاتا بیزاری اور نفرت کے عالم میں مسل کر پھینک دیتا۔ وہ خود سے بیزار اور متنفر ہو گیا تھا۔ کسی اندرونی احساس کے زیر اثر اس نے دیوار پر رینگتے ہوئے ایک کیڑے کو سگریٹ کے ٹکڑے کی آگ تلے مسل دیا۔ وہ کیڑا اسی لمحہ راکھ بن کر نیچے گر گیا اور دیوار پر ایک بدنما دھبہ سا پڑ گیا۔ چتا کی راکھ کے نشان کی طرح!

"مجھ میں کون سما گیا ہے؟" آئینے کے سامنے کھڑے نین موہن اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ اتا سی دورے پر چلی گئی۔

میں بالائی منزل پر ہوں —— وہیں ملیکا بھی ہے۔ وہی کالی سی دبلی پتلی نازک اندام ملیکا صوفے پر بیٹھی ہے۔ اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے۔ کیوں نہ میں اس کے قریب تر ہو جاؤں اور اسے چھولوں۔ مجھے کوئی قوت اپنے اس اقدام سے باز رکھ رہی ہے۔ یہی سوال ملیکا کے سوچوں کا بھی مرکز بنا ہوا ہے۔ وہ اپنی انگلیوں کے شگاف سے جھانکنے لگی ہے۔ کمرے میں نرم ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گلدان میں سجے ہوئے پھول ابھی ترو تازہ تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ وہ لمحہ جس کے لئے یہ دونوں اتنے دنوں سے منتظر تھے آج قسمت سے ہاتھ آگیا ہے۔ نہ کسی کے آنے کا خطرہ نہ کسی کی مداخلت کا خوف۔ آزادی ہی آزادی لیکن وہ کیوں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہے اور معصوم ننھے سے کیڑوں کو جلا کر خاکستر بنا رہا ہے۔ وہ کیوں میرے پاس نہیں آجاتا۔

"کیوں؟ —— میں ایسا کیوں نہیں کر پاتا؟" نین موہن ایک ذہنی کرب و اذیت میں مبتلا رہا۔ کہیں دور سے ایک بلی کی چیخ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے وہ پانی کا گلاس اپنے ہونٹوں تک لے گیا لیکن گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ یکایک برف سا کیوں

ہو رہا ہے؟ اس کے اعضا مفلوج ہوتے محسوس ہونے لگے ہیں۔ وہ شل ہو چلے ہیں۔

رات موج کی طرح بڑھ آئی تھی۔ پانی ملیکا کی کمر تک چڑھ گیا تھا اور پھر کمرے ہوتے ہوئے چھاتیوں تک اور پھر گردن تک! ہائے بھگوان! میں ڈوب جاؤں گی! وہ مایوسی کے عالم میں سوچنے لگی میں یہاں کس لئے رکی ہوئی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ وہ مجھے ڈوبنے سے نہیں بچا سکتا۔ میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے نہ بچائے گا۔ ورنہ اس نے اب تک مجھے اپنی باہوں میں کھینچ لیا ہوتا!"

ملیکا اٹھ کھڑی ہو گئی۔ کیا وہ خوف و ہراس سے میرے پاس دوڑتی چلی آ رہی ہے؟ نین موہن سوچنے لگا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم پیچھے پڑنے لگے۔

لیکن۔ وہ تصنع آمیز حجاب کے ساتھ ساری کو اپنے شانوں کے گرد لپیٹتی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ سوچنے لگا ——— وہ جانے لگی ہے۔ کیا میں اسے روک لوں؟ کیا میں واقعی روک لوں؟۔

لیکن وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے سگریٹ جلانے کے لئے تین دیا سلائیاں جلا ڈالیں۔ کیا میں بزدل ہوں وہ دروازہ پار کر چکی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کے وجود کا ہلکا سا عکس اس کمرے میں لہرا اٹھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر زیر لب کچھ کہا جسے نین موہن سن نہ سکا۔ کیا وہ کہہ رہی تھی 'اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کے بعد وہ اس کمرہ میں پھر چلی آئے گی، شاید!

نین موہن کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے محسوس کیا ملیکا اب کبھی نہ آئے گی۔ حالانکہ وہ اس کمرے میں اکیلا ہے۔ وہ اس دہلیز کو پار کر کے اس کمرے میں پھر قدم نہ رکھے گی۔ وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نین موہن کو ایک حقیقی صحبت مل گئی ہے۔ اس عورت کی صحبت جو اپنے تابندہ ماتھے پر سیندور کی ایک بڑی سی بندیا سجائے جاتے وقت اپنے پیچھے اپنا اعتماد چھوڑ گئی ہے ان دونوں پر اپنی کڑی نظر رکھنے کے لئے۔ کسی تیسری شخصیت کی موجودگی میں وہ دونوں ایک دوسرے کو کیسے چھو سکتے تھے؟ لذت بخش لمس سے کیسے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ □

ڈاکٹر عنوان چشتی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

حسرت موہانی : ایک تخلیقی صورت گر

حسرت موہانی اردو کے ان ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے فن کے نگار خانہ میں اپنے خون دل سے روشنی کی ہے حسرت کی پہلی غزل ۱۸۹۳ء کی اور آخری غزل ۱۹۵۰ء کی ہے اس طرح حسرت نے تقریباً ۵۷ برس عروسِ شاعری کی حنا بندی کی ہے اردو کے بیشتر نقادوں نے حسرت کو خراج تحسین ادا کیا ہے لیکن اب تک پوری طرح ان کی شاعری کا تجزیہ اور ان کے مرتبہ کا تعین نہیں ہوا ہے اب تک حسرت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان کی غزلیہ شاعری سے متعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حسرت کی شاعری کا بہت بڑا حصہ غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا باقی ماندہ حصہ بھی غیر اہم نہیں ہے جس میں گیت، نظم، منظوم ترجمے، حمد، نعت، منقبت اور مذہبی شاعری شامل ہے۔ میری نگاہ میں حسرت کی غزلیہ شاعری کی قدر و قیمت کی از سر نو دریافت کی جتنی ضرورت ہے اتنی ہی ضرورت ان کی باقی ماندہ شاعری پر توجہ کرنے کی ہے حسرت کے ماسوائے غزل شعری سرمائے سے صرف نگاہ کر کے حسرت سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے حسرت کی غزلوں سے قطع نظر کر کے ان کے شعری تجربوں اور ان معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے فن کارانہ کارنامے کو ان کے عہد کے بڑے شعری مرقع میں سجا کر دیکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

حسرت موہانی کے فنی کارناموں اور ہیئت کے تجربوں کی اہمیت کیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ان کے عہد کے منظر نامے پر نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ حسرت موہانی کے عہد میں روایت اور تجربے کی شدید کشمکش تھی۔ ایک طرف روایت کے شدید علمبردار بساطِ ادب پر اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے تھے اور دوسری طرف بعض فن کار تجربوں پر اصرار کر رہے تھے۔ شعری تجربوں کا رجحان تین ذیلی صورتوں میں منقسم تھا۔ ایک روایتی اصناف سخن کو لچک دار بنانے کا رجحان، دوسرا مغربی ہیئتوں کو اپنانے کا رجحان اور تیسرا ہندی اصناف و اسالیب سے استفادہ کا رجحان۔ مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں جن موضوعی مشاعروں کی بنیاد ڈالی تھی انھوں نے دورِ حسرت میں اردو شاعری کو خاصا متاثر کیا تھا غلام مولا قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی نے منظوم ترجموں کی روایت ڈالی تھی ۱۹۰۱ء کے بعد سے یہ روایت کافی بالیدہ ہوئی تھی اور یہ دور دورِ تراجم کہا جانے لگا تھا حالی نے قافیہ کے خلاف لفظی اعلان جہاد کیا تھا، محمد حسین آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی اکبر الہ آبادی اور عظمت اللہ خاں وغیرہ نے عملاً معرا نظم کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی، عبدالحلیم شرر نے تو ۱۸۹۸ء

میں منظوم ڈرامہ دل گداز میں شایع کیا تھا اور نظم معرا پر بحث کا آغاز کر کے اس ضمن میں انقلابی اقدام کیا تھا حالی نے ایک جگہ جہاز سے شاذ کا صوتی قافیہ لکھا تھا۔ سید سجاد حیدر یلدرم نے ۱۸۹۸ء میں "انتہائے یاس" نظم میں "حیات کے ساتھ بساط" اور اس کے ساتھ خاص "کو قوافی بنا کر صوتی قوافی کی روایت کو آگے بڑھایا تھا، نظم طباطبائی اور عظمت اللہ خاں نے مصرعے کے نئے تصور کو فروغ دیا تھا جس پر انگریزی کے RUN-ON-LINE کا اثر بھی ہے اس دور میں ایک نظم میں مختلف بحروں کے امتزاج کا تجربہ بھی کیا گیا تھا۔ نظم طباطبائی نے "ہفت خواں قصیدہ" میں سات بحروں کا تجربہ کیا تھا اقبال نے قدیم اصناف میں دلکش تجربے کئے انھوں نے خیال کے بہاؤ کے تحت مثنوی کو بندوں میں تقسیم کیا رباعی کی ہیئت میں تبدیلی کی طرف راغب کیا۔ اسی دوران مسمط کے انداز کے استیزا فارم برتے گئے برج موہن دتاتریہ کیفی، نظم طباطبائی، ضامن کنتوری اور تلوک چند محروم وغیرہ نے اس طرف بطور خاص توجہ کی ____ عظمت اللہ خاں نے ہندی چھند شاستر کو بنیاد بنا کر ایک نئے عروضی نظام کو پیش کیا۔ حالی اس سے قبل ہی "مناجات بیوہ" کو ہندی بحر میں لکھ چکے تھے اس طرف شوکت میرٹھی نے خاص طور پر توجہ کی اور حمد اور نعت میں خدا کو بھگوان اور پیغمبر کو "اوتار" کے تصورات سے متصف کر کے پیش کیا نادر کاکوروی نے "دھرتی ماتا" لکھی اور عظمت اللہ خاں نے تو اپنی شاعری کو ہندی اسالیب و اصناف کے سانچے میں ڈھالنے کی زبردست کوشش کی۔ اسی دوران اردو گیت کے سرمائے پر ہندی الفاظ، روایات اور چھندوں کا اثر ہوا غرض اردو شاعری نے موضوع، مواد اور ہیئت کی ہر سطح پر تجربے اور تبدیلی کی طرف پیش قدمی کی۔ حسرت موہانی اسی دور میں شاعری کر رہے تھے ان کا اپنے دور کے ادبی منظر نامے سے یکسر بے نیاز رہنا مشکل تھا چنانچہ انھوں نے بھی ہیئت کے تجربوں کی طرف پیش قدمی کی۔ اگرچہ ان کے شعری تجربوں کی تعداد کم ہے لیکن بے حد اہم ہے۔ حسرت کی شاعری میں دو طرح کے تجربے ملتے ہیں۔ یہ تجربے ہندی اصناف و اسالیب اور مغربی ہیئتوں کو اپنانے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

حسرت اپنے سماج کے ایک ایسے باشعور شاعر تھے جو اس سے پوری طرح وابستہ بھی تھے اس لئے ان کا اپنے دور کے تجربوں سے متاثر ہونا ناگزیر تھا چنانچہ انھوں نے غزل سے ہٹ کر جو تجربے کئے ان میں گیتوں کے تجربے، ہندی بحروں کے تجربے، ایک نظم میں چار چار زبانوں کے تجربے اور انگریزی طرز کی نظموں کے تجربے خاص طور پر قابل ذکر ہیں حسرت کے اب تک ۱۲ گیت دستیاب ہیں ہر گیت ۶ مصرعوں پر مشتمل ہے ترتیب و قوافی اس طرح ہے۔

الف ____ الف

ب ____ الف

ج ____ الف

یعنی پہلا، دوسرا، چوتھا اور چھٹا مصرع باہم مقفیٰ ہیں ان گیتوں کی بحریں لوک گیتوں اور ہندی چھندوں سے ماخوذ ہیں اور گیتوں کا بیشتر سرمایہ عربی فارسی بحروں میں ہے۔ چند گیت "سرسی" اور "سار" چھند میں ضرور ملتے ہیں لیکن یہ دونوں چھند مزاجاً عربی و فارسی بحروں کے دائرے میں شامل ہیں۔ حسرت کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے گیتوں کی ہیئت کا تعین کیا ہے اور انھیں لوک گیتوں کی دھنوں اور ہندی چھندوں کے مطابق لکھا ہے۔ مثلاً

سونی نگریا پڑی ہے اجاڑ — برہ کی رین کٹے نہ پہاڑ
نردئی شام بدیس سدھارے
ہم دکھیارن چھوڑ چھاڑ
تج بیٹھیں گھر بار کواڑ — کاہے نہ حسرت سب سکھ سیت

ان گیتوں کی زبان پر اودھی زبان کا اثر ہے۔ اس لئے ڈاکٹر گیان چند نے انھیں اردو گیتوں کے سرمائے سے خارج کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میرے خیال میں حسرت نے بول چال کی زبان، ہندی زبان اور اودھی زبان سے استفادہ کرکے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو وسیع کیا ہے۔ اردو زبان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی خراد پر چڑھا کر اپنا بنا لیتی ہے۔ اس لئے ان گیتوں کو اردو زبان کی شاعری سے خارج نہیں کیا جا سکتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ حسرت نے اپنے گیتوں میں جو زبان برتی ہے وہ اپنے ذائقہ اور خوشبو تیز گھلاوٹ کی خصوصیت کی وجہ سے بے حد منفرد زبان ہے اور اردو زبان کے رنگ و آہنگ میں ایک نئے شیڈ اور نئے سر کا اضافہ کرتی ہے۔ حسرت کے گیتوں کی زبان کی توسیع اس دور میں بعض نئے شاعروں خاص طور پر ناصر شہزاد، جمیل الدین عالی، ندا فاضلی، شہاب جعفری وغیرہ کے یہاں ہو رہی ہے اس کے علاوہ مستقبل میں اس زبان کے روشن امکانات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

حسرت موہانی کے گیتوں کا موضوع معرفت ہے، ان کے گیتوں پر بھگتی تحریک کے شعری سرمائے کا اثر ہے اور کرشن جی اور گوپیوں کی پریم لیلا کا رنگ ایشور بھگتی کا پریم رس اور بندرابن کے رسم عاشقی کا آہنگ شامل ہے۔ بعض گیتوں میں حسرت نے اپنے سلسلے کے بزرگانِ طریقت سے کرشن بھگتی کی روایت کی روشنی میں اظہارِ عقیدت کیا ہے میری نگاہ میں حسرت نے ان گیتوں میں جذبہ کو فکر اور فکر (عرفان) کو جذبہ بنانے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ اور اردو میں گیتوں کے سرمائے میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

ہم ہوں گریب ہیں پار جو تیا — بغدادی دیا لو کھویا
برہا کی ماری تپٹ دکھیاری
تاکن کب لگ دور سے نیتا

پار اتار پیا سے ملاؤ　　　　رزاق پیا بانسے نگر کے بسیا

اس گیت میں حضرت شاہ سید عبد الرزاق بانسویؒ سے اظہار عقیدت کیا گیا ہے اب ایک اور گیت پڑھیے جو کرشن کنھیا، کے پریم رنگ میں رنگا ہوا ہے، اور "ہولی" کے رنگ بار تہوار کی یاد تازہ کرتا ہے۔

موپہ رنگ نہ ڈار مراری　　　　منتی کرت ہوں تہاری

پنیا بھرن کاہ جائے نہ دیہیں

شیام بھرے پچکاری

تھر تھر کانپت لاجن حسرت　　　　دیکھت ہیں نر ناری

ان گیتوں سے حسرت موہانی کی تخلیقی قوتوں اور گیت کی ہیئت کے نئے امکانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اگر ان گیتوں کو عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، افسر میرٹھی، ناصر شہزاد، جمیل الدین عالی، حسن کمال، شہاب جعفری، قتیل شفائی، ندا فاضلی وغیرہ کے گیتوں کے ساتھ پڑھا جائے تو حسرت کی انفرادیت کا رنگ زیادہ گہرا اور دلکش نظر آئے گا۔

اسی نوع کی ایک اور غزل بھی ہے جس پر "کلیات حسرت" میں "غزل قلندرانہ ہندی بحر میں" لکھا ہے۔ اس غزل میں حسرت نے ایک طرف غزل کی ہیئت کی جمالیات کا احترام کیا ہے اور دوسری طرف عربی و فارسی بحر و آہنگ سے انحراف کیا ہے۔ مثلاً:

ترے کوچے میں جس دن سے آ بیٹھے　　　　ہم دنیا کو دل سے بھلا بیٹھے

جسے قدر محبت ذرا بھی نہیں　　　　ہم یہ کس سے دل اپنا لگا بیٹھے

ہمیں دیکھیں یہاں سے اٹھاتا ہے کون　　　　درِ جانا پہ دھونی رما بیٹھے

یہ بیستی ماترا کا چھند ہے۔ عظمت اللہ نے سریلے بول کے مقدمے میں، جہاں اپنا عروضی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس چھند کی افادیت پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ رباعی کے تقریباً تمام اوزان میں ۲۰ ماترائیں ہوتی ہیں، اس لئے ۲۰ ماترا کے ہر چھند کو رباعی کا وزن مان لینا چاہیئے، اس اصول کو مان لینے کے بعد بقول عظمت اللہ خاں رباعی کے بحروں کی تعداد چوبیس کے بجائے دس ہزار نو سو چھیاسی تک پہنچ جاتی ہے۔" حسرت موہانی کا یہ تجربہ اسی رجحان کی توثیق ہے جسے میں نے ہندی اصناف و اسالیب سے استفادہ کا رجحان کہا ہے ـــــــ اسی طرح کلیاتِ حسرت میں ایک اور دلچسپ تجربہ نظر آتا ہے یہ ایک مخمس ہے جو چار زبانوں میں ہے ترتیب یہ ہے کہ پہلا مصرع ہندی میں اور دوسرا اردو میں تیسرا فارسی میں اور چوتھا نیز پانچواں عربی زبان میں ہے۔ یہ ترتیب ہر بند میں قایم ہے مثلاً۔

کاساتجھ سکار کی بات کہی — کچھ فکر نہ شام و سحر کی رہی
دل گشت مرا زیں جملہ تہی — الصبح بدامن طلعتہ
واللیل وَبِجُے مَنُ و فرتہ

ب روح پرور نعت ہے، یہ تجربہ حسرت موہانی کی قادرالکلامی کے ساتھ، ان کے تخلیقی ذہن کی خلاقی کا آئینہ دار ہے۔ ان تجربوں سے حسرت موہانی نے اظہار کے وسیلوں کو وسعت دی ہے اور اردو نیز ہندی کے اس رشتہ ز سرِنو استوار کرنے کی کوشش کی جسے زبان و بیان میں معیار بندی کے رجحان نے کمزور کر دیا تھا۔

حسرت موہانی کو عام طور سے غزل کا شاعر سمجھا جاتا ہے یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کا یہ مد نہیں کہ حسرت نے نظمیں لکھی ہی نہیں، یا وہ نظم نگاری کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اب تک ان کی کل ۹ نظمیں یاب ہیں، جن کے عنوانات ہیں بربطِ سلمیٰ۔ موسمِ بہار کا آخری پھول (ترجمہ) ترانۂ محبت (ترجمہ) تخیل کے کرشمے، م۔ مثنوی الجھ اور دو نظموں کا عنوان معشوق عاشق مزاج ہے۔ ان کی تمام نظموں کا جائزہ لینا میرا مقصد نہیں ہے ن ہیئت کے تجربوں کے نقطۂ نظر سے حسرت موہانی کی تین نظمیں قابلِ توجہ ہیں۔ یعنی بربطِ سلمیٰ، ترانۂ محبت اور م بہار کا آخری پھول۔ ان تینوں نظموں پر انگریزی شاعری کا نمایاں اثر ہے۔ یہ نظمیں ہیئت میں تجربوں کے ں طاقت ور رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں جو مغربی شاعری خاص طور پر انگریزی شاعری کی ہیئتوں کو اپنانے یا ہیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کی صورت میں نمایاں ہوا تھا۔ بربطِ سلمیٰ ۱۹۰۱ء میں شایع ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ریزی شاعری سے استفادہ کا رجحان زور پر تھا۔ بربطِ سلمیٰ کی تکنیک پر سانٹ کا اثر ہے۔ اس نظم میں تیرہ مصرعے ب۔ پوری نظم چار حصوں میں منقسم ہے یہ نظم کئی اعتبار سے دلچسپ تجربہ ہے۔ ایک تو یہ کہ بربطِ سلمیٰ اختر شیرانی ے سانیٹوں میں ایک جیتی جاگتی سلمیٰ بن کر ابھرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نظم کے بندوں کی تقسیم اور ترتیبِ قوافی ابل توجہ ہے۔ جس سے انحرافِ روایت کا سراغ ملتا ہے۔ تیسرے اس نظم میں وحدتِ خیال کے ساتھ ارتقائے یال بھی قایم ہے۔ یہ وہ تصورِ نظم ہے جس کا فروغ مغرب کے زیرِ اثر اردو میں ہوا ہے۔ چوتھی اور اہم بات یہ ہے یہ نظم اردو میں سانیٹ کا پیش خیمہ ہے۔ اگرچہ یہ مکمل سانیٹ نہیں لیکن سانیٹ نما ضرور ہے۔ آگے چل کر ۱۹۱۴ء بں اختر جوناگڑھی نے باقاعدہ سانیٹ نگاری کا آغاز کیا اور "شہر خموشاں" لکھ کر اردو کو ایک نئی ہیئت سے آشنا یا "موسم بہار کا آخری پھول" "ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ ہے اور ترانۂ محبت بھی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جو بالترتیب ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں شایع ہوئی تھیں۔ اس دور میں انگریزی سے اردو میں کافی ترجمے ہوئے ہیں۔ ترجموں کی کثرت کی جہ سے اس دور کو دورِ تراجم کہا جاتا ہے۔ یہ ترجمے محض ترجمے نہیں بلکہ فن کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ ایک تو ن میں وہ شعریت ہے جو کسی تخلیق کو شاعری کا درجہ عطا کرتی ہے۔ دوسرے یہ ہیئت کے کامیاب تجربے ہیں اور

ان پر انگریزی کے اسٹینزا فارم کا اثر ہے، جو اردو کے مسمط کے بندوں سے ملتے جلتے ہیں۔ " ترانۂ محبت " کا ایک بند یہ

وادی کوہ میں وہ برف پہ چمکا جس دم ماہ روشن کو نکلتے ہوئے دیکھا میں نے
اور کس قصد سے اس وقت اٹھائے تھے قدم اپنے آہو سے بھی یہ راز چھپایا میں نے

اس نظم کے تمام بندوں کی ترتیب قوافی یہ ہے

الف ——— ب :

الف ——— ب

یعنی پہلا اور تیسرا نیز دوسرا اور چوتھا مصرع باہم مقفیٰ ہے۔ اردو میں " مربع " کی ترتیب قوافی مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے اس نظم کو اردو کی روایتی مربع نما نظم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے انگریزی کے اسٹینزا فارم " کوارٹرین " میں ہے "کوارٹرین " میں بھی " گے اسٹینزا اور " ایلی جائک " اسٹینزا فارم میں ہے۔ کوارٹرین کی ان دونوں شکلوں میں ترتیب و قوافی وہی ہوتی ہے جو حسرت موہانی کی نظم " ترانۂ محبت " میں ملتی ہے ——— موسم بہار کا آخری پھول " بھی جدید اردو نظم کے ذخیرہ میں کامیاب منظوم ترجمہ ہے۔ اور اس کے موضوع و مواد کے علاوہ اس کی ہیئت پر بھی انگریزی شاعری کا اثر ہے۔

(۱) حسرت کے اس مختصر سے تجربے کا حاصل یہ ہے کہ روایت اور تجربے کی خلیج کو کم کیا ہے۔

(۲) حسرت نے اردو شاعری کو گیت کی مخصوص ہیئت دی، اور گیتوں کے سرمائے میں موضوع، مواد، زبان اور ہیئت کے نقطۂ نظر سے دل کش اضافہ کیا ہے۔

(۳) حسرت نے اردو شاعری میں ہندی چھندوں کو برت کر عروض کے دائرہ کو وسیع کیا ہے۔

(۴) حسرت نے انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم تراجم کر کے ترجمہ نگاری کے رجحان کو تقویت دی ہے اور انگریزی شاعری کے موضوعات تیز ہیئتوں سے روشناس کرایا ہے۔

(۵) حسرت نے ایک ہی نظم میں کئی کئی زبانوں کو برتنے کے امکانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد، اردو شاعری میں تجربوں کا جو رجحان نمایاں ہوا تھا، حسرت موہانی نے ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے اس رجحان کو فروغ دیا۔ اگرچہ ان کے تجربوں کی تعداد کم ہے، لیکن ان کی فنکارانہ توانائی اور تازگی زیادہ ہے۔ ابھی تک اردو شاعری میں تجربوں کی اہمیت پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ جوں جوں ہیئت کی معنویت کا عرفان بڑھے گا، حسرت کے کارناموں کی قدر و قیمت کا احساس بھی عام ہوگا۔

غزلیں

محسن بھوپالی
۴ الف ۵/۳ اے ناظم آباد، کراچی

(نذرِ جگر مرحوم)

خود کو شامِ بے سحر کے عہد میں پاتا ہوں میں
ساتھ دے اے روشنیٔ غم بجھا جاتا ہوں میں

کوئی تو سنگِ حریفانِ جنوں کی زد پہ ہو
ٹھوکریں کھاتا ہوں لیکن پھر سنبھل جاتا ہوں میں

تیرے امکاں میں اگر ہے لا کوئی میرا جواب
اے بساطِ جبرِ ہستی لے اٹھا جاتا ہوں میں

کیا غضب ہے شہرِ آذر ابن آذر سے تہی
جوہرِ عرضِ ہنر اب خود سے شرماتا ہوں میں

میں نے بطنِ دشت و صحرا سے ابھارا تھا جنھیں
آج انھی شہروں میں در در ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

کیسا سناٹا ہے اب کوہِ ندا بھی چپ ہوا
اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا پاتا ہوں میں

ق

ڈوب کر خوں میں ابھرنا اک فسانہ ہی سہی
اس صدی کے سانحے کو پھر سے دہراتا ہوں میں

میری ناکردہ گناہی پھر سرِ فہرست ہے
جرمِ حرفِ آگہی کی پھر سزا پاتا ہوں میں

شاید اگلی فصل میں مہکیں محبت کے گلاب
اس کے پودوں کو محسن خوں دیئے جاتا ہوں میں

اسلم شیخ
666/7 INSIDE PAK GATE
MULTAN (PAKISTAN)

گلشن کی دلفریب و مفرح ہوا بھی دیکھ
فرصت ملے تو دشت کی وحشی فضا بھی دیکھ

حد سے سوا بھی غرق نہ ہو اپنی ذات میں
خود کو ضرور دیکھ مگر کچھ سوا بھی دیکھ

بہتر کو دیکھنے کی تمنا کے ساتھ ساتھ
مقدور ہو اگر تو کسی دم برا بھی دیکھ

ایوانِ زرنگار کے فانوس دیکھ کر
چکرا نہ جا، غریب کے گھر کا دیا بھی دیکھ

غیروں کے بارِ طوق کی لعنت بھی دیکھ لے
اس دور کی گرانیٔ زنجیرِ پا بھی دیکھ

انساں پہ صرف ایک ہی رخ سے نظر نہ ڈال
اس جنسِ مبتذل کو کبھی دور جا بھی دیکھ

ڈاکٹر سلیم اختر
لاہور

کھجوروں کا موسم

اس بستی کا بادشاہ ــــ کہ سر پر سایۂ ہما تھا اور بخت رسا نے چھتر تانا تھا ــــ نہایت نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت تھا۔ ہر دم اپنی پرجا اور چاکروں کی فکر میں ہمتِ عالی کو غلطاں رکھتا دن بھر مشیروں اور بہی خواہوں کے جھرمٹ میں مثلِ ماہتاب چمکتا اور ان سے پرجا اور چاکروں کی بہبود کے لئے نیک مشورے اور صائب رائے لیتا وہ بھی ایسے نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت تھے کہ کبھی غلط مشورے نہ دیتے جب دن تمام ہوتا تو مانندِ آفتاب شبستانِ عطر بیز میں استراحت فرماتا بلکہ خوفِ خدا سے شب بیدار ہوتا اور اس اندیشہ سے ہلاک ہوتا کہ سلطنتِ خداداد میں کوئی بچہ بھوک سے نہ روتا ہو۔ کسی بیوہ کے گال آنسوؤں سے تر نہ ہوں۔ کوئی ناہنجار رات کی تیرہ چادر اوڑھ کسی بے کس ناکتخدا پر ظلم نہ ڈھائے۔ خون ناحق نہ بہے۔ رعیت اور چاکر چین کی نیند سوئیں ــــ انہی فکروں میں چشمِ نرگس آشنا سے نیند کو دور رکھتا۔ شب بیدار رہتا۔ دل کا قرار گنواتا اور مثل مرغ نو گرفتار محل کی غلام گردشوں اور قلعہ کی فصیلوں پر دیوانہ وار پھرتا ــــ بیگمات شب بسری کے لئے درخواست گذار ہوتیں مگر وہ ہرگز شبستانِ عشرت کا رخ نہ کرتا ــــ یہ اس نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کی بدولت تھا کہ پرجا نیک چلن اور چاکر خوش حال تھے۔ ڈکیت سولی پاتے، بدمعاش زمین میں گاڑ دیئے جاتے اور گوہرِ عصمت کو چکنا چور کرنے والوں کی علامت کاٹ دی جاتی ــــ یہ سب سرِعام ہوتا، وہ نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کھیل تماشوں موسیقی، ناچ رنگ اور بے کار تفریحات میں وقت ضایع کرنا پسند نہ فرماتا تھا۔ اس لئے ہر روز مجرموں کی سرِعام بیخ کنی کے مشاہدہ کو ایک خلق کا اژدہام ہوتا، امراء ڈاکوؤں کو سولی پر تڑپتے دیکھ کر نعرہ زن ہوتے، بدمعاشوں کو گردن تک زمین میں دھنسے دیکھ کر شرفاء اطمینان کی سانس لیتے اور عزتوں کے لٹیروں کی کٹی علامت دیکھ کر کنواریاں تاسف سے گردن ہلاتیں۔ الغرض! نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کے

زیر اثر اس کی پرجا اور چاکر بھی نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بن چکے تھے۔
بادشاہ نے کہ بخت رسا کی مانند ذہن رسا بھی رکھتا تھا ——— ایک دن مشیروں کو کہ دانش و فراست میں ستاروں جیسی تابانی رکھتے تھے، طلب فرمایا، سب بموجب دستورِ دربار کورنش و آداب بجا لائے ہر چند کہ چہرہ پر نور دیکھنے کی آرزو دل میں رکھتے تھے مگر فرطِ ادب سے نگاہ فرش سے نہ اٹھاتے، بادشاہ نے کہاان ستاروں میں ماہتاب پر نور تھا۔ لب مبارک سے سب کو یہ نوید دی کہ اب مملکتِ خدا داد میں کرنے کو کچھ نہ رہا تھا۔ پرجا کے سکھ چین اور چاکروں کی بہبود کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا تھا، وہ کیا جا چکا ہے جس کے نتیجہ میں بیت المال کہ درحقیقت عوام کا مال ہے، زرِ سرخ و سپید ہیں جواہرات اور ملک ملک کے تحائف نادر اور کمیاب اور نایاب اشیاء سے پُر ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ دستِ سخاوت نے فراغت پائی کہ اب لینے والا کوئی نہیں۔
سب نے یک زبان ہو کر اس نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کی ثنا کی جس نے اپنے اعمال نیک سے ملک کی تیرہ تاریخ میں ایک روشن باب قلم بند کر کے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنے لئے عالی مرتبت کرسی حاصل کر لی تھی۔ بادشاہ کہ درحقیقت شاد روزگار تھا اس تعریف سے ہرگز شاد نہ ہوا کہ اس امر سے آگاہ تھا کہ یہی اس کا فرضِ منصبی تھا، انکساری کے بار گراں سے سر جھکا لیا۔ عاجزی و انکساری کے اس مظاہرہ سے تمام مشیران ذی شعور دم بخود رہ گئے۔ چندے توقف فرمایا اور پھر لب گوہر بار کو یوں جنبش دی، کئی راتوں کی مسلسل بیداری کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ پرجا اور چاکروں کی خوش حالی اور بہبود کے لئے اب مزید کرنے کو کچھ نہ رہا تاہم بادشاہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ ورنہ بادشاہ اور پرجا میں کیا فرق ؟ سب مشیرانِ عالی قدر نے اس نکتہ روشن کو یک زبان ہو کر سراہا۔ اس پر بادشاہ نے تبسم فرمایا اور جنبشِ لب کو یوں تکلیف دی کہ ہم نے مسلسل شب بیداری کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب اس مملکتِ خدا داد میں کھجوروں کے درخت عام کئے جائیں۔ یہ نکتہ دقیق اور رمز غریب تھا اس لئے مشیرانِ کرام نے توثیق میں سر ہلایا مگر لب کشا نہ ہوئے۔ بادشاہ کہ چہروں سے دلوں کی پوشیدہ تحریر پڑھ لیتا تھا مشیرانِ گرامی قدر سے فرمایا ہم سمجھتے ہیں کہ تم یہ رمز لطیف نہیں سمجھے اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ ہم بھی سب سمجھتے ہیں۔ یہ کلمات غریب سن کر سب نے نظریں جھکا لیں کہ خاموشی حسب حال تھی بادشاہ نے کہ دلوں کا بادشاہ بھی تھا باری باری سب کی جھکی نظریں اور خمیدہ گردنیں دیکھیں اور یوں لب

ہوا۔ کھجور کا درخت خالی از حکمت نہیں تنا سرکشیدہ، کھجور میں شہد ہی شہد، درباری حکیم نے ہماری شاہی معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ کھجور ہزار امراض کی شفا ہے اس کی شاخیں بھی ہزار طرح سے سود مند ثابت ہو سکتی ہیں صرف ایک خرابی ہے کہ ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں دینے سے قاصر ہے لیکن وجہ ظاہر ہے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے عقابی نظریں سب پر دوڑائیں مگر کوئی مشیر بھی وجہ نہ بتا سکتا تھا چنانچہ بادشاہ سلامت نے خود ہی لب گوہر بار کی ایک جنبش سے اس راز پر سے پردہ اٹھا کر فرمایا۔ چھتری اگر اونچی ہو تو اس سے چھاؤں عنقا ہو جاتی ہے، سب مشیروں نے بادشاہ کی فہم رسا کی داد دی۔ اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف کیا اور اس امر کو صاد کیا۔

بموجب فرمان شاہ پرجا اور چاکر کھجور کا درخت لگانے میں مصروف ہو گئے اگرچہ ملک میں پہلے بھی کھجور کے درختوں کی کمی نہ تھی اور کھجور بلکہ اس کی گٹھلیوں تک کو ہر مرض کی دوا بھی سمجھا جاتا تھا مگر اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ بادشاہ نے دربار موقوف کیا۔ امور سلطنت سے ہاتھ اٹھایا اور بیت المال کا دروازہ کھول دیا چنانچہ قلیل عرصہ میں ملک میں ہر طرف کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ جب کھیت چراگاہ، باغ اور راستے کھجور کے درختوں سے پُر ہو گئے تو گھروں اور آنگنوں میں درخت اگائے جانے لگے بادشاہ سلامت کا جوش پرجا میں مثل خون دوڑ گیا اس لئے پرجا اور چاکروں نے امور زیست معطل کئے اور صرف کھجور کے درختوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئے، وہ بھی اور ان کی زندگیاں بھی!

(۲)

اس نے بازو میں زور سے ناخن چبھوئے تو احساس ہوا کہ یہ سب دہشت ناک خواب نہیں حقیقت ہے لیکن خواب ثابت نہ ہونے سے حقیقت کی دہشت کم نہیں ہو سکتی وہ دہشت جسے صرف خوابوں ہی میں مجسم دیکھا جا سکتا ہے کہیں یہ تو نہیں کہ یہ دہشت ناک خواب اتنا طویل ہو چکا ہو کہ اب یہی حقیقت اور حقیقت کا معیار ٹھہرے۔ آخر حقیقت کی طرح خوابوں کے بھی تو اپنے معیار ہوتے ہیں خواہ وہ دہشت ناک خواب ہی کیوں نہ ہوں۔

اگر واقعی یہی حقیقت ہے اور وہ عالم خواب میں دہشت زدہ نہیں تو پھر یقیناً وحشت زدہ ہے، بازو میں ناخن گاڑے تو حقیقت کی پہچان کی مگر اپنے ذہن میں کیا چبھوئے کہ دیوانہ ثابت نہ ہو۔ کیا دوسروں کے شہبازوں سے اپنا ممولا لڑا دے؟

اس نے دور تک نگاہ دوڑائی۔ تا حدِ نگاہ کھجور کے سرکشیدہ درخت فاتحین کے پرچموں کی

مانند نظر آ رہے تھے۔ ہوا کھجوروں کی مٹھاس سے بوجھل تھی، اگرچہ یہاں کے ہر موسم میں ہمیشہ سے ہی حبس رہا تھا مگر کھجوروں کی مٹھاس ” ہوا میں شامل ہو کر جو حبس پیدا کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس بستی کے بعض کمال جیسے تاریخی حیثیت اختیار کر چکے تھے یہ حبس بھی ویسے ہی تاریخ ساز ثابت ہو رہا تھا۔

کھجوروں کے درختوں کے بارے میں لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ ان کا بس نہ چلتا ورنہ خود ہی بازو پھیلا کر درختوں میں تبدیل ہو جاتے۔ تمام قوم ہمہ وقت درخت لگانے میں مصروف رہتی، اتنے درخت لگے کہ آسمان ان کی شاخوں میں چھپ گیا۔ جس کے نتیجہ میں اب سورج نظر نہ آتا تھا بلکہ عجیب و غریب جھٹ پٹا سا رہتا تھا زمین اور اس کے ساتھ ساتھ وقت کی گردش تھم گئی ہو۔ چاند ستارے نظر نہ آنے سے شاعر گیت اور عشاق اختر شماری بھولتے جا رہے تھے۔ تا حدِ نگاہ پھیلے لمبے لمبے تنوں نے ایک ہجوم کی صورت اختیار کر لی۔ ایسا ہجوم جو انسانوں کا راستہ روکے! چند قدم چلو تو یہ تنے راستہ روک لیتے۔ موڑ مڑتے تو کسی تنے سے جا ٹکراتے۔ یہ ناممکن تھا کہ بازو پھیلاؤ اور وہ کسی تنے سے نہ جا الجھے۔ تہواروں کے موقع پر یوں محسوس ہوتا کہ اپنے عزیز و اقارب کی بجائے تنوں سے معانقہ ہو رہا ہے۔

فضا، ہوا اور سانس میں کھجوروں کی مٹھاس یوں رچی کہ اب اپنا وجود چپچپاتی کھجور میں تبدیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا ڈر تھا کہ کہیں سب لوگ کھجوروں میں تبدیل نہ ہو جائیں دھڑ تنا، بازو شاخیں اور ذہن میں کھجوروں کی گٹھلیاں!

ملک کی تاریخ، کھجور کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ جغرافیہ کھجور کا موسم قرار پایا تو کھجور کا درخت مرکزِ ثقل!

نہ گھنے درختوں کی خنک چھاؤں میں کویل کوکتی، نہ املتاس کے درختوں پر پیلے پھولوں کے جھومر سجتے نہ جھاڑیوں کی مہکار میں چڑا چڑیا سے اظہارِ محبت کرتا۔ نہ دن کو موتیا مہکتا نہ رات کو رات کی رانی خوشبودار سانس لیتی نہ بن میں مورنی کو رجھانے کے لئے مور رقص کرتا۔ ان سب میں کھجوروں جیسے فواید نہ تھے، اس لئے ان سب کو کاٹ کر ان کی جگہ کھجور کے درخت لگا دیئے گئے تھے یوں صرف مگرمچھ کی کھال جیسے لمبے لمبے تنے ہی باقی رہ گئے۔ مصور ہزار زاویوں سے کھجور کے درختوں کی تصویریں بناتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔ شاعر کھجوروں کی تعریف میں لفظوں کے خم بہ خم لنڈھاتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔

جذبۂ عشق سے مغلوب محبوب کھجوروں سے ہم آغوش ہوتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔ کلفتِ عشق کے مارے عشاق جنون اختیار کر کے کھجوروں سے سر ٹکرا زخمی ہوتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔

شاعر نے کھجور کی سخت کھال میں اپنے ناخن اتار دیئے تو ٹوٹے ناخن دیکھ کر یقین آ گیا کہ حقیقت یہی ہے۔ نہ وہ دیوانہ ہے اور نہ کسی دہشت ناک خواب کے عالم میں ہے۔ مگر چند روز پیشتر اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اسے کیسے فراموش کر سکتا ہے۔

وہ دونوں دوست تھے، دونوں شاعر، حسن، خوشبو، رنگ اور سچائی سے پیار کرنے والے، دونوں کی دوستی کی مانند ان کی شاعری بھی پایدار تھی، پھر وہ انفرادی سوچ کے حامل بھی تھے اور شاید یہی خرابی کی بنا تھی، وہ دونوں خواب دیکھنے والے تھے اور ان کے خوابوں میں کھجوروں کی گنجائش نہ تھی اور شاید یہی خرابی کی بنا تھی۔

اس کا دوست زیادہ جذباتی تھا، اس لئے وہ زیادہ نادان تھا اور اس لئے بہت اچھا لگ سب سے اچھا شاعر تھا، اس نے سب سے پہلے کوئل کی کوک، چڑیوں کی چہچہاہٹ، مور کے رچ، موتیے اور رات کی رانی کی کمی کو محسوس کیا، اگر محسوس کر کے خاموش رہتا تو شاید بات بگڑتی مگر اس نے تو ان کا برملا اظہار بھی شروع کر دیا، یہ سن کر لوگوں نے اس سے قطع تعلق لیا کہ ایسی سوچ بے سود تھی اور ایسی باتیں سودمند نہ تھیں۔ صرف شاعر کا دوست شاعر رہ گیا کہ وہ بھی تقریباً اتنا ہی جذباتی اور اتنا ہی نادان تھا!

اور پھر ایک دن!

وہ دونوں بستی سے باہر کھجوروں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے موضوع وہی ایک تھا یعنی کھجور کا درخت ——— وہ حسبِ معمول زوردار لہجہ میں کھجوروں کی مذمت کر رہا تھا۔ کہ اچانک پہلو کا درخت جھکا اور پیشتر اس کے کہ انھیں احساس ہوتا درخت کی لمبی لمبی شاخوں نے اسے کسی بچہ کی مانند اپنے بازو میں لے لیا درخت سیدھا ہوا تو وہ اس کی شاخوں میں گم ہو چکا تھا یہ سب اتنا اچانک تھا کہ اب تک اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ کھجور کا بے ضرر درخت اچانک آدم خور درخت بن گیا۔

اس نے لوگوں سے اس حادثہ کا ذکر کیا تو سب نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا، کوئی اس کی بات نہ سمجھ رہا تھا۔ بند ہونٹوں، اور نہ دیکھتی آنکھوں سے سب نے اس کی بات

استقبال کیا اور تب اسے یہ احساس ہوا کہ وقتاً فوقتاً اس سے پیشتر بھی اسی طرح لوگ غائب ہوتے رہے ہیں تو کیا یہ سب کھجور کے درختوں کا کھاجا بنے ؟ کیا انسان اب صرف کھجور کے درخت کی کھاد بننے کے لئے رہ گیا ہے ؟

(۳)

وہ سوچتے سوچتے پاگل ہوا جا رہا تھا اور پھر ایک دن وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور کھجور کے درخت کے تنے پر اپنی پوری دیوانگی کی شدت کے ساتھ ایک کاری ضرب لگائی اور لوگوں کی حیرت سے پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کے دوست کو کھا جانے والا درخت ایک ہی ضرب میں ڈھ گیا ہے ، اس نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا مگر پیشتر اس کے کہ اس کا کھلا منہ بند ہوتا ایک اور درخت اسے اُچک چکا تھا۔ □

غزلیں

کنول شاہ آبادی
بکڑی، آرہ، بہار

وہ جو لگتا تھا پیمبر اک دن
گمرہی کا لگا پیکر اک دن
کانچ کا گھر اسے یاد آئے گا
خوب پچھتائے گا پتھر اک دن
ٹھنڈ پہنچائے گا، راحت دے گا
ریت کا گرم یہ بستر اک دن
لاج رکھ لے گی ترے جذبوں کی
مرے احساس کی چادر اک دن
آتشِ وقت میں تپتے تپتے
ہیرے بن جائیں گے کنکر اک دن
لطفِ شہرت مجھے دے جائے گا
تپتے لفظوں کا سمندر اک دن
پاپ جل جائے گا دنیا کا کنولؔ
آنکھ جب کھولے گا شنکر اک دن

عبدالمتین نیاز

برسا نہ ابر سبزۂ دل خاک ہی رہا
یہ دن بھی روز کی طرح سفاک ہی رہا
یوں لاتعلقی نے کیا ذہن و دل میں گھر
میرا جنوں نہ آپ کا ادراک ہی رہا
رسماً ہجوم چارہ گراں ساتھ تھا مگر
غم میں شریک دیدۂ نمناک ہی رہا
تن پر کسی کے ریشم و کمخواب سج گئے
میرے بدن پہ جامۂ صد چاک ہی رہا
بس خاک پر تمام ہوئیں میری عظمتیں
میرا ضمیر خاک تھا میں خاک ہی رہا
ہم کو جہاں میں بھیج کے دیں آزمائشیں
وہ خود اسیرِ مسندِ افلاک ہی رہا
میں سبز موسموں میں گھرا تھا مگر نیازؔ
دامن خزانۂ خس و خاشاک ہی رہا

پرویز ید اللہ مہدی
۲۱۹-جعفر گلی، بہرام نگر
باندرہ، بمبئی ۵۱

مہاجرین اردو نگر اور مشاعرہ گاڑی

جنگلوں، بیابانوں، ریگستانوں، قبرستانوں اور ایسے ہی کئی ہم قافیہ "تانوں" کی چھانتے ہوئے خاک اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے ہوئے بوجھ اپنے مجموعہ ہائے مضامین و دواوین کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں، منکوحہ وغیر منکوحہ بیویوں اور منقولہ وغیر منقولہ بال بچوں کا پہنچے، جس بستی کی سرحد پر مہاجرین اردو نگر وہ موسوم تھی نام سے "ان پڑھ نگر" کے جہاں کے تازہ دباسی سبھی نگر واسی تھے پیچھے تو اسی اپنے نگر کے اور تعلق رکھتے تھے تین مختلف طبقہ جات سے ——— پہلا طبقہ تھا لیشتینی جاہل، دوسرا پیشہ ورسائل اور تیسرا تھا خاندانی کاہل ——— البتہ باگ ڈور تھی حکومت کی جن کے ہاتھ میں وہ پٹھو تھے غیر ملکی طاقتوں کے اور رٹایا گیا تھا جو بولتا قاعدہ انہیں اس کی رو سے مطلب تھا "الف" سے ایٹم بم "ب" سے بندوق اور "پ" سے پستول ———
ایسے سنگین ماحول میں رنگین فضا ہموار کرنا شعر و ادب کے لئے مصداق تھا۔ آ بیل مجھے مار کے، چنانچہ بھانپتے ہی نگر کی ان پڑھ فضا کو مہاجرین اردو نگر کے قافلے نے ڈال دیئے پڑاؤ بستی سے باہر اور پھر نگر کی ان پڑھ آبادی پر بولنے سے پہلے "ادبی دھاوا" اندر ہی اندر یعنی اپنے اپنے پڑاؤ کے اندر کرنے لگے اسلحہ اٹھا یعنی بالائے طاق رکھ کر افزائش نسل کے فطری تقاضوں کو تخلیق شعر و ادب میں مصروف ہو گئے تندہی سے، دودھ دہی سے ہو کر بے نیاز ———
اشد ضروری تھا سب سے پہلے شاعروں و ادیبوں کا آپسی اتحاد۔ چنانچہ ترقی پسند، تنزل پسند قدیم، جدید ہر مکتب خیال کے شاعروں و ادیبوں نے ڈال دیئے تلے عارضی طور پر اپنے اپنے اسکولوں کو اور پھر ہو گئے ایک دوسرے سے بغل گیر، بلکہ کچھ منچلوں نے تو بغل گیر ہونے کی کوشش کی شاعرات سے، لیکن جواباً خبر لی گئی ان شریر حضرات کی اسلحہ جات امور خانہ داری عرف چمٹا بیلنی اور کف گیر سے تب کہیں خواتین کی حد تک ممنوع قرار دیا گیا معانقہ اور اجازت دی گئی صرف مصافحے کی حد تک ——— ا

پھر ایسے گھاگ اور جغادری قلم کاروں کو کہ جن کے زنگ آلود ہو چکے تھے قلم لیکن خواہش بدستور جوان تھی گل رخوں میں بیٹھنے کی، تشکیل دی گئی، ایک کمیٹی کہ نام جس کا تجویز کیا گیا "گرگ باراں دیدہ کمیٹی" اور پھر بنائی گئی اس کی ذیلی کمیٹیاں جن کے ذمہ تفویض کئے گئے مختلف کام، ——— ایک ذیلی کمیٹی مشتمل تھی۔ انقلابی شاعروں و ادیبوں پر جس کے ذمہ تھا "انقلابی چیزیں" سنا کر مضبوط کرنا ارادوں کو ناخواندہ خواتین و نابالغ بچوں کے ——— پھر تمام کمیٹیوں کی بلائی گئی ایک ہنگامی میٹنگ یہ کرنے کہ بھیجا جائے کس کو بغرض جاسوسی ان پڑھ نگر کی طرف ——— اس سلسلے میں بھیجا جانا طے پایا نہایت ہی چالاک اور زیرک قسم کے شاعروں و ادیبوں کا، لیکن ابتداء میں سامنا کرنا پڑا بڑی دقتوں کا اس انتخاب میں کہ جو تجربہ رکھتے تھے، جاسوسی کا، المیہ تھا ان کے ساتھ یہ کہ عادی تھے نشہ کرنے کے اور اترتے ہی دو گھونٹ نیچے متاثر ہو جاتا تھا فعل، ان کے گردوں کا یعنی ادھر عطا ہوتا تھا ذہن بیمار سے مطلع، اور خطا ہو جاتا تھا اُدھر حسن مطلع، نچلے حصے سے جسم کے۔ بلکہ بعض اوقات تو اپنے اپنے مقام سے بہ یک وقت جاری و ساری ہو جاتے تھے مطلع و حسن مطلع ——— ——— جاسوسی جیسے خطرناک کام کے لئے انتخاب کیا جانا کمزور گردے والے اصحاب کا نہیں ہو سکتا تھا، موزوں بلکہ اس جوکھم کے کام کے لئے تو انتخاب کیا جانا چاہیئے ایسے اشخاص کا جن کے مضبوط ہوں نہ صرف گردے بلکہ دل بھی۔ اور سارے قافلے میں مہاجرین الدونگر کے یہ غلط فہمی عام تھی "جدیدیوں" کے بارے میں کہ بے حد مضبوط ہیں ان کے دل کے گردے اور اس سلسلے میں پیش کیا جاتا تھا یہ استدلال کہ بعید از فہم تخلیقات لکھنے کے باوجود بھلے چنگے بلکہ نارمل نظر آتے ہیں۔ ذہنی طور پر، چنانچہ اتفاق رائے کے ساتھ منتخب کیا گیا اس کام کے لئے چند جدیدیوں کو بلاخوف و خطر کہ اگر خدانخواستہ پکڑے بھی جائیں تو پاگل قرار دیئے جا کر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اپنی علامتی، اور ابہام آلودہ گفتگو کے باعث ———

خدا خدا کر کے بغرض جاسوسی روانہ ہوا جدیدیوں کا یہ پہلا دستہ، لیکن بدقسمتی سے چونکہ تمام کے تمام شاعر بھی تھے۔ اور نوجوان بھی اس لئے پہنچتے ہی ان پڑھ نگر میں مقامی حسیناؤں کے تیر نظر سے ہو کر گھائل ہو گئے۔ غافل اپنے فرائض منصبی عرف جاسوسی۔ سے اور اپنا کر چلا اٹھا اے ہم، کا شہرہ، ہو کر دی، عاشقی ———

ادھر لٹکے لٹکے انتظار کی سولی پر تمام مہاجرین اردو نگر کی منتظر آنکھیں نکل آئیں اپنے حلقوں سے باہر تب کہیں احساس ہوا سبھی کو اپنی غلطی کا کہ ایسے جوکھم کے کام کے لئے بجائے نوجوانوں کے بھیجا جانا چاہیئے تھا ایسے تجربہ کار اور عمر رسیدہ قلم کاروں کو کہ جن کے دل میں عاشقی نہ ہو، ہوک سن کے کوئل کی کوک ــــــــ چنانچہ اس مرتبہ بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کرکے پانچ عدد پیر جہاں دیدہ، کمر خمیدہ، قبر رسیدہ، قلم کاروں کو روانہ کر دیا گیا۔ دوسری مہم پر ــــــــ ایک تو جدیدیوں کے دستۂ گم گشتہ کی تلاش دوسرے جاسوسی ان پڑھ نگر کی ــ یہ دوسرا دستہ مشتمل تھا ایسے تجربہ کار گھاگ قلم کاروں پر کہ جو شاعرانہ طبیعت سے زیادہ رکھتے تھے۔ مجرمانہ ذہنیت ــــــــ چنانچہ اپنی دانست میں پکا کام کیا ابتدا ہی سے یعنی بدل کر بھیس بنائے ہوئے حلیہ مست الست فقیروں کا ہوئے داخل ان پڑھ نگر کی حدود میں یہ الاپتے ہوئے سے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشائے ان پڑھ نگر دیکھتے ہیں

ادبی فقیروں کے اس ٹولے کو پیش نظر آیا کوئی حادثہ پشتینی جاہلوں اور خاندانی کاہلوں کے محلے میں لیکن قدم رکھتے ہی پیشہ ور سائیلوں کے حدود اربعہ میں خطرے میں پڑ گیا جغرافیہ جاسوسوں کے دوسرے دستے کا ــــــــ بستی میں نئے فقیروں کو دیکھ کر ہو گئے آگ بگولہ پیشہ ور سائیل حضرات اور اکھاڑ دیا ہتھے سے انھیں اس خدشے نے کہ پیٹ پر پاؤں رکھنے اور ان کی آدھی روٹی کے حصہ دار بننے کے لئے نازل ہوا ہے۔ فقیروں کا یہ نیا ٹولہ پھر کیا تھا۔ بمصداق بھکاری سے بھیک مانگے مرے تک مار کھائے مہاجرین اردو نگر کے اس عمر رسیدہ دستے کی پٹائی کی گئی اس قدر زبردست کہ سبھی کے جاری ہو گئے دست بلکہ ہٹے کٹے سائیلوں نے ایسی دست کاری دکھائی کہ تیر ماکدہ کیا تیر بہدف نسخہ جمال گوٹے کا ــــــــ! اس بے دست و پا دستے کے پیٹ کے دفتر صفائی کی مکمل صفائی کے بعد مونڈھ کر سبھی کے سر کر دیا گیا بستی بدر، اب اس دستے کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا سوائے بے نیل و مرام لوٹنے کے لیکن اس زخم خوردہ دستے کا سرغنہ کہ جو خود کو سمجھتا تھا۔ بہت بڑا نقاد اور شاعر، دھونس جماتا تھا اردو والوں پر غیر ملکی ادب کی، اپنی اس "چمپی" کے بعد ساتھ مونڈھے ہوئے سر کے لوٹنے کو تیار نہ

ہوا۔ اپنے قافلے کی طرف تاوقتیکہ سرپر دوبارہ بال نہیں اُگ آتے ——— یہ بھیسا جواب سن کر وہ مہاجر جو مرعوب ہوتے تھے اس کے مستعار فلسفے سے رُک گئے۔ اس کے ساتھ البتہ جو کبھی کبھی سوچنے کے عادی تھے اپنے ذہن سے لوٹ آئے قافلے کی طرف ——۔

جب مہاجرین اردو نگر کو پتہ چلا دوسرے دستے کی درگت کا تو اور دیکھنے کے پہلے دستہ گم گشتہ اور دوسرے دستہ خستہ کے بچے کھچے اجزائے پریشان کی حالت زار قطار کو مصداق اگلا گرا، پچھلا ہشیار بغرض جاسوسی جو تیسرا دستہ کمربستہ ہوا قبل روانگی کے قسم کھائی اس نے چھو کر "دیوانِ غالب" کو کہ مہاجرین اردو نگر کے نزدیک متصور کی جاتی تھی یہی کتاب مقدس کہ بھول کر بھی نہ رکھیں گے قدم اس خطۂ ان پڑھ نگر کی طرف کہ جہاں آباد تھی پیشہ ور سائیل برادری ——— اسی دستہ تازہ کا ملّا دد بیانہ یعنی کہ سرغنہ تھا تو آدمی کا جنا، لیکن سمجھتا تھا خود کو آدمی کم شاعر زیادہ ——— ویسے تھا اپنے وقت کا بڑا مشاعرے باز شاعر بلکہ مشاعروں میں چلتا تھا بصورت کرنسی نوٹ کے، زندگی کا پہلا مشاعرہ لوٹتے ہی اترایا تھا۔ منظاہرۂ کم ظرفی پہ یعنی اپنے استاد عالی مقام کے کلام بلاغت نظام میں نکالنے لگا تھا کیڑے۔ جس استاد نے جانا تھا اسے اپنا نورِ نظر لختِ جگر ثابت کرنے لگا اسی کے کلام کو لخت دولخت، آدمی چونکہ خاصا کمینہ فطرت میں اس کی تھا کینہ ہی کینہ اس لئے سرکردگی میں اس کائیاں اور شرپسند کی اس دستے کو حاصل ہوئی پہلی کامیابی —— جب یہ دستہ لوٹا ہو کر سرخرو دکامراں تو مہاجرین نے اسے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جیسے یہ دستہ نہ ہو گلدستہ ہو۔ اس گلدستے نے جو گل کھلائے تھے جاسوسی کے ان پڑھ نگر میں اس کی رو سے تمام مہاجرین اردو نگر کو معلوم ہوئی رازکی یہ بات کہ ان پڑھ نگر کا خاندانی کاہل طبقہ دراصل آل اولاد ہے ان شاعروں وادیبوں کی جو بہ سلسلہ تجارت برسوں پہلے آیا جایا کرتے تھے اردو نگر سے ان پڑھ نگر کی طرف، البتہ دستِ بردِ زمانہ نے دور کر دیا تھا خاندانی کاہل حضرات کو شعر وادب سے لیکن صفت کاہلی باقی تھی ان میں ابھی تک جو ثبوت تھی اسی بات کا کہ بلاشک وشبہ یہی آل اولاد ہیں۔ مہاجرین اردو نگر کے آباد اجداد کی۔

تیسرے دستہ گلدستہ کی چونکہ شناسائی ہو چکی تھی کچھ خاندانی کاہلوں سے

اس لئے تمام ارباب مجاز نے صادر فرمایا یہ متفقہ فیصلہ کہ بدلنا چاہیئے اس شناسائی کو دوستی اور پھر رشتہ داری میں ______ پھر کیا تھا کامیاب بنانے اس مہم کو مہاجرین اردو نگر بڑی تعداد میں جانے لگے سوئے ان پڑھ نگر ______

ان پڑھ نگر کے کاروبار چونکہ زیادہ تر تھے ہاتھ میں خاندانی کاہلوں کے اس لئے خرید و فروخت کے بہانے مہاجرین کو اور بھی آسانی ہوئی خاندانی کاہلوں سے ربط بڑھانے میں ______ مہاجرین اردو نگر نے عارضی طور پر تشکیل دی تھیں جو مجلس منتظمہ اور صلاح کار کمیٹیاں منتخب کیا تھا ان کا چیرمین (CHAIRMAN) یعنی کرسی کا آدمی۔

علامہ مکر و فریب کو ______ علامہ کو دخل درنا معقول تھا اردو ادب کی ہر صنف میں، جس زمانے میں اردو نگر کے نقار خانے میں طوطی بولتا تھا شاعروں و ادیبوں کا علامہ کی مہربانی نے کئی نو آموز ادیبوں و شاعروں کو پہنچا دیا تھا اس حال کو کہ ان کا حال اور حالات آ گئے تھے گردش میں عمر بھر کے لئے۔ ایک ایک اینٹ جن کے گھروں کی صحیح سلامت تھی اپنی جگہ ڈھیلے کنکر تک نہ بچے ان گھروں کے ______ اب جب کہ مہاجرین اردو نگر کے ساتھ گردش میں آ گئے تھے۔ خود علامہ بھی اس لئے بہت حد تک کم ہو گئی تھی ان کے مزاج کی فرعونیت لیکن ذہنیت بدستور تھی تخریب پسند ______ علامہ کی تخریب پسند ذہنیت نے دور کی کوڑی لائی کہ پگھلانے کے لئے خاندانی کاہلوں کی رگوں میں منجمد شعر و ادب کی لہروں کو اس لئے خورد و نوش کی خرید و فروخت کے دوران چھوڑے جائیں مختلف بہانوں سے شعر و ادب کے شوشے بلکہ بہتر ہو گا اگر مطلوبہ اشیاء کی فہرستیں تیار کی جائیں منظوم شکل میں۔ قابل قبول تھی علامہ کی یہ تجویز اس لئے جدید و قدیم شاعروں کا ایک جتھا سر جوڑ کر جٹ گیا سودے سلف کی فہرستوں کو منظوم کرنے میں۔

علامہ کی یہ تجویز ثابت ہوئی بڑی کارگر چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے خاندانی کاہلوں کا خاندانی مرض یعنی جذبۂ تخلیق شعر و ادب انگڑائی لینے لگا پھر سے، بقول علامہ تپنا شروع ہو گیا تھا لوہا بس جمانے کی دیر تھی ایک عدد ہتھوڑا ______ لیکن ان پڑھ نگر میں چونکہ خاندانی کاہلوں کے ساتھ آباد تھے پشتینی جاہل اور پیشہ ور سائل بھی اور ان دو طبقات سے لاحق تھا مہاجرین اردو نگر کو زبردست خطرہ، اس لئے [illegible]

مشاعروں اور ادبی نشستوں سے کیونکہ مشاعرے اور اجلاس جہاں ہوا دیتے خاندانی کاہلوں کی آتش شوق کو وہیں یہ خوف بھی تھا کہ ہوا نہ بگاڑ دیں کہیں پیشہ ور سائیل و پشتینی کاہل مہاجرین اردو نگر کی ـــــــ تاہم خاندانی کاہلوں کی رگوں میں پیدا ہونے والی آتش شوق کو بھڑکا کر لانا ضروری تھا اس مقام تک جہاں پہنچ کر خود کہہ اٹھے ان کی آتش شوق کہ ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کی میں نہیں قائل

مہاجرین اردو نگر کی منزل آچکی تھی اس قدر قریب کہ ذرا سی بھی بد احتیاطی پانی پھیر سکتی تھی سارے کئے کرائے پر، بس دو چار قدم کا رہ گیا تھا فاصلہ لیکن ہر قدم اٹھانا تھا پھونک پھونک کر، چنانچہ تمام مہاجرین قدم اٹھانے سے پہلے مصروف ہو گئے پھونکنے میں۔ اس پھونک پھانک "میٹنگ" میں پیش پیش تھے طنز و مزاح نگار حضرات حالانکہ شاعروں ادیبوں کے اس جم غفیر میں سمجھے جاتے تھے یہ حضرات ناقابل اعتنا، محض اس بنا پر کہ بہتوں کی نظر میں طنز و مزاح کا ادب تھا دوسرے درجے کا گویا دو نمبر کے کاروبار کی طرح یہ ادب بھی تھا دو نمبر کا ـــــــ انگلیوں پر گنی جانے والی طنز و مزاح نگاروں کی اس تعداد میں ایک نوجوان طنز و مزاح نگار ایسا بھی تھا جو طنز و مزاح کو اسکولی درجہ بندی کے حساب سے دوسرے درجے کا اور دیگر اصناف ادب کو گردانتا تھا پہلے درجے کا ـــــــ ظاہر ہے اسکول کا دوسرا درجہ پہلے درجے سے بہر حال اونچا ہوتا ہے ـــــــ اسی ناقابل اعتنا صنف ادب کے ایک نو آموز الم بردار نے ایک ایسی تجویز پیش کی کہ لاکر جسے روبہ عمل سانپ کو پکڑا جا سکتا تھا زندہ بغیر لاٹھی کی مدد کے ـــــــ تجویز یہ تھی کہ مشاعرے یوں تو رائج ہیں برسوں سے لیکن باوجود اس کے شاعر اور عوام کے بیچ کا فاصلہ برقرار ہے ہنوز جوں کا توں یعنی نہ شاعر کے سر کی جوں پہنچ پاتی ہے عوام تک اور نہ عوام کے سر کی جوں شاعر تک ـــــــ اور کوئی بھی شاعر اس وقت تک نہیں ہو سکتا عوامی جب تک کہ وہ عوام سے دس فیٹ کی بلندی پر کھڑا ہو کر سناتا رہے گا اپنا کلام ـــــــ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ شمع کو بجائے شاعر کے پاس پہنچانے کے ایسا طریقہ کار رائج کرنا چاہیئے جس کی مدد سے پہنچایا جا سکے شاعر کو بذات خود سامع

[illegible]

کو ۔ لیکن حاصل کرنے کے لئے اپنے گوہر مقصود کو کچھ نہ کچھ قربانی تو دینی پڑتی ہے ۔ اور اگر کچھ شاعروں کو چڑھا کر "بلی" مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے شاعروں کو چاہئے کہ زبانی بہت باندھ چکے سر سے کفن اب زبان کی ترویج و ترقی کے لئے سچ مچ باندھ کر سر سے کفن کود پڑیں میدان عمل میں ـــــــ !

اس انوکھی تجویز کی بھرپور تائید کی تمام نثر نگاروں نے بلا تفریق و تقسیم ، لیکن کھٹیا کھڑی ہو گئی ، بیشتر شاعروں کی خصوصاً جدیدیوں کی کہ سمجھنا خود شعراء برادری کو مشکل ہوتا ہے ان کا کلام پُر ابہام اس پر عوام پھر ٹھہرے عوام ــــــــ قبل اس کے کہ سوخت ہو جدید شاعروں کے کم خون جسم کا خون ایک اور سینئر طنز و مزاح نگار نے اپنے جونیئر کی تجویز کے ہر پہلو پہ فرمانے کے بعد غور و خوص یہ صلاح دی کہ کیوں نہ روایتی مشاعروں کی جگہ گشتی مشاعرے یعنی چلتے پھرتے مشاعروں کی داغ بیل ڈال دی جائے اور یہ گشتی مشاعرے ثابت بھی ہوں گے کم خرچ بالانشیں کیونکہ اس میں نہ ضرورت پڑے گی اسٹیج کی نہ پنڈال کی بلکہ صرف تین عدد بچہ گاڑیوں سے کام چل جائے گا ـــــ جب پوچھا گیا کہ تین عدد بچہ گاڑیاں کس کے لئے ہوں گی درکار تو بولے یوں سینئر طنز و مزاح نگار کہ صدر مشاعرہ ہوں گے جلوہ افروز ایک عدد بچہ گاڑی میں ، مہمان خصوصی دوسری بچہ گاڑی میں اور تیسری میں باری باری کرتے ہوئے سواری ہر شاعر اپنے کلام بے لگام سے چلتے پھرتے سامعین کو زبردستی کر سکتا ہے محظوظ ، خود کو رکھتے ہوئے ہر طرح سے محفوظ ـــــــ اب رہا سوال کھینچنے کا ان تینوں بچہ گاڑیوں کو تو عائد ہوگی یہ ذمہ داری باری باری ، بلا تفریق مشاعرے میں شرکت کرنے والے تمام شاعروں پر بلا لحاظ عمر و رتبہ ـــــــ

تجویز کیا تھی ، پیر صاحب کا تعویذ تھی جس کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ دوران مشاعرہ اگر خدانخواستہ ہو جائے فضا خراب کسی وجہ سے تو گول کرنے میں شاعروں کو اپنے اپنے بوریئے بستر نہیں درپیش ہوگی کوئی دقت یعنی کہ بہ آسانی گاڑیوں میں منتقل کر کے رخت سفر پلک جھپکتے میں "چھو" کرائے بغیر "چمپت" ہوا جا سکتا ہے ۔ بچہ گاڑیوں سمیت مقام واردات سے ـــــ !!

مشاعرہ گاڑی کے اس روشن پہلو نے سبھی کے دل و دماغ کر دیئے چکا چوند ، تمام مہاجرین نے ایک دوسرے کے سر خوب دُھنے ـــــ بلکہ علاحدہ مکر و فریب کے حق بہ

ثابت ہوئی یہ تجویز شادی مرگ۔ یعنی سن کر یہ تجویز اچھلے اس زور سے علامہ کہ آزاد ہو گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین کی کشش ثقل سے اور کر گئے پرواز آن واحد میں مکرو فریب سے بھرپور اس عالم ناپائیدار سے عالم پروردگار کی طرف ــــــــ افسوس صد افسوس! ہو گئے رخصت علامہ مرحوم بچہ گاڑی میں بیٹھنے سے محروم ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں اُڑنے والے میں

علامہ کی اچانک رحلت کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا دو دن کے لئے تجربہ کشتی مشاعرے کا ــــ!

اور پھر علامہ مکرو فریب کی وفات حسرت آیات کے تیسرے روز بپا کرنے کی غرض سے کشتی مشاعرہ روانہ ہوئیں سوئے ان پڑھ نگر مشاعرہ گاڑیاں ــــــ بڑی اٹھا پٹک اور کھینچا تانی کے بعد منتخب ہوئے کشتی مشاعرے کے پہلے صدر علامہ زاغ دغاباز پوری ــــ اور مہمان خصوصی والی بچہ گاڑی میں بٹھلایا گیا ــــ علامہ مجید لنگ کو کہ جن کا ازروئے قافیہ ملتا تھا سلسلۂ نسب تیمور لنگ سے یعنی معذور تھے علامہ موصوف دونوں ٹانگوں سے ــــــ!

انوکھی مشاعرہ گاڑیوں کی روانگی سے قبل دوڑایا گیا ایک عدد ڈھنڈورچی کو ان پڑھ نگر کی طرف اس غرض سے کہ جا کر بپا کرے خاندانی کاہلوں کی بستی میں پہلے ہی سے خاصا ہنگامہ۔ اس کے لئے دیا گیا ایک عدد بھونپو، جسے لگا کر اپنے منہ سے وہ کسی سڑک چھاپ حکیم کی طرح چلانے لگا یوں گلی گلی ؎

اے اہلیان بنگلا و ماڑی
سنو سنو! آ گئی مشاعرہ گاڑی
گھر بیٹھے بیٹھے مفت میں تفریح لوٹیے
نہ مال دیجئے نہ تو زر ہی دیجئے
بھوکی ہے واہ واہ کی یہ شاعروں کی قوم
اس قوم بے اماں کو فقط داد دیجئے .....

● پہلا کشتی مشاعرہ کامیاب رہا توقع سے کہیں زیادہ اچھلتے پھرتے سامعین نے کہ جس میں تقریباً تمام خاندانی کاہل حضرات مع اپنی اہلیان کے تھے شامل، لطف اٹھایا خوب

کو ۔ لیکن حاصل کرنے کے لئے اپنے گوہر مقصود کو کچھ نہ کچھ قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ اور اگر کچھ شاعروں کو چڑھا کر "بلی" مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے شاعروں کو چاہئے کہ زبانی بہت باندھ چکے سر سے کفن اب زبان کی ترویج و ترقی کے لئے سچ مچ باندھ کر سر سے کفن کود پڑیں میدان عمل میں ــــــــــ!

اس انوکھی تجویز کی بھرپور تائید کی تمام نثر نگاروں نے بلا تفریق و تقسیم، لیکن کھٹیا کھڑی ہوگئی، بیشتر شاعروں کی خصوصاً جدیدیوں کی کہ سمجھنا خود شعراء برادری کو مشکل ہوتا ہے ان کا کلام پُر ابہام اس پر عوام پھر ٹھہرے عوام ــــــــــ قبل اس کے کہ سوخت ہو جاتا جدید شاعروں کے کم خون جسم کا خون ایک اور سینئر طنز و مزاح نگار نے اپنے جونیئر کی تجویز کے ہر پہلو پہ فرمانے کے بعد غور و خوص یہ صلاح دی کہ کیوں نہ روایتی مشاعروں کی جگہ گشتی مشاعرے یعنی چلتے پھرتے مشاعروں کی داغ بیل ڈال دی جائے اور یہ گشتی مشاعرے ثابت بھی ہوں گے کم خرچ بالا نشیں کیونکہ اس میں نہ ضرورت پڑے گی اسٹیج کی نہ پنڈال کی بلکہ صرف تین عدد بچہ گاڑیوں سے کام چل جائے گا ــــــ جب پوچھا گیا کہ تین عدد بچہ گاڑیاں کس کے لئے ہوں گی درکار تو بولے یوں سینئر طنز و مزاح نگار کہ صدر مشاعرہ ہوں گے جلوہ افروز ایک عدد بچہ گاڑی میں، مہمان خصوصی دوسری بچہ گاڑی میں اور تیسری میں باری باری کرتے ہوئے سواری ہر شاعر اپنے کلام بے لگام سے چلتے پھرتے سامعین کو زبردستی کر سکتا ہے محظوظ، خود کو رکھتے ہوئے ہر طرح سے محفوظ ــــــــــ اب رہا سوال کھینچنے کا ان تینوں بچہ گاڑیوں کو تو عائد ہوگی یہ ذمہ داری باری باری، بلا تفریق مشاعرے میں شرکت کرنے والے تمام شاعروں پر بلا لحاظ عمر و رتبہ ــــــــــ

تجویز کیا تھی، پیر صاحب کا تعویذ تھی جس کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ دوران مشاعرہ اگر خدانخواستہ ہو جائے فضا خراب کسی وجہ سے تو گول کرنے میں شاعروں کو اپنے اپنے بوریئے بستر نہیں درپیش ہوگی کوئی دقت یعنی کہ بہ آسانی گاڑیوں میں منتقل کر کے رخت سفر پلک جھپکتے میں "چھپی" کرائے بغیر "چمپت" ہوا جا سکتا ہے۔ بچہ گاڑیوں سمیت مقام واردات سے ــــــــــ!!

مشاعرہ گاڑی کے اس روشن پہلو نے سبھی کے دل و دماغ کو کر دیئے چکا چوند، تمام مہاجرین نے ایک دوسرے کے سر خوب دُھنے ــــــ بلکہ علامہ مکر و فریب کے حق میں

ثابت ہوئی یہ تجویز شادی مرگ۔ یعنی سن کر یہ تجویز اچھلے اس زور سے علامہ کہ آزاد ہو گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین کی کشش ثقل سے اور کر گئے پرواز آن واحد میں مکرو فریب سے بھرپور اس عالم ناپائیدار سے عالم پروردگار کی طرف ——— افسوس صد افسوس! ہو گئے رخصت علامہ مرحوم بچہ گاڑی میں بیٹھنے سے محروم ؎

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں اُڑنے والے میں

علامہ کی اچانک رحلت کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا دو دن کے لئے تجربہ گشتی مشاعرے کا ——!

اور پھر علامہ مکرو فریب کی وفات مسرت آیات کے تیسرے روز برپا کرنے کی غرض سے گشتی مشاعرہ روانہ ہوئیں سوئے ان پڑھ نگر مشاعرہ گاڑیاں ——— بڑی اٹھا پٹک اور کھینچا تانی کے بعد منتخب ہوئے گشتی مشاعرے کے پہلے صدر علامہ زاغ دغاباز پوری ——— اور مہمان خصوصی والی بچہ گاڑی میں بٹھلایا گیا —— علامہ ہچھوند لنگ کو کہ جن کا ازروئے قافیہ ملتا تھا سلسلۂ نسب تیمور لنگ سے یعنی معذور تھے علامہ موصوف دونوں ٹانگوں سے ———!

انوکھی مشاعرہ گاڑیوں کی روانگی سے قبل دوڑایا گیا ایک عدد ڈھنڈورچی کو ان پڑھ نگر کی طرف اس غرض سے کہ جا کر بپا کرے خاندانی کاہلوں کی بستی میں پہلے ہی سے خاصا ہنگامہ۔ اس کے لئے دیا گیا ایک عدد بھونپو، جسے لگا کر اپنے منہ سے وہ کسی سڑک چھاپ حکیم کی طرح چلانے لگا یوں گلی گلی ؎

اے اہلیانِ بنگلا و ماڑی
سنو سنو! آ گئی مشاعرہ گاڑی
گھر بیٹھے بیٹھے مفت میں تفریح لوٹیے
نہ مال دیجئے نہ تو زر ہی دیجئے
بھوکی ہے داد واہ کی یہ شاعروں کی قوم
اس قوم بے اماں کو فقط داد دیجئے ......

● پہلا گشتی مشاعرہ کامیاب رہا توقع سے کہیں زیادہ اچھلتے پھرتے سامعین نے کہ جس میں تقریباً تمام خاندانی کاہل حضرات معہ اپنی اہلیان کے تھے شامل، لطف اٹھایا خوب

داد بھی بے حساب دی اور ہوٹنگ بھی جی کھول کر کی یعنی کہ فقرے بھی کسے گئے، جوتیں بھی چلی گئیں اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو ضمانت ہوتی ہیں کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی ——— نمونتہً پیش ہیں چند مثالیں ——— جب ایک شاعرہ نے بیٹھ کر مشاعرہ گاڑی میں فرمایا ——— "مطلع عرض کرتی ہوں —" تو سامعین میں سے لگائی کسی نے یوں ہانک ——— "محترمہ کچھ تو خیال فرمائیے تذکیر و تانیث کا، مطلع نہیں، "متلی" عرض کیجئے —" جواباً شاعرہ نے کہ جس کا نام تھا دلبر جانی، آنکھ میں جس کی نام کو نہیں تھا پانی، قربان کرکے شاعروں پر اپنی جوانی، حاصل کی تھی بلا کی چرب زبانی، زد میں جس کی آکر اچھے اچھوں کی مرجاتی تھی نانی، یوں چوٹ کی ——— "حضور والا معاف کرنا آپ مجھے ناتجربہ کار نظر آتے ہیں "متلی" عرض نہیں کی جاتی، اگلی جاتی ہے، اور میں نے اپنے لئے مطلع پسند کرکے "متلی" آپ کی بیوی کے لئے چھوڑ دی ہے ———"

سامعین کی دیدہ دلیریاں دیکھ کر چوٹ کرنے لگے ایک دوسرے پر شاعر حضرات بھی کسی کے شعر پر یوں اعتراض جھاڑ دیا کسی نے ——— "جناب والا" آپ کے اس شعر کے مصرع اول میں "الف" گر رہا ہے ———"

گرنے دیجئے ——— شاعر نے ڈھٹائی سے دیا جواب ——— شعر بھی میرا ہے اور الف بھی میرا" چاہے اسے گراؤں یا اٹھاؤں آپ کی بلا سے آپ اپنی الف، ب کی تختی سنبھالیے بقول شاعر ؎

میرے الف کی کمال نہ ایسے ادھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

تجربہ، مشاعرہ گاڑی کا اس قدر کامیاب رہا کہ اب ہر دوسرے تیسرے روز جانے لگیں۔ یہ گاڑیاں ان پڑھ نگر کی طرف نتیجہ جس کا یہ ہوا کہ خاندانی کاہل حضرات کی اکثریت نے توجہ دینی شروع کر دی۔ تخلیق شعر و ادب کی طرف سنجیدگی سے اپنی اس دھواں دھار کامیابی پر پھولے نہ سمائے مہاجرین اردو نگر، بلکہ ایک زوردار مشاعرہ بپا کرنے کی ٹھان لی جشن کی صورت میں ——— مشاعرے کی تیاریاں زور و شور سے ہو گئیں شروع ادھر اور ادھر پشتینی کاہل اور پیشہ ور سائل کہ جن کے کانوں میں پڑ چکی تھی بھنک مشاعرہ گاڑی کی بلکہ کچھ نے تو دیکھا تھا مشاعرہ گاڑیوں کو بہ نفس نفیس خود اردو شاعروں کی صورت میں

سونگھ چکے تھے کسی بہت بڑے خطرے کی بو ـــــــــ اس لئے اندر ہی اندر، کرنے لگے تیاریاں تاکہ شاعروں کے مشاعرہ لوٹنے سے پہلے ہی لوٹ لیں، خود مشاعرہ شاعروں سمیت ـــــــــ

اس مرتبہ بجائے مشاعرہ گاڑیوں کے طے پایا تھا روایتی مشاعرہ، یعنی اسٹیج پنڈال کا کیا جانے لگا خصوصی اہتمام ـــــــــ خدا خدا کر کے آگئی مشاعرے کی رات، جس میں لگائے گھات پہلے ہی سے تھی تیار پشتینی جاہلوں اور پیشہ ور سائلوں کی بارات ـــــــــ مشاعرہ شروع ہوا ہی چاہتا تھا کہ بول دیا دھاوا، سائلوں و جاہلوں کے لٹھ باز نمائندوں نے ـــــــــ پھر کیا تھا ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ آن واحد میں مشاعرے کی تبدیلی ہوگئی جنس، ـــــــــ مہاجرین اردو نگر کے نمائندے دیکھتے ہی حالات کی سنگینی کو، جدھر سمائے اپنے اپنے سینگ اُدھر کو ہو گئے رفو چکر، البتہ خاندانی کاہلوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، حملہ آوروں کا ـــــــــ اس سے پہلے کہ دونوں طرف لگ جاتے کشتوں کے پشتے اور دشمن کا بیج پکڑ لیتا جڑ، پشت در پشت کے لئے، ان پڑھ نگر کے ارباب اقتدار نے فوج کی مدد سے فرو کر دیا اس فری اسٹائیل ہنگامے کو ـــــــــ البتہ جب تلاش کی گئی فساد کی جڑ تو اس کے ڈانڈے مہاجرین اردو نگر سے جڑے ہوئے نظر آئے، چنانچہ، ممنوع قرار دیا گیا ان پڑھ نگر کی حدود میں مشاعرہ گاڑیوں اور شاعروں و ادیبوں کا داخلہ ـــــــــ

کچھ دنوں تک تو دونوں طرف سکون رہا ـــــــــ کیونکہ مہاجرین اردو نگر نے بھول کر بھی رخ نہیں کیا ان پڑھ نگر کا ـــــــــ لیکن جب واہ واہ کی بھوک، ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ نے اشتعل پیتعل کرنا شروع کیا سبھی کے ہاضمے کو تو بیٹھ گئے سبھی سر جوڑ کے ترکیبیں لڑانے ـــــــــ اور پھر بعد کافی غور و خوض کے فیصلہ کیا گیا "گوریلا چھاپہ ماروں" کے طریقہ کار کو آزمانے کا ـــــــــ چنانچہ اگلی شب پہلا دستہ مشاعرہ گاڑیوں سمیت داخل ہوا۔ ان پڑھ نگر کی حدود میں رات کی تاریکی میں ـ علامہ جھجو رنگ، صدارت گاڑی میں جلوہ افروز تھے ـــــــــ شامل تھے جتنے بھی شاعر و ادیب اس "چھاپہ مار" مہم میں اتفاق سے سبھی نا واقف تھے "گوریلا جنگ" کے طریقہ کار سے ـــــــــ لہٰذا پہلی غلطی یہ سرزد ہوئی اس دستے سے کہ رات کی تاریکی میں بجائے خاندانی کاہلوں کے محلے کے پہنچ گئے پشتینی جاہلوں کی کالونی میں ـــــــــ پھر کیا تھا، "چھاپ" دیا پشتینی جاہلوں نے ان ناتجربہ کار چھاپہ ماروں

کو رات کی جس تاریکی سے دو کر پہنچا دیا تھا چھاپہ مار مہاجرین کو پشتینی جاہلوں کے فولادی شکنجے میں اس تاریکی نے فرار کا راستہ بھی سجھا دیا تمام چھاپہ ماروں کو سوائے علامہ ہجور لنگ کے۔ سب تو بھاگ نکلے سر پر رکھ کے پاؤں لیکن بھاگ نہ سکے علامہ کے پاؤں سرے سے تھے ہی نہیں جو سر پر رکھ کر نکل بھاگتے ——— جب مہاجرین اردو نگر کو علم ہوا اس سانحۂ عظیم کا تو ہر کسی نے یک زبان فاتحہ پڑھ ڈالی علامہ ہجور لنگ کے نام پر، اور سوچنے لگے کوئی ترکیب، پشتینی کاہلوں سے بدلا لینے کی، اسی دوران کچھ جاسوس لے آئے یہ خبر کہ خاندانی کاہلوں نے پشتینی جاہلوں کی کالونی پر کر دیا ہے حملہ ——— اور حملے کی شدت نے ارباب اقتدار کو اس قدر اکھاڑ دیا ہے جس سے کہ خاندانی کاہلوں کے ساتھ مہاجرین اردو نگر کو بھی نیست و نابود کر دینے کا جاری کر چکے ہیں حکم ——— یہ دہشت ناک خبر کا سننا تھا کہ مچ گئی کھلبلی مہاجرین اردو نگر کے قافلے میں ——— فوراً بلائی گئی ہنگامی میٹنگ تمام صلاح کار کمیٹیوں کی تاکہ کیا جائے یہ فیصلہ کہ ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیئے ——— جتنے عمر رسیدہ ادیب و شاعر تھے ان کا قطعی فیصلہ تھا۔ یہاں سے فوراً کسی اور بستی کی طرف کوچ کرنے کا ——— کہ ان سب کے سوکھ چکے تھے تخلیقی سوتے اور جم چکا تھا رگوں میں دوڑنے پھرنے والا لہو بھی کہ خلاف اس کے نوجوان ادیب و شاعر کہ جن کا گرم تھا خون، ان پڑھ نگر کے ارباب اقتدار سے ٹکرا کر تیار تھے پاش پاش ہو جانے کو ——— قبل اس کے کہ مہاجرین اردو نگر کا یہ باہمی اختلاف انھیں آپس میں ٹکرا کر کر دیتا پاش پاش جاسوس پیغام لے آئے خاندانی کاہلوں کا کہ موقع کی نزاکت کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام مہاجرین اردو نگر فوراً ان پڑھ نگر کی سرحد سے چلے جائیں کہیں دور اس وقت تک کے لئے جب تک کہ بحال ہو جاتا امن، ان پڑھ نگر میں اب رہے ہم یعنی خاندانی کاہل چونکہ برسوں سے بستے آئیں ہیں۔ ہمیں اس لئے ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کر نہیں سکتے کوئی بے ایمانہ سلوک ——— آخر میں تمام مہاجرین اردو نگر سے کہ آپ حضرات ہی نے شعر و ادب کے جن سوئے ہوں سوتوں کو جگایا ہے ہمارے دلوں میں کھا کر قسم ان ہی کی کرتے ہیں یہ وعدہ کہ ان پڑھ نگر" میں لہرا کر اردو کا جھنڈا دلا کر رہیں گے۔ مستحق مقام اس زبان کے شعر و ادب کو ——— لہٰذا فوراً کیجئے عمل ہماری درخواست پر اور خدارا جتنا جلد ہو سکے چلے جائیے ان پڑھ نگر کی حدود سے دور بہت دور ———

اس پیغام نے کر دکھایا چمتکار، ہو گئے تمام مہاجرین اردو نگر چل پڑنے کو تیار ———

سبھی نے فوراً باندھا رخت سفر۔ اور پھر ایک بار اردو والوں کا یہ قافلہ نکل کھڑا ہوا تلاش میں نئے ٹھکانے کی ـــــــ ایک ایسے ٹھکانے کی تلاش، جہاں کسی کو بیر نہ ہو، پیاری پیاری اردو زبان سے ـــــــ جہاں کوئی جوڑ گردشتہ اس زبان کا کسی خاص مذہب سے منافرت پھیلانے کا نہ کرے کوشش ـــــــ جہاں نہ کوئی لیڈر نہ کوئی پارٹی اس مظلوم زبان کا سہارا لے کر نہ کرے کوشش الیکشن جیتنے کی ـــــــ اور پھر نہ چلائے الٹی چھری اس زبان پر بعد جیتنے کے الیکشن ۔۔۔۔۔۔۔ اور جہاں ۔۔۔ اور جہاں ۔۔۔۔۔۔

یہی سوچتے ہوئے یہ قافلہ جلائے ہوئے نئے دیئے امیدوں کے آگے بڑھتا رہا ـــــــ رات کی تاریکی میں بڑھتا رہا ۔۔۔۔۔ بڑھتا رہا ۔۔۔۔۔۔

اگر ملک بادشاہ تنگ است تو زمین خدا وسیع تر ـــــــ !! □

[اس مضمون کے کردار وہی ہیں جو "قصہ اردو نگر کا" میں اپنے فن کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ لیکن مقامات اور واقعات بالکل نئے اور تازہ بہ تازہ ہیں ـــ اس مضمون کا اختتام وہاں ہوتا ہے جہاں سے ایک نئی داستان شروع ہوتی ہے جو پھر کبھی سنائی جائے گی۔]

احمد ہمیش

دوسرا نِروان ــــ ۱

اُس کے نُور (ہدایت) کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے (فرض کرو ایک طاق ہے اور اس میں ایک چراغ رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے اور وہ قندیل ایک طاق میں رکھا ہے، اور وہ قندیل ایسا صاف شفاف ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو اور وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت) ہے جو (کسی آڑ کے) نہ پورب رُخ ہے اور نہ پچھم رُخ ہے اُس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اُس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بہ خود جل اُٹھے گا اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو نور علیٰ نور ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اِس نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دے دیتا ہے۔ (سورۃ النور)

میں انتہائی خوش ہوں کہ صلاح الدین پرویز نے "نمرتا" لکھ کر برصغیر کی کئی زبانوں کے بیشتر نقادوں پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا ہے۔ کسی نے فرانز کافکا سے متعلق لکھا ہے کہ اُسکی دنیا میں فلسفی جلا وطن ہیں۔ صلاح الدین پرویز نے "نمرتا" لکھ کر اپنی جو دنیا بنائی ہے، اس میں بیشتر نقاد جلا وطن ہیں۔ اور جب میں یہ سطر لکھ رہا ہوں، اس عرصہ میں 'نمرتا' برصغیر کے کئی زبانوں کے ادبی حلقوں میں پہونچ چکی ہوگی۔ اس لئے کہ اردو رسم الخط میں لکھنے اور چھپنے کے باوجود نمرتا کی "ووکیبلری" برصغیر میں بولی اور لکھی جانے والی زبانوں کی مرکب، صوری وصوتی، تشکیلی اور تصویری خصوصیات کا آئینہ ہے۔ اور اِس آئینہ میں صرف لفظ نظر نہیں آتے بلکہ لفظ کے میڈیم میں چتر کلا، شلپ کلا، سنگیت، نرت اور ناٹک کی ملی جلی "پرفارمنس" نظر آتی ہے۔ جدید ٹکنالوجی 'سرکا راما' کو اگر نمرتا کی ووکیبلری کی جگہ اپلائی کی جائے تو 'نمرتا' پڑھنے اور سننے والوں کو ذرا ہی دیر میں ان گنت متحرک تصویروں اور آوازوں کے درمیان گھرے ہونے کا احساس ہوگا۔

اُن کے ذہن میں گم شدہ تہذیبی پورٹریٹ، لینڈ اسکیپ اور میورل کبھی اک اک کر کے بتدریج اور کبھی یکبارگی صورت آئیں گے یہاں تک کہ وہ ٹرانس میں آ جائے گا اور عرصہ تک وہ اِسی کیفیت میں رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی انوکھی دنیا اور اس کی انوپم سندرتا کی تاب نہ لانے کی شکتی ایسے اہل بصیرت ہی میں ہوگی جو بہ یک وقت شش پہلو کرداروں میں جھانکنے اور کئی جہتوں میں سفر کرنے کا اہل ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ میں نے شروع ہی میں 'نرتا' کی تخلیقی بلند قامتی کے ذکر کے ساتھ ہی برصغیر کی کئی زبانوں کے بیشتر نقادوں کو پست قامت کیوں قرار دیا ہے! اور خود میں انھیں بہت بھاری پتھر کے نیچے دبا ہوا دیکھ کر کیوں خوش ہوا ہوں۔ اِس لئے کہ کسی بھی ملک میں کسی بھی زبان کے ادب کی تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کوئی بڑی تخلیقی تصنیف منظر عام پر آئی تو بیشتر نقادوں کے قد چھوٹے ہو گئے۔ یہ ایک ایسا متنازعہ فیہ مسئلہ ہے، جو اب تک تخلیقی کارنامہ اور تنقید کے درمیان حدِ فاصل قائم کئے ہوئے ہے۔ اِس سے قطعِ نظر کہ کئی بڑے شاعر مانے ہوئے نقاد بھی رہے ہیں، تخلیقی کارنامہ کی بلند قامتی آپ ہی آپ متعین ہوئی۔ "ابھی گیان شکنتلم" (شکنتلا) کی رچنا کے زمانہ میں تو نقاد ہوتے ہی نہیں تھے۔ یورپ میں بھی ڈِوائن کامیڈی کی تخلیق کے دور میں ادب کی تنقید نہیں تھی۔ اب ذرا دیر کے لئے اس تفصیل میں چلتے ہیں جو بدنصیبی سے برصغیر کی ادبی تاریخ کا "وکوم" ہے۔ اس "وکوم" میں کتنی ہی اہمیتیں الوپ ہو گئیں۔

کالی داس۔ غالب اور ٹیگور کے بعد پریم چند کی فردیت ادب کی تاریخ میں برصغیر کی انا کو آزاد دیکھنا چاہتی تھی مگر انھوں نے غلطی سے یا شاید بزرگانہ انکسار کے ناطے ۱۹۳۶ء والی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ بس اُسی دن سے ترقی پسند نقادوں نے پارٹی لائن کے مقاصد کے لئے پریم چند کو ترقی پسند تحریک سے بریکٹ کر دیا۔ ترقی پسند تحریک کا تو ویسے بھی ادب یا اس کی انفرادی قدر و قیمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن جو تھوڑی بہت ادبی قدر و قیمت جدید اور نئے ادب سے علامت پسندی، تجریدیت، استعاروں کے استعمال، نئی حقیقت پسندی، نثری نظم اور جمالیات کی ڈائنزم کے نام پر وضع کی گئی، وہ بھی تنگ نظر نقادوں کی کج فہمی کی نذر ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بغیر کسی تحریری کارنامہ کے اسٹیبلشمینٹ کے اداروں اور ٹی ہاؤسوں میں وہی لٹریری اور انٹلیکچوئل سناب نظر آنے لگے، جو بیس برس گذرے نظر آتے تھے۔ البتہ کچھ ٹیبل ٹاک کا موضوع بدلا تو کچھ اس قسم کی بحث ہونے لگی کہ فلاں ماڈرن ہے .... فلاں ماڈرنسٹ ہے .... وغیرہ وغیرہ۔ بیس برس کے عرصہ مغربی ادب اور فلسفہ کے ادھورے مطالعے نے اکثر نقادوں کو تنقید لکھنے کا مصنوعی اعتماد دیا اور تھوڑا بہت تخلیقی ادب لکھنے والے اس التباس میں رہے کہ شاید دونوں ملکوں میں کم و بیش کچھ کام

ہو رہا ہو۔ مگر اچانک معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ کسی نے کہا.... نہیں، دائیں بازو اور بائیں بازو تو ہو رہا ہے۔ پھر کسی کونے سے کوئی دل جلا بولا: "دائیں بازو والے ادب کو ادب سے پاک کر رہے ہیں اور بائیں بازو والے ادب میں ہر روز مزید بائیں بازو اگا رہے ہیں'...' پھر ادب پر کیا گزر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔ جواب ملا: 'ادب' ادبی سماجیات کا حصہ ہو گیا ہے۔ ادیبوں کے خون پر پلی ہوئی پیر اسائٹ زرد اور بلو صحافت کا بازار گرم ہے اور ادیب اتنے بھی مقتدر نہیں رہے کہ وہ صحافیوں کے عجلت پسندانہ پیشہ کی نوٹس لیں اور انھیں ان کی اوقات میں رکھیں:" یہ سن کر مجھے بڑی چنتا ہوئی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ ادب جس ادیب کا مقدر ہے، وہ کسی غیر ادب کو چیلنج کرے! مجھے قرۃ العین حیدر کی ایک کہانی 'فوٹو گرافر' کی آخری سطر یاد آ گئی ...." زندگی انسان کو کھا گئی صرف کا کروچ رہ جائیں گے :" اسی دوران کسی نے مجھے بڑے دکھ سے مطلع کیا:" نیک و بد کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ اس بد مزگی کے لئے ہمارے نقاد بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں" میں نے سوچا کہ اگر نقاد بڑی حد تک ذمہ دار ہیں تو ایسے نقادوں پر بھی کڑا وقت آنا چاہئے۔ کچھ ایسا ہو بلکہ کوئی ایسا غیر معمولی تخلیقی کارنامہ ہونا چاہئے کہ ادب کے گمبھیر لوگ حیران اور خوش ہوں اور نصف صدی سے نقادوں کا جو گروہ عادت کی خرابی کے سبب بد مزگی پیدا کرتا رہا ہے وہ خود بد مزا ہو اور اسے شاک پہونچے۔ اسی سوچ میں ایک عرصہ گذر گیا۔

اچانک ۱۹۷۸ء کی ایک شام میرے ایک دوست ریحان صدیقی نے مجھے اطلاع دی کہ ریاض سعودی عرب سے صلاح الدین پرویز کراچی آیا ہے اور ایک مکان میں بظاہر اس کے اعزاز میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں مگر اندیشہ یہ ہے کہ صلاح الدین نشست میں موجود غیر سنجیدہ لوگوں کے درمیان 'ایلین' نہ ہو کے رہ جائے؛ میں نے فوراً طے کیا کہ میں اس نشست میں پہونچوں۔ ویسے بھی میں صلاح الدین پرویز سے غائبانہ متعارف تھا۔ میں اس کی کئی نظمیں ۶۸-۱۹۶۷ء کے عرصہ میں پڑھ چکا تھا۔ خاص کر اس کی تین نظموں کو پڑھکر بے حد چونکا تھا۔ ایک نظم یوں تھی۔

وہ کنویں سے نکل کے گھر آیا
شام اخبار پڑھ کے سوئی تھی
چائے کی کیتلی میں آنکھیں تھیں
بچے اندھے تھے ٹوٹے مونڈھے پر

ایک خط استوا کو پکڑے تھے

دوسری نظم یوں تھی :

وہ اداسی نہیں کہانی تھی
تار پہ چل کے خوب ہنستی تھی
اپنے دونوں مکان دیکھا کر
نیچے گرتی تھی ٹوٹ جاتی تھی

خاص طور پہ تیسری نظم 'عورت خدا کا انجار ہے' کی چند سطریں :

آج سے صرف کچھ سال پہلے کی یہ بات ہے
آسماں جب زمیں پر نہیں تھا
خدا ایک انجار تھا

اور مزید یہ سطریں :

آج کی رات عورت ہے
جس کے بدن میں مرادرمیانہ بدن
ڈولتا ہے ہواؤں کے سنگیت لئے
آج کی رات
ہنستے ہوئے کیوں نہ پکڑیں خدا کو
خُدا : ایک انجار

مجھے یہ تینوں نظمیں نئی شاعری کے اس فارم سے بالکل مختلف لگی تھیں، جو ۱۹۶۰ء سے ۶۸ء تک کے عرصہ میں کی جارہی اُردو سمیت برصغیر کی کئی زبانوں کی نئی شاعری میں عام تھا۔ بہت سے نئے شاعر اندر کی ضرورت کے بغیر، خود پر نری داخلیت یا فرضی معروض کے گرائیسک کو امپوز کئے ہوئے نئی شاعری کر رہے تھے۔ بلکہ یہ روش بعد کے برسوں میں بھی جاری رہی۔ تو محض اس فارم سے صلاح الدین پرویز کو مختلف دیکھ کر اُس وقت سے مجھے ایک تجسس رہا کہ اس سے مل کر مزید اس کی نظمیں سنوں کہ معلوم کروں کہ اصل مسئلہ کیا ہے! سو جب میں اس کے اعزاز میں دی گئی نشست میں پہونچا تو میں نے دیکھا کہ وہ حاضرین کے درمیان دل برداشتہ بیٹھا ہوا ایلین معلوم ہو رہا ہے اور دو تین سنجیدہ شاعروں سے قطع نظر کئی زہریلے چہروں والے مقامی شاعر سوال کرنے کے بہانے اُس پر آمادۂ

نقرے چست کر رہے ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی یکایک فقرے چست کرنے والی پیشہ ورانہ مہارت ایک طرح کی مسخرانہ مگر خاموش منافقت میں بدل گئی ۔ البتہ صلاح الدین کو مجھ سے مل کر کچھ حوصلہ ہوا ۔ ویسے میرے علاوہ محبوب خزاں بھی موجود تھے جن کے بارے میں ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے، وہ نادم میں بھی کی گئی شاعری کے زبردست پارکھی تھے ۔ اچھے شاعر سے ملاقات کرنے کے لئے وہ لاہور سے سفر کر کے کراچی آ سکتے ہیں ۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف صلاح الدین پرویز کی شاعری سننے کے لئے ہی نشست میں آئے تھے ۔ صلاح الدین نے اپنی کئی نظمیں سنائیں ۔ خاص کر 'تراتر' اور ایک طویل نثری نظم 'نگیٹیو'۔ مثلاً 'تراتر' سناتے ہوئے جب وہ ان سطروں تک پہونچا :

خُدا :
تو ہمارے گناہوں کو
بچوں کی شکلیں عطا کر
بڑا نیک ہے تو
نمک کے خزانے کو تقسیم کر
اور تقسیم سے
اک پریشان چہرے کی تقدیر بن

تو میرے پاس ہی بیٹھے محبوب خزاں نے میرے کانوں میں سرگوشی کی" یہ نظم تو ان بقراطوں پر بھاری پڑے گی جو محض فیشن میں لایعنیت کی باتیں کرتے ہیں"۔ پھر جب صلاح الدین اپنی طویل نثری نظم 'نگیٹیو' سنا چکا تو میں نے 'نگیٹیو' کی کچھ سطریں کوٹ کر کے حاضرین کو مخاطب کیا ' آپ میں سے کسی نے ایسی جیتالی نثری نظم اس سے پہلے کبھی سنی ہے!' تو کسی نے جواب نہیں دیا اور کوئی کیا جواب دیتا ۔ میرا تخاطب دعوے کے بغیر نہیں تھا :

چاند تاروں کی کٹوریاں پانی سے بھر گئی ہیں
لیکن ہوا آسمان سے زمین پر مسلسل ریت کی
صورت گر رہی ہے تمہارا نام پرندیا ہے تمہارے
جھولے میں اب کوئی بھی سانس ٹیڑھی نہیں ہے
میرے سینے کے بال ایک دوسرے سے لپٹ کر
زمین کے نیچے دھنستے جا رہے ہیں

تمھاری کوکھ میں انار کے پودے نے جنم لیا ہو یا
تمھارے جھکے ہوئے کاندھوں پر انگور کی
بیل چڑھ رہی ہو مجھے تمھارا نام یاد
رہے گا تم مجھے اپنے ہاتھوں میں کدال
لے کر کس طرح گھماؤگی ـــــ تمھارے
شمال مغرب چاروں طرف ننھے منے سیاح
تیر رہے ہیں ـــــ اور درمیان
میں بلی بچہ ـــــ مار سکتی ہے
پرنیتا مکان کے پروں سے نکل کر
اسٹیشن کی پٹریوں پر اتر جاؤ
بھاگو بھاگو ـــــ بھاگتی رہو
ـــــ اور تمھارے شمال مغرب
ننھے منے سیاح تیر رہے ہیں ـــــ
اور میں اب اپنے پائپ سے
تمباکو کے بجائے پانی پیتے پیتے
خود بھی ایک نل بن گیا ہوں
خدا حافظ تمھارا ـــــ الم ـــــ

یہ تو نگیٹیو کی کچھ سطریں ہیں مگر یہ نظم پوری پڑھنے یا سننے کی صورت میں ایک جہانِ حسیات لگتی ہے۔ ہمہ گیر انسانی لطافتوں کی حسیات اور فرسٹ اسٹروک میں انتہائی بے ساختہ۔ معنویتیں بہت گہری ہیں مگر ٹرانس پیرینٹ بھی ہیں۔ دراصل شعر و ادب کی کوئی فارم، کوئی ٹریڈ یونین کا مسئلہ نہیں کہ ایک الیکشن کمیٹی بنائی جائے، فلاں فلاں تجاویز رکھی جائیں اور ایک بھیڑ اکٹھی کرکے تقریر کی جائے اور تقریر کے بعد قرارداد پاس ہو کہ نہیں فلاں نے نثری نظم پہلے نہیں شروع کی بلکہ کسی اور فلاں نے شروع کی اور صاحب فلاں کی نثری نظم کو تو کوئی شاعری تسلیم نہیں کرتا تھا کسی اور فلاں نے اسے تحریک بنا دیا اور ملک کے کونے کونے میں لوگ نثری نظمیں لکھ رہے ہیں مگر میرے خیال میں کسی شاعر کی شاعری کو (خواہ وہ کسی فارم میں شاعری کر رہا ہو) صرف اس کے ذاتی

انی شی ایٹیو اور اس کی مجموعی شخصیت میں دیکھنا چاہیئے۔ ذاتی انی شی ایٹیو کی مثال خیام کے ایک شعری قول سے دی جاسکتی ہے "کہ شراب بھی جانتی ہے کہ اسے کون پی رہا ہے"! اب اگر یہ کہا جائے کہ خیام ایک صوفی بھی تھے۔ ممکن ہے اُن کے مذکورہ قول میں شراب کے لفظ سے مراد عشق یا ہستی خالص کا نور ہو۔ مثلاً صلاح الدین پرویز نے اُس نشست میں رسولِ پاک، اہل بیت اور صحابۂ کرام سے متعلق بھی چند ایمان افروز نظمیں سنائیں اور سامعین پر ایک علیحدہ جہت منکشف ہوئی۔ خود میرے قلب پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے بے اختیار کہا: یہ تو ایک خوبصورت اسلام ہے، خاص کر ایک نظم 'محمد رسول اللہ' سنتے ہوئے:

وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا
سپید شب کی مسافری سے
سیاہ سورج کا غم اُٹھائے
وہ اپنے گھر سے نکل پڑا تھا

اور مزید یہ سطریں:

یہ کیسا گھر ہے جھک رہا ہے
یہ کیسا بستر ہے جل رہا ہے
یہ اسپ از حد مکان والا
ابھی تلک سامنے کھڑا ہے
عبادتوں سے بنا پرندہ
ابھی تلک آنکھ مَل رہا ہے

معلوم یہ ہوا کہ اسلام کا جہاں رُوح کی خوبصورتی سے علاقہ ہوتا ہے، وہاں قلب کی توجہ آپ ہی آپ مرکوز ہو جاتی ہے اور جتنا ہمارے ورثہ اور ہماری سائنس میں مذہب شامل ہوتا ہے، اس کا ریڈیم آپ ہی آپ چمک اُٹھتا ہے، ورنہ ۹۰ کروڑ والی مملکتی اسٹیٹجی جسم کی کھال کو بھی نہیں چھوتی، قلب اور سائنس تو دور کی بات ہے۔ بات تو اس میں ہے کہ پرندہ خود اُڑ رہا ہے، پیڑ خود اُگ رہا ہے، پانی خود بہہ رہا ہے، ہوا خود چل رہی ہے، خوشبو خود پھیل رہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک پر کوئی مصنوعی مرضی مسلط نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر ذرا دھمکا کے کی جائے تو وہی چیز بدصورت ہو جاتی ہے۔ غالب کو کوئی ایسی تکلیف تو ضرور رہی ہو گی کہ ثوابِ طاعت و زہد جانتے

ہوئے بھی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی تھی اور یہ معاملہ ہے بھی اتنا نازک کہ اس میں کسی دلیل کا گزر نہیں۔ گوتم کو جب نروان ملا تو اُن کا حاسد کزن راجکمار دیودت اُن کے پاس پہونچا اور اُن سے مخاطب ہوا "بتاؤ کہ تمھیں کیسے نروان ملا!" گوتم نے جواب میں کہا" راجکمار دلیل کی تلوار مجھ پر مت آزما.... میرے دل میں تو ایک بات ہے، جو میں تجھ تک پہونچانا چاہتا ہوں۔" میں یہ یہ مثال دے کر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہی دل کی بات صلاح الدین پرویز کی تقدیسی نظموں میں نظر آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ سلسلہ حضرت نظام الدین اولیا، اور حضرت امیر خسرو سے جا ملتا ہے یعنی عشق کی آزادی۔ ابھی یہ جہت منکشف ہی ہوئی تھی کہ شعری نشست اختتام کو پہونچی۔ مگر صلاح الدین اپنے چہرہ سے عجیب بیتاب معلوم ہوا۔ گویا وہ کوئی ایسا بھید بتانا چاہتا ہو، جو وہ لوگوں کو نہیں، کسی ایک کو ہی بتا سکتا ہو۔ مجھے تجسس ہوا۔ کیونکہ لوگ تو تھے نہیں۔ صرف میں ہی تھا یا میرے علاوہ سویرا تھا۔ صلاح الدین پرویز اپنے ہاتھوں میں ایک مسودہ تھامے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا" یہ نمرتا ہے۔ اور پہلی بار میں تمھیں ہی سنا رہا ہوں۔" اس نے پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا، مجھ پر ایک جہت اور منکشف ہوئی یا ہوتی گئی:

"نمرتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر نیل کنٹھ کی اور دیکھا ـــــ نیل کنٹھ کے بھولے تاثر جیسے چہرے کو کرودھ اور جھنجھلاہٹ نے کتنا بدصورت بنا دیا تھا ـــ نمرتا اگر چاہتی تو وہ نیل کنٹھ کو بتا سکتی تھی کہ اب وہ ایک ایسا سمراٹ ہے جو یُدھ ہار چکا ہے۔ اُس کے سارے منتری، سیناپتی، فوج اور یدھ کا سارا ساز و سامان ایک مٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ماس کی تسکتی شالی سوگندھ رچی ہوئی ہے جو بےچین ہو رہی ہے کہ کب آزاد ہو، کب ساری دھرتی کو آزاد کر دے، خشک سالی اور قحط ـــــ سے، موسموں کو پت جھڑ اور بانجھ پن سے، کہ اس بار خوب پانی برسے، آکاش تلک فصلیں لہلہائیں..... یہ تبدیلی وِشال اور آنند ہے ہو.....لیکن کرپاؤں میں ڈوبا ہوا یہ کسرتی منشیہ کتنا پاگل ہے کہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا، اس کے ساتھ منشیہ کا شبد جُڑ چکا ہے، چاہے اِس شبد کی آیو کتنی ہی ہینت، معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو....."

ـــــ "تیسرا ادھیائے سے ایک اقتباس"

یوں جب نمرتا، کا مسودہ اختتام کو پہونچا تو کراچی میں اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح کی دُھوپ رُوپہلے اور اشیاء کے پیچھے مستقل بھاگنے والے لوگوں، روزمرہ کی ایمبیشنز کے بتوں اور بےگھر مکانوں کی

اروں سے پَرے اُوپر پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک وقت بدلا مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ کیسے کراچی
اکتوبر ۱۹۷۸ء کا دن ڈھلا اور کیسے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کی شام دہلی میں ہوئی۔ جامعہ
اسلامیہ کے آڈیٹوریم میں گوپی چند نارنگ، انتظار حسین، محمود ہاشمی، وحید اختر، شمیم حنفی،
ج مین را، آشفتہ چنگیزی، لینڈ آڈنٹینک اور میرے علاوہ بہت سے با ذوق سننے والے
تھے اور کہانی کے سمینار کی آخری رات نصف حصہ طے کر چکی تھی مگر ڈائس پر صلاح الدین
یز کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی 'نمرتا' جاری تھی۔ شاعری، کہانی، ناولٹ اور ناول کی ہر مروّجہ
م سے مختلف اور ماورا 'نمرتا' کے صفحات سے صلاح الدین پرویز کی دیومالا ادب کی نئی
یخ بناتی ہوئی معلوم ہوئی۔ صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی، ملیالم
اور تامل ادب میں بھی بہ یک وقت نئی تاریخ بناتی ہوئی 'نمرتا' کے واکیہ، مکالمے، بیان
پیرا فریز گونج اُٹھے: ـــ مثلاً ایک واکیہ: "بھنگ اُودر کوٹ پہن کر جنگ کو دستک دیتی
" یا "شنکر، یدوپتی اور خسرو کس بھیروی میں بہہ رہے ہیں" یا "سبھی لڑکیاں اپنی اپنی
لیوں سے اپنے اپنے سِدرۃ المنتہیٰ نکالی کر خلاؤں میں ٹانک دیتی ہیں اور پھر ان کی شاخوں
لپٹ جاتی ہیں ـــ پھر بجلی گرتی ہے اور شامیانے کو چھیدتا ہوا ادم، عجائب گھر سر پر جائے
زمیوں، جانوروں، آسمان اور اپنے آپ کو ہانکتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ عظیم ہے" یا اور ایک
اکیہ: تو کیا سب عورتیں رسولی گھر ہیں اور مرد ان کے دھات سے بنے برتن' یا خود سے پوچھ
دال: بادل اُٹھ رہے ہیں؟ .... نہیں! دھنش ٹوٹی ہے؟ ... نہیں ...... سورج ڈوبا
؟ .... نہیں .... اساوت برسا ہے .... ؟ نہیں! دھنش پھوٹی ہے؟ .... نہیں! دھنش
ٹی ہے؟ ... نہیں! چاند میں بیٹھی نمرتا چرخا کات رہی ہے؟ ... نہیں! نہیں؟ نہیں؟ نہیں!
ی طرح ایک مکالمہ: ـــ تو اسے تیل کنٹھ آؤ میرے پاس کہ تمھیں سجا دوں ... مَل دوں
ارے بدن پر ہلدی کہ چمکنے لگو تم اُس رات، پرتھوی پر چندرما سے زیادہ جو کم کم روشنی
ے رہا ہے .... چھاپ دوں تمھارے ماتھے پر بھورے چندن کا تِلک کہ آکاش سے کوئی
ی اُتر کر تمھیں اپنی آنکھوں میں نہ بھر لے .... تم پرتھوی پر چلتے رہو۔ جب تک پرتھوی چلتی
ہے'.... یا ایک پیرا فریز: تمھارا نام کیا ہے ....؟ بولو بولو، بولتی کیوں نہیں ہو... میرے
منے سے ہزاروں برس گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تمھیں دیکھتے دیکھتے ایک ہی لمحہ میں ایک
ر بن گیا ہوں۔ ایک لمبا اُجاڑ بے لباس برس .... میرا انت سویکار لو کہ میں سہن نہیں کر پاؤنگا۔

ہوئے بھی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی تھی اور یہ معاملہ ہے بھی اتنا نازک کہ اس میں کسی دلیل کا گذر نہیں۔ گوتم کو جب نروان ملا تو اُن کا حاسد کزن راجکمار دیودت اُن کے پاس پہونچا اور اُن سے مخاطب ہوا "بتاؤ کہ تمھیں کیسے نروان ملا!" گوتم نے جواب میں کہا "راجکمار دلیل کی تلوار مجھ پر مت آزما۔۔۔۔ میرے دل میں تو ایک بات ہے، جو میں تجھ تک پہونچانا چاہتا ہوں"۔ میں یہ یہ مثال دے کر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہی دل کی بات صلاح الدین پرویز کی تقدیسی نظموں میں نظر آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ سلسلہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو سے جا ملتا ہے یعنی عشق کی آزادی۔ ابھی یہ جہت منکشف ہی ہوئی تھی کہ شعری نشست اختتام کو پہونچی۔ مگر صلاح الدین اپنے چہرہ سے عجیب بیتاب معلوم ہوا۔ گویا وہ کوئی ایسا بھید بتانا چاہتا ہو، جو وہ لوگوں کو نہیں، کسی ایک کو ہی بتا سکتا ہو۔ مجھے تجسس ہوا کیونکہ لوگ تو تھے نہیں۔ صرف میں ہی تھا یا میرے علاوہ سویرا تھا۔ صلاح الدین پرویز اپنے ہاتھوں میں ایک مسودہ تھامے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "یہ نمرتا ہے۔ اور پہلی بار میں تمھیں ہی سُنا رہا ہوں"۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا، مجھ پر ایک جہت اور منکشف ہوئی یا ہوتی گئی:

"نمرتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر نیل کنٹھ کی اور دیکھا ـــــ نیل کنٹھ کے بھولے ناتھ جیسے چہرے کو کرودھ اور جھنجھلاہٹ نے کتنا بدصورت بنا دیا تھا ـــ نمرتا اگر چاہتی تو وہ نیل کنٹھ کو بتا سکتی تھی کہ اب وہ ایک ایسا سمراٹ ہے جو یُدھ ہار چکا ہے۔ اُس کے سارے منتری، سیناپتی، فوج اور یدھ کا سارا ساز و سامان ایک مٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ماس کی تتکلی شالی سوگندھ رچی ہوئی ہے جو بیچین ہو رہی ہے کہ کب آزاد ہو، کب ساری دھرتی کو آزاد کر دے، خشک سالی اور قحط ـــ سے، موسموں کو پت جھڑ اور بانجھ پن سے، کہ اس بار خوب پانی برسے، آکاش تلک فصلیں لہلہائیں ..... یہ تبدیلی وِشال اور آنند سے ہو ..... لیکن کرپاؤں میں ڈوبا ہوا یہ کسرتی "منشیہ" کتنا پاگل ہے کہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا، اس کے ساتھ "منشیہ" کا شبد جُڑ چکا ہے، چاہے اِس شبد کی آیو کتنی ہی نہیں، معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو....."

ـــــ "تیسرا ادھیائے سے ایک اقتباس"

یوں جب "نمرتا" کا مسودہ اختتام کو پہونچا تو کراچی میں اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح کی دھوپ دُھند اور اشیاء کے پیچھے مستقل بھاگنے والے لوگوں، روزمرہ کی ایمبیشنز کے بتوں اور بے گھر مکانوں کی

ستاروں سے پرے اُدھر پھیلتی جارہی تھی۔ پھر اچانک وقت بدلا مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ کیسے کراچی میں اکتوبر ۱۹۷۸ء کا دن ڈھلا اور کیسے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کی شام دہلی میں ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آڈیٹوریم میں گوپی چند نارنگ، انتظار حسین، محمود ہاشمی، وحید اختر، شمیم حنفی، راج مین را، آشفتہ چنگیزی، لینڈ آدنٹینک اور میرے علاوہ بہت سے باذوق سننے والے بیٹھے تھے اور کہانی کے سمینار کی آخری رات نصف حصہ طے کر چکی تھی مگر ڈائس پر صلاح الدین پرویز کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی 'نمرتا' جاری تھی۔ شاعری، کہانی، ناولٹ اور ناول کی ہر مروّجہ ہیئت سے مختلف اور ماورا 'نمرتا' کے صفحات سے صلاح الدین پرویز کی دیومالا ادب کی نئی تاریخ بناتی ہوئی معلوم ہوئی۔ صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی، ملیالم، تلگو اور تامل ادب میں بھی بہ یک وقت نئی تاریخ بناتی ہوئی 'نمرتا' کے واکیہ، مکالمے، بیان اور پیرا فریز گونج اُٹھے: — مثلاً ایک واکیہ: "بھنگ آدور کوٹ پہن کر جنگ کو دستک دیتی ہے" یا "شنکر، پدوپتی اور خسرو کس بھیروی میں بہہ رہے ہیں" یا "سبھی لڑکیاں اپنی اپنی پسلیوں سے اپنے اپنے سدرۃ المنتہیٰ نکال کر تلاؤں میں ٹانک دیتی ہیں اور پھر ان کی شاخوں سے لپٹ جاتی ہیں —— پھر بجلی گرتی ہے اور شامیانے کو چھیدتا ہوا آدم، عجائب گھر سر پہ سجائے زمینوں، جانوروں، آسمان اور اپنے آپ کو ہانکتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ عظیم ہے"؛ یا اور ایک واکیہ: تو کیا سب عورتیں رسوئی گھر ہیں اور مرد ان کے دھات سے بنے برتن' یا خود سے کچھ سوال: بادل اُٹھ رہے ہیں؟ .... نہیں! دھنش ٹوٹا ہے؟ ... نہیں .... سورج ڈوبا ہے؟ .... نہیں .... اساوت برسا ہے .... ؟ نہیں! دھنش پھولی ہے؟ .... نہیں! دھنش ٹوٹی ہے؟ .... نہیں! چاند میں بیٹھی نمرتا چرخا کات رہی ہے؟ .... نہیں! نہیں؟ نہیں؟ نہیں اسی طرح ایک مکالمہ: — تو اسے نیل کنٹھ آؤ میرے پاس کہ تمھیں سجا دوں .... مل دوں تمھارے بدن پر ہلدی کہ چمکنے لگو تم اُس رات، پرتھوی پر چندرما سے زیادہ جو کم کم روشنی دے رہا ہے .... چھاپ دوں تمھارے ماتھے پر بھورے چندن کا تلک کہ آکاش سے کوئی پری اُتر کر تمھیں اپنی آنکھوں میں نہ بھر لے .... تم پرتھوی پر چلتے رہو۔ جب تک پرتھوی چلتی ہے' .... یا ایک پیرا فریز: تمھارا نام کیا ہے .... ؟ بولو بولو، بولتی کیوں نہیں ہو ... میرے سامنے سے ہزاروں برس گزرتے چلے جارہے ہیں۔ میں تمھیں دیکھتے دیکھتے ایک ہی لمحہ میں ایک برس بن گیا ہوں۔ ایک لمبا اُجاڑ بے لباس برس .... میرا انت سویکار لو کہ میں سہن نہیں کر پاؤں گا۔

ہوئے بھی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی تھی اور یہ معاملہ ہے بھی اتنا نازک کہ اس میں کسی دلیل کا گذر نہیں۔ گوتم کو جب نروان ملا تو اُن کا حاسد کزن راجکمار دیودت اُن کے پاس پہونچا اور اُن سے مخاطب ہوا "بتاؤ کہ تمھیں کیسے نروان ملا!" گوتم نے جواب میں کہا "راجکمار دلیل کی تلوار مجھ پر مت آزما.... میرے دل میں تو ایک بات ہے، جو میں تجھ تک پہونچانا چاہتا ہوں۔" میں یہ یہ مثال دے کر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہی دل کی بات صلاح الدین پرویز کی تقدیسی نظموں میں نظر آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ سلسلہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو سے جا ملتا ہے یعنی عشق کی آزادی۔ ابھی یہ جہت منکشف ہی ہوئی تھی کہ شعری نشست اختتام کو پہونچی۔ مگر صلاح الدین اپنے چہرہ سے عجیب بیتاب معلوم ہوا۔ گویا وہ کوئی ایسا بھید بتانا چاہتا ہو، جو وہ لوگوں کو نہیں، کسی ایک کو ہی بتا سکتا ہو۔ مجھے تجسس ہوا۔ کیونکہ لوگ تو تھے نہیں۔ صرف میں ہی تھا یا میرے علاوہ سویرا تھا۔ صلاح الدین پرویز اپنے ہاتھوں میں ایک مسودہ تھامے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "یہ نرمتا ہے۔ اور پہلی بار میں تمھیں ہی سُنا رہا ہوں۔" اس نے پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا، مجھ پر ایک جہت اور منکشف ہوئی یا ہوتی گئی:

"نرمتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر نیل کنٹھ کی اور دیکھا ـــــ نیل کنٹھ کے بھولے تاثر جیسے چہرے کو کرودھ اور جھنجلاہٹ نے کتنا بدصورت بنا دیا تھا ـــ نرمتا اگر چاہتی تو وہ نیل کنٹھ کو بتا سکتی تھی کہ اب وہ ایک ایسا سمراٹ ہے جو یُدھ ہار چکا ہے۔ اُس کے سارے منتری، سیناپتی، فوج اور یدھ کا سارا ساز و سامان ایک مٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ماس کی تشکتی شالی سوگندھ رچی ہوئی ہے جو بیچین ہو رہی ہے کہ کب آزاد ہو، کب ساری دھرتی کو آزاد کر دے، خشک سالی اور قحط ـــــ سے، موسموں کو پت جھڑ اور بانجھ پن سے، کہ اس بار خوب پانی برسے، آکاش تلک فصلیں لہلہائیں ...... یہ تبدیلی دشال اور آنند مے ہو..... لیکن کریاؤں میں ڈوبا ہوا یہ کسرتی منشیہ کتنا پاگل ہے کہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا، اس کے ساتھ منشیہ کا شبد جُڑ چکا ہے، چاہے اِس شبد کی آیُو کتنی ہی نہیں، معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو....."

ـــــــ "تیسرا ادھیائے سے ایک اقتباس"

یوں جب 'نرمتا' کا مسودہ اختتام کو پہونچا تو کراچی میں اکتوبر ۱۹۸۷ء کی صبح کی دُھوپ دُوپٹے اور اشیاء کے پیچھے مستقل بھاگنے والے لوگوں، روزمرہ کی ایمبیشنز کے بتوں اور بے گھر مکانوں کی

ون سے پرے اُدپر پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک وقت بدلا مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ کیسے کراچی
تو بر ۱۹۷۸ء کا دن ڈھلا اور کیسے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کی شام دہلی میں ہوئی۔ جامعہ
لامیہ کے آڈیٹوریم میں گوپی چند نارنگ، انتظار حسین، محمود ہاشمی، وحید اختر، شمیم حنفی،
ین را، آشفتہ چنگیزی، لینڈ آف ٹیٹنک اور میرے علاوہ بہت سے باذوق سُننے والے
، اور کہانی کے سیمینار کی آخری رات نصف حصہ طے کر چکی تھی مگر ڈائس پر صلاح الدین
کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی 'نمرتا' جاری تھی۔ شاعری، کہانی، ناولٹ اور ناول کی ہر مروجہ
سے مختلف اور ماورا 'نمرتا' کے صفحات سے صلاح الدین پرویز کی دیومالا ادب کی نئی
بناتی ہوئی معلوم ہوئی۔ صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی، ملیالم
ر تامل ادب میں بھی بہ یک وقت نئی تاریخ بناتی ہوئی 'نمرتا' کے واکیہ، مکالمے، بیان
افرینہ گونج اُٹھے: — مثلاً ایک واکیہ: "بھنگ آدور کوٹ ہن کر جنگ کو دستک دیتی
یا "شنکر، یدوپتی اور خسرو کس بھیروی میں بہہ رہے ہیں" یا "سبھی لڑکیاں اپنی اپنی
ں سے اپنے اپنے سدرۃ المنتہیٰ نکال کر خلاؤں میں ٹانک دیتی ہیں اور پھر ان کی شاخوں
ٹ جاتی ہیں —— پھر بجلی گرتی ہے اور شامیانے کو چھیدتا ہوا ادم، عجائب گھر سر پر جھاٹے
ں، جانوروں، آسمان اور اپنے آپ کو ہانکتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ عظیم ہے۔" یا اور ایک
: تو کیا سب عورتیں رسوئی گھر ہیں اور مرد ان کے دھات سے بنے برتن' یا خود سے کچھ
: بادل اُٹھ رہے ہیں؟ .... نہیں! دھنش ٹوٹی ہے؟ ... نہیں .... سورج ڈوبا
.... نہیں .... ! ساون برسا ہے .... ؟ نہیں! دھنش پھوٹی ہے؟ .... نہیں! دھنش
ہے؟ .... نہیں! چاند میں بیٹھی نمرتا چرخا کات رہی ہے؟ .... نہیں! نہیں؟ نہیں؟ نہیں!
رح ایک مکالمہ: — تو اسے نیل کنٹھ آؤ میرے پاس کہ تمھیں سجا دوں .... مل دوں
ے بدن پر ہلدی کہ چمکنے لگو تم اُس رات، پرتھوی پر چندرما سے زیادہ۔ جو کم کم روشنی
رہا ہے .... چھاپ دوں تمھارے ماتھے پر بھورے چندن کا تلک کہ آکاش سے کوئی
تر کر تمھیں اپنی آنکھوں میں نہ بھر لے .... تم پرتھوی پر چلتے رہو۔ جب تک پرتھوی چلتی
.... یا ایک پیرا فرینہ: تمھارا نام کیا ہے .... ؟ بولو بولو، بولتی کیوں نہیں ہو... میرے
سے ہزاروں برس گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تمھیں دیکھتے دیکھتے ایک ہی لمحہ میں ایک
ئی ہوں۔ ایک لمبا اُجاڑ بے لباس برس .... میرا انت سو برس کا ہو کر بھی سہن نہیں کر پاؤنگا۔

ہوئے بھی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی تھی اور نہ معاملہ ہے بھی اتنا نازک کہ اس میں کسی دلیل کا گزر نہیں۔ گوتم کو جب نِروان ملا تو اُن کا حاسد کزن راجکمار دیودت اُن کے پاس پہونچا اور اُن سے مخاطب ہوا "بتاؤ کہ تمھیں کیسے نِروان ملا!" گوتم نے جواب میں کہا "راجکمار دلیل کی تلوار مجھ پر مت آزما.... میرے دل میں تو ایک بات ہے، جو میں تجھ تک پہونچانا چاہتا ہوں۔" میں یہ یہ مثال دے کر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہی دل کی بات صلاح الدین پرویز کی تقدیسی نظموں میں نظر آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ سلسلہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو سے جاملتا ہے۔ یعنی عشق کی آزادی۔ ابھی یہ جہت منکشف ہی ہوئی تھی کہ شعری نشست اختتام کو پہونچی۔ مگر صلاح الدین اپنے چہرہ سے عجیب بیتاب معلوم ہوا۔ گویا وہ کوئی ایسا بھید بتانا چاہتا ہو، جو وہ لوگوں کو نہیں، کسی ایک کو ہی بتا سکتا ہو۔ مجھے تجسس ہوا کیونکہ لوگ تو تھے نہیں۔ صرف میں ہی تھا یا میرے علاوہ سویرا تھا۔ صلاح الدین پرویز اپنے ہاتھوں میں ایک مسودہ تھامے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "یہ نمرتا ہے۔ اور پہلی بار میں تمھیں ہی سنا رہا ہوں۔" اس نے پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا، مجھ پر ایک جہت اور منکشف ہوئی یا ہوتی گئی:

"نمرتا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر نیل کنٹھ کی اور دیکھا ـــــ نیل کنٹھ کے بھولے ناتھ جیسے چہرے کو کرودھ اور جھنجھلاہٹ نے کتنا بدصورت بنا دیا تھا ـــ نمرتا اگر چاہتی تو وہ نیل کنٹھ کو بتا سکتی تھی کہ اب وہ ایک ایسا سمراٹ ہے جو یُدھ ہار چکا ہے۔ اُس کے سارے منتری، سیناپتی، فوج اور ریدھ کا سارا سازوسامان ایک مٹی میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ماس کی تشکیک شالی سوگندھ رچی ہوئی ہے جو بیچین ہو رہی ہے کہ کب آزاد ہو، کب ساری دھرتی کو آزاد کردے، خشک سالی اور قحط سے، موسموں کو پت جھڑ اور بانجھ پن سے، کہ اس بار خوب پانی برسے، آکاش تلک فصلیں لہلہائیں..... یہ تبدیلی دِشال اور آنند ہے ہو..... لیکن کرپاؤں میں ڈوبا ہوا یہ کسرتی "منشیہ" کتنا پاگل ہے کہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا، اس کے ساتھ "منشیہ" کا شبد جُڑ چکا ہے، چاہے اِس شبد کی آیو کتنی ہی ہین، معمولی اور مختصر کیوں نہ ہو....."

ــــــ "تیسرا ادھیائے سے ایک اقتباس"

یوں جب 'نمرتا' کا مسودہ اختتام کو پہونچا تو کراچی میں اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح کی دھوپ ڈوبنے اور اشیاء کے پیچھے مستقل بھاگنے والے لوگوں، روزمرہ کی ایمبیشنز کے بتوں اور بے گھر مکانوں کی

دیواروں سے پرے اُدپر پھیلتی جارہی تھی ۔ پھر اچانک وقت بدلا مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ کیسے کراچی میں اکتوبر ۱۹۷۸ء کا دن ڈھلا اور کیسے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کی شام دہلی میں ہوئی ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آڈی ٹوریم میں گوپی چند نارنگ ، انتظار حسین ، محمود ہاشمی ، وحید اختر ، شمیم حنفی ، بلراج مین را ، آشفتہ چنگیزی ، لینڈ آڈیٹنگ اور میرے علاوہ بہت سے باذوق سننے والے بیٹھے تھے اور کہانی کے سمینار کی آخری رات نصف حصہ طے کر چکی تھی مگر ڈائس پر صلاح الدین پرویز کے ہاتھوں میں لکھی ہوئی 'نمرتا' جاری تھی ۔ شاعری ، کہانی ، ناولٹ اور ناول کی ہر مروّجہ فارم سے مختلف اور ماورا 'نمرتا' کے صفحات سے صلاح الدین پرویز کی دیومالا ادب کی نئی تاریخ بناتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی ، بنگالی ، مراٹھی ، گجراتی ، ملیالم تیلگو اور تامل ادب میں بھی بہ یک وقت نئی تاریخ بناتی ہوئی 'نمرتا' کے واکیہ ، مکالمے ، بیان اور پیرا فریز گونج اُٹھے :— مثلاً ایک واکیہ : " بھنگ آدور کوٹ پہن کر جنگ کو دستک دیتی ہے " یا " شنکر ، یدوپتی اور خسرو کس بھیروی میں بہہ رہے ہیں " یا " سبھی لڑکیاں اپنی اپنی چولیوں سے اپنے اپنے سِدرۃ المنتہیٰ نکالی کر تھلاؤں میں ٹانک دیتی ہیں اور پھر ان کی شاخوں سے لپٹ جاتی ہیں ـــــ پھر بجلی گرتی ہے اور شامیانے کو چھیدتا ہوا ادم ، عجائب گھر سر پر جاٹے آدمیوں ، جانوروں ، آسمان اور اپنے آپ کو ہانکتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ عظیم ہے " یا اور ایک واکیہ : تو کیا سب عورتیں رسوئی گھر ہیں اور مرد ان کے دھات سے بنے برتن ' یا خود سے کچھ سوال : بادل اُٹھ رہے ہیں ؟ .... نہیں ! دھنش ٹوٹی ہے ؟ ... نہیں ..... نہیں ...... سورج ڈوبا ہے ؟ .... نہیں .... ! ساون برسا ہے .... ؟ نہیں ! دھنش پھولی ہے ؟ .... نہیں ! دھنش ٹوٹی ہے ؟ .... نہیں ! چاند میں بیٹھی نمرتا چرخا کات رہی ہے ؟ .... نہیں ! نہیں ؟ نہیں ؟ نہیں ! اسی طرح ایک مکالمہ :— تو اسے تیل کنٹھ آ ، میرے پاس کہ تمھیں سجا دوں ... کل دوں تمھارے بدن پر ہلدی کہ چمکنے لگو تم اُس رات ، پرتھوی پر چندرما سے زیادہ جو کم کم روشنی دے رہا ہے .... چھاپ دوں تمھارے ماتھے پر بھورے چندن کا تلک کہ آکاش سے کوئی پری اُتر کر تمھیں اپنی آنکھوں میں نہ بھر لے .... تم پرتھوی پر چلتے رہو ۔ جب تک پرتھوی چلتی رہے ' .... یا ایک پیرا فریز : تمھارا نام کیا ہے .... ؟ بولو بولو ، بولتی کیوں نہیں ہو ... میرے سامنے سے ہزاروں برس گزرتے چلے جا رہے ہیں ۔ میں تمھیں دیکھتے دیکھتے ایک ہی لمحہ میں ایک برس بن گیا ہوں ۔ ایک لمبا اُجاڑ بے لباس برس .... میرا انت سویکار لو کہ میں سہن نہیں کر پاؤنگا ۔

یا اور ایک پیرا فریز :— ہم صندوقوں میں اپنے ہاتھوں سے پرندے، مناظر، آدمی، عورتیں اور بچے سبھی بھرتے چلے جا رہے ہیں۔ پرندے ہم سے خائف ہیں اور ہم پرندوں کی شکلوں میں ایک ہی استھان پر بیٹھے بیٹھے کتنی تیزی سے اُڑتے چلے جا رہے ہیں.... کہاں....؟ ہم جانتے ہیں پر ہمیں ڈر لگ رہا ہے.... ڈر کہاں ہے.... کہاں....؛

یہ کلیدی مثالیں ہیں اِن سے 'نمرتا' کے تصورِ حقیقت، مثلاً ہمہ اوست، رُومانس، فنتاسی، تصورِ معاشرت بلکہ کرگے گور کے اسکول والی، مشرق کے صوفیوں کی وجودیت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ مگر ان سے مل کر صلاح الدین پرویز کی ذاتی دیومالا جنم لیتی ہے اور ذاتی دیومالا ایک طرح سے گم شدہ اجتماعی سوانح ہے۔ صلاح الدین پرویز کا کمال یہ ہے کہ وہ موجودہ عہد کے اجتماع سے باخبر بھی ہے۔ اس کی نظر میں مادی نظام کی جدید ترین ٹکنالوجی ہے۔ اس کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی وہ اسے بے وقعت سمجھتا رہا۔ اسی کے تصوّرِ حقیقت سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس سے پہلے یہ دھیان سے دیکھ لیا جائے کہ اس کے ہاں حقیقت کس روپ میں ہے! مثلاً جب وہ نیل کنٹھ کی زبان میں نمرتا سے مخاطب ہے: نمرتا میری پیاری نمرتا میں جیون بھر ارتھ شاستر ہی لکھتا رہا ہوں.... ایک بار، کیول ایک بار مجھ سے لکھوا دو ایک پریم شاستر کہ میں پھر سے نیل کنٹھ بن سکوں.... کوئی مجھے نیل کنٹھ کہہ کے پکار سکے.... جس طرح میں خود کو نیل کنٹھ، نیل کنٹھ.... نیل کنٹھ کہہ کر پکار رہا ہوں،.... یا تصورِ حقیقت کی ایک اور جھلک: ماں نمرتا نے دریا پار کیا۔ دریا پار اُس نے عجیب عجیب شکلوں والے مرد دیکھے، جن کے ہاتھوں میں ان کی حویلیوں کے بڑے بڑے کھنڈر تھے۔ وہ گرمی سے گھبرا کر اپنی قمیصیں اور پتلونیں کندھوں پر ڈالے خانقاہوں اور استوپوں سے باہر نکل، چوراہے پہ آن کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس اُن کی ڈھلکے جسموں والی عورتیں بکھری ہوئی تھیں.... عجیب بات یہ تھی کہ سب کے پاؤں تو دھرتی میں دھنسے ہوئے تھے، آنکھیں آسمان کی اُور اُٹھی ہوئی تھیں اور اُن کے ہونٹ بُدبُدا رہے تھے:

او ما میگھ دے چاول پھینک دے
او ما میگھ دے روٹی بھیک دے
او ما میگھ دے

بنگال کے قحط سے قطع نظر برصغیر میں نہ جانے کتنے قحط پڑے ہوں گے۔ بہت سے قحط تاریخ میں

ریکارڈ نہیں ہوئے مگر ایک آرٹسٹ کی پرفارمنس میں اُن کا وِژن دَر آیا۔ اور کسی بھی وژن کے پورٹرے میں آرٹسٹ پر کوئی شرط نہیں عائد کی جا سکتی۔ "نرتا" کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ صلاح الدین پرویز نے اس تخلیقی کارنامہ کو غیر مشروط مکمل کیا۔ یہ ایک ایسا ڈومین ہے کہ اس میں بڑے سے بڑا سوشلسٹ حقیقت پسند داخل نہیں ہو سکتا۔ برصغیر کے ادبی حلقوں میں حقیقت پسندی سے متعلق باتیں تو بہت ہوتی رہی ہیں مگر ایک تصنیف بھی نٹ ہمسن کے ناول "دی ہنگر" کے پایہ کی نہیں ملتی۔ منٹو کی انا بڑی گرم اور تیز تھی مگر زندگی کے بارے میں اُن کا وِژن صفر تھا۔ بہت دور تک وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تھوڑی سی نفسیات جاننے کے ناطے بہتر حقیقت نگاری کر گئے، ورنہ سوشلسٹ حقیقت نگار تو کمیٹمنٹ کی بیساکھی کے باوجود بڑی سطحی حقیقت نگاری کرتے رہے۔ ظاہر ہے، اس کے نتیجہ میں ہی ذاتی دیو مالا کا رجحان شروع ہوا۔ جزوی طور پر کوششیں کی گئیں۔ مگر 'نرتا' کی ذاتی دیو مالا سے پہلی اور آخری بار ایک جمالیاتی تاریخ بنی ہے کیونکہ ایک بات یہ بھی طے ہے کہ 'نرتا' کے بعد کوئی دوسری 'نرتا' خود صلاح الدین پرویز کے لئے ممکن نہیں ہوگی۔ گو کئی برسوں سے ادبی حلقوں میں یہ کہا جاتا رہا کہ ہماری سوسائٹی بے چہرہ ہو گئی ہے۔ اہل جدید کہلانے کے مدعی لکھنے والے بے چہرہ سوسائٹی کو پورٹرے کرنے کے استعاراتی اور علامتی نسخے بھی استعمال کرتے رہے ہیں مگر بیشتر میں یہ جرأت نہیں کہ یہ دکھلا سکیں کہ وہ اپنی زندگی کے کس کونے کھدرے میں جدید ہیں! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بہتوں کے پیٹ تیزاب ہیں اور باطن کھوکھلے ہیں۔ جبکہ صلاح الدین پرویز نے بغیر کسی رجحاناتی سنابری کے دعوی کے 'نرتا' کے تھیم میں اس ٹوٹل پرفارمنس کا حق ادا کر دیا ہے، جس کی توقع لاعصری اور لازمانی خصوصیات رکھنے والے آرٹسٹ سے ہی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر آپ برصغیر کی سوسائٹی میں تصور کریں کہ شنکر، یدوپتی اور خسرو کس بھیروی میں بہہ رہے ہیں؟ تو اِس کھوج میں متعدد رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ مذہبی اعتقادات اور رسومات کے حلقوں سے اعتراضات نازل ہوں گے۔ فینٹک مشتعل ہوں گے۔ مگر وہ صلاح الدین پرویز کے مسئلہ ہمہ اوست کی بنیاد نہیں دیکھ سکتے۔ خود وہ اس مقام تک کیسے پہونچا! اِس کا سُراغ بڑی حد تک اس کی شاعری سے ملتا ہے: 'نرتا' کی بیک گراؤنڈ میں اُس کی نظمیں "محمد رسول اللہ، ہاجرہ، بتول، اقرا، ترائن، نگیٹو، ساقی نامہ اور خسرو نامہ قابل ذکر ہیں۔ اِن کا منبع اس کا قلب ہے اور اُس کے قلب کی راہیں پُراسرار ہیں۔ ایک راہ دیارِ رسول سے عشق کی ہے۔ ایک راہ رسولِ کریم کے واسطہ سے

حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو کے رُوحانی دیار سے عقیدت کی ہے اور ایک راہ کاشی، ہردوار، اجنتا، ایلورہ اور کھجراہو سے متعلق اپنی ذات کی جمالیاتی توسیع کی ہے۔ مگر معاملہ وہی ہے کہ :

ہر قومے راست گاہے، دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم، بر سمت کج کلاہے

مختلف جہتوں اور مختلف راہوں پر انسانی قلب کا یہ یک وقت مرکوز ہو جانا آسان نہیں۔ یہ عمل تو غیر جمالیاتی-تاریخ مرتب کرنے کا عمل ہے۔ مثلاً 'نرتا' میں رومانس کی نوعیت خالص جمالیاتی وجود کی بنیاد ہے 'نرتا' عورت کا مکمل روپ ہے۔ وہ خود پریم میں پہل کرتی ہے اس طرح کہ پُرش کی ہستی کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔ در اصل گوتم بدھ نے پُرش کو ادھوری عورت سے دُور رہنے کا اُپدیش دیا تھا۔ اُس مکمل عورت سے نہیں، جو مرد کی دستک پر دھیان دیتی ہے۔ مگر یہ بعید موجودہ عہد کے سماجیات کے ماہرین کی سمجھ میں نہیں آسکتا ویسے بھی موجودہ عہد میں عورت کے وجود کی مسٹری باقی نہیں رہی ہے۔ اُسے اخلاقیات کی ریاکارانہ آڑ میں رکھ کر ایک قسم کی بے فیض مخلوق بنا دیا گیا ہے یا وہ کثرت استعمال میں آنے والی بے وقعت اور بے سواد کموڈٹی بن گئی ہے۔ اس کے باوجود اس عہد میں بھی آدمی کو زندہ رہنے کے لئے کسی طور یہ ضروری ہے کہ اسے مسرت میتسر ہو۔ اگر کوئی ریجیمنٹیشن آدمی کی مسرت کے خلاف ہو تو اُس سے کسی طور پر نجات ضروری ہے۔ ہرمن ہیس نے ایک کاسمک گیم کی فنتاسی میں یہ دکھایا ہے کہ آنے والی ایک صدی کی اپنی ایک تصوراتی دنیا ہے اور اس میں لوگ بے روک ٹوک انجوائے کر رہے ہیں۔ افسوس یہ کہ ہمارے خطے میں تو خواب دیکھنے کی بھی آزادی نہیں۔ حیرت یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز نے 'نرتا' میں اِتہ میں اور خواب کے بلینڈ سے فنتاسی کی رچنا کی ہے۔ خاص کر پہلے اور چوتھے ادھیائے میں ـــ پھر ایک انتہا پر پہنچ کر انکشاف ہوتا ہے 'نرتا' اور نیل کنٹھ دونوں مل کر یک وجود ہیں۔ اور اگر کہیں الگ ہوتے بھی ہیں تو ایک دوسرے کی کھوج میں کسی انہونی سے نادم پھر آملتے ہیں۔ مشرق کے صوفیوں کی وجودیت کی یاد دلاتے ہیں یہاں تک کہ آدمیت کا مستقبل بن جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ صلاح الدین پرویز سیلف کا دوسرا نام نیل کنٹھ ہے تو اس ذاتی دیومالا کے ناطے 'نرتا' آدمیت کے مستقبل کی دیوی ہے

"..... تم سو گئی ہو ہمیشہ جاگتے رہنے کے لئے .....

بہترین کہانیوں کے پیش لفظ میں میں نے تحریر بھی کیا کہ ممکن ہے 'نرتا' کی اشاعت ۱۹۸۰ء میں ہو اور اردو زبان اُن بین الاقوامی زبانوں کی صف میں شامل ہو جائے، جن میں بڑے ناول لکھے گئے۔ اس ضمن میں میں نے بڑے ناول کی تصنیف سے متعلق ژاں پال ساخت (سارتر) کی پیش بینی کا حوالہ بھی دیا کہ آیندہ لکھا جانے والا بڑا ناول وہ ہوگا، جس میں تھیم مشرق کا ہوگا اور تکنک مغرب کی۔ اس اعتبار سے اگر گذشتہ برسوں کے عرصہ میں بغور جائزہ لیا جائے تو بیشتر زبانوں میں لکھے گئے ناول ساخت (سارتر) کی پیش بینی پر پورے نہیں اُترتے۔ مگر صرف ایک 'نرتا'، کو جو ناول کی مروجہ فارم سے بھی ماورا ہے، دانش حاضر پیشوا کی پیش بینی سے مطابقت حاصل ہوئی ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے۔ مگر ہے ضرور۔ ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے خطہ میں لوگ ادبیات سے متعلق معکوس دانشوری کے سراب رویوں سے اتنے مرعوب ہیں کہ وہ یہ آسانی سے مان نہیں سکتے کہ اُردو اور ہندی میں بہ یک وقت ایک بڑا ناول لکھا گیا۔ سو یہ کام بہت مشکل ہے کہ پہلے لوگوں کی تنگ نظری، حسد اور احساس کمتری سے اَٹے ہوئے آلودہ مطلع کو صاف کیا جائے پھر اُن سے کہا جائے کہ وہ 'نرتا'، کا مطالعہ کریں۔ بہرحال ایک بات تو اپنی جگہ طے ہے کہ 'نرتا' کے مطالعہ سے قلب و ذہن کی یکسوئی اور وسیع النظری مشروط ہے اور اگر یہ لوگوں کے لئے ممکن ہو تو وہ پہلے تیس سال کے عرصہ میں بین الاقوامی زبانوں میں لکھے گئے ناولوں کی تخلیقی قدر و قیمت کا بغور جائزہ لیں پھر 'نرتا'، کا مطالعہ کریں۔ کیونکہ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں کہا جا رہا ہے کہ جو اعزاز ٹیگور کو اپنے وقت میں ملا، وہ صلاح الدین پرویز کو اپنے وقت میں مل رہا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مشرق، مشرق میں اور مغرب، مغرب میں مر گیا تو یہ بالکل درست ہے مگر یہ تلاش بھی تو ہونی چاہئیے کہ کہیں تو کوئی زندہ رویہ، اجتماعی پرفارمینس میں نہ سہی، انفرادی پرفارمینس میں ہوگا۔ کہیں تو وہ زمین ہوگی جس کی صلاح الدین پرویز نے اپنی ایک نظم "گم کدے" میں کلپنا کی ہے:

یہ زمیں جو اک کویتا تھی کبھی
زندہ تھی کبھی
سینوں کی منڈیروں اور چھجّوں پہ
گنگناتی تھی کبھی
تہہ بہ تہہ اور دَم بہ دَم ریتوں کے جزیروں میں
دریا سا بناتی تھی کبھی
یہ زمیں اب رچ رہی ہے آنے والا کوئی فکشن
اَن کہا
اور
اَن بیتا ہوا

□

سید امین اشرف

ایک یادگار شام

کتابوں کا اجرا ایک رسم بن گئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے ادیب و شاعر "ذوقِ نغمہ" کی کمی محسوس کرنے لگے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے اردو افسانہ اور شاعری کو کیا فائدے پہنچے اور کیا نقصان ــــ یہ تو ادب کے پارکھ ہی بتائیں گے لیکن یہ سچ ہے کہ اس تحریک نے ہر ہر شہر میں انجمنیں بنوا دی تھیں جہاں ادیب بیٹھتے ــــ مضامین اور افسانے اور نظمیں پڑھتے اور ادبی مباحث میں حصہ لیتے ــــ اگر کسی پر خنجر چلتا تو سب تڑپ کر رہ جاتے تھے ــــ اس میں سردار جعفری اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی کوئی تخصیص نہ تھی ــــ لیکن اس کے بعد تو پھر ایسا لگتا ہے کہ مل بیٹھنے کا سارا سلسلہ ختم ہو گیا ــــ چنانچہ جب ہمیں مدیرانِ الفاظ کا دعوت نامہ ملا، کہ صلاح الدین پرویز کے ناول "سارے دن کا تھکا ہوا پرش" کی رسم اجرا ہے تو جی خوش ہو گیا کہ اس بہانے کچھ دیوانے مل بیٹھیں گے۔

یوں تو پچھلے ہفتے سے صلاح الدین پرویز کی علی گڑھ میں دھوم مچی ہوئی تھی خاص طور پر اس لیے بھی کہ "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین" نے انھیں ایک استقبالیہ دیا اور انھیں یونین کا لائف ممبر بنا کر ایک "اولڈ بوائے" کو وہ اعزاز دیا جو کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ یونین نے اپنے روایتی انداز میں ان پر پھولوں کی بارش کی ــــ اور یہ تقریب یادگار بن گئی۔ مختلف اقامتی ہالوں نے استقبالیہ جلسے کیے ــــ ویمنس کالج کی رنگین شام کو کون بھول سکتا ہے جہاں ان کی نعتِ رسول نے اس رنگین ماحول میں تقدس و طہارت کی رنگ آمیزی سے جاگتی جگمگاتی فضاؤں کو ایک پیکرِ نور میں ڈھال دیا۔ وائس چانسلر لاج میں صلاح الدین پرویز کی لوریوں نے بڑوں کا دل بھی موہ لیا۔ چنانچہ ادارۂ الفاظ کے دعوت نامے نے ایک موقع اور فراہم کیا۔ ہم بھی خراماں خراماں پہنچے۔ مئی کی شام ــــ مارچ کی شام محسوس ہو رہی تھی ــــ پھر اسد یار خاں صاحب کے مکان کے بالائی صحن کا پر فضا منظر ــــ شمشاد مارکیٹ کا روایتی شور و غل اس فضا میں ڈوب گیا تھا ــــ سید حامد صاحب ٹھیک وقت پر پہنچ چکے تھے اور ادارے کی مطبوعات کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس درمیان میں پروفیسر عتیق احمد صدیقی،

ڈاکٹر رضوان حسین، نسیم قریشی، ابن فرید، خواجہ مسعود علی ذوقی، اس۔ان۔شاہ، بزمی بھارتی آچکے تھے صلاح الدین پرویز اور آشفتہ چنگیزی اور غیاث الرحمٰن ذرا سی دیر بعد داخل ہوئے۔ پھر جیسے ہی بزم میں سید حامد داخل ہوئے ایسا لگا کہ چراغ جل گئے اور حاضرین کی تعداد سو تک پہنچ گئی ــــ ساڑھے چھے بجے حافظ عبدالخالق کی تلاوت کلام پاک کے ساتھ جلسے کا آغاز ہوا۔ الفاظ کے ایڈیٹر ڈاکٹر اطہر پرویز نے مہمانوں کا استقبال کیا ــــ شاید ہر ایک ڈاکٹر نورالحسن نقوی کو تلاش کر رہا تھا کیوں کہ ان دونوں دوستوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے ــــ یہ دونوں ہر کام میں برابر کے شریک ہیں ــــ برسوں سے علی گڑھ میں ان دونوں کی دوستی کے چرچے ہیں۔ اور جب یہ دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں تو گویا کہتے ہوئے ــــ

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ   نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

ورشاید انھیں علی گڑھ والوں پر اعتماد ہے جہاں اب ایسے تعلقات یقیناً قابلِ رشک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے کہ یہ دونوں مل کر اسی طرح اچھے اچھے کام کرتے رہیں ــــ ہاں تو ڈاکٹر نورالحسن کسی ضروری کام سے لکھنؤ گئے ہوئے تھے اور اطہر پرویز ٹرین کے منتظر تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ اگر اس وقت آئے تو سیدھے جلسہ گاہ میں پہنچیں گے۔ مگر افسوس کہ وہ بر وقت نہ پہنچ سکے اور اطہر پرویز اور اسدیار خاں نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ بہت کم ادیب ایسے دیکھے گئے ہیں جنھیں تحریر و تقریر میں یکساں مشق ہو۔ نہایت شستہ اور رنگ و حجن میں دھلی ہوئی زبان میں اپنی بارہ منٹ کی استقبالیہ تقریر اطہر پرویز لکھ کر لائے تھے، جسے انھوں نے اپنی موثر اور جوشیلی آواز میں بڑے آتار چڑھاؤ کے ساتھ پیش کیا۔ اگر وقت آجائے تو پرویز صاحب ۱۲ منٹ تو کیا ۱۲ گھنٹے بلا تکان تقریر کر سکتے ہیں۔ وہ جس کاوش اور عرق ریزی کے ساتھ کلاس میں پڑھاتے ہیں اسی طرح باتیں بھی کرتے ہیں ــــ "اک کھیل تقریر کا دریا مرے آگے"
اگر مکتبہ الفاظ اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کا یہ سلسلہ قایم رہا اور ایسے ادبی جلسے ہوتے رہے تو ادبی جلسوں میں "وحدتِ ساعت" کی روایت کا احیا کیا جا سکتا ہے۔ اطہر پرویز نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس کی بنیاد آج سے ۵۰ سال قبل جناب عبدالشہید خاں نے ڈالی تھی۔ انھوں نے واضح کیا کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اس وقت کتابوں کا کام شروع کیا جب مولوی اسمٰعیل کی ریڈریں ہماری روز افزوں ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر تھیں، اس ادارے نے بڑے پیمانے پر درسی کتابوں کی اشاعت کی تقسیم ملک کے بعد جب اردو زبان پر نازک وقت آیا تو اس ادارے نے نہایت جانفشانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ساری منزلیں طے کیں۔ عبدالشہید خاں صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے اسدیار خاں

صاحب کی قیادت میں ایجوکیشنل بک ہاؤس نے کروٹ لی۔ لیتھو کی طباعت کو خیرباد کہا اور اپنی تمام درسی کتابوں کو آفسٹ کی طباعت سے آراستہ کرنے کا قدم اٹھایا۔ ابتدائی درجوں سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعتوں کے لئے درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ امدادی کتب کی اشاعت کا بھی بیڑا اٹھایا۔ اطہر پرویز نے بتایا کہ آج اس ادارے کو صفِ اول کے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے اور نئے ادب کے ساتھ ساتھ کلاسکی ادب کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے اور ان کے خوبصورت اڈیشن شایع کئے گئے — پرویز صاحب نے بتایا کہ آج سے چھ سال قبل اس ادارے نے دوماہی "الفاظ" کا اجرا کیا۔ گذشتہ سال الفاظ نے اپنے ضخیم افسانہ نمبر شایع کئے جن کی ہندو پاک میں دھوم مچ گئی — ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مکتبہ الفاظ کی بیشتر کتابوں کو مختلف اکیڈمیوں نے انعامات سے نوازا اور نیشنل بک ٹرسٹ، اترپردیش اردو اکیڈمی اور بنگال اردو اکیڈمی نے بہترین طباعت کے انعامات بھی دیئے۔ اور آج اس ادارے سے کلام پاک شایع کیا گیا ہے اور صلاح الدین پرویز کے ناول کی رسم اجرا ہو رہی ہے۔ کلام پاک کی اشاعت اس ادارے کے لئے ایک فال نیک ہے۔

"سارے دن کا تھکا ہوا پرش" کا ذکر کرتے ہوئے اطہر پرویز نے کہا کہ صلاح الدین پرویز نے اردو شعر و فکشن کو ایک نئی آواز سے روشناس کرایا۔ ان کی زبان، ان کا لب ولہجہ روایتی زبان اور اسلوب سے مختلف ہے اور پڑھنے والوں کو چونکاتا اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے — گویا جلسہ کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ حاضرین چونکے — اور اس وقت اطہر پرویز نے آشفتہ چنگیزی کو دعوت دی کہ وہ صلاح الدین پرویز کے رفیق ہیں اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالیں گے۔ چنگیزی خود شاعر ہیں اور اپنی شاعری سے بہت پہلے اردو پڑھنے والوں کو چونکا چکے ہیں: "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"، پڑھ کر انھوں نے روشنی کا سارا رخ صلاح الدین پرویز کی طرف کر دیا اور ہم نے ان کے چہرے پر وہ معصومیت دیکھی جس کا ذکر سید حامد صاحب نے بعد میں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس خاکے نے کسی بحث کا دروازہ نہیں کھولا، کیوں کہ ہر چہرہ تائید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ جامعہ اردو کے رجسٹرار اشرف علی خاں بھی جو ہر جلسے میں سوالیہ نشان بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں وہ بھی ایک اک جملے اور ہر فقرے کی تائید کرتے نظر آرہے تھے۔

آشفتہ چنگیزی کی شیریں بیانی کے بعد اطہر پرویز صاحب نے صلاح الدین پرویز صاحب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی کہ وہ مکتبہ الفاظ کے مطبوعہ کلام پاک کی پہلی جلد سید حامد صاحب کو پیش کریں۔ سید حامد صاحب نے قرآن پاک کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اس کے بعد تالیوں کے درمیان

سید حامد صاحب نے "سارے دن کا تھکا ہوا پرش" کا پہلا نسخہ صلاح الدین پرویز صاحب کو پیش کیا۔
جس وقت سید حامد صاحب نے کلام پاک پر بوسہ دیا تھا موذن نے بروقت اذان دی ۔ اور ہر ایک کے دل میں یہ مصرع گونجا "تری آواز کے اور مدینے"۔ نوری قافلے مسجد کو چلا ـــــ
جب کہیں کوئی جلسہ ہوتا ہے تو سامعین میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں ۔ پڑھنے والے اہل منصب و انتظامیہ اور عام سامعین ـ لیکن اس میں ایک قسم اور شامل کر لیجئے یعنی عاشقانِ مطبخ ــ جن کے لئے ایک اک سکنڈ پہاڑ تھا کیوں کہ ہونٹوں اور پیالوں کے درمیان ایک منزل اور تھی ۔

نماز کے بعد سید حامد صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی اس موقع پر کچھ کہیں ــــ سید حامد کو جو لوگ جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ لفاظ اور لسان نہیں ــ بلکہ وہ تو لفظوں کو بڑی احتیاط سے خرچ کرتے ہیں ۔ وہ بات پیدا کرتے ہیں، بات سے بات نہیں نکالتے ۔ وہ شعلہ بیان مقرر نہیں ۔ ان کی زبان میں تلوار کی کاٹ نہیں بلکہ چاندنی کی شفافیت ، شبنم کی سی تازگی اور برگ گل کی نرمی ہے ۔ ان کا دل دردمند ہے ۔بعض مقررین کا شیوہ ہے کہ زبان پہلے چلتی ہے اور دماغ بعد میں ۔ سید صاحب کی تقریر میں زبان ، دل و دماغ کے مابین ایک خوبصورت توازن پایا جاتا ہے ۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے ۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ انسان ہیں ۔ سید صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں آج سے ۴۵ سال پہلے ایجوکیشنل بک ہاؤس کا بورڈ دیکھا تھا ۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ برابر ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہے اور اب اس کا شمار اردو کے بڑے اداروں میں ہے ۔
سید حامد صاحب نے صلاح الدین پرویز کی معصوم اور پرکشش شخصیت پر روشنی ڈالی ۔ مطالعہ کی وسعت ، معلومات اور علامت نگاری جیسی صلاحیتوں سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ صلاح الدین پرویز کی شخصیت کی چھاپ ان کی شاعری پر دیکھی جاسکتی ہے جو ان کی شخصیت کی طرح سادہ ، فطری اور معصوم ہے ۔ انھوں نے فرمایا کہ صلاح الدین پرویز کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کا بے جھجک اور بے محابا اظہار ہے ۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا من وعن اظہار کر دیتے ہیں ۔ اس کے باوجود ان کی شاعری خشک اور PROSAIC نہیں بلکہ نہایت لطیف اور شگفتہ ہے ۔ آشفتہ چنگیزی کے دلچسپ پرمغز اور معلوماتی خاکے کی تعریف کرتے ہوئے سید حامد نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ دوسرے اشخاص اور احباب اور اداروں کی طرح انھوں نے بھی صلاح الدین پرویز سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن یہ فائدہ ذاتی نہیں بلکہ یہ پہنچا ہے ان کے توسط سے مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزیز طلبا کو انھوں نے فرمایا کہ اس

مایوس کن اور مضمحل دور میں بھی جب اس ادارے کی بعض اقدار پامال ہو رہی ہیں، ایک بات جو اس کے ہونہار فرزندوں میں مشترک ہے وہ اس ادارے سے محبت ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ بحمد للہ اس ادارے کے لائق فرزند صلاح الدین پرویز میں یہ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کیوں کہ اس ادارہ اور اس کے طلبا کو جو فائدے صلاح الدین پرویز صاحب سے پہنچ رہے ہیں وہ دراصل ادارے سے ان کی شدید محبت کا ثمرہ ہیں۔

نعتیہ شاعری کو سید حامد نے ایک نازک مرحلے سے تعبیر کیا اور کہا کہ یہاں اعتدال اور احتیاط پسندی ضروری ہے، مبادا جوشِ عشق میں کلام شرعی حدود سے متجاوز ہو جائے ــــ با خدا دیوانہ باش وبا محمد ہوشیار۔ سید حامد نے پرویز کی نعتیہ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ بڑی خوبصورتی سے اس فرض سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے امید ظاہر کی کہ صلاح الدین پرویز کی ناول نگاری اور شاعری بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نئے اسالیب، نئے انداز اور نئی نئی ہیئتوں کی تلاش سے گزرتے ہوئے ادب کو نئی اقدار سے روشناس کرے گی اور ان کی تخلیقات مستقبلِ قریب میں منارۂ نور کی طرح روشن ہوں گی۔

وائس چانسلر صاحب کی تقریر کے بعد ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ہونٹوں اور پیالیوں کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو چکا تھا۔ محفل برخاست ہوئی اور پروانے شمع سے اٹھ کر جا رہے تھے۔ اطلاع یہ ہے کہ اس کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں جلسے ہوتے رہے لیکن خوبصورت شام رات میں ڈھل گئی۔ □

یاد آوری کا شکریہ

● تازہ ترین (جنوری، فروری ۸۲ء) الفاظ ملا۔ آپ ہمیشہ اچھی تحریروں کو جمع کرتے ہیں۔ اس مرتبہ پرویز (صلاح الدین) پر مضامین پڑھ کر ان کے بھی قریب ہونے کا موقع ملا۔ آپ ہر بار ایک گوشہ بنا کر خوب EXAUSTIVE جائزہ لیتے ہیں۔ البتہ پرویز کے گوشہ میں ان کی نثر کی کمی محسوس ہوئی۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ پرویز مختصر نثر نہیں لکھتے۔ پھر بھی ان کے کسی زیر طبع/غیر مطبوعہ ناول ہی کا کوئی حصہ پڑھنے کو مل جاتا۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تشریف لائے تھے۔ خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کا قیام یہاں لاہور میں بہت مختصر تھا — صرف تین دن۔ سنا ہے جوگندر پال بھی آئے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ ایک آدھ روز میں میں خود جوگندر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ البتہ افتخار امام صدیقی صاحب (شاعر۔ بمبئی) سے کل ہی ملاقات ہوئی۔ خوب لطف رہا۔

(ڈاکٹر) انور سجاد ، لاہور

● جنوری، فروری ۸۲ء کا شمارہ ابھی ابھی گیا میں دستیاب ہو سکا ہے۔ صلاح الدین پرویز کی تصویر سرورق پر دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ کاغذ کا رنگ تصویر کے LOOK سے ہم آہنگ نظر آیا۔ آپ لوگوں کے انتخاب اور ذوق جمالیات کی داد نہ دینا حق تلفی ہوگی۔ پرویز کی ادبی کاوشوں کا بھرپور جائزہ لے کر ادارہ الفاظ نے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔

م۔ ق۔ خان، گیا

● الفاظ کا صلاح الدین پرویز نمبر میرے ہاتھوں میں ہے۔ مضمون ایک سے ایک اُبر ہے۔ خوبصورت افسانے اور پر معنی غزلیں پڑھ کر بڑا اطمینان ہوا۔

خوش دیو مینی ، پونچھ

● آپ کا خط اور الفاظ کا تازہ شمارہ ساتھ ساتھ ملے۔ شکر گزار ہوں۔ یہ پرچہ آپ نے خاصا جلد نکال دیا، مرحبا۔ ابھی پورا پڑھا نہیں، یہ خط دفتر سے فوری طور پر لکھ رہا ہوں۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار رہتا ہوں اور آپ کا مداح ہوں۔

گوپی چند نارنگ، نئی دہلی

● الفاظ کا تازہ شمارہ نظروں سے گذرا۔ مجھے اس شاعر کی جستجو ہے جو اس غیر متحرک، غیر تخلیقی اور مشینوں کے فریب میں گھرے ہوئے نئے معاشرے کو آزاد و ہمہ گیر معاشرے کی تصویر

"یہ ہی (پرویز) جو اپنی تخلیق کے محرک سے اس عہد کی بے حسی و بے بسی سے ماورا اس وجود کی داستاں سنا سکتا ہے جو خداؤں کا مقرب ہو اور زمین پر ایک مکمل انسان کی طرح سانس لیتا ہو۔" میں سمجھتی ہوں کہ اس ریگ ریگ معاشرے میں صدیوں کی آبلہ پائی کے بعد ہی کوئی انسان اس منزل کو پا سکتا ہے جو مغرب کی داستان سنا سکے۔ صلاح الدین پرویز تو ابھی راہ راہ اٹھاتا، انھیں پھول سمجھ کر تولتا، اپنے دامن میں بھرتا چلا جا رہا ہے۔ اس انسان کی اسی معصومیت کو سامنے رکھتے ہوئے محترم گوپی چند نارنگ، پرویز کو اردو کے معاشرے میں اس راہ پر پاتے ہیں جہاں انسانی ذہن اپنی روحانی سربلندی وسرشاری کا احساس کر سکے منطقی موضوعات سے پہلے دامن بچا سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ صلاح الدین پرویز اس مادی و مشینی دور کا ایک سادہ لوح عابد نظر آتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے کہہ رہا ہو ——

خدا
تو ہمارے لئے عاجزی سے بڑا
دوستی سے ذرا چھوٹے قد کا نبی بھیج دے
یہ ضروری نہیں

پرویز کی شاعری اور شخصیت کو اس کی بے پناہ دولت سے ہم آگیں نہ کیا جائے تو پھر یہ شاعر اور فن کار اردو شاعری و ادب کی آبرو ہی نہیں معصومیت و پاکیزگی کا یقیناً دعویدار ہو سکتا ہے ..."

الفاظ کے نومبر، دسمبر ۱۸۱ء اور جنوری، فروری ۸۲ء کے دونوں شمارے اور ان سے قبل افسانہ کے شمارے میں نے دیکھے ہیں۔ یہ شمارے جس انفرادیت کے حامل ہیں، جن خصوصیات کے ضامن ہیں اگر لکھنے لگوں تو پھر مجھے ڈر ہے کہ کہیں مادی دور کا مادہ پرست انداز نہ سمجھ بیٹھیں۔ بہر کیف! مبارک ہیں وہ اذہان اور ہاتھ جنھوں نے الفاظ کے سہارے اردو ادب کے ایوانوں کو سجا اور سنوار کر رکھا ہے۔

صبوحی طارق، رانچی

● الفاظ کی طرف سے بہت پہلے مجھے ایک خط ملا تھا کہ اسے بند کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ پرچہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں پچھلے ہفتے بمبئی گیا تھا وہاں الفاظ موجود —— جی خوش ہو گیا کہ جسے ہم مرحوم سمجھ چکے تھے وہ ابھی زندہ ہے —— یہ صلاح الدین پرویز بھی غضب کے آدمی ہیں۔ نظم ونثر دونوں پر اپنے اثرات ثبت کرنے میں پتہ نہیں کیا کیا لکھ رکھا ہے۔ "نمرتا" نے الگ ہنگامہ مچا رکھا ہے —— بہر حال 'الفاظ' کی حیات دراصل ہماری زندگی ہے۔ کوئی تو سلیقہ کا پرچہ ہو —— ان دنوں ہر طرف اچھے پرچے کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

رؤف خیر، حیدر آباد

● جنوری، فروری ۸۲ء کا شمارہ ملا۔ میں لکھنے والے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا یوں سمجھئے کہ قاری ہوں —— اور جدید ادب کا قاری —— اور جدید ادب کو پڑھنے کے سلسلے میں محنت سے گریز نہیں کرتا اس لئے شاید میں عام قاری سے مختلف ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ بتاؤں کہ مجھے ہر اعتبار سے آپ کا یہ شمارہ بہت

اچھا لگا۔ آپ نے صلاح الدین پرویز کا بڑا بھرپور تعارف کرایا۔ اس شمارے نے مجھے صلاح الدین پرویز کو سمجھنے میں بڑی مدد دی، ورنہ شاید میں بھی ان کے بارے میں بدگمان ہوتا۔ اس گوشے میں دو تنقیدی مضامین ہیں اور تین شخصیت پر ــــ محمود ہاشمی اور نارنگ نے ان کی شاعری پر بڑے اچھے مضامین لکھے۔ چنانچہ میں نے "دھوپ سمندر سایہ" کی ایک جلد خریدی اور خوب خوب لطف اندوز ہوا۔ اس غیر معمولی شعریت میں ڈوب گیا۔ آپ نے نظموں کے انتخاب میں بخل سے کام لیا۔ خیر مجھے تو یہ فائدہ پہنچا کہ میں نے پورا مجموعہ پڑھ ڈالا۔

آشفتہ چنگیزی نے بڑا معرکے کا خاکہ لکھا ہے۔ مجھے خاکے پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ اور خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں کے ــــ شاید یہ وجہ بھی ہے کہ مجھے الفاظ پسند ہے کہ اس میں ہر بار خاکے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مضامین، افسانے اور نظمیں غزلیں تو ہر رسالے میں ملتے ہیں لیکن خاکے تو شاذ ہی ملتے ہیں۔ ثریا سعید کا خاکہ ـ عورت کے دردمند دل اور حساس شخصیت کا آئینہ دار ــــ مبارک ہو آشفتہ چنگیزی کو آپ نے خاکہ نہیں لکھا ادب کی تخلیق کی ہے۔ جدید افسانے نے کردار نگاری کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ آپ نے تو کمال کیا ہے کہ صلاح الدین پرویز کو دیکھنے اور ملنے کا جی چاہنے لگا۔ ہمارے یہاں کشتوں کے تو ڈھیر لگے ہیں۔ لیکن قسمت والوں کو چنگیزی ملتا ہے۔ یہاں میں خاص طور پر شہریار صاحب کے خاکے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ــــ انھوں نے اپنی شخصیت کے وسیلے سے صلاح الدین پرویز کا تعارف کرانا چاہا ہے اور اس APPROACH نے ان کے خاکے کا مزا خراب کر دیا ہے ــــ صلاح الدین پرویز کا تعارف کراتے ہوئے وہ ذرا سی دیر کو اپنے آپ کو بھول جاتے تو لطف آ جاتا۔ ان کا اندازِ بیان خاکہ نگار کا نہیں ہے بلکہ وہ تو اس خاکے میں PATRONISE کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ استاد ہونے کی کمزوری ہے کیوں اڈیٹر صاحب ہے نا ــــ کاش یہ خاکہ اس شمارے میں چھپتا جس کے سرورق پر شہریار کی دھندلی تصویر ہے ــــ میں نے اس گوشہ مضامین کے ساتھ شہریار کا یہ خاکہ دوبارہ پڑھا۔ ذرا آپ بھی پڑھئے ــــ لیکن آپ تو ان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ آپ تو عام قاری کی صلاحیت سے محروم ہوں گے۔ معاف کیجئے گا میں ذرا سخت بات کہہ گیا۔

ادب میں جب کسی کی غربت کی باتیں نہیں کی جاتیں، ان کا شجرہ حسب ونسب نہیں دیکھا جاتا تو پھر بیچارے صلاح الدین پرویز کے ساتھ ایسا کیوں روا رکھا ہے۔ محمد علوی اگر دولت مند ہیں تو اس میں ان کا کیا قصور ــــ

آپ ہرگز مت سمجھئے گا کہ میں عیب جو ہوں ــــ مجھے تو "الفاظ" پڑھ کر بڑا مزا آیا۔ اسی لئے پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

نسیم احمد نظامی، بمبئی

● "الفاظ" کے دونوں شمارے افسانہ نمبر اول دوم صحیح سلامت مل گئے ہیں۔ دونوں شمارے نہایت اعلیٰ ہیں اور آپ لوگ جس محنت سے پرچے کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اس کی جتنی داد

دی جائے کم ہے۔

میں بھی علی گڑھ کا ہی ہوں۔ ۱۹۵۴ء تک وہیں تھا۔ مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم میرے والد ہیں۔

محمد عمر میمن، میڈیسن، WISCONSIN (U.S.A.)

● ہندوستان سے واپسی پر الفاظ کے دو شمارے اپنے ساتھ کراچی لائی تھی۔ اتنا اچھا جریدہ نکالنے پر میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ شمارہ دسمبر ۸۱ء جو کہ انشا جی کے بارے میں تھا اس کے اداریہ میں اردو کے بارے میں پڑھا۔ واقعی یہ اردو کی سخت جانی ہی ہے جس کے باعث آج ہندوستان میں اردو اپنی جڑیں مضبوط کر رہی ہے۔ اس شمارے میں ابن انشا کی نظمیں، غزلیں اور ان پر جو مضامین تھے وہ بہت ہی عمدہ تھے۔ اس کے علاوہ سلمٰی صدیقی کی آپ بیتی اور ایس۔ پی۔ شدھیش کی جگ بیتی بہت پسند آئی۔

جنوری، فروری ۸۲ شمارہ میں صلاح الدین پرویز کے بارے میں شہریار کا خالص ذاتی تاثر پسند آیا۔ اس کے علاوہ قتیل شفائی کی غزلیں، جوش ملیح آبادی کی "تلاش" اور افسانوں میں "پرفگر گھن" اور "کٹے ہوئے وقت کا ایک لمحہ" بہت پسند آئے۔ امید ہے کہ جوش اور فراق گورکھپوری کو جلد ہی "الفاظ" میں جگہ ملے گی۔

روحی قریشی، کراچی

تفہیم

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔
دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ)

شعلۂ نیم سوز	فضا ابن فیضی	فیضی پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن (یو-پی)	۴۰/..
جزیرہ	شمیم رومانی	مکتبہ اربابِ قلم، کراچی	۲۵/..
پیراہن	قتیل شفائی	ماورا پبلشرز، لاہور	۲۵/..
پہلے کرت کا بوجھ	مغنی تبسم	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۲/..
کرب زار	تبسم رضوانی	مکتبہ احساسات، لاہور	۱۸/..
نمو کی آگ	اکبر حیدرآبادی	سیما پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰/..
سبزۂ گفتار	ڈاکٹر یعقوب عامر	عامر پبلی کیشنز،	۲۰/..
واو بین	شجاع خاور	قصر اردو، اردو بازار، دہلی	۲۵/..
افکارِ پریشاں	اثر انصاری	نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن	۱۰/..
اور دائرے	علی گرامی	قیمت ۵/..	

اس وقت میرے سامنے مختلف شعرا کے ۹ مجموعے ہیں۔ ان میں بزرگ بھی ہیں اور نوجوان بھی، ہندوستانی بھی ہیں، پاکستانی بھی۔ ان میں بعضوں کے یہاں روایت کا احترام ہے اور بعض اپنے نئے خیالات اور جدید اسلوب کی حیثیت سے منفرد بھی ہیں۔ ان میں ایسی آوازیں بھی ہیں جن سے قارئین مانوس ہیں اور ایسی آوازیں جو اپنے نئے پن سے پہچانی جا سکتی ہیں۔

شعلۂ نیم سوز فضا ابن فیضی کا نیا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "سفینۂ زرگل" شایع ہو کر ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ فضا کی شاعری میں قدیم و جدید کا ایسا امتزاج ہے جس میں روایت اور جدت کی جھلکیاں کچھ اس طرح نظر آتی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا آسان نہیں۔ وہ ترقی پسند بھی ہیں اور جدید بھی۔ ان کا کلام اس امر کا ثبوت

ہے کہ ترقی پسند خیالات کو نئے فکری سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر کے مسائل فضا ابن فیضی کا موضوع ہیں۔ وہ فردکی باتیں کرتے ہیں جن میں تہذیبوں کے عکس جھلملاتے ہیں۔ ان کا مشرقی ادبیات وعلوم کا مطالعہ وسیع ہے اور اس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں ہیں ـــــ فضا بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو میں اقبالؔ اور جوشؔ کی روایات کو اپنایا ہے۔ ان کی نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پابند نظم کے سانچے میں بھی نئے خیالات کس طرح سما سکتے ہیں۔ "شعلۂ نیم سوز" اردو شعری ادب میں ایک پسندیدہ اضافہ ہے۔ خوبصورت طباعت اور گٹ اپ نے بڑی خوبصورتی سے ظاہر و باطن کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔

جزیرہ شبنم رومانی کا خوبصورت مجموعہ ہے ـــــ مختصر مگر جامع۔ غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ـــــ شبنم کے یہاں جدید شعرا کی طرح تنہائی کا حصار نہیں۔ اس حصار کے دریافت کی کوشش ـــــ اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کا عمل ـــــ ان کی لفظیات مروجہ بھی نہیں اور نہ ان میں بلاوجہ افکار کو چھپانے کی کوشش ہے اور یہ اس لئے کہ وہ زبان و بیان کے سامنے عاجز نہیں ہیں۔ بقول ممتاز نقاد محمد علی صدیقی "ان کی شاعری اظہارِ ذات اور حصولِ خودی کا ایسا وظیفہ ہے جو وقتی ابال اور فیشنوں کی چمک دمک قبول نہیں کرتی ـــــ اور اسی لئے ان کے یہاں روایت کے ساتھ بہت لطیف اور واقعیت پسندانہ سلوک ملتا ہے۔ وہ ماضی و حال میں کسی ایک کے ہو کر رہ جانے کے بجائے اپنی شاعری میں دونوں زمانوں اور حالتوں کے مابین ایک ایسے لمحۂ خود آگہی کی جانب سے بڑھتے ہیں جو بالآخر ہم عصری حسیت ہی کا حصہ بن جاتا ہے۔"

شبنم رومانی بلاشبہ ہمارے عہد کے سچے شاعر ہیں۔ وہ کائنات کو متحیر آنکھوں اور بچے کے تازہ ذہن سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی نے ان کی شاعری میں رنگ و آہنگ اور افکار میں وزن پیدا کر دیا ہے۔ شبنم رومانی کی آزاد نظموں میں بھی حسن ہے جو لفظوں کے معانی اور اس کی موسیقی سے ظاہر ہوتا ہے۔

کہیں غزل
کہیں کنول
کہیں رباب و چنگ ہیں
کہیں بلا کشانِ زندگی حریف سنگ ہیں
یہ سب لہو کے رنگ ہیں

(بہیہ)

پیراہن قتیل شفائی کا نیا مجموعۂ کلام ہے جو شبنم رومانی کے مجموعے کی طرح طباعتی حسن سے بھی مالا مال ہے۔ قتیل کا شمار اردو کے مقبول ترین شاعروں میں ہوتا ہے اور اس مقبولیت میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحدیں بھی حائل نہیں۔ قتیل کے یہاں کسی قسم کی بناوٹ نہیں ہے۔ وہ نہ

ترقی پسندی کا اعلان کرتے ہیں اور نہ جدت کے اوہام میں گرفتار ہیں ۔ وہ شاعر ہیں اور شعر کہتے وقت وہ صرف یہ کہ نظریات کے ہیر پھیر سے آزاد ہوتے ہیں بلکہ نقادوں کو بھی بھول جاتے ہیں ۔ ان کی اپنی ذاتی لفظیات بھی نہیں بلکہ وہ عام اردو والوں کی لفظیات سے کام چلاتے ہیں ۔ چنانچہ دل سے اٹھتے اور دل پر گرتے ہیں اور اسی نے ان کے پڑھنے والوں کے حلقے کو وسیع کر دیا ہے ۔ اس میں ایک خطرہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر نرا عوامی ہو کر رہ جاتا ہے لیکن قتیل کی شاعری میں افکار کا ایسا خزانہ ہے جو انھیں عوام و خواص دونوں کی محفلوں کی زینت بنانے کے لئے کافی ہے ۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے نت نئے تجربے بھی ہیں اور روایت کا احترام بھی ــــ

بظاہر بزم آرائی بہت ہے ــــ بھرے شہروں میں تنہائی بہت ہے
پرانے جوہڑوں کا ہے یہ عالم ــــ کہ پانی کم ہے اور کائی بہت ہے
محبت کی کہانی منفرد بھی ــــ مگر دنیا نے دہرائی بہت ہے

قتیل کی غزل میں ایک خاص قسم کی تازگی ہے اور مجموعے کی ۱۷ غزلیں اس کی گواہ ہیں ۔ اردو غزل کے خزانے کو مالامال کرنے میں قتیل کے نرم لہجے، مترنم آہنگ اور ان کے حسی تجربے کو بڑا دخل ہے اور اس عمل میں ان کے قارئین ہمیشہ ان کے ساتھ رہے ہیں ۔ "پیراہن" اردو غزل میں ایک اضافہ ہے ۔

پہلی کرن کا بوجھ اردو کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر مغنی تبسم کا مجموعۂ کلام ہے ۔ ان کے یہاں تنوع ہے ۔ نظموں میں بھی اور غزلوں میں بھی ۔ مغنی تبسم کی لفظیات "جدیدیت" سے مستعار ہے ۔ لیکن ان کے یہاں محض ابہام ہی میں حسن کی تلاش کارفرما نہیں ــــ روایت کی جھلک بھی ملتی ہے اور تجربے کی مہک بھی ۔ دس مختصر نظمیں ــــ وہ پھول ہیں جن کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ میں بسنے لگتی ہے ۔ انھیں پابند شعر گوئی پر پوری قدرت حاصل ہے اور شاید اسی قدرت کی وجہ سے ان کی آزاد نظموں میں ذرا بھی کھردرا پن محسوس نہیں ہوتا ۔

ان کی غزلیں بھرپور ہیں اور ذرا بھی ہیئت کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوتا ؎

ترس گیا ہوں میں سورج کی روشنی کے لئے ــــ وہ دی ہے سایۂ دیوار نے سزا مجھ کو

مغنی تبسم کی نثری نظموں میں شاعری کے تمام اجزائے ترکیبی ملتے ہیں اور ان کو پڑھتے وقت ہم ان تمام مباحث کو فراموش کر دیتے ہیں جو نقادوں کے دماغ کے پروردہ ہیں ۔ تجربے، ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں لیکن یہاں ہمدردی کی چنداں ضرورت نہیں ۔ البتہ اگر قلم کو بے رحمی کی نکیلی دھار سے بچایا جائے تو ہمارے نقاد ان نظموں میں بھی وہ سب کچھ پائیں گے جن سے افکار کے دریچے کھلتے ہیں ۔

امید ہے کہ یہ مجموعہ اپنے تنوع کی بنا پر ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا ۔

کرب زار تبسم رضوانی کی ۴۲ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ رضوانی بڑے پرگو شاعر ہیں۔ پرگو اس لئے بھی کہ زندگی بھرپور گزار رہے ہیں۔ جسم و روح دونوں کے معالج ہیں۔ پچھلی دہائی میں غزل میں جتنی وسعت ہوئی ہے، شاید اس سے پہلے اسے ایسا موقع نہیں ملا۔ تبسم رضوانی کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں غیر معمولی تنوع ہے اور جو شاید فکر و عمل کا سرچشمہ ہے

فردِ منکر نکیر لگتے ہیں   قبر لگتا ہے اپنا گھر مجھ کو

آراستہ ہے معر کا بازار دور تک   لیکن نہیں ہے کوئی خریدار دور تک

میں وزیر آغا کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ تبسم رضوانی نے روایت کے استحکام سے رشتہ جوڑا ہے نہ کہ تجربے کے اضطراب سے اور یوں انھوں نے تجربات کی تخلیق مکرر کر کے اپنی روایت کے دھاگے میں پرو دیا ہے۔ ان کے یہاں معاشرے کا مشاہدہ بھی ہے اور ذات کے انکشاف کا عمل بھی اور ان دونوں کا امتزاج ان کی غزلوں کو تابدار کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے آنے والے مجموعے میرے خیال کی نہ صرف تصدیق کریں گے بلکہ اس قول کی صداقت پر بھی اپنی مہر ثبت کریں گے۔

نمو کی آگ اکبر حیدر آبادی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اکبر انگلستان میں مقیم ہیں اس لئے ان کی شاعری سے برِ عظیم کے ادبی حلقے کم آشنا ہیں۔ قیامِ انگلستان نے ان کی فکر کو یقیناً متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پہ شاعری میں مشرق و مغرب کا حسین امتزاج ہے اور یہ حسن اس وقت اور زیادہ مکمل ہو جاتا ہے کہ جب اس کا علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہوتا اور اس کی وجہ وہ داخلی تاثر ہے جو شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی "ان کی شاعری میں روحانی کشش اور کشاکش نمایاں ہے۔ جو ایسے لوگوں کی تقدیر ہے جو غیر ممالک میں ہیں اور اجنبی ماحول میں اپنی اس داخلی زندگی کو قایم رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جسے وہ اپنے وطن سے لے کر آئے ہیں۔ اس کیفیت کو فاروقی صوفیوں کی اصطلاح "سفر در وطن" سے تعبیر کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ اکبر حیدر آبادی کی ۱۵ غزلوں، ۲۶ نظموں اور ۱۲ رباعیات پر مشتمل ہے — اور ان سب میں تجربوں کا احساسِ اشتراک ہے اور اس نے ان کی غزلوں میں نیا پن پیدا کر دیا ہے ؎

تشنہ روحیں تشنہ پیکر ہر طرف   آ گئے کس پیاس کے صحرا میں ہم

اپنا ہی تو ہے شہکارِ عمل تہذیب کا یہ زنداں اکبر   ہم آج ہیں شہروں کے قیدی کل تک آوارہ صحرا تھے

ہر موڑ پہ اک دعوتِ نظارہ بھی لیکن   اپنی ہی طرف اپنی انا لے گئی ہم کو

نہ صداؤں کا ہے وطن کوئی نہ ہواؤں کا ہے کوئی ختن   ہمیں ہر روش، ہمیں ہر جہت نہ جنوب ہم نہ شمال ہم

اپنی نظم "کورچشم" میں اکبر لکھتے ہیں:

سچ کے ہم نے [illegible]

کر کے تہہ چاندنی راتوں کی روپہلی چادر
اک کڑی دھوپ میں آنکلے ہیں

اکبر ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

رفتار ہوا کی تیز ہوتی ہی گئی — ہر لہر سفینے کو ڈبوتی ہی گئی
رخشندہ تھا جس سے زندگی کا چہرہ — ذات اپنی وہ آب کھوتی ہی گئی

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ ہندوستان اور پاکستان میں بڑے شوق سے پڑھا جائے گا اور اس کی پذیرائی ہوگی۔

سبزۂ گفتار ڈاکٹر یعقوب عامر کا مجموعۂ غزلیات ہے۔ عامر کی غزلوں میں کعبہ اور کلیسا آگے پیچھے ہے۔ ایک طرف زندگی کے اجتماعی تجربے اپنے جوہر دکھا رہے ہیں تو دوسری طرف فرد کی اپنی ذات کا انکشاف واحساس صاف طور پر جھلک دکھا رہا ہے۔ جہاں معاشرے کا ظلم ہے تو دوسری جانب تقدیر کا جبر بھی، اور ان دونوں نے مل کر یعقوب عامر کی غزلوں کا خمیر تیار کیا ہے کہ شعر پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بات بھی ہمارے دل میں ہے ؎

وہی ہم ہیں، وہی موسم، وہی گھر — مگر رونق نہیں انگنائیوں میں
مرے گھر کی روشنی اتنی کہاں — اور بھی کچھ گھر جلے ہیں دوستو
وہ قصے جو سنتے تھے بزرگوں کی زباں سے — جب ہم پہ نہ گزرے تھے تو افسانے لگے تھے
نہ اختیار کی باتیں کرو رعونت سے — ہمیں خبر ہے کہاں جاکے ہاتھ جوڑو گے

عامر کی غزل، اس کی اپنی شخصیت اور اپنے فکر وعمل کا حاصل ہے۔ بقول فاروقی ان کے یہاں داخلی وخارجی دونوں دنیاؤں کا براہ راست تجربہ بھی ہے۔ خلوص کو میں فکر شعر کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور عامر کے یہاں کوئی چیز مستعار نہیں — سبزۂ گفتار میں سب کچھ یعقوب عامر کا اپنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ شوق سے پڑھا جائے گا۔

شجاع خاور کا مجموعہ **وادین** ابھی حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ خاور بقول خود تیسری دنیا کے شاعر ہیں۔ میں تو شاعری کو اس طرح خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں۔ نقاد اپنی سہولت کے لئے یہ تقسیم کرتے رہتے ہیں لیکن یہ کام خود شاعر نہیں کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ کرنا بھی نہیں چاہئے۔ میں نے شجاع خاور کی "ڈیڑھ بات" پڑھنے کے بعد ان کے کلام کا مطالعہ کیا۔ مجھے ان میں سماجی شعور اور اظہارِ ذات کا نہ کہیں تضاد نظر آیا اور نہ اس سے بچنے کی کوشش — خاور کی غزلیں صاف ستھری غزلیں ہیں۔ ان میں نہ معاشرے سے جی چرانے کی کوئی شعوری کوشش ہے اور نہ اپنی ذات سے پہلو تہی نمایاں ہے شجاع خاور نے اپنے تجربوں کو زبان دے دی ہے اور ہمیں اس میں معاشرتی تجربے نظر آتے ہیں ؎

تنہائی کا اک اور مزا لوٹ رہا ہوں　　مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں
کٹ کے رہ جاؤ گے سب ہم سفروں سے تم بھی　　اس لئے کوئی نئی راہ نکالا نہ کرو

قادر کی غزلوں میں ایک نیا پن ہے — ایک نیا لہجہ اور سوچنے کا اپنا انداز ہے۔ ان میں پختگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ہر اعتبار سے "وادین" قارئین کی توجہ کا مستحق ہے۔

افکارِ پریشاں اثر انصاری کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۵۵ء سے بعد کی غزلیں شامل ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ ان کے کلام کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اثر صاحب کے یہاں بڑی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ان کا اپنا لب و لہجہ ہے — اثر کے یہاں روحِ عصر کی جھلک نمایاں ہونے کے باوصف غزل کے مزاج سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ اور بقول احتشام صاحب "داخلیت، خارجیت کے انفعالی روپ میں" دیکھی جا سکتی ہے۔ کہیں کہیں ایک درد کی کسک بھی ہے اور اپنے عہد کی رمز شناسی بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نبھ سکی نہ ہم سے تو رسمِ دوستی تنہا　　کیسے کاٹ لیتے ہیں لوگ زندگی تنہا
صورتیں فرشتوں کی خصلتیں درندوں کی　　یہ صفت بھی رکھتا ہے صرف آدمی تنہا
بکھیر اپنے تبسم کی روشنی اے دوست　　ستارے ٹانک دے کچھ رات کی قباؤں میں
تیرے وعدوں کی صداقت کہیں مجروح نہ ہو　　میں نے ہر بات تری سچ کے برابر جانا
اس دورِ پر آشوب کی تاریخ بدل دو　　اس دور میں انسانوں کے کردار جلے ہیں

اثر کی بعد کی غزلوں میں رچاؤ بھی ہے اور پختگی بھی — اور وہ برابر لکھ رہے ہیں، حالانکہ ان کا اپنا خیال ہے کہ جوانی کے جذبات سرد پڑتے جا رہے ہیں لیکن تجربوں کے شعور نے یقیناً ہر کمی کی تلافی کر دی ہے ؎

چھلک اٹھا ہے مرا پیمانۂ حیات مگر　　وہ تشنگی ہے کہ بجھتی نہیں شرابوں سے

دائرے مرتبہ اس۔ ان۔ شاہ، منظور ہاشمی، طارق چھتاری اور اسعد بدایونی۔
شمارہ نمبر ۲

دائرے کا یہ دوسرا شمارہ بہت دنوں کی تاخیر سے شایع ہوا لیکن جب سامنے آیا تو سارے گلے شکوے مٹ گئے۔ "گوشۂ صلاح الدین پرویز" کے علاوہ سلیم احمد، سلام بن رزاق، عبدالمغنی، خالدہ حسین، جوگندر پال، شمیم صادقہ، زاہدہ حنا، بیگ احساس، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، جذبی، منظور ہاشمی، آشفتہ چنگیزی، عبداللہ کمال، وزیر آغا، بلراج کومل، زاہدہ زیدی، ابن فرید اور اطہر پرویز کی تحریریں اس شمارے میں شامل ہیں۔ صلاح الدین پرویز کے گوشہ میں جو لوگ نظر آ رہے ہیں ان میں آل احمد سرور

دیویندر اسر، سلیم احمد، آشفتہ چنگیزی ہیں ۔ ان حضرات نے اپنے اپنے انداز سے صلاح الدین پرویز کی شخصیت اور فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے ۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں ـــــ " صلاح الدین پرویز اپنی تجرباتی شاعری کی معنویت کی وجہ سے ادبی حلقوں میں امتیازی جگہ پیدا کر چکے ہیں ـــ پرویز لفظ کے لاتعداد امکانات کو برتنا جانتے ہیں ۔ ان کی وجہ سے ہماری زبان کے لوچ اور رس میں اضافہ ہوا ہے "۔

اردو شاعری اور فکشن میں صلاح الدین پرویز کی ایک منفرد آواز ہے اور دائرے کے ۵۲ صفحات اس کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔

آشفتہ چنگیزی کا رپورتاژ " ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق " علی گڑھ اور دلّی کی کہانی ہے جو اس سفر میں انھوں نے سنی ، سمجھی اور سنائی ـــ چنگیزی شاعر ہیں لیکن انسانوں کے سینے کے اندر جھانکنے کے انداز سے واقف ہیں ۔ اس لئے ان کے رپورتاژ ہوں یا خاکے ـــ انسانوں کے پیکر صاف طور پر جسم و جان کے ساتھ نظر آتے ہیں اور ان کی دروں بینی کی صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں ۔

اس مجموعے کی تمام تخلیقات منتخب ہیں اور مرتبین کی دیدہ ریزی کا پتہ دیتی ہیں ۔

اس مجموعے میں خاصے کی چیز اس کا اداریہ ہے " ایک اہم بات " جس میں طارق چھتاری نے اردو رسم خط کو آسان بنانے کی تجویز پیش کی ہے جس پر اداریہ میں ہم اظہار خیال کر رہے ہیں ۔ امید ہے کہ قارئین اس مسئلے پر غور کریں گے ۔ □

ـــــ اطہر پرویز


بہارِ نو بے بی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
مشہور اور پیٹنٹ دوائیں

FORM IV *(See Rule 8)*

1 Place of publication — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
2 Periodicity of its publication — دو ماہی
3 Printer's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
4 Publisher's Name — اسد یار خاں
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
5 Editor's Name — اطہر پرویز
(Whether citizen of India?) — ہندوستانی
Address — ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
6 Names and address of individuals who own the newspapers and partners or shareholders holding more than one percent of the total capital.

اسد یار خاں (مالک)، ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

I, ASAD YAR KHAN, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Dated 1-3-82 — *Signature of Publisher*
Asad Yar Khan


۷۰ سال سے
زیادہ مدت سے
سب کا من پسند
شربت
شربت رُوح افزا ۷۰ سال سے زیادہ مدت سے گرمی کے
دنوں میں سب کو ٹھنڈک اور تراوٹ پہنچاتا آرہا ہے۔
شربت رُوح افزا بدن کو قدرتی تازگی دینے والی
سو۱ جڑی بوٹیوں اور پھولوں پھلوں کے
خالص رس سے بنتا ہے۔ یہ پیاس ہی نہیں بجھاتا بلکہ
آپ کے جسم کو گرمی کا
مقابلہ کرنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔
اِسے آپ چینی کی جگہ ٹھنڈے پانی،
دودھ، لسی اور آئس کریم میں ڈالیے اور
بھرپور فرحت بخش لذت حاصل کیجیے۔
ہمدرد
شربت
رُوح افزا
'کیا لاجواب چیز ہے'
ROOHAFZA



ڈاکٹر اطہر پرویز، پروفیسر عتیق احمد صدیقی — صلاح الدین پرویز صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔
داہنی طرف خالد علی خاں مینجر مکتبہ الفاظ کو دیکھا جا سکتا ہے۔



(دائیں سے بائیں طرف) احمد سعید خاں مینجنگ اڈیٹر "الفاظ"،
اسد یار خاں مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مکتبہ الفاظ، جناب صلاح الدین پرویز،
محمود ہاشمی (آل انڈیا ریڈیو اردو سروس) اور الطاف حسین فریدی (اردو صحافی)

d. No. L. ALG/91 Marh, April, May, June 1[illegible]

ALFAZ Aligarh

Regis'ered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/76

دو ماہی

الفاظ

علی گڑھ

جلد ۷ | جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء | شمارہ ۴، ۵

زر سالانہ ـــــ سولہ روپے (۱۶)
قیمت ـــــ تین روپے

پرنٹر پبلشر ـــــ اسد یار خاں
مطبوعہ ـــــ جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی
کتابت ـــــ ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق کی تصویر: جوش

پتہ : دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

الفاظ

اداریہ

اردو زبان اور مسلمانوں کا مسئلہ سچ پوچھئے تو "برائے شعر گفتن خوب است" کی طرح الکشن کے لئے خوب ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا۔ اس لئے ہر پانچ سال کے بعد ہر پھر کر اسی کو نعرے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندستان کے تمام سیاست داں اس بات سے خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ اُردو زبان محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ سیکڑوں تقریریں مضامین اور کتابیں اس کے ثبوت میں موجود ہیں اور کبھی کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا۔ حکومت بھی اس بات سے واقف ہے۔ ادارہ آجکل سے لے کر ترقی اُردو بورڈ اور یونیورسٹیوں میں کتنے ہی غیر مسلم حضرات اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ بات حکومت سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب الکشن کا زمانہ آتا ہے تو بے چاری اردو زبان اکدم سے مسلمان کی کیسے ہو جاتی ہے۔ اور ہر جلسے میں اعلان ہوتا ہے کہ اگر ہم الکشن میں جیت گئے تو مسلمانوں کو خوش کر دیں گے اور اردو کو اس کا جائز حق دلوا دیں گے۔

چنانچہ پچھلے انتخابات میں بھی برسرِ اقتدار کانگرس پارٹی نے یہی نعرہ لگایا۔ اردو والوں نے دامے درمے اور سخنے اس کا ساتھ دیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بار پارٹی جیسے ہی اقتدار سنبھالے گی، وہ "مسلمانوں کی زبان" کو اس کا جائز حق دلوا دے گی لیکن جب الکشن کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس فائل کو شاید پھر ۵ سال کے لئے اٹھا کر رکھ دیا گیا۔ اس میں شریمتی اندرا گاندھی کا کوئی قصور نہیں۔ آپ انھیں کوئی اور نعرہ دیدیجئے وہ اردو کا نام لینا چھوڑ دیں گی۔ البتہ ہمیں اس بات پر حیرت ضرور ہے کہ وہ تو ہر الکشن میں اُردو کا جائز حق دلوانے کا بیڑا اُٹھاتی ہے لیکن پھر وہ کامیاب کیوں نہیں ہوتیں؟

چوبیس سال پہلے کی ایک بات یاد آئی، انجمن ترقی اردو کی کانفرنس دلّی میں ہو رہی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا افتتاح کیا تھا لیکن وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی حیثیت سے۔ اس اعلان کے ساتھ کہ اُن کی اپنی زبان اُردو ہے۔ خدا جنّت نصیب کرے مولانا ابوالکلام آزاد کو کہ انھیں اردو کی بےبسی پر ترس آیا اور اُنھوں نے اُردو والوں کو مبارکباد دی کہ اس کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو کر رہے ہیں جو ہندستان کے وزیر اعظم بھی ہیں۔ مولانا نے آخری فقرے کو بار بار دُہرایا۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ جواہر لال نہرو جیسا وزیر اعظم کتنا بےبس ہے کہ اپنی ہی زبان کو اُس کا حق نہ دلوا سکا۔

لیکن ہم اردو والے کتنے سادہ لوح ہیں۔ اِس بات سے خوش ہو جاتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے کسی ممبر نے اُردو کا کوئی شعر پڑھ دیا۔ کسی وزیر نے کہہ دیا کہ مجھے اردو زبان بہت پسند ہے۔ حیات اللہ انصاری راجیہ سبھا کے ممبر ہو گئے، یا انھوں نے اردو میں حلف لیا۔ یا دلّی کلاتھ ملس اور مودی ملس نے بڑے شاندار مشاعرے کئے اور شعرا کو ۵ ستاروں کے ہوٹلوں میں ٹھہرایا —— اللہ رے سادہ لوحی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کے پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جب اردو پڑھنے اور لکھنے والا نہ ہوگا تو کچہری میں اردو میں درخواست کون دے گا۔ گویا اُردو کے دوسری زبان کا اعلان بےمعنی ہے۔ اب تو شریمتی اندرا گاندھی چاہیں تو یہ اعلان کر سکتی ہیں لیکن اردو کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ ہم انجمن ترقی اردو ہند کے اربابِ حل و عقد سے درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا اس مسئلہ سے دلچسپی لیں اور اردو کے معاملہ کو اگلے الکشن تک ملتوی نہ ہونے دیں کہ یہ اُردو دوستوں کا نہیں اردو دشمنوں کا طریق ہے۔ کتابیں چھاپنے والے تو اور بھی ادارے ہیں لیکن انجمن کے مقاصد اس سے بھی بالاتر ہیں۔ اگر ہم اس وقت لاپرواہی اور بے نیازی برتیں گے تو تاریخ ہمیں معاف نہ کرے گی کہ ہم کھلونے پا کر ہی بہلتے رہے۔

مجلس ادارت

فیض احمد فیض

ایک نغمہ
کربلائے بیروت کے لئے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پرنور ہوئے
اب ان کی دمک کے پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اب جگ مگ ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
ہر کشتہ مکاں، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر
ہر دختر قامتِ لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک قائم ہے
بیروت دلِ ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

(بیروت، ۱۹ جون ۱۹۸۲ء)

ایک نظم

ادھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں
صدق و ایماں کی آزمودہ پرانی تلوار
مڑ گئی ہے
ادھر نہ دیکھو کہ جو کج کلہ
صاحب حشم تھے
جو اہلِ دستار و محترم تھے
ہوس کے پرپیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی

ادھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لٹا کر
لحد میں اس وقت تک غنی ہیں
ادھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنے تن سجا کر
جہاں سے اوجھل ہوئے ہیں
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

فیض احمد فیض

دو غزلیں

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
کسی طرح تو جمے بزم مے کدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے
آوارہ ہے پھر کوہِ ندا میں جو بشارت
تمہیدِ مسرت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے
کس عکس سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے
حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

جمیل الدین عالی

کراچی - پاکستان

دوہے

اس کو کچھ نہیں ملتا جس نے ہاتھ نہیں پھیلائے
یہ سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے جانے کیا مل جائے

کاہکشاں میں پیار کی ہم کو ملا اک ایسا چاند
جتنے سورج ساتھ چلے تھے وہ سب پڑ گئے ماند

گاؤں کے لوگ نہیں پہچانیں چپ ہے ساہوکار
ارے ترے روپیوں کی گٹھڑی رہ گئی ہے اس پار

عالی ڈوبا ڈوبنا ہی تھا رکھے بوجھ ہزار
ایک ذرا سی کشتی کتنے بوجھ اٹھاتی پار

جاننے والے دکھ سے چپ تھے پرنیجے چلائے
عالی جی تم کویتا جی کو کس رن میں چھوڑ آئے

پریم اور سمے کا ساتھ نہیں جب لکھ گئے سب استاد
پھر وہ ناری آج تلک ہے من میں کیوں آباد

غزل

عالی جس کا فن سخن میں اک انداز نرالا تھا
نقد سخن میں ذکر یہ آیا دوہے پڑھنے والا تھا
چند نئے شعروں کے شعلے کیسی لَے میں بھڑکتے تھے
تم آ کر سنتے تو سہی کل ساری رات اجالا تھا
جانے کیوں لوگوں کی نظریں تجھ تک پہنچیں، ہم نے تو
برسوں بعد غزل کی رو میں اک مضمون نکالا تھا
فکر و نظر کے پرچم اک دم کس نے آ کر چھین لئے
صدیو تم نے کس شکل میں یہ میدان سنبھالا تھا
ہم نہ ملے اور جب بھی ملے تو دونوں نے اقرار کیا
ہاں وہ وعدہ تھا ایسا تھا جو پورا ہونے والا تھا
تپتی دھوپوں میں بھی آ کر ساتھ بہت دے جاتے ہیں
چاند نگر کے انشا صاحب عالی جن کا ہالا تھا

گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

شاعرِ حریت و فطرت ـــ جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔۱۹۸۲ء) بیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں سے تھے، جن کی نظیر زمانہ پھر پیدا نہیں کر سکے گا۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک جوش نے اپنی شاعری کا جزر و مد اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ قبول عام و لطف سخن کو خدا داد کہا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ تخلیقیت خواہ وہ کسی طرح کی ہو، اس کا گہرا تعلق وہبی صلاحیت سے ہے۔ قبول عام میں تو پھر بھی زمانے کی روش، مذاق و معیار، نیز شخصیت کے بانکپن یا ابالجی (ECCENTRICITY) کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہتا ہوگا، لیکن لطف سخن تو تمام و کمال اس تخلیقی اُٹھان کے فروغ سے عبارت ہے جو شاعر کے عہد میں یا اس کے بعد حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہونے یا جاوداں ہونے کی قوت رکھتا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبال کے بعد جتنی عزت، شہرت اور مقبولیت جوش کو نصیب ہوئی، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب جوش نے ہجرت کی، تو دونوں ملکوں یعنی پورے برصغیر کے طول و عرض میں جوش کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کیا یہ امر غور طلب نہیں کہ قطع نظر اس ذاتی واقعے کے بیانیہ شاعری کا وہ انداز جس کے جوش اتنے زبردست ترجمان تھے، تاریخی اعتبار سے اس کے خاتمہ ہونے کا اعزاز بھی انھیں کو نصیب ہونے والا تھا کیوں کہ آزادی کے بعد کے چند برسوں میں کیا یہ انداز اپنی بساط تہہ نہیں کر رہا تھا جب زمانہ بدلتا ہے تو مذاق بھی بدلتے ہیں۔ ادبی تبدیلیاں اگرچہ خاموشی سے رونما ہوتی ہیں، لیکن کئی بار یہ سیاسی طوفانوں اور تہلکوں سے کم ہوش ربا اور روح فرسا نہیں ہوتیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آزادی کی ایک دہائی کے اندر اندر ہی پاکستان اور ہندوستان میں اردو شعر و ادب کی سطح پر دوررس تبدیلیوں کے آثار سامنے آنے لگے۔ چنانچہ جب مذاق بدلنے لگا تو انقلاب کی صدا لگانے والے خود ایک انقلاب کی زد میں آ گئے۔ ہماری شاعری کی حالیہ تاریخ ان تبدیلیوں کی خاموش تماشائی ہے گوش نصیحت نیوش ہو یا نہ ہو، دیدہ عبرت نگاہ تو خون کے آنسو رو بھی چکی اور رلا بھی چکی۔

جوؔش اس قدر جلد روایت پارینہ بن جائیں گے، آج سے پچیس برس پہلے اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم وہ ہماری کتاب شعر کا ایسا باب ہیں جس کے بعض نقوش کی چمک آسانی سے ماند نہ ہوگی۔ جوؔش کی اٹھان میں بلا کا زور تھا۔ انھوں نے اپنا تخلص جوؔش بلا وجہ اختیار نہ کیا ہوگا، غالباً اپنی فطرت کے ہیجان انگیز عناصر کا انھیں شروع ہی سے شدید احساس تھا۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے ایک زبردست قوتِ نمو۔ تخلیقی اپج، پھٹ پڑتے اور بے اختیارانہ بہائے جانے کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ایک بگولے کی طرح اٹھے اور طوفان بن کر چھا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنی تہلکہ خیزیوں سے ایوان شعر کے در و دیوار کو لرزا دیا۔ وہ سر تا سر ایک رومانی شاعر تھے اور شدید باغی، ایسا باغی جو بالآخر خود اپنی ہی آگ کی نذر ہو گیا۔ مشاقی، بدگوئی، شوکت الفاظ اور قادرالکلامی ان پر ختم تھی۔ ان کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ جس موضوع یا منظر کو جیسا چاہتے آناً فاناً نظم کر دیتے تھے لفظوں کا ایسا بڑا جادوگر انیسؔ کے بعد دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ زبان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی حاکمانہ اور آمرانہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں الفاظ قطار اندر قطار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور ادنیٰ سا اشارہ پاتے ہی سر جھکائے شعر میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ جوش کے لہجے میں ایسا طنطنہ اور مردانگی تھی اور ان کی آواز میں ایسی گھن گرج، کڑک اور دبدبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہمالیہ لرز رہا ہے یا زلزلہ آگیا ہے "شعلہ و شبنم" کے بعد ان کا یہ شعر بلا وجہ زبان زد خاص و عام نہیں ہو گیا تھا:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

یوں وہ شاعر انقلاب کے ساتھ ساتھ شاعر شباب بھی کہے جانے لگے۔ بیک وقت شاعر انقلاب اور شاعر شباب ہونا جوؔش ہی کا کمال تھا۔ تضاد کا یہ سلسلہ جوؔش کی پوری شاعری میں ملتا ہے۔ جوؔش کو اس پر فخر بھی تھا۔ انھوں نے اپنے مجموعوں کے نام "شعلہ و شبنم، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، حرف و حکایت، فکر و نشاط، جنون و حکمت، سرود و خروش، الہام و افکار، عرش و فرش، آیات و نغمات، سموم و صبا بلا وجہ نہیں رکھے۔ جوؔش کی پوری شاعری میں یہی کیفیت ہے کہ ایک جذبہ دوسرے کی نفی کرتا ہے اور ایک رنگ دوسرے کو بے رحمی سے کاٹتا ہے۔ لیکن جوؔش اب پل کے دوسری طرف جا چکے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ وقت کے اس ظلمات میں ان کی شاعری کا جو چہرہ ابھرتا ہے، وہ کیسا ہے، اور صرصر و سموم کے اس دشت سے گزرنے کے بعد جس کا نام دنیا ہے، جوش کی شاعری کے وہ کون سے نقوش ہیں جو اب بھی روشن ہیں۔

اس کے جواب کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ جوش اپنے وقت سے آگے نہ سہی، اپنے وقت کی آواز ضرور تھے اور یہ سعادت معمولی نہیں ۔ خلافت تحریک اور اس کے بعد سے یہ برصغیر سیاسی بیداری اور قومی جوش و خروش کے جس ابال سے گزر رہا تھا، جوش کی شاعری اس کی فطری نقیب بن گئی تھی ۔ آزادی کے ترانے چھیڑنے والوں میں جوش اکیلے نہیں تھے ۔ شبلی، حسرت موہانی چکبست، اکبر الہ آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، اقبال سہیل اور کئی دوسرے شعرا سامراج دشمنی کی فضا تیار کر چکے تھے لیکن جوش کی آواز جوش کی آواز تھی ۔ ان کی باغیانہ تڑپ اور گھن گرج سب سے الگ تھی ۔ شاعر انقلاب کہلانے کا اعزاز کسی کو ملا تو صرف جوش کو ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ شاعری کی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے قافلہ سالاروں میں سے تھے اور جس مجاہدانہ جوش و خروش اور ہمت و پامردی سے انھوں نے سامراج دشمنی اور انقلاب کے ترانے گائے اور انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ کو سینوں میں دہکایا، وہ دونوں ملکوں کی قومی تاریخ کا حصہ ہے ۔ رہا شاعرِ شباب کا معاملہ تو وہ ذرا کمزور ہے ۔ ان کی شدید جذباتیت سے شاید جتنا فائدہ ان کی انقلابیت اور بغاوت پسندی کو پہنچا، اس نسبت سے اتنا یا اس سے زیادہ نقصان ان کی عشقیہ شاعری کو پہنچا جسم و جمال کے تذکروں میں لذت اندوزی اور ہوس پرستی سے آگے نہ دیکھ سکنے کی وجہ بھی یہی تھی ۔ جوش کا عورت کا تصور محدود اور فرسودہ تھا ۔ تاہم باغیانہ لے سے ہٹ کر ان کی شاعری کا اگر کوئی اور روشن پہلو ہوسکتا ہے وہ تو ان کا حسنِ فطرت سے بے پناہ لگاؤ ہے ۔ لگتا ہے قدرتی مناظر کی کشش سے ان پر ربودگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ انھوں نے فطرت کے حسن و جمال کے جو مرقعے کھینچے ہیں اور ایسی صبحوں، ڈھلتی شاموں، ساون کے مہینوں، اور گرجتی برستی گھٹاؤں سے آواز کی سرسراہٹوں کے ذریعہ جو باتیں کی ہیں اور دن، رات، لو، گرمی، تپش، بہار اور برسات کی جو کیفیتیں بیان کی ہیں، وہ پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں ۔ جوش کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اتنی توجہ نہیں ہوئی جتنی اس کا حق ہے ۔ یہاں ان دونوں پہلوؤں کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا، اور ان اسلوبیاتی جہات کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا۔ جو جوش کی شاعری کا امتیازی نشان ہیں ۔

جوش کی باغیانہ شاعری کے تین پہلو خاص ہیں ۔

عوامی سماجی پہلو جہاں انھوں نے سماج کی خرابیاں دکھائی ہیں اور عوام کی حالت بیان کی ہے ۔ دوسرے وہ نظمیں جن میں انھوں نے بغاوت و آزادی کے ترانے چھیڑے ہیں، اور تیسرے وہ نظمیں جن میں سامراج دشمنی کا کھل کر اظہار ہوا ہے ۔ ان میں ہر ہر سطح کا تفصیلی تجزیہ ممکن نہ ہوگا، بعض

جگہ صرف اشاروں سے کام لیا جائے گا۔ جوش کی باغیانہ شاعری میں عوامی سماجی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ہمارے پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے بغیر کسی خارجی سہارے کے انسان کی مرکزیت کو تسلیم کیا اور اسے انقلاب کی پہلی اور بنیادی کڑی کے طور پر پیش کیا۔ وہ اس نئے انسان کی بشارت دیتے ہیں۔ جسے اپنی قوت پر بھروسہ ہے اور جو سامراج سے ٹکر لینے کے عزم و ولولے سے سرشار ہے۔ ترقی پسند تحریک کی سالاری بعد کی چیز ہے۔ اس نوع کے جذبات جوش کے یہاں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے دس پندرہ برس پہلے یعنی ۱۹۲۱۔ ۱۹۲۲ سے ملنے لگے تھے۔ "انسان کا ترانہ" "باغی انسان" "پست قوم" "جھریاں" "مہاجن اور مفلس" "ضعیفہ" "بھوکا ہندوستان" اور بالخصوص "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" اور اس طرح کی دوسری نظموں میں جوش نے برصغیر کے عوامی دکھ درد، افلاس، ناداری اور جہالت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کی غیرت کو للکارا ہے۔ باستثنائے "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" جو اعلیٰ پائے کی نظمیں ہیں۔ دوسری عوامی سماجی نظموں میں دو کمیاں خاص طور پر کھٹکتی ہیں۔ اول تو جوش جہاں بھی عورت کو دیکھتے ہیں، ان کی انقلابیت شبستان طرب میں پہنچ جاتی ہے۔ "حسن اور مزدوری" کا شمار بعض نرم دل حضرات جوش کی بہترین نظموں میں کرتے ہیں۔ اس کے جذبۂ عوام دوستی اور وطنیت میں کلام نہیں۔ ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں پتھر توڑ رہی ہے۔ رخساروں پر گرد ہے اور زلفیں چاک میں اٹی ہوئی ہیں۔ چوڑیوں کے ساز میں سوز بھرا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر شاعر کے دل سے دھواں اٹھتا ہے اور وہ افلاس کے مارے ہوئے ہندوستان پر افسوس کرتا ہے۔ لیکن اس جذبۂ وطنیت کی تان بالآخر اس خیال پر ٹوٹتی ہے :

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

دوسرے یہ کہ عوام سے خطاب کرتے ہوئے اکثر جوش کا لہجہ اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور خلوص پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ اتنی بات واضح ہے کہ جوش کا تصور سماج کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھا۔ وہ ہر چیز کو ذاتی برتری کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس میں کچھ ہاتھ ان کے رئیسانہ مزاج اور خاندانی وجاہت کا بھی تھا۔ ایک جگہ کہا ہے کہ "ہند کے غلامانہ روسیاہ" شاعر سے نگاہ ملانے کے قابل ہی نہیں۔ "فرنگی کے غلام" "روسیاہ" "کمینے" "وحشی" "بے حیا" "بدگمان" جیسے الفاظ جوش کے نوک زبان تھے۔ وہ اکثر گلہ کرتے تھے کہ وہ "نامرد قوم" میں پیدا ہی کیوں ہوئے "غلاموں سے خطاب" ایسے مقامات پر ان کا رویہ اپنے ہم وطنوں کے لئے اہانت آمیز ہو جاتا ہے۔ اصلاً ایسا

وہ غیرت دلانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کرتے تھے، لیکن غیظ و غضب سے شعر پایۂ اعتبار سے فروتر ہو جاتا تھا۔ جوش کی عوامی سماجی نظموں سے وہ نظمیں کہیں بہتر ہیں جن میں انھوں نے آزادی اور بغاوت کے ترانے گائے ہیں اور انقلاب کے لئے بیدار کیا ہے۔ جوش کے لہجے میں جو مردانگی شکوہ، بلند آہنگی اور طنطنہ تھا، وہ جذبۂ بغاوت اور آزادی کی تڑپ کے اظہار سے خاص مناسبت رکھتا تھا۔ جوش کی آواز کی للکار اور کڑک ولولوں کو بڑھانے اور ہمتوں کو بلند کرنے کے لئے آگ کا کام کرتی تھی۔ نعرۂ شباب میں کہتے ہیں:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"
رنگ سورج کا اڑاتا ہے مرے سینے کا داغ — بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رخ میرا چراغ
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر — خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زر فشان — ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر "ہندوستان"
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا — گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے، برق کے مانند لہرایا ہوا — موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

ایسی نظموں میں "سلام"، "بغاوت"، "ناخدا کہاں ہے"، "بیدار ہو بیدار"، "پیدا کر" اور "نظامِ نو" میں آزادی اور بغاوت کی آگ بھری ہوئی ہے۔ ان سے آج بھی اس پر آشوب عہد کی ولولہ خیزیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج، کڑک ہے، کڑک چمک ہے، چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
جھنن جھنن ہے گھڑڑ گھڑڑ ہے، گھنن گھنن ہے دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحذر ہے، زمیں کے لب پہ الاماں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟
(ناخدا کہاں ہے)

اٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر — نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
نظامِ کہنۂ نیلی رواق، وہم و فریب — نیا تصورِ لیل و نہار پیدا کر
بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے — جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر
(پیدا کر)

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو — ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں — بالش کا اشتیاق، نہ بستر کی آرزو

(سلام)

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت آندھی میرا نام — میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتل عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات — کانپ اٹھتی ہے مری چین جبیں سے کائنات
ذکر ہوتا ہے مرا پر ہول پیکاروں کے ساتھ — ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کروٹیں میرے دل آزاد کی — جن سے گر جاتی ہیں ڈاٹیں قصر استبداد کی
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر — میری سر تابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
الحذر میری کڑک کا زور ہنگام مصاف — صاف پڑ جاتا ہے ایوان حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزم ہستی میں مری گل باریاں — ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ استخواں
الاماں والحذر! میری کڑک، میرا جلال — خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار — بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
جنگ کی صورت سے گر ہنگامہ کرتی ہوں شروع — امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع
اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ — بھاگ، دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
موت کا پیغام ہے بپھرے ہوئے شیروں کا وار — مدعی! کف دردہاں آبادیوں سے ہوشیار
خلق میں بیتاب تیرا منہ جھلسنے کے لئے — تیرے سونے پر ہے اب لوہا برسنے کے لئے
حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون؟ — جذبۂ خلق خدا کو فتح کر سکتا ہے کون
رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں — جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

(بغاوت)

لیکن ان سے بھی زیادہ آگ ان نظموں میں ہے جہاں جوش نے سامراجی نظام پر کھل کر وار کیا ہے۔ ان نظموں میں جوش کے مجاہدانہ تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل گیا ہے اور شعلے برس رہے ہیں۔ انھوں نے فرنگیوں کو للکارا ہے اور سامراجی نظام کے پارہ پارہ ہونے کی نوید دی ہے۔ ایسی نظموں میں "زوال جہانبانی" "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے نام" "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" اور "شکست زنداں کا خواب" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جنھیں برصغیر کی آزادی کی تاریخ میں ہرگز

ہرگز بھلایا نہیں جاسکے گا۔"وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" میں طنز کی ایک زیریں لہر ہے جس نے پوری نظم میں تیغ کی آبداری پیدا کر دی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مجبور و بے بس عوام کی زبان میں انگریزوں سے بظاہر ڈرتے ڈرتے خطاب کیا ہے لیکن در پردہ ایسا طنز کیا ہے جس کا وار نہایت گہرا ہے۔ اس سلسلے کی بہترین نظم بلاشبہ "شکست زنداں کا خواب" ہے۔ یہ پوری نظم آزادی سے پہلے کے ابلتے کھولتے ہوئے ہندوستان کا استعارہ ہے۔ پورا ملک زنداں کا منظر پیش کرتا ہے جہاں بغاوت کا لاوا ابلنے کو ہے۔ عوام قیدی ہیں جو دیواروں کے نیچے آ آ کر جمع ہو گئے ہیں، سینوں میں تلاطم اور نظروں میں بجلی ہے۔ زنجیروں کی جھنکار بغاوت کا جز بن گئی ہے۔ دیوار و در بیٹھ گئے ہیں اور انقلاب نے پرچم کھول دیا ہے۔ آٹھ شعروں کی اس مختصر سی نظم میں جوش نے جس طرح جذبۂ حریت کی ہیجان انگیزیوں اور ولولہ خیزیوں کو زندہ جاوید کر دیا ہے، انھیں کا حصہ ہے:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی شوخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہاں کچھ اشارے جوش سے تخلیقی اظہار کے اسلوبیاتی پیرایوں سے متعلق بھی ضروری ہیں جوش نے یوں تو اپنی نظموں میں مختلف ہیئتوں سے کام لیا ہے لیکن قصیدے اور مسدس کی روح ان کی پوری نظم نگاری کو سرشار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سلام، مراثی، منقبت سے دور اول میں تخلیقی ربط رہا، پھر برسوں کے فصل کے بعد انھوں نے اسے "طلوع فکر" کے ذریعے جوڑا۔ اس ٹوٹتے جڑتے ہوئے سلسلے کے باوصف انیس کی شعری روایت سے جوش کا جو تخلیقی رشتہ تھا۔ اور جس طرح انھوں نے شعری وغیر شعری طور پر اس سے استفادہ کیا، وہ مطالعات جوش کا ایک الگ باب ہے۔ قصیدے اور مسدس کی ہیئتوں میں جو اسلوبیاتی ربط ہے، اس سے میں اپنے مضمون "اسلوبیات انیس" میں بحث کر چکا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ جوش نے اپنی خطابت سے ایک طاقت ور حربہ کا کام لیا، اور اپنی مجاہدانہ اور بیانیہ شاعری میں ایک خاص شان پیدا کی۔ لیکن جہاں جہاں وہ اظہار کی کشتی کو جذباتیت کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیتے ہیں، تکرار لفظی سے ایسی صورت پیدا ہوتی ہے جس سے لفظ سے معنی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور محض لفظیات کی ضربیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں باوصف شدید روانی، برش اور تخلیقی قوت نہ ہو کے نظم معنیاتی طور پر آگے نہیں بڑھتی۔ کیا یہ غور طلب نہیں کہ جوش کے یہاں بہت سے بند یا نظمیں ایسے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں جن کی تکرار کو وہ خواہ مخواہ اپنے لئے لازم کر لیتے ہیں، خلاً /قسم ان کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں /قسم ان گھن گرج پر ہول توپوں کے دہانے کی /قسم ان غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں / یا پھر /قسم اس دل کی چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا /قسم اس روح کی خو ہے جسے فطرت پرستی کی /قسموں کا یہ اکتا دینے والا سلسلہ شعر در شعر پوری نظم میں جاری رہتا ہے۔ اس طرح اگر کبھی بھولے سے وہ /ساقی/ سے خطاب کر لیں تو پھر اسے آسانی سے چھوڑتے نہیں ان کی کئی نظمیں "السلام" سے شروع ہوتی ہیں۔ یہی حال "الحفیظ/ الاماں / الحذر/ کا بھی ہے ان لفظوں کے صرف میں وہ ایسی فیاضی برتتے ہیں کہ معنیاتی روح متاثر ہوتی ہے اور لفظ باقی رہ جاتے ہیں۔

آخر میں مناظر فطرت سے متعلق جوش کی ان بیانیہ نظموں سے بھی استنباط ضروری ہے جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا، اور جنھیں "منظریہ" کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے "شکست زنداں کا خواب" اور "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" جیسی باغیانہ نظموں کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ بیانیہ اسلوبیاتی پیرایہ اور تخلیقی قوت

کا سرشتہ ایک ہی ہے۔ "شکست زنداں کا خواب" ۱۹۲۱ میں تحریک خلافت کے زمانہ عروج میں لکھی گئی تھی۔ اس کے سات سال بعد یعنی ۱۹۲۷ کی لکھی ہوئی ایک منظریہ نظم کا بند ملاحظہ ہو:

"اٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیر شب ٹوٹی — وہ دیکھو پو پھٹے غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی!"
اٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو — ہوائے انقلاب آنے کو ہے، ہندوستاں والو"

(آثار انقلاب)

اس میں صبح کے غرفے کے کھلنے اور زنجیر شب کے ٹوٹنے سے قطع نظر/ اٹھو/ دیکھو/ چونکو/ بڑھو کی گونج سے معاً "شکست زنداں کا خواب" کے آخری شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

/سنبھلو/ جھپٹو/ اٹھو/ دوڑو/ کیا یہ انداز اور حصوصیہ کلمات ایک باغی سالار کی للکار کے غماز نہیں۔ افعال کی یہ یورش جوش کے یہاں کئی جگہ نظر آتی ہے اور ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے۔ جوش کے یہاں متوازیت (PARALLELISM) ایک خاص جمالیاتی کردار ادا کرتی ہے۔ "بدلی کا چاند" سے یہ منظر دیکھئے:

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

قافیے ردیف کی فعلیت سے قطع نظر مصرعوں کے اندر کے یہ ٹکڑے غور طلب ہیں۔ // سمٹی جو گھٹا/ سنکی جو ہوا// پردہ جو اٹھایا بادل کا/ چلمن جو گرائی بدلی کی// ابھرا/ الجھا// ڈوبا/ سلجھا// یہ ساخت باہم دگر مربوط مصرعوں کی یکساں صرفی مطابقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ فعلیہ متوازیت کس طرح غیر شعوری یا شعوری طور پہ تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتی ہے اور شعر میں لطف

داخل کا جادو جگاتی ہے۔ اب اس کا دوسرا پہلو بھی دیکھئے۔ ذیل کی شاہکار نظم "روپ متی" اسمِ استعمال کا شاہکار ہے۔ آٹھ اشعار کی اس نظم میں ایک بھی فعل نہیں۔ داخلی ساخت میں فعل کا وجود ہے لیکن خارجی ساخت میں اس کا یکسر حذف ہوا ہے:

رخسار میں شمع کعبہ کی ضو — آنکھوں میں چراغ دیر کی لو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رو — چھلکی ہوئی چاندنی لب جو
پلکوں کی جھپک میں مسکراہٹ — شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی راتیں — غلطیدہ حسین دست و پا میں
انفاس میں کمسنی کی خوشبو — بنگال کا، انکھڑیوں میں جادو
چہرے پہ شباب کا تلاطم — بت خانے کی صبح کا تبسم
عارض میں دمک، دمک میں ندرت — برسات کے چاند کی لطافت
رس کی بوندیں کہ نرم باتیں! — آواز میں مالوے کی راتیں

بالکل یہی ساختی کیفیت "گرمی اور دیہاتی بازار" کی بھی ہے۔ سارا ڈھانچہ اسما پر ٹکا ہوا ہے، کہیں کہیں ہونا کی گردان ہے۔ یہ نظم بھی جوش کی شاہکار نظم ہے اور تمام و کمال پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور — خون کی پیاسی شعاعیں، روح فرسا لو کا زور
آگ کی رو، کاروبار زندگی کا پیچ و تاب — تند شعلے، شوخ ذرے، گرم جھونکے آفتاب
شور، ہل چل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار — بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
کھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس — خربزے آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رو — کملیوں پہ سرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے شدائد، جھگڑوں کی سختیاں — جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھوں پہ بچے، گرد میں ڈالے ہوئے — بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے — ہر نفس، اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے
مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے — چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی — پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی — دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی — بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا دم — نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی — ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکس گناہ — تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

ان نظموں کو تمام و کمال پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان سے علاوہ جوش کی قادرالکلامی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کے اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ جہاں جوش نے اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں رکھا ہے، اور اپنی جذباتیت کو زیر دام لا کر ضبط سے کام لیا ہے، نظم بے مثال ہو گئی ہے اس پایے کی دوسری نظمیں "جادو کی سرزمین" "آواز کی سیڑھیاں" اور "البیلی صبح" ہیں، جو اپنی طرحداری اور حسن کاری میں "گرمی اور دیہاتی بازار" اور "روپ متی" سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر اوراق کی کوتاہ دامانی مانع نہ ہوتی تو ان نظموں کو بھی تمام و کمال پیش کیا جاتا۔ اور ان سے بحث کی جاتی کیوں کہ جب تک ان کا ایک ایک مصرعہ نہ پڑھا جائے، ان کے لطف و اثر کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے، اور یہ معلوم کرنا نہایت دشوار ہے کہ اپنی ایسی نظموں میں جوش نے بیانیہ شاعری کی کن بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ برسات جوش کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس پر جوش نے "بھری برسات کی روح" "برسات کی پہلی گھٹا" "رم جھم" "برسات ہے برسات" برسات کی چاندنی" "برسات کی شفق" "ساون کے مہینے" بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ یہاں آخر میں ایک چھوٹی سی نظم "برسات کی ایک شام (راجپوتانہ)" پیش کی جاتی ہے جس سے ان تمام باتوں کی توثیق ہو جائے گی جو جوش کی اس پائے کی نظموں کے بارے میں اوپر کہی گئی ہیں۔

خنک ہواؤں میں اٹھتی جوانیوں کا خرام — کنارے دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پہ آسماں کی ترنگ — خنک ہواؤں کی بھیگی ہوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازئ طفلانہ ابر پاروں کی — ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرے میں ہیجان مست ہونے کا — ذرا سا ریل کی پٹری پہ رنگ سونے کا
شفق، ہلال، ندی، رنگ، ابر، سبزہ، ہوا — ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ، امواج کی روانی میں! — فلک پہ رنگ، درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چونچال — ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیال

یہ جہاں فروز مناظر، کہ دل لبھاتے ہیں   بچھڑ گیا ہوں کسی سے تو کھائے جاتے ہیں

یہ تو جوش پر تحقیق کرنے والے ہی بتائیں گے کہ جوش نے کتنے ہزار اشعار کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ایک عام تخمینے کے مطابق جوش نے پچاس ہزار اشعار سے کم کیا کہے ہوں گے بیانیہ شاعری میں فیاضی اور فراوانی کی راہیں تو بہر حال کھلی ہی رہتی ہیں۔ قصیدے اور مسدس کی روایت کا شاعر جب کہنے پر آجاتا ہے تو سمجھا یہی جاتا ہے کہ موتیوں کے دریا بہا رہا ہے۔ اور جوش کے مداح انھیں یہ باور کراتے بھی تھے۔ یہی زمانے کا رنگ بھی تھا۔ تاہم اشعار کے اس انبار میں گہر ہائے آبدار کی بھی کمی نہیں۔ ایسے مقامات بھی آئے ہیں اور بار بار آئے ہیں۔ جہاں نظم کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں لا کر جوش نے اپنی قادر الکلامی سے صحیح کام لیا ہے۔ باغیانہ اور منظریہ شاعری میں انھوں نے ایسے ایسے شاہکار چھوڑے ہیں جن کے کلاسیکی رچاؤ، حسن کاری اور تابناکی کے نقش کو زمانہ آسانی سے دھندلا نہ سکے گا۔ "ہماری سوسائٹی" "شکستِ زنداں کا خواب" "وفاداران ازلی کا پیام" "کسان" "گرمی اور دیہاتی بازار" "بدلی کا چاند" "روپ متی" "البیلی صبح" "برسات کی ایک شام" ہماری نظر میں اس پایے کی نظمیں ہیں کہ یہ بیسویں صدی کے اردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی جگہ پائیں گی، اور ان کے بغیر اردو نظم کی کوئی بحث مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ جوش ایک منفرد شاعر تھے، اپنی آواز کے اعتبار سے بھی، اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔ ہر ہر سطح پر انھوں نے مسلمات پر شدید ضرب لگائی۔ ان کے کردار کا روشن ترین پہلو یہی ہے کہ انھوں نے ہر ہر تصور سے بغاوت کی۔ وہ سماج کے بھی باغی تھے، سیاست کے بھی باغی تھے اخلاق کے بھی باغی تھے۔ اور تو اور انھوں نے خود اپنے آپ سے بھی بغاوت کی۔ یعنی ان آدرشوں اور قدروں کو بھی پاش پاش کرنے سے نہیں چوکے جنھیں انھوں نے خود تراشا اور سنوارا تھا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے، اور یہی ان کا المیہ۔ وہ لفظوں میں آگ بھر سکتے تھے اور دلوں میں آگ لگا سکتے تھے۔ جب تک حق گوئی و بیباکی آئین جواں مرداں ہے، اور آزادی و جذبۂ حریت شعر و دانش کی سرفرازی کا نشان ہے، جوش کی باغیانہ اور مجاہدانہ روش اور ان کا انداز کج کلہی اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار رہے گا۔

(کراچی کے پاک و ہند جوش ملیح آبادی مذاکرے میں پڑھا گیا)

□

فارغ بخاری
پشاور (پاکستان)

شعلہ و شبنم

میں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو برِصغیر میں خیبر سے راس کماری تک شاعرِ انقلاب جوؔش ملیح آبادی کا طوطی بول رہا تھا، ویسے طوطی تو اس وقت کئی دوسرے شعراء کے بھی چہک رہے تھے یعنی علامہ اقباؔل حفیؔظ جالندھری، فراقؔ گورکھپوری، احسانؔ دانش وغیرہ۔ لیکن جوشؔ کی بات کچھ اور تھی، سیاسی طور پر وہ ایسا دور تھا کہ انگریز سامراج کی غاصب حکومت کے خلاف بلا امتیاز مذہب و ملت پوری قوم کے دلوں میں نفرت کی جوالا بھڑک رہی تھی، ملک میں جنگ آزادی پورے عروج پر تھی، اس تحریک کو دبانے کے لئے انگریز حکمرانوں کے ظالمانہ عزائم حرکت میں آگئے تھے، ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور حریت پسند نوجوانوں کو جلیانوالہ باغ امرت سر، قصہ خوانی پشاور اور کئی دوسرے شہروں میں گولیوں سے چھلنی کیا جانے لگا۔

اس وقت اس غلام آباد میں جوشؔ ہی اکلوتا شاعر تھا جس کے انقلابی نغموں سے ملک کی فضا گونج رہی تھی، یوں نصف صدی تک اس کی شاعری عوام کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی، دوسری جنگ عظیم کے ہنگامۂ کارزار میں بھی جب حریت خواہ سیاسی جماعتوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی بھرتی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور فرنگی حکومت اپنے اقتدار کا کبھی نہ ڈوبنے والا سورج غروب ہوتا دیکھ کر جوشِ انتقام میں انتہائی ظالمانہ حربوں پر اتر آئی تو وہ جوشؔ ہی تھا جس نے کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بزدل حکمرانوں کو بری طرح للکارا اور وہ تاریخی نظم لکھی جس کا آخری شعر تھا۔

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

اور جب کانگرس اور مسلم لیگ کی آویزش سے ملکی آزادی کھٹائی میں پڑتی نظر آئی تو جوشؔ کی حقیقت پسندانہ بصیرت نے بلا جھجک قیام پاکستان کی حمایت میں اپنا زورِ قلم صرف کیا اور کھل کھلا اپنی

نظم میں برصغیر کی تقسیم پر زور دیا جو کانگرسی نیتاؤں کو سخت ناگوار گزرا لیکن اس پر کلمۃ الحق کے اظہار سے کسی پیش بینی کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس دور میں برصغیر کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کے لبوں پر اس کی انقلابی نظموں کے اشعار نہ ہوں، جوش جنگ آزادی کے جیالے نوجوانوں کا ہیرو بن چکا تھا اور اس کی شہرت اور عوامی ہردل عزیزی کے طلسم کو توڑنے کے لئے حریفوں کو بڑے پینترے بدلنے پڑے۔

یہ جوش کی شہرت و قبولیت کے عروج کا دور تھا وہ اس طرح ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا کہ اس کے سامنے کسی کا چراغ جلنا محال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے تمام بڑے چھوٹے شاعر کم و بیش جوش سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ خصوصاً اس دور کی نئی نسل کو تو اس کی شاعری بہت مرعوب کرتی تھی، اس لئے کوئی نوجوان شاعر بھی اس کے جذباتی انداز اور تیز و تند لہجے سے دامن نہ بچا سکا یہ الگ بات ہے کہ بعض نے اس بات کو تیغ الہ آبادی (مصطفٰے زیدی) کی طرح برملا تسلیم کیا اور بیشتر نے مجاز، ساحر، احسان دانش، سردار جعفری وغیرہ نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔

مجھے بھی ایک عرصہ تک جوش کے بلند آہنگ نے اپنی گرفت میں لئے رکھا، نوجوانی کے دن تھے اس پر افتاد طبع ایسی، جیسے رگ و پے میں بارود بھرا ہو، جوش کو پڑھ کر مجھ پر دیوانگی طاری ہو جاتی، اس طرح میں بھی اسی روش پر چل نکلا اور آزادی، بغاوت، جنگ آزادی کا سپاہی قسم کی تند و تیز نظمیں لکھنے لگا لیکن بعد میں یہ تمام کلام ضائع کر دیا کہ اس میں سوائے نعرہ بازی کے اور کچھ نہ تھا۔ تاہم میں نے جوش کے مطالعہ سے بہت کچھ سیکھا، خصوصاً اس کے ذخیرۂ الفاظ سے میں نے بڑا استفادہ کیا کہ انیس و دبیر کے سوا اور کسی شاعر کے ہاں مترادفات کا اتنا سرمایہ نہیں ملتا اور یہ ایسی دولت تھی جس کے لئے میں اس عظیم شاعر کا ہمیشہ ممنون احسان رہوں گا۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی زندگی اور فن کا تجزیہ کیا جائے تو فارسی کا یہ مصرع پوری طرح اس پر صادق آتا ہے ؎

قلب او مومن دماغش کافر است

یہ اس اعتبار سے کہ جس جاگیردارانہ ماحول میں اس نے آنکھ کھولی اس کی روایات سے بغاوت کرنے میں قلمی طور پر تو اس نے جہاد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ذہنی طور پر وہ اس سے اپنا پنڈا نہیں چھڑا سکا۔ یعنی اپنے آپ کو ڈی کلاس کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، خود

عادات، رہن سہن، وضع قطع، گفتگو آج تک اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے، وہی رئیسانہ چونچلے، وہی امیرانہ ٹھاٹھ، وہی پورژوا لہجہ، وہی بگڑے نوابوں کے لچھن ـــــ گویا "رسی جل گئی، بل نہیں گئے۔"

ان دنوں جوش کے متعلق عجیب و غریب باتیں سننے میں آتی تھیں۔

وہ ایسا بلانوش ہے کہ صبح آنکھ کھلتے ہی پینا شروع کر دیتا ہے اور رات گئے تک پیتا ہی چلا جاتا ہے۔

ظالم نیٹ پیتا ہے اور تین چار بوتلیں روز چڑھاتا جاتا ہے۔

آج تک اسے کسی نے ہوش میں نہیں دیکھا۔

شراب پیتے ہوئے اس پر شعروں کا نزول ہوتا ہے تو رکنے میں نہیں آتا۔

وہ اتنا مغرور ہے کہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

اس کے سامنے کوئی غلط لفظ بولے تو کھانے کو دوڑتا ہے۔

درحقیقت یہ سب افسانہ طرازی تھی اس کی اعتدال پسندی کا شہرہ تو مجاز کے اس مشہور لطیفے سے ہوا جو کچھ یوں ہے۔

"مجاز جوش کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ اسے جام پہ جام چڑھاتے دیکھ کر جوش نے کہا ـــــ

"برخوردار ـــــ شراب کا لطف لینا ہے اور اس کے ضرر سے بچنا ہے تو میری طرح گھڑی سامنے رکھ کر پیا کرو ـــــ" مجاز نشے کی ترنگ میں بولا ـــــ "آپ گھڑی کہتے ہیں میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیوں۔"

پھر مشاعروں میں جوش سے ملاقاتیں ہونے لگیں تو بڑا مہربان، بڑا شفیق پایا۔ ایک دفعہ اسلام آباد ٹی وی سٹیشن پر شوٹنگ لیٹ ہونے کے سبب جوش سے طویل ملاقات میسر آئی اس بڑھاپے میں بھی اس کا دم خم وہی تھا۔

میں نے پوچھا۔ آپ کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ الفاظ کے زور پر شاعری کرتے ہیں اور پُرگوئی کے باعث آپ کی نظموں میں بھرتی کے اشعار زیادہ ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اب تو ایک عرصہ سے آپ اپنے آپ کو دہرانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"بھائی شعر و ادب کا تو سارا کاروبار ہی الفاظ کے زور پر چل رہا ہے، الفاظ نکال دیئے جائیں تو شاعری میں اور رہ کیا جاتا ہے اور اپنے آپ کو دہرانے

والی بات بھی نری احمقانہ ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو میر تقی میرؔ، غالبؔ، انیسؔ و دبیرؔ اور اقبالؔ تک سب پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے بلکہ اقبالؔ کی شاعری میں تو جتنی REPETITION ہے وہ شاید ہی کسی اور شاعر میں ملتی ہو، اس لئے کہ اس کا کینوس محدود ہے، وہی خودی کا ورد، شاہین کی تکرار، اسلام اور مسلمان کا ذکر، برخلاف اس کے میرے ہاں سیاسی نظموں اور مذہبی کلام کے علاوہ فلسفہ، منطق، حکمت، حسن و عشق سب کچھ ملتا ہے میری شاعری کا کینواس ہے پوری دنیائے انسانیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

میں نے کہا ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری میں نعرہ زیادہ ہے اور لہجے میں گھن گرج اتنی ہے کہ آپ کی اپنی آواز اس میں کھو جاتی ہے۔

بولے "ٹھیک ہے میرے سیاسی کلام میں اس مناسبت سے جوش، ولولہ اور جلال ملتا ہے لیکن میری شاعری میں جلالی اور جمالی دونوں کیفیتیں ایک دوسرے سے معانقہ کرتی نظر آتی ہیں، میری غزل، رباعی اور غیر سیاسی نظموں کا لہجہ بالکل مختلف ہے، دھیما اور شگفتہ اور طنزیہ۔"

میں نے کہا۔ اپنی سرگزشت "یادوں کی برات" میں آپ نے بڑی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اردو میں اپنے متعلق اس قدر صاف گوئی اور برہنہ سچائی کے اظہار کی بلاشبہ یہ پہلی مثال ہے اسی لئے آپ کی شرمیلی قوم بڑی مشتعل ہوئی ہے اور انھوں نے اعتراضات کا طومار باندھا ہے جن میں نہایت بودے اور جاہلانہ اعتراض بھی ہیں۔ ان سے قطع نظر یہ بتائیے کہ معترضین کے مطابق آپ نے ہیرو بننے کی کوشش کی ہے اور اکثر و بیشتر بے جا مبالغے سے کام لیا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ مجھے پوچھنا یہ ہے کہ اگر اتنا مبالغہ نہیں جو کہا جاتا ہے تو کتنا ہے تاکہ اسے منہا کر کے پڑھا جائے۔

"جہاں تک مبالغے کا تعلق ہے تو یہ شعراء کی فطرت ثانیہ ہے ممکن ہے مجھ سے بھی زیب داستان کے لئے، یا مضمون باندھنے کے لئے یا بھولے چوکے کچھ نہ کچھ مبالغہ ہو گیا ہو، ورنہ سچ پوچھئے تو میں نے بہت سی باتوں کو بڑے انکسار اور اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ میرے ماحول کے لئے گوارا ہو سکیں، ورنہ اگر میں وہ سب کچھ جیسا کہ میں چاہتا ہوں برملا لکھ دیتا تو شاید ان تنگ نظر اور تھرڈ لے لوگوں کے ہاتھوں میرا جینا دوبھر ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تین بار کے بار دیگرے مجھے مسودے لکھ کر تلف کرنے پڑے اور آخر چوتھی بار اسے

محتاط انداز میں پیش کیا ہے۔
اچھا اب ایک سوال میں خود پوچھنا چاہوں گا۔ آپ نے اپنی سرگزشت میں اپنے اٹھارہ
ں کا اقرار کیا ہے، بعض بقراطوں نے انھیں بھی مبالغہ جانا ہے لیکن ان کے برعکس میں یہ سمجھتا
کہ آپ ایسے دل پھینک اور رنگین مزاج شخص نے تو سینکڑوں معاشقے بھگتے ہوں گے۔ کیا اس
، میں آپ نے عمداً کسرنفسی سے کام نہیں لیا اور ایسا کیا ہے تو کیوں؟
"تم ٹھیک سمجھے ہو، درحقیقت میرے معاشقوں کا تو کوئی شمار نہیں یہ تو چند ایک یادگار
دں کا ذکر کر دیا کہ اگر میں سب معاشقوں کا ذکر لے بیٹھتا تو شاید اتنی ضخامت تو صرف انھیں
اتی۔"
ملاقاتیں اس کے بعد بھی ہوتی رہیں لیکن سرسری سی جیسے عموماً مشاعروں میں ہوتی ہیں
فعہ بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں کوثر نیازی نے کچھ اہلِ قلم کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل راولپنڈی
عو کیا، مدعوئین میں فیض صاحب اور قاسمی صاحب نہیں آئے، میرے علاوہ ابراہیم جلیس
، ابن انشاء مرحوم، شوکت صدیقی، جمیل الدین عالی اور چند ایک اور دوست بھی تھے جن کا نام
رہا ہوں، اس میٹنگ کی جو غرض و غایت تھی، اس پر تو خیر میں نے پانی پھیر دیا لیکن اس سے
مجھے جوش صاحب سے گفتگو کے لئے خاصا وقت مل گیا۔
بات یہاں سے شروع ہوئی کہ گرمی کے دن تھے پہلے کچھ ٹھنڈا مشروب منگایا گیا جو سب
لیکن جوش صاحب نے سادہ پانی لیا، پھر چائے آگئی لیکن انھوں نے چائے پینے سے
نکار کر دیا۔ میزبان نے انھیں بیئر یا وہسکی کی پیش کش کی لیکن وہ اس سے بھی انکاری تھے۔
میں نے کہا۔ چائے تو لیجئے اس میں کیا مضائقہ ہے۔
اس پر کہنے لگے "بھائی میں صبح شیریں چائے کے ساتھ روغنی روٹی کا ناشتہ لیتا ہوں
ے بعد رات کو کھانا کھاتا ہوں دن بھر مکمل فاقہ ہوتا ہے یہ گذشتہ بیس برس سے میرا معمول
دیا صائم النہار ہوں۔
میں نے کہا اس حد تک نظم و ضبط تو شاعرانہ روایات کے خلاف ہے، اور آپ کی زندگی
، کے مطابق بڑی بے نظم و ضبط گزری ہے، کوئی پابندی کبھی گوارا نہیں کی، ہر قدر کے باغی
، ہیں پھر یہ کیا۔
"جی ہاں ـــــ اسی لئے تو ان شاعرانہ روایات سے بھی روگردانی کی ہے، سرشام ہی

کھانا کھا کر سو جاتا ہوں، تہجد گزار تو نہیں لیکن تین بجے شب اٹھ کر ادبی عبادت یعنی لکھنے کا کام کرتا ہوں، اذان ہوتے ہی ٹہلنے کے لئے چلا جاتا ہوں، واپس آکر ناشتہ کرتا ہوں، پھر اخبار دیکھتا ہوں دن ڈھلتے ایک دو پیگ بڑے پریم سے تقریباً گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پیتا ہوں۔ یہ ہے میرا روزمرّہ زندگی کا معمول، جس میں شاید ہی کبھی ناگزیر حالات میں کچھ فرق آجائے ورنہ گردش چرخ دوراں بھی اس معمول کو ذرہ بھر نہیں سرکا سکتی۔

سب کو حیرت تھی کہ جوشؔ صاحب اس اجلاس میں کیوں کر آگئے جب کہ یہ مدعو بھی نہیں تھے کچھ دن پہلے اسلام آباد کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت کوثر نیازی سابق وزیر اوقاف اور اسلامی امور کر رہے تھے جوشؔ اسے بڑھ چڑھ کر داد دیتے ہوئے پائے گئے۔ حالانکہ شعرا کو ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ وہ داد لینا جانتے ہیں داد دینے میں ایسے بخیل واقع ہوئے ہیں کہ اچھے سے اچھے شعر پر کبھی بھوٹے منھ واہ تک نہیں کہتے۔ یہ بات یاروں نے ان تک پہنچائی بھی لیکن وہ ثقل سماعت کا عذر کر کے ٹال گئے اور داد دی بھی تو کوثر نیازی کو جسے شاعر تو کیا انھوں نے اسے کبھی آدمی بھی نہیں سمجھا۔ ان کی اس حرکت کو حاضرین نے بھی اور ٹی وی پر یہ تماشا دیکھنے والے ان کے مدّاحوں نے بھی بری طرح محسوس کیا۔

اجلاس کے بعد بھی جوشؔ صاحب بیٹھے رہے، یہ صورت حال بھی ان کی وضع داری کے خلاف تھی کہ وہ بھرے مشاعرے میں اپنا کلام سنا کر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کر چل دیتے تھے، اتنے میں قدرت اللہ شہاب آئے تو پتہ چلا کہ نیازی نے ان کا وظیفہ بند کر دیا ہے اور بنگلے سے نکالنے پر بھی تلا ہوا ہے، مشاعرے میں داد کے ڈونگرے بھی اسی غرض سے برسائے گئے اور اس میٹنگ میں بھی بغیر دعوت کے اسی لئے آنا پڑا، دکھ بھی ہوا کہ اس عمر میں اتنی صاحب شخصیت کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ بہر حال شہاب صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ اس پر لعنت بھیجیں ہم وزارت تعلیم کی طرف سے یہ مراعات جاری رکھیں گے۔

پچھلے دنوں قتیل بھائی پشاور آیا تو اس نے بتایا کہ وہ جوشؔ سے ملا ہے، گھٹنوں نے معذور کر دیا ہے، چلنے پھرنے کے نہیں رہے، قتیل جانے لگا تو میں بھی جوشؔ کو دیکھنے راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں اگلے دن ملنے کے لئے فون پر وقت لیا اور جا کر ملاقات کی۔ تقریباً تین گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہے، فراز بھی، ہماری تلاش میں وہیں آپہنچا۔

جوشؔ صاحب کو دیکھ کر بڑی پریشانی ہوئی، سماعت نہیں رہی، بہت مشکل سے سنتے ہیں

بینائی کمزور ہوگئی ہے، یادداشت نے جواب دے دیا ہے، گھٹنوں نے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے لاچار کر دیا ہے، بیساکھیوں کے سہارے رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں لیکن کلا ٹھلا دیسے کا دیسا ہے رنگ روغن میں ذرا فرق نہیں آیا۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح تخت پر سنگھاسن جمائے بیٹھے ہیں ان کی بیٹی، بیٹا اور داماد بھی موجود تھے، وہ تینوں ان کے مقابل بوڑھے لگتے تھے۔ خوش طبعی اسی طرح برقرار تھی، ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے، خوب چہکتے رہے، میں نے حسبِ عادت کچھ پوچھنا چاہا لیکن ان کی ہمشیرہ نے اس کی اجازت نہ دی شاید اس لئے کہ وہ ٹی وی والے جوش کے انٹرویو کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکے تھے۔ وہ انٹرویو کسی نیاز مند نے اس یقین دہانی پر لیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد نشر ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ مخالفین کے ہتھے چڑھ گیا جو ان سے اختلاف رکھنے والے انسانوں کا دانہ پانی بند کر کے انھیں بھوکوں مارنا عین اسلام سمجھتے ہیں، اسے پچھلے دنوں نشر کر کے مخالف پریس میں ان پر خوب کیچڑ اچھالا گیا اور حکومت کو اکسایا گیا اس اسلامی ملک میں وہ ایک ملحد کو کیوں پال رہی ہے فوراً اس کا وظیفہ بند کیا جائے اور بنگلہ خالی کرایا جائے اور اسے اور اس کے بچوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے فٹ پاتھ پر ڈال دیا جائے۔

یہ باتیں اس ترقی یافتہ دور میں عجائبات لگتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں آئے دن یہ عجائبات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو کچھ دانشور افسروں کا جنھوں نے ان ادب دشمن عناصر کے ظالمانہ ارادے پورے نہ ہونے دیئے ورنہ اس پیرانہ سالی اور معذوری کے عالم میں نجانے ان پر کیا گزر جاتی، ان کا عذر بجا تھا اس لئے میں بھی خاموش ہو رہا۔

اس اثنا میں وہ خاموش مگر پوری توجہ سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا غالباً وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا کیوں کہ اچانک اس نے ہمیں مخاطب کر کے فارسی کا یہ برمحل شعر پڑھا ——

گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

اور پھر خاصی دیر اس شعر کو دہراتا رہا۔ فراز کے آنے سے جیسے جوش صاحب کی طبیعت جولانی پر آگئی کچھ اپنے اشعار اور رباعیات بھی سناتے رہے لیکن حافظہ ساتھ نہیں دے رہا تھا، مصرع بھول جاتے، پرانا کلام تھا، ہم میں سے کوئی یاد دلاتا تو خوش ہو کر مصرع اٹھاتے —— اس دوران دو دفعہ ہم نے رخصت چاہی لیکن ان کا جی چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا اصرار کر کے روکتے رہے، ان کی بیٹی بڑی خاموش طبع، سنجیدہ اور مہذب خاتون ہیں، داماد دمہ کا پرانا مریض لگتا ہے نحیف

ونزار ــــــ بات کرنے میں اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ اس کی حالت پر رحم آتا۔ بیٹا بڑا ہونق ساہے' جوش کی بالکل ضد ــــــ بار بار اپنے شعر سنانے کی کوشش کرتا، جوش قرائن سے سمجھ جاتا اور پیچ وتاب کھا کر رہ جاتا۔ وہ ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے آیا اور جاتے جاتے دو ایک پہیلی سی غزلیں درجن بھر بے تکی رباعیاں سنا کر اپنا غبار نکالا۔

جوش نسلاً پشتون ہے ، اس فخر کا اظہار اس نے اپنی شاعری میں بھی اور نثر میں بھی کھل کر کیا ہے اس کے لہجے کی گھن گرج بھی سرحد سکول کی دین ہے جس کا شجرہ خوشحال خاں خٹک اور پشتو کے اولین شاعر امیر کروڑ سے جا ملتا ہے ، اسے اردو میں جدید نظم کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے پہلے اگرچہ نظمیں کہی گئی ہیں لیکن نظم میں اظہار کا بھرپور انداز اور روایت سے بغاوت کا جرأت مندانہ شعور جوش ہی نے دیا ہے حریت پسندی ، حقیقت پسندی اور صداقت اظہار کا پرچم بھی اسی نے بلند کیا اور اس طرح اس نے ایک ایسے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی جس نے آگے جا کر ترقی پسند تحریک کو جنم دیا ، یہی نہیں بلکہ جدید طرز احساس کا آغاز بھی جوش ہی کی نظموں سے ہوا ، پھر اس نے جہالت، توہمات اور عقیدہ پرستی کے خلاف اپنی شاعری میں مسلسل جہاد کیا ہے ویسے اس کا سب سے بڑا وصف انسان دوستی ہے جس کا شعور اردو شاعری میں سب سے پہلے واضح طور پر اگر کسی نے دیا تو وہ جوش ہے۔

جو مشرکِ یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط
جو مشرکِ انسان ہے، وہ انسان نہیں

"یادوں کی برات" میں جوش کے خودنوشت حالات زندگی ہیں ، اس میں اس نے کسی کو نہیں بخشا یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں معاف کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ ہوا، یہ اردو میں پہلی آٹو بائیوگرافی ہے جس میں اگر سو فی صد نہیں تو کم از کم پچاس فی صد وانکشاف حقیقت پسندی اور سچائی سے کام لیا گیا ہے اور بقول اس کے ہماری شرمیلی قوم جو ہر بات کو چھپانے کی عادی ہے اس کا ان برہنہ حقائق سے بوکھلانا برحق تھا۔ اس وضاحت سے جوش کی وکالت مقصود نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کی مخالفت جذباتی انداز سے متعصب اور تنگ نظر حلقوں کی طرف سے ہوتی رہی ہے تاہم جوش کے متعلق اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ نرگسیت کا شکار ہے، ... ہے اور اس کے لئے خود ہی اکثر وبیشتر ایسے اسباب پیدا کرتا رہا ہے۔ ویسے تو ہر شریف خود اپنی بیوی سے ڈرتا ہے لیکن جوش کی تو جیسے بیگم کے عتاب سے

جان جاتی ہے ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کا شوہر ایک پولیس افسر ہے جو اسے جا دبے جا پیٹتا بھی ہے اور اس کے فن کا مذاق بھی اڑاتا ہے، ایک موقع پر جوش نے ملکۂ موسیقی سے ازراہِ مذاق کہا۔

"کیا یہ دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہوائی ٹھیک ہے کہ تمہارا وہ کمبخت تمہیں بری طرح پیٹتا ہے"

"جی ہاں ـــــــ آپ کی بیگم کی طرح وہ میرا عزرائیل ہے۔" اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں اپنے جیون ساتھی آپس میں بدل لیں۔" جوش نے برابر کی چوٹ کی۔

"جیون ساتھی بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل سکتی جوش صاحب! نہ ہی فطرت بدل سکتی ہے، کیا معلوم کبھی پٹنے کی خواہش جاگ اٹھے تو پھر ہمیں ان ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے۔" ملکۂ موسیقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے یہ فقرہ کس کر جوش صاحب کو لاجواب کر دیا۔

ایک دفعہ جوش صاحب اپنے گھر میں دوستوں سے کہہ رہے تھے۔ "جانے کن گناہوں کی سزا مجھے اپنی بیگم کی صورت میں ملی ہے۔" اتنے میں اچانک بیگم آنازل ہوئیں، اسے دیکھتے ہی جوش کا رنگ فق ہو گیا، فوراً بات کا رُخ بدل کر مسکراتے ہوئے بولے، بس جی ہم تو اپنی بیگم کے دم قدم سے جی رہے ہیں، ہمارا تو ادب، شاعری سب کچھ اسی کے کرم سے ہے۔"

وہ اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں لکھتا ہے، میں نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن بیگم سے کبھی سچ نہیں بول سکا۔

ایک بے تکلف دوست جو مدتوں بعد ملا۔ جوش کے سر پر نظر پڑتے ہی بولا۔" ارے تمہاری تو چندیا نکل آئی یہ کہیں بھابی کے جوتوں کا کرشمہ تو نہیں۔" جوش نے مسکرا کر کہا ـــ "اسے جوتے لگانے کی کیا ضرورت ہے، میں خود ہر روز اپنے سر پر سات جوتے گن کر لگاتا ہوں کہ اس کے پلے کیوں بندھا تھا۔" جوش کی بیگم بیچاری بھی گئی، جوش کے متعلق بھی یہ بری خبر آئی ہے کہ اسے کینسر ہو گیا ہے۔

ادب و شعر، تہذیب و ثقافت، رندی و سرمستی، انا پرستی، وضعداری، دردمندی، بیباکی اور سرکشی کا یہ باب بھی ختم ہونے والا ہے۔

مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیدان رفتم

□

ڈاکٹر سید محمد عقیل
شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی

جوش کی انقلابی شاعری کا ایک معمولی مطالعہ

اس مقالے میں جوش کے سیاسی افکار اور انقلابی ذہن کا مطالعہ مقصود ہے۔ عام طور پر جوش شباب و شعر اور نغمہ و نور کے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران، انھوں نے ہر موقع پر، کچھ ایسے اشعار اور نظمیں پیش کی ہیں کہ انھیں 'شاعرِ انقلاب' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہاں نہ جوش کی وطن پرستی اور ہندوستان دوستی، ثابت کرنا مقصود ہے اور نہ ان کی شاعری کا مکمل احاطہ، اس مختصر اور معمولی سے مقالے میں کیا جا سکتا ہے، ہاں اس بات کی کوشش ضرور کی جاتی ہے کہ جوش کے انقلابی مزاج اور انقلابی نظموں نے کس حد تک ملک اور وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ اور اس میں انھیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ ان کے باغیانہ خیالات کے محور اور مدارج کیا ہیں۔ اپنے ذہنی انقلاب نے، جوش کس طرح ملک کی انقلابی صورت حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر کس طرح، ان کی انقلابی شاعری کو ان حالات سے غذا ملتی رہی ہے۔ کس طرح جوش، ملک میں آنے والے انقلاب کی طرف درجہ بدرجہ بڑھتے رہے ہیں۔ وہ آواز جو ــــ

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب   میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور ــــ

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں   قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

سے اٹھی تھی، "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" اور "تلاشی" تک پہنچتے پہنچتے، کن کن پیچ و خم سے گزری اور آزادی کے بعد، آج اس آواز کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔

جوش نے باقاعدہ نظم نگاری کا سلسلہ، تقریباً ۱۹۱۴ء میں شروع کیا جب انھوں نے عزیز لکھنوی کی شاگردی اور غزل گوئی ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ انھوں نے بقول خود، سلیم پانی پتی کی ترغیب پر کیا تھا۔ سب سے پہلی نظم جو، جوش نے لکھی وہ 'ہلال محرم'، تھی

کیوں کہ نظم نگاری کا فیصلہ، محرم کے ایام ہی میں کیا گیا تھا[1] ہو سکتا ہے کہ یہ فیصلہ انھوں نے اسی وقت کیا ہو جسے مولانا عبدالماجد دریا بادی نے۔ "لکھنؤ کی بری صحبتوں میں پڑ کر، شبیر احمد خاں، سے شبیر حسن خاں، ہو گئے"[2] سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے کچھ پہلے بقول جوش :

> "ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی سے پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلایا کرتا اور کمرہ بند کر لیتا... لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، دہشت اور اضطراب کے ساتھ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا، جیسے میرے دماغ کے اندر، کوئی خطرناک کمانی کھل رہی ہے... کچھ مدت بعد مجھ میں ایک قسم کا ہلکا باغیانہ میلان پیدا ہو گیا.... اور اب میں اس منزل میں آگیا جہاں ہر قدیم اعتقاد، ہر پارینہ روایت پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

جوش کے ذہن کی یہ ہیجانی صورت تقریباً ۱۹۲۰ء تک ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک فیصلہ لیتے ہیں۔ ہر روایتی چیز سے بغاوت کا۔ روایتی قدریں، دفتر پارینہ، ادیان، صرف اوہام اور سماجی زندگی، محض چند رسموں کی پابندی، ان کو معلوم ہونے لگی جو بدلتے ہوئے ہندوستان کے نئے ذہنوں کو آسودہ نہیں کر سکتی۔ انگریزی حکومت کا دباؤ، ان صورتوں کو برقرار رکھنا چاہتا تھا تاکہ ملک میں جو وطنیت کی لہر اٹھ رہی تھی، اسے مزید طاقت نہ مل سکے۔ ہر مورچے پر قدامت کی پاسداری اور جدت سے بھڑکنا، زوال پذیر معاشرے کا خاصہ ہوا کرتا ہے اور ہوشیار لوگ، اس کا خاص فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیوں کہ جدت اگر بااصول ہوتی ہے اور حالات کے تقاضوں سے وجود میں آتی ہے، تو وہ یقیناً ذہنوں کو متاثر کرتی ہے اور اس کو معاشرے سے طاقت ملتی ہے لیکن اگر یہ محض ایک نقالی اور اوپر سے اوڑھی ہوئی ہوتی ہے تو، اس کا قیام کسی بھی سوسائٹی میں دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں جو انگریزوں کے خلاف انقلابی لہریں بلند ہونا شروع ہوئیں تھیں، ان کی جڑیں گہری تھیں اور یہ ایک ایسے ناآسودہ سماج سے اٹھی تھیں جو ۱۸۵۷ء سے 'آہ سرد سے نگاہ کرم' کی طرف گامزن تھا۔ اردو میں نظم نگاری کی ابتدا ہی سے شعری اور فکری نظام میں تبدیلی آتی رہی تھی۔ جس کے خاص محور، غزل سے نظم کی طرف مراجعت اور نظموں میں سماجی اصلاح سے وطنیت کے جذبے کی طرف توجہ، تعلیمی نظام میں 'کریما' اور 'ماقیما' سے آزاد اور اسماعیل کی بچوں کے لئے ریڈروں تک۔ پھر حالی کی حب وطن بہ نظر باز دید دیکھ لینا چاہیے۔ جس سے ہندوستان کے بدلتے ہوئے سماج میں وقت کی رفتار اور ذہن میں آتی ہوئی تبدیلیوں کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام، بھی اس مرتے ہوئے نظام

[1] افکار کراچی جوش نمبر مطبوعہ نومبر ۱۹۶۱ء ۔ [2] جوش نمبر صفحہ ۶۳۳۔

میں ایک نئے قدم کی آمد کا اعلان ہے جو حکومت کے ساتھ، ایک متوازی تنظیم بنا کر، ابنائے وطن کی بہتری کی فکر کر سکتا ہے۔ جو بھی باشعور اور مستقبل پر نظر رکھنے والا صاحب فکر، ایسے دور میں پیدا ہوگا ممکن نہیں کہ وہ ان تبدیلیوں سے آنکھیں چرا سکے پھر جب کہ اس نے شعر و شاعری کے ایسے راستے کو چنا ہو جس میں چکبست کی ہوم رول تحریکات پر نظموں کے ساتھ ساتھ، اقبال کے ترانۂ ہندی، کی گونج، ہندوستان کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی ہو، اس پس منظر میں جوش نے اگر انقلابی اقدامات کئے تو یہ اقدام عین فضا، ماحول اور شعری روایت کے مطابق تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جوش کی لکھی ہوئی نظم 'وطن' اور اس پر لگے ہوئے نوٹ کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

> "میں تمام نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں۔ وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور دین آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ لیکن اس قدر وطنیت پر میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔

یہ خیال محض رومانی بغاوت کے سبب وجود میں نہیں آیا تھا کہ اس وقت اس طرح کا اعلان کر کے حکومت سے ٹکر لینے کی بات تھی۔ آج کی سیاست پر تنقید کرتے رہنا جیسا کام نہیں تھا۔ جنھوں نے انگریزی حکومت کا کرّ و فر اور طنطنہ دیکھا ہے۔ وہی جوش کے اس نوٹ کے عواقب کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ 'وطن' سے لے کر 'ذاکر سے خطاب' پھر 'شکستِ زنداں کا خواب' پھر 'شریکِ زندگی سے خطاب'، 'غلاموں سے خطاب'، 'حیف اے ہندوستان'، 'مردِ انقلاب کی آواز'، 'دردِ مشترک'، 'زندہ مردے'، 'مقتل کا تیور'، 'وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام'، 'وقت کی آواز'، 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے' اور 'تلاشی' تک جوش کے فکری اور ذہنی انقلاب کا درجہ بدرجہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں 'ذاکر سے خطاب'، 'حسین اور انقلاب'، 'اے مرتضیٰ'، 'اے موجد و مفکر' اور 'مولوی' کی شمولیت، ایک دوسرے موڑ کا پتہ دیتی ہے جس میں مذہب کی روایت پرستی، ظاہر بینی اور کھوکھلے اوہام کے ساتھ ان واعظین اور مولویوں کے بطون کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جو گندم نمائی کے پردے میں جو فروشی کا کام کر رہے تھے۔ جوش کے ذہنی اور فکری انقلاب کو زینہ بہ زینہ، انھیں نظموں سے دیکھنا چاہیئے، جنھیں چھوڑ کر جوش کی انقلابی شاعری کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں کچھ مقامات پر تضادات بھی ملتے ہیں، کچھ میں لحاتی منافرت اور اکثر میں ان کی بغاوت اور انقلابی مزاج کی صحیح صورتیں کارفرما ہیں۔ لیکن انھیں صرف انقلاب کا رومانوی تصور کہنا، جوش کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

جوش کے پاس انقلاب کا کیا تصور تھا؟ یہ پوچھنے سے پہلے، جوش کے ہم عصروں اور ان سے پہلے کے وطن پرست شعراسے بھی ایسا ہی سوال کرنا چاہئے۔ جو لوگ جوش سے ایسا سوال کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جوش، ایک شاعر اور فن کار تھے، وہ کوئی سیاسی مفکر اور رہنما نہ تھے کہ انقلاب کا کوئی ایسا باضابطہ نظام پیش کر سکتے، جیسا کہ دنیا کے انقلابیوں یا انقلابی مفکرین مثلاً مارکس، اینگلز، ماؤزے تنگ، لینن اور ہندوستان میں ایم۔ این۔ رائے یا گاندھی جی نے پیش کیا۔ انھیں چینی انقلابی سن یات سین یا ہوچی منہ کے تصوراتی پیمانے سے بھی ناپنا مناسب نہیں ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے انقلابی شعرا ہی سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے یہاں جوش کا کوئی دفاع پیش نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی انقلابی شاعری کی حیثیت کو صحیح پس منظر میں جانچنے کی ایک کوشش ہے کہ ہر ادیب اور شاعر کا تجزیہ، اس کے پس منظر اور گرد و پیش کے ماحول ہی سے کرنا چاہئے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں، جہاں گوپال کرشن گوکھلے، تلک، مسز اینی بسنت اور گاندھی جی، ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت، سیاست کا رخ بدلتے تھے۔ وہاں کسی منظم انقلاب کا اگر کوئی تصور کسی کے پاس تھا تو صرف اس قدر کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ اس کا طریق کار کیا ہوگا، یہ بہت کچھ اس وقت کے حالات پر منحصر ہوتا تھا۔ چنانچہ چکبست نے جو مشہور نظم 'ہوم رول' پر لکھی تھی، اس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

برطانیہ کا سایہ، سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا، اور ہوم رول ہوگا

پھر اس کے بعد یہ بھی کہ ؎

یہ اپنے حال پہ جو بیکسی برستی ہے — یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے — وہاں سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے
جو اُن پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے — یہ دیکھتے رہیں، بیڑہ یہ پار ہو جائے

یعنی انگریزی حکومت کا جو عملہ، ہندوستان میں ہے، دراصل وہ ہم کو ستاتا ہے۔ برطانیہ کے انگریز اور برطانیہ کا بادشاہ، ایسا نہیں چاہتا۔ اس تصور میں، جو انگریزوں کی خوشامد اور ہندوستانی سیاست کی مفاہمت پرستی اور سیاسی انقلاب کے لئے "جی حضوری" کی جو کے شامل ہے، وہ چکبست کی اپنی آواز نہیں ہے بلکہ بورژوا سیاست کی آواز ہے جس کی قیادت وہ تمام لوگ کر رہے تھے جن کے نام اوپر پیش کئے گئے۔ صرف تلک، ان میں مستثنیٰ ہیں۔ اِسی سیاست سے مفاہمت کے لئے 'ساحلِ ہند سے

جو آرانِ وطن، جو محض جنگ لڑنے مرنے کے لئے گئے تھے لیکن جب وارسائی کے صلح نامے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مسائل میں کوئی دلچسپی نہ لی اور جو وعدے انھوں نے کئے تھے، انھیں پورے نہیں کئے تو ہندوستان کی بورژوا سیاست کے پول کھل گئے۔ اسے دھکا بھی لگا۔ انگریزوں کی خوشامد کر کے، ان سے صوبائی حکومتوں کا حاصل کر لینے کا ہندستانی سیاست کا خیال خام بالکل بودا اور بیجان ثابت ہوا۔ ایسی صورت میں جوش سے کسی منظم انقلاب کی تاسیس یا اصول سازی کی توقع کرنا، بہت بڑی زیادتی ہے۔ سیاست کے ایسے دھندلے دور میں، 'وطن' نظم میں جوش کے یہ اشعار، ایک داغ بے ریا اور کسی حد تک جذباتی وطنیت کی طرف ضرور متوجہ کرتے ہیں۔ اور اگر شکستِ زنداں کا خواب، ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی ہے جیسا کہ 'شعلہ و شبنم' کے پہلے ایڈیشن پر یہ تاریخ مندرج ہے تو جوش کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ہمت کی داد دینی پڑے گی۔ 'وطن' میں جوش کے کچھ اشعار یوں ہیں ؎

اے وطن، پاک وطن، روحِ روانِ احرار اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگِ بہار

ہم زمین کو ترے ناپاک نہ ہونے دیں گے تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے

جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گزر جائیں گے کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

اِس پوری نظم میں، صاف طور پر چکبست اور اقبال کی ملی جلی گونج سنائی دیتی ہے۔ مگر مفاہمت یا دلداری کی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ اور پھر شکستِ زنداں کا خواب، میں تو ایسے اشعار ہیں جو انگریزی حکومت کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہیں ؎

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہے
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

تقریباً اسی کے گرد و پیش وہ چھوٹی سی نظم بھی ملتی ہے جو لمحۂ آزادی، کے نام سے 'شعلہ و شبنم' میں درج ہے۔

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

ایسی باتیں سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد کہنا تو آسان تھا مگر سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء یا سنہ ۱۹۳۰ء تک بھی، اس طرح کی باتیں، حکومت کو مخاطب کر کے یا عوام سے کہنا بہت مشکل بات تھی۔ ان سنین کے درمیان شمالی ہندوستان کے مشہور اخباروں کی فائلوں میں بہت سے بیانات، سیاسی مفکرین اور قائدین کے بھی ہیں مگر کسی میں، اتنا واضح بیان شاید ہی ملے۔ یہ بات ابھی شاید لوگوں کو یاد ہو کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں حسرت موہانی نے جب احمد آباد کے کانگریس کے اجلاس میں، آزادیٔ کامل، کا رزولیوشن سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس میں پیش کر دیا تھا تو گاندھی جی، گھبرا گئے تھے اور اس طرح کے رزولیوشن کو قبل از وقت قرار دے کر انھوں نے رزولیوشن واپس کر دیا۔ کوئی بھی مصلحت پسند، ایسے نازک موقع پر، اس طرح کی باتیں نہیں لکھ سکتا جس طرح باتیں 'شکستِ زنداں کا خواب' یا 'حیف اے ہندوستاں' میں لکھی گئی ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے قریب کی ایک نظم 'خریدار تو بن' کا پہلا ہی شعر آزادیٔ کامل، کے تصور سے شروع ہوتا ہے جس میں حسرت موہانی اور ملک کے عوام کے تقاضوں کی گونج سنائی دیتی ہے ؎

اے دل، آزادیٔ کامل کا سزادار تو بن
پہلے اس کا کلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

اور پھر اسی نظم کے مقابل کی دوسری نظم "خریدار نہ بن" کا آخری شعر یوں ہے ؎

پست سے پست ہو جو چیز، وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

یہ اشعار، ہندوستانیوں کی رگ حمیت پر ایک ضرب ہیں۔

گاندھی جی ایک عملی سیاست داں تھے۔ وہ ملک کی رفتار اور انگریزوں کی طاقت کا اندازہ خوب اچھی طرح کر چکے تھے۔ ہندوستان کے عوام الناس کا مزاج بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس وقت انگریزوں کو ناراض کر کے، کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہندوستان ابھی اس قابل ہے کہ اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لے سکے۔ اگر ٹکر کی نوبت آئی تو سوا کشت و خون کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مفت میں جانیں جائیں گی۔ جوش کے انقلابی خیالات کی عملی صورت بھی سوا کشت و خون کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ ذہن تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر صرف ذہن کی بیداری کسی انقلاب لانے کے لئے برگ و ساماں کا کام نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی انقلاب لانے والی جنگ یا شورش کا ساز و سامان بن سکتے ہیں۔ سید احتشام حسین نے جوش کے لئے ایک جگہ بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ :

"جوشؔ، اس پُرخلوص سپاہی کی طرح گولیاں چلاتے رہے جو جنگ فتح کرنے کی دھن میں اتنا دیوانہ ہو چکا ہے کہ نہ اپنے ساتھیوں پر نگاہ رکھتا ہے، نہ میدانِ جنگ کی شاطرانہ چالوں سے کام لیتا ہے اور جنگ کے دوسرے محاذوں کی حالت سے بھی واقف نہیں۔"

جوشؔ کے خیالات، ذہن کو اکساتے رہے، ہندوستانیوں کو بغاوت کی دعوت دیتے رہے، مگر یہ بغاوت، بے ساز و برگ بغاوت تھی۔ اصل انقلاب لانے والا طبقہ، ہندوستان میں، اس وقت تک صحیح طور پر بیدار نہیں ہوا تھا اور سچ بات یہ ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں انقلاب کا صرف ایک ہی بازو، یعنی کسان موجود تھا۔ مزدور طبقے کا آتنا عملی اقدام، اس وقت تک نہیں ہو سکا تھا۔ جوشؔ نے ۱۹۳۴ء کے قریب 'کسان' پر جو نظم لکھی ہے، وہ ان کی حالات سے باخبری کی دلیل ہے، صرف رومانوی 'ہاؤ ہو' نہیں، اگرچہ ان کے اسٹائل سے یہی مترشح ہوتا ہے۔

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزّ و وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاج دار
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ
دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منھ، گھر کی جانب ہے رواں
اپنی دولت کو، جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے

یہ وہ دور تھا جب ۳۳-۱۹۳۲ء میں کسان آندولن، بڑے زور شور سے شروع ہو چکا تھا۔ کسانوں نے لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی زمینیں بحقِ سرکار ضبط ہو رہی تھیں۔ ان کے کھیتوں سے انھیں بے دخل کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف انتشار کی صورت تھی۔ ادھر ۱۹۳۴ء کے زلزلے نے بہار کے کسانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے کسانوں کے مسائل پر پریم چند کا گوشۂ عافیت اردو میں اور چوگان ہستی شائع ہوا اور اسی مسئلے پر پریم چند کا ایک اور ناول گئو دان، تشکیل کی منزل میں تھا۔ کسانوں کا مسئلہ، ہندوستان کے شعرا اور ادیبوں کو خاصا، متوجہ کر رہا تھا۔ کساد بازاری کا دوسری طرف یہ عالم تھا کہ غلّہ، فصل پر تقریباً ایک روپئے میں بیس سیر بکتا تھا۔ ایسی حالت میں کسانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب 'تلاشِ ہند' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اور اس دور کے مزدوروں اور کسانوں کی پوری تفصیل، رجنی پام دت کی کتاب 'نیا ہندوستان' میں مزید تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ قحط، مفلسی اور مفلوک الحالی کی صورتیں، قدم قدم پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ کون حساس ادیب، ان حالات کی طرف آنکھیں چرا سکتا تھا۔ ہندی کے ادیبوں میں، میتھلی شرن گپت

نرالا، بال کرشن شرما نوین اور سبھدرا کماری، سب کی شعری تخلیقات، ان حالات سے متاثر ہیں۔ کسان مزدور، ملک میں جنگ آزادی کی کشمکش، ملک کو آزاد کرانے کی فکر، ہر باشعور اور ترقی پذیر ادب کا مزاج بن رہی تھیں۔ چھایاوادی، جو رنگ و نور، شہد و شبنم، چاندنی اور جھرنوں کی باتیں کرتے تھے ان کے یہاں ملک سے محبت کے اظہار کی لہریں ابھر آئی تھیں۔ اِن حالات نے جوش کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے آواز دی ؎

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے ۔۔۔ اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں ۔۔۔ مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں

کان پور کے ۱۹۳۱ء کے ہندو مسلم فساد میں تقریباً سات سو افراد ہلاک ہوئے۔ جوش کے تجزیئے کے مطابق، انگریزی حکومت ایسے فسادات کرا رہی تھی اور ہندو مسلمان، جو آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے، انھیں جنگ آزادی میں پیچھے ڈھکیلنے کا یہ اچھا حربہ، ان کے ہاتھ آیا تھا۔ "مقتل کانپور" لکھ کر جوش نے طیش اور طنز کے انداز میں اس نظم میں اپنے دل کی آواز بلند کی ؎

س طرح انسان اور شدت کرے انسان پر ۔۔۔ تف ہے تیرے دین پر، لعنت ترے ایمان پر
رکنے ہی والا ہے، آزادی کا جاں پرور جہاد ۔۔۔ اے فرنگی اِشادماں باش و غلامی ! زندہ باد

یر کی خدمت گزاری، باہمی خوں ریزیاں ۔۔۔ دوپہر کی دھوپ سر پر، اور یہ خوابِ گراں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

ردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے ۔۔۔ اتنی غلام قوم میں ہمت کہاں ہے جوش

یتھلی شرن گپت کے 'ساکیت'، اور 'جھنکار' میں بھی یہی کیفیت کبھی کبھی ابھرتی ہے۔ اگرچہ یہ جلال کوکل نیت جی کے یہاں نہیں ہے۔

۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن آیا اور اس نے ہندوستانیوں سے مفاہمت چاہی تو ملک میں سیاسی سرگرمیاں رکھنے والے، دو گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ مفاہمت کے حق میں تھے، کچھ اس کمیشن کو محض انگریزوں کی ایک چال سمجھ رہے تھے، جو جنگ آزادی کی تیزی کو منتشر کو دے۔ جوش دوسرے گروہ کے ساتھ ہو گئے اور 'زوال جہانبانی' جیسی نظم لکھی معلوم نہیں کہ جو لوگ، جوش کو موقع پرست اور محض رندلاابالی اور سیاسی انقلابات سے بے خبر، کہتے ہیں، وہ جوش کے ایسے اشعار کا کیا تجزیہ کریں گے؟ ۱۹۲۸ء میں کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہندوستان کی تقدیر کیا ہو گی؟

اٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داروں کی جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریار
ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہے کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت، سر جھکا
نہ ہو مغرور، اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنا
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا ضرورت ہے، قفس پر اب تجھے بجلی گرا

کوئی چاہے تو اس نظم پر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں اقبال کے 'خضرِ راہ' کی بازگشت ہے اور کچھ نہیں
مگر سوچنے کا یہ طریقہ، صحیح تنقیدی رویہ نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

"جوشؔ کی ساری گھن گرج، ایک نادان کے ہاتھ کی تلوار ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس سمت رُخ کرے گی اور کس کا گلا کاٹے گی۔ اس طرح کی گھن گرج اور دشنام طرازی میں جرأت اور دلیری ضرور پائی جاتی ہے، لیکن یہ جرأت اپنے اندر کوئی شعور نہیں رکھتی۔ یہ کبھی کبھی ناداں کے ہاتھ میں تلوار بن جاتی ہے جس سے وہ اپنا گلا بھی کاٹ سکتا ہے اور اس کا بھی جس کا وہ دوست ہو۔"

(فکر و فن ص۱۴۶ ص۱۴۸)

یہ جوشؔ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء تک جس طرح درجہ بدرجہ، سیاست
ہر موڑ پر جوشؔ نے جو کچھ لکھا، اس سے تحریکِ آزادی کے مفاد کو کیا نقصان پہنچا؟ یا سیاست کی صحیح
کو چھوڑ کر انھوں نے کون سا قدم ایسا اٹھایا جس سے تحریکِ آزادی یا اس وقت کی ترقی پسند سیاست
لئے ان کی نظمیں نقصان دہ ثابت ہوئی ہوں اور اس طرح نادان کے ہاتھ میں تلوار کا انھوں نے کام کیا
پھر جوشؔ، جنگِ آزادی اور انقلاب کے نہ تو منتظم تھے، نہ ان کے ہاتھ میں، ملک کے سیاست دانوں
طرح سیاست کی باگ ڈور تھی کہ ان کی غلط پالیسی کی وجہ سے تحریکِ آزادی کو کوئی دھکا پہنچا ہو۔ ان
یہ سوجھ بوجھ کتنی ہی لمحاتی اور جذباتی کیوں نہ رہی ہو، مگر ملک کی قومی سیاست سے ہمیشہ قدم ملا کر چلتی رہی۔

سائمن کمیشن کے سلسلے کی دوسری نظم 'دامِ فریب' ہے اور پھر 'زنداں کا گیت'، جوشؔ
اس طرح کی نظم نگاری کا سلسلہ، برابر قومی سیاست کے پیچ و خم کے ساتھ چلتا رہا ہے۔ اور یہ باتیں
نظمیں محض تفریحاً، صرف محفل آرائی کے لئے نہیں ہو سکتیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ وہ وقت
جب جوشؔ حیدر آباد کی نشاط انگیز محفلوں میں، بہ ظاہر 'دینا و مافیہا' سے بے خبر ہو سکتے تھے اور عا
پر یہی سمجھا بھی جاتا تھا۔ ان کا شمالی ہندوستان سے بھی برائے نام واسطہ رہ گیا تھا، جہاں قومی سیا
سب سے زیادہ متحرک اور جاندار سمجھی جاتی تھی۔ پھر جو آدمی، شاہی کے زیرِ سایہ پرورش پا رہا ہو، ا

ار سے وابستہ ہو جہاں، فانی بدایونی اور جلیل مانکپوری جیسے اساتذہ کی صحبتیں تھیں، اسے ایسے سیاسی ل سے کیونکر دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے جب تک اس کا ذہن اور ضمیر بیدار نہ ہو۔ ایسے ماحول میں رہ کر، اس کیفیت کے، کس طرح جوش، سائمن کمیشن، گول میز کانفرنس اور کسانوں کے اندولن سے ن ہی نہیں بلکہ متاثر رہ سکے ہوں گے؟۔ یہ سوال ان لوگوں سے خاص طور پر پوچھا جانا چاہئے، جو ں کو صرف ایک خوش باش رومانی شاعر سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے آنے پر جوش کی 'دام فریب' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہیں ہے دھوپ سے نادان، بدتر — غلامی کی گھٹا کا شامیانہ
لگی ہے گھات میں مدت سے تیری — فرنگی کی نگاہِ جادوانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر — مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو — سنا دشمن کو پڑھ کر یہ ترانہ

"برو، این دام، بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را، بلند است آشیانہ"

ر اسی حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء میں 'زنداں کا گیت' لکھا گیا ؎

یہ رنگ کیا ہے کشورِ ہندوستاں کا آج — ہر ذرۂ حقیر ہے بستاں لئے ہوئے
اس موجِ خوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس — یہ موجِ خوں ہے، لعلِ بدخشاں لئے ہوئے
ان جالیوں پہ محبسِ تاریک کی نہ جا — یہ جالیاں ہیں، جنبشِ مژگاں لئے ہوئے
ان کروٹوں کو، اہلِ قفس کی، سبک نہ جان — یہ کروٹیں ہیں، موجۂ طوفاں لئے ہوئے
آزادیوں کو دیکھ رہا ہے لطیف خواب — زندانیانِ عشق کو زنداں لئے ہوئے
جوش، اہلِ دل کے پاؤں کی زنجیر پر نہ جا — یہ سلسلہ ہے زلفِ پریشاں لئے ہوئے

ھر ۱۹۳۲-۳۳ء میں ان کی نظم 'ہوشیار' چھپی۔ اس میں بھی اسی طرح کا انتباہ اور آگہی کی باتیں کہی گئی ہیں ؎

ضعف و قوت میں توازن پھر یہ ممکن ہی نہیں — پھول سے کلیوں کا ہر پیمان ہے نااستوار
رحم کی درخواست سے پہلے، یہ دل میں سوچ لے — خون ہے خادم کا، آقا کے گلستاں کی بہار
تن سے رخصت ہو رہی ہے روح مزدورِ ضعیف — حلق پر رکھا ہوا ہے خنجرِ سرمایہ دار
دیکھتا ہوں عصرِ حاضر کی نگاہِ مہر میں — وہ دہکتی آگ، کانپیں جس سے دوزخ کے شرار

پھر ۱۹۳۹ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے، والی نظم کے لئے جوش کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ تو جوش نے "تلاشی" نام کی نظم لکھی جسے پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ "تلاشی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد — آمرے دل کی تلاشی لے کر بَر آئے مراد
جس کے اندر دہشتیں پُر ہول طوفانوں کی ہیں — لرزہ افگن آندھیاں، تیرہ بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں، اے دشمن ہندوستاں — شیر جس میں ہنکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں، افسر دار ژنگ کی — جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبلِ جنگ کی

ان تمام اشعار اور نظموں کے بعد، جو کہ درجہ بدرجہ، جوش کے سیاسی عقائد کے مدارج طے کرتی ہیں، ان کے لئے یہ کہنا کہ:

"جوش کی عام طور پر یہ عادت ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کو اپنی قوت نظم کے بل بوتے پر شعر کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کو یہ بات سمجھا دی کہ یہ موضوع بڑا اہم ہے یا ترقی پسند ہے تو جوش فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں چونکہ یہ موضوع ایک تخلیقی عمل سے گزر کر ان کی شخصیت اور ان کے شاعرانہ ادراک سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، اس لئے اس کا ایک خلاصہ یا دھندلا سا تصور لے کر قافیہ پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔" (فکر و فن ص ۱۵۳)

یہ مناسب بات نہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر شاعر خالص سیاسی انداز کی شاعری کرے تو، پایۂ شاعری سے ساقط ہو جائے۔ اگر صرف حالات کا پرتو پیش کرے تو وہ صرف قافیہ پیمائی کر رہا ہے۔ تو پھر اس کا کیا فرض ہے اور اس سے، اہل علم کے تقاضے کیا ہیں۔؟ اگر کوئی شاعر، کارل مارکس کا فلسفہ نظم کر دے تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ شاعری کیا ہوئی؟ اور اگر اس تحریک سے متاثر ہو کر، کچھ لکھے جو ہندوستان گیر تحریک ہے تو اسے محض سنی سنائی باتوں کا ناظم محض کہا جاتا ہے۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ پھر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اردو شعراء میں وہ کون سا شاعر ہے، جس نے قومی سیاست کو جذب کر کے ایسی شاعری کی ہے جس میں نہ پروپگنڈہ ہے، نہ کف دردہاں چیخ اور نہ محض ہنگامیت جب بھی شاعری، کسی قومی تحریک یا سیاسی مسلک سے وابستہ ہوگی، اس میں خطابت کا آنا لازمی ہے اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک تمام قومی تحریک سے وابستہ شاعری، اس خطابت سے خالی نہیں۔ یہاں تک کہ ہندی اور بنگالی شاعری بھی اس سے خالی نہیں۔ انگریزی ادب میں بھی ساسون اور ٹریچ یونش

(TRENCH POETS) کی مثالیں موجود ہیں۔ پھر لوئی میکنیس، آڈن، اسپنڈر۔ سی۔ ڈے۔ لیوس اور تمام کنٹری پوئٹس (COUNTRY POETS) کوئی اس سے خالی نہیں ہے۔ سی۔ ڈے۔ لیوس نے اپنی نظم "دی والنٹیر (THE VOLENTEAR) میں ایک کتبہ، ان لوگوں کے لئے تحریر کیا جنھوں نے انٹرنیشنل بریگیڈ (INTERNATIONAL BRIGADE) میں بھرتی ہو کر جنگ کی تھی اور مارے گئے تھے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا یوں ہے۔

TELL THEM IN ENGLAND, IF THEY ASK
WHAT BROUGHT US TO THESE WARS
TO THIS PLATEAU BENEATH THE NIGHTS
GRAVE MANIFOLD OF STARS

IF WAS NOT FRAND OR FOOLISHNESS
GLORY, REVENGE OR PAY:
WE CAME BECAUSE OUR OPEN EYES
COULD SEE NO OTHER WAY.

اس نظم کو پنٹو (PINTO) نے اپنی مشہور کتاب 'کرائسس ان انگلش پوئٹری' میں لکھا ہے کہ اس نظم میں ایسی کلاسکی تابندگی اور روانی ملی جسے خطابت میں بھی کنٹری پوئٹس (COUNTRY POETS) کے کسی شاعر کا کلام نہیں پاسکا۔ اوپر کے اقتباس میں، ملکی اور سیاسی حالات اور جنگ میں شامل ہونے کے عقلی جواز کے ساتھ پروپگنڈہ کو شامل کر کے، شاعر نے نظم دالنیٹر کو لافانی بنادیا۔ آج یہ نظم، سوا ایک تاریخی واقعے اور ملک پر جاں نثاری کی داستان کے اور کیا ہے۔؟ پھر کلاسکیت، اگر کچھ ہے، تو ایک لمحے کی تہذیب اور جاں نثاروں کے ایثار کی داستاں بس، یہی شعری سانچہ، اشعار کی دار و بست اور شاعر کے جذبے کا بہاؤ، نظم میں قوت (VIRILITY) پیدا کرتے ہیں اور جوش کی تمام نظموں میں یہ قوت، یہ بہاؤ اور کلاسکیت موجود ہے۔ پنٹو کے الفاظ میں۔ ان میں ایک INNER RADIANCE OF FEELING حد درجہ موجود ہے لیکن جوش کا اطناب، کہیں کہیں مصرعوں کو بے کیف بھی بنا دیتا ہے جسے، سی۔ ڈے۔ لیوس نے EMOTIONAL THINNESS سے تعبیر کیا ہے اگر جوش کے پاس تغزل اور شعریت کا فن نہ ہوتا تو ان کا انقلابی اور سیاسی موضوع، وقتی اور لمحاتی ہونے

کے سبب سے بے حد ناپائدار ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ وقتی اور ہنگامی موضوعات آج بھی، اسی شغف کے ساتھ نظم کئے جاتے ہیں، جس طرح بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں نظم کئے گئے۔ یہاں تک کہ ابھی ہندوستان اور پاکستان.... پاکستان کی لڑائی کے وقت پاکستان کے مشہور جدید غزل گو ناصر کاظمی نے بھی 'سیالکوٹ تو زندہ رہے گا، صدائے کشمیر، ہوا باز ہمارے، 'سرگودھا میرا شہر، پاک فوج کے جواں تو ہے عزم کا نشان' ' ہر محاذ جنگ پر، اے ارض وطن، 'گلشن پاک ہمارا' جیسی نظمیں لکھی ہیں جن میں محض یک رخا پروپگنڈہ ہے۔ اس مجموعے کی حیثیت خود شاعر کی نظر میں کیا رہی ہے اس کے لئے نشاطِ خواب، (ان نظموں کے مجموعے کا نام ہے) کے پہلے صفحے پر یہ شعر لکھا ہوا ہے

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

~~۱۹۳۶ء~~ ۱۹۳۶ء میں جوش نے دلی سے کلیم نام کے رسالے کا اجرا کیا۔ اس رسالے کے ~~۱۹۳۷ء~~ کے ایک نمبر میں، انھوں نے ایک معرکے کا مضمون لکھا۔ جس کا عنوان تھا "اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت"۔ اس مضمون میں سے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی انقلاب اور انقلابی شاعری، اس وقت جوش کے کتنے محبوب موضوعات تھے۔

"میں حیران ہوں، کیا آپ واقعی نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے۔ دانے دانے کو ترس رہا ہے۔ کیا آپ کے علم میں اب تک یہ نہیں آیا کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں، بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں۔"

●

"لیکن ہندوستانیو! تمھاری سماعت کو کس طرح طوفانی بجلی کی کڑک اچک لے گئی۔ کیا واقعی تم نہیں سنتے کہ ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے۔ سنسنا رہا ہے.... اور کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پر اسرار سناٹا، پہنائے عالم کا احاطہ کر لیتا ہے تو نامعلوم سمتوں سے 'انقلاب۔ انقلاب، کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔" (افکار، جوش نمبر ص ۵۱۰)

اس مضمون میں جا بجا ہندوستان کی زبوں حالی، افلاس اور کس مپرسی کا جہاں ذکر ہے، وہیں ذہن اور فکر میں بھی انقلاب لانے کی باتیں ہیں۔ ظاہر ہے یہ باتیں وہی کہہ اور کر سکتا ہے جو واقعی اندر سے

تبدیلی کے لئے فکر مند ہو۔ یہ باتیں نہ صرف محفل سازی کے لئے ہیں اور نہ محض "سن کر" فیشن کے طور پر لکھی گئی ہیں اور نہ صرف رسالہ فروخت کرنے کے لئے۔ اس مضمون کا لکھنے اور چھاپنے والا، اس بات سے باخبر ہے کہ ایسی باتوں سے اس وقت رسالے نہیں چل سکتے تھے۔ جیسا کہ 'کلیم' کا حشر بھی ہوا مشکل یہ ہے کہ انقلاب کے تصور کو اگر کوئی صرف اشتراکیت سے وابستہ کرے گا تو یقیناً، اس وقت، جب یہ نظمیں اور مضامین لکھے گئے ہیں، جوش کے پاس اشتراکیت کا کوئی واضح کیا، دھندھلا تصور بھی نہ تھا۔ 'وقت کی آواز' جو ۱۹۴۵ء کے اواخر میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے، جوش نے شاید ہی اشتراکیت کے فلسفے یا اشتراکی انقلاب کی بات کی ہو۔ پھر ان کے پاس اشتراکیت کا کیا شعور تھا، یہ کہیں بھی واضح طور پر جوش نے 'وقت کی آواز' سے پہلے، دوسری اور تیسری دہائی میں ظاہر نہیں کیا۔ لیکن ان کا سیاسی شعور، جیسا کچھ بھی تھا، وقتی ہنگامہ آرائیوں میں کھویا نہیں۔ آزادی کی لڑائی لڑتے ہوئے، ہندوستانی سیاست میں، بہت سے پیچ وخم آئے۔ جون ۱۹۴۱ء میں، سویت روس پر جرمنی کے حملے نے عالمی جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا اور یہ خیال عام ہونے لگا کہ محوری طاقتیں، متحد ہو کر، تمام دنیا کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی ہیں۔ جنگ کا جو نقشہ بن رہا تھا، اس میں دنیا سامراجی اور سوشلسٹ نظام، دونوں سے نکل کر فاسسٹوں کے قبضے میں پہنچنا چاہتی تھی۔ یہ ایک ایسا نظام بن رہا تھا جس میں رہی سہی انسانیت کے پرخچے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست، دوسری جنگ عظیم کے قریب بہت کچھ اشتمالی صورتوں اور اشتمالی نظام زندگی کو پسند کرنے لگی تھی۔ جواہر لال نہرو نے جب ۳۶-۱۹۳۵ء میں روس کا دورہ کیا تھا، وہاں کے حالات سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ وہ خاصے سوشلسٹ ہو گئے تھے۔ پھر سامراجی، جو ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے، ان سے اگر کوئی نجات دلا سکتا تھا تو صرف سوشلزم کی طاقت اور فکر ہی ہو سکتی تھی۔ محوری طاقتوں سے ہاتھ ملا کر، انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کا تصور، نہ گاندھی جی کو پسند تھا اور نہ کسی سوجھ بوجھ رکھنے والے اچھے سیاست داں کے حلق سے یہ بات نیچے اترتی تھی۔ اس لئے کہ اس میں خطرہ زیادہ تھا اور فائدہ شاید ہی ہوتا۔ لیکن انگریزوں سے، ہندوستان اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ، کچھ لوگ نجات کا یہ ذریعہ بھی سوچتے تھے کہ جس طرح بھی ہو، انگریزوں سے نجات فی الحال حاصل کر لی جائے، بعد کو دیکھا جائے گا۔ لیکن ایسے لوگ نہ دور میں تھے اور نہ انہیں محوری چالوں کا صحیح اندازہ تھا۔ سید ھارات، سوشلزم ہی کا زیادہ سمجھ میں آتا تھا۔ اس طرح ملک کی اس وقت کی جدید سیاست، تیسری دہائی کے بعد، چوتھی دہائی میں داخل ہوئی تو سوشلزم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ ہونے لگا۔ ملک کی قومی سیاست کی نظر، روز بروز اشتراکی طاقت پر پڑنے لگی۔

تاہم ہندوستان، ایک اور چپقلش میں گرفتار تھا۔ صورت حال عجیب و غریب تھی۔ اگر ہندوستانی، لڑائی میں اتحادیوں کی مدد نہیں کرتے تو نازی فاسسٹوں کی طاقت انھیں سمیٹ لے گی اور اگر مدد کرتے ہیں تو سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں، ہندوستانی، مدد کر کے سامراجیوں سے دھوکا بھی کھا چکے تھے۔ اس طرح عجیب کشمکش کی منزل تھی۔ تلاش ہند میں جواہر لال نہرو نے کسی مصری سیاست داں کا ایک طنزیہ جملہ لکھا ہے۔ مصری سیاست داں نے جواہر لال نہرو کو مخاطب کر کے کسی کانفرنس میں کہا:

"YOU HAVE NOT ONLY LOST, YOUR OWN FREEDOM, BUT YOU HELP THE BRITISH TO ENSLAVE OTHERS."

(آپ لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی آزادی کھودی ہے بلکہ دوسروں کو بھی غلام بنانے میں برطانیہ کی مدد کر رہے ہیں)

لیکن یہ بات دھیرے دھیرے ضرور واضح ہو رہی تھی کہ ہندوستان، اب انگریزوں کے ہاتھ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ ایک واضح تبدیلی آئے گی، جس کا انتظار کرنا چاہئے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں 'مستقبل ہندوستان' کے عنوان سے، جوش نے ایک نظم لکھی، جس میں اس امید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ اب حالات بدل رہے ہیں۔ جلد ہی ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ ہونا چاہتا ہے۔ یہ نظم 'سنبل و سلاسل' کے صفحہ ۱۳۲ پر درج ہے جس کے حسب ذیل اشعار قابل توجہ ہیں ؎

یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر — زمیں کا ذرہ ذرہ پُر فشاں معلوم ہوتا ہے
اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹپٹے کا طرفہ آئینہ — تبسم کارواں در کارواں معلوم ہوتا ہے
بحمداللہ کہ جوش، اس صبح نو کی تازہ کاری میں — مجھے مستقبل ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

اس کے بعد، جوش کے یہاں نئے سیاسی شعور کے ارتقائی مدارج کی بہت واضح جھلک نہیں ملتی۔ 'تین فریادیں'، 'بے چارگی'، 'درس آدمیت'، اور 'رشوت'، میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ حالات سے نا آسودگی کا اعلان تو ہے مگر سیاسی ذہن کی کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اب حکومت اپنی تھی اور جوش بقول اکبر "مدخولۂ گورنمنٹ" ہو چکے تھے۔ وہ 'آج کل' اور 'بساطِ عالم'، کے ایڈیٹر تھے جو سرکاری ادارہ تھا۔

جوش کے یہاں منضبط (WELL KNIT) فلسفۂ فکر کی تلاش بیکار ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر اچھے شاعر کے یہاں کوئی باقاعدہ فلسفۂ فکر لازمی طور پر مل جائے۔ لیکن اگر کسی سلسلۂ خیال

کو ربط دے کر کوئی فلسفۂ فکر بنانا ہی چاہے، تو جوش کے یہاں، انسانی محبت، بھائی چارہ اور آدمیوں کے ساتھ خلوصِ مجسّم، ایک سلسلۂ خیال بن سکتا ہے۔ جوش عملی سیاست کے آدمی نہ تھے لیکن اپنی انقلابی جدو جہد سے اوہام اور جہل کے خلاف، ایک طرح کی بغاوت پیدا کر کے، انسانی قدروں کی مدد سے، اخوت اور محبت کے مادّی فلسفے کو الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ایک عالمگیر برادری کا تصوّر ابھرتا ہے اور جس کا ادراک صرف لمحاتی جذبات پر نہیں، بلکہ ان حقیقتوں پر ہوگا جو حرکت و عمل اور قوتِ حیات سے پائندہ ہوتی ہیں۔ اور اسی کے لئے شاید انھوں نے اوہام ادیان کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کی تھی کہ دنیا کے مذاہب، صرف انسان کی وحدت کے قائل ہیں، باقی تمام باتیں فروعی ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنی اسلامیات کی شاعری پیش کی ہے، وہاں اسلام کی ایسی فروعی باتوں سے بغاوت بھی کی ہے جو محض روایتی طور پر اوہام کے سہارے اسلام میں داخل ہو گئی ہیں، جنھیں مفاد پرست مولوی، اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جنھیں اسلام کی اصل روح سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر ان باتوں کے خلاف آواز اٹھانا، خود کو مصیبت میں ڈالنا تھا، جیسا کہ یگانہ کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ تاہم جوش کی ایسی باغیانہ نظموں میں، ان نظموں کی روح کو تلاش کرنا چاہئے اور بقولِ جوش

الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنیٰ الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

جب جوش کی نظمیں، 'پیغمبرِ اسلام'، 'ذاکر سے خطاب'، 'متولیانِ وقفِ حسین آباد سے'، چھپیں، تو روایت پرستوں پر خاص ضرب پڑی۔ جوش کو ملحد اور زندیق کے لقب سے نواز اگیا، مگر اس کے علاوہ یہ حلقہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ جوش نے جس نہج سے ان کے "مذہب" کو ایک تجارتی ادارہ ثابت کر کے 'حسین اور انقلاب'، 'مولوی'، 'فتنۂ خانقاہ'، 'متولیانِ وقفِ حسین آباد سے'، جیسی نظمیں لکھ کر، مذہب کے غلط ٹھیکہ داروں کا بناوٹی پردہ چاک کر کے، انھیں مذہب کی صحیح روح کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دی، اس نے اس حلقے کو سرمہ در گلو بنا دیا۔ اس طرح جوش کی اس سرمستی میں، ہشیاری کے عمل نے مذہبی انقلاب کی طرف بھی ایک قدم آگے بڑھنے کے لئے، عام انسان کو تیار کیا، جس سے اخوت، مساوات اور حرّیت کی طرف جوش کے یہ اقدامات، ایک آزاد اور بے ریا، انسانوں کی برادری بنانے کا فلسفہ بنتے ہیں۔ جس سے ایک طرح کی آفاقیت اور ہمہ گیر انسانیت کے خد و خال ابھرتے ہیں اپنی ایک نظم 'نیا میلاد'، میں جوش ایک ایسی دنیا کی بشارت دیتے ہیں جو توہمات سے پاک ہوگی جہاں 'اخوت'، مساوات اور حرّیت کا دور دورہ ہوگا اور جو عنقریب وجود میں آنے والی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں ؎

ج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اور ہے — اب زمیں کچھ اور ہے، اب آسماں کچھ اور ہے
ں وہی عالم کہ تھا مدت سے جس کا اشتیاق — آج پیدا ہو رہا ہے با ہزاراں طمطراق
نب کے اس دھندلے افق سے باہزاراں آب و تاب — امن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب

ان پھلوں کو آدمی چکھ کر امر ہو جائے گا — آفتابِ حبِّ انساں جلوہ گر ہو جائے گا
اک انوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی — شمعِ بزمِ آدمیت کی جلا دی جائے گی
جنگ کی بھٹی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مراد — ارتقا پائندہ باد و نوعِ انساں زندہ باد

ایک دوسری نظم 'باغی روحوں کا کورس'، میں یہی بات باغیانہ ڈھنگ سے پیش کی گئی ہے۔

آفریں یاد کہ اس جبرِ شریعت پہ بھی ہے — آفریں یاد کہ اس رعبِ نبوّت پہ بھی ہے
آفریں یاد کہ اس خوفِ عقوبت پہ بھی ہے — آفریں یاد کہ اس دعوتِ جنّت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

مگر جوش اعتراضات، طنز، استہزا اور جھنجھلاہٹ سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ وہ اقبال کی طرح کی نظمیں، 'باغی مرید'، 'پنجاب کے پیرزادوں سے'، اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'، جیسی جاندار نظمیں نہیں پیش کر سکے ایسے موقعوں پر جوش کو طنز و تمسخر اور مولویوں کا خاکہ اڑانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ ان کے اشعار میں

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

(اقبال)

جیسی گہرائی اور کاٹ نہیں پیدا ہو پاتی۔ صرف مرض کی نشاندہی کرنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے بلکہ اس نظامِ فکر کی تشکیل اُسی وقت ممکن ہے جب کوئی فلسفۂ حیات، خود سماج کے اندر سے پھوٹے، سوشلسٹ نظام اس وقت تک وجود میں نہیں آیا جب تک سوسائٹی خود اس کے لئے تیار نہیں ہو گئی اور یہ انقلابی تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب اندرونی طاقتیں خود بیرونی نظام کو اتار پھینکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ پھر جوش کی مشکل یہ بھی ہے کہ ان کا طریق اظہار فکری نہیں بلکہ اظہاری اور ابلاغی ہے جو کبھی کبھی صرف محفل اور دلچسپ گفتگو ہی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاید، ان کی انجمن سازی اور مجمع مدّاحاں نے نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی ایسی شاعری سے فکری عناصر کے کم ہونے میں انجمن سازی، 'مجمع مدّاحاں'، کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسی صورت نے عجب نہیں کہ کف درحال ہیچ بھی ان کی شاعری میں

داخل کی ہو۔ کیوں کہ جس طرح سامعین اردو شعرا کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں اسی طرح انھیں اپنے مزاج اور دلچسپی میں ڈھال کر انھیں بربادبھی کرتے ہیں۔ اقبال نے شاید اسی وجہ سے ہمیشہ مشاعروں سے پرہیز کیا اور مصرعہ طرح میں شعر کہنے سے انکار کیا۔ جب بھی شاعر، اپنی فکر کا راستہ چھوڑ کر محض سامعین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شاعری کرتا ہے، اس کی شاعری میں گہرائی باقی نہیں رہ جاتی۔ اس میں روز بروز لمحاتیت بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ سیاسی اور ابلاغی مسائل میں اس کے امکانات بہت ہوتے ہیں، اس لئے، اس میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کو سامعین کی لمحاتی تحسین اور دلچسپیوں سے بہت زیادہ بچ کر اپنی تخلیقات پیش کرنا چاہئے۔

جوش کی انقلابی شاعری پر، ایک حلقے سے، ہمیشہ سخت اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ سبب جو کچھ بھی ہو، کہا نہیں جاسکتا۔ جب کہ جگر صاحب کی شاعری، کو اس حلقے میں بڑی اہمیت دی گئی جوش کے خاص معترضین میں، علامہ اقبال سہیل، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، اور خلیل الرحمن اعظمی شامل ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ایک خاص ڈھنگ کی شاعری پسند نہ آئے۔ اقبال، جس پر اردو کی تنقیدی دنیا میں سب سے زیادہ کتابیں اور مضامین لکھے گئے، ترقی پسندوں کے حلقے میں، ان کی فکری عظمت پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگایا گیا۔ ان کے مرد مومن، شاہین اور وقت کے تصور، سب کو مستعار اور جانے کیا کیا کہا گیا۔ لیکن جوش پر جس ڈھنگ سے اعتراضات کئے گئے، ان کی نوعیت دوسری تھی۔ مجنوں صاحب نے تو یہاں تک لکھا کہ "جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے۔" خلیل الرحمن اعظمی نے لکھا کہ "چونکہ ان کی (جوش کی) مغربی ادب اور علوم کی اطلاع صفر کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جہاں انگریزوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، وہاں انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔" اس کے معنی ہوئے کہ تمام ہندی پر بھی جو انگریزی تعلیم اور زبان کے مخالف ہیں یا رہے ہیں ان سب کی مغربی ادب اور علوم کی اطلاع صفر کے برابر ہے۔ ہندی والوں میں، ایسے مخالفین میں راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن، سیٹھ گوبند داس، مہادیوی ورما، سمترانندن پنت اور یشپال بھی شامل ہیں۔ اور اردو والوں میں فی زمانہ، یہ سلسلہ، مولانا ابوالکلام آزاد، ساغر نظامی، نیاز فتحپوری روش صدیقی اور بہت سے لوگوں تک پہنچے گا۔ یہ صحیح ہے کہ جوش مغربی علم و ادب سے اس طرح واقف نہ تھے۔ جس طرح، یونیورسٹی کے اچھے گریجویٹ ان کے دور میں ہوا کرتے تھے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص مغربی علوم سے بہت زیادہ گہرائی سے واقف نہ ہو، وہ اردو کا اچھا شاعر یا مفکر نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اسی طرح کی بات ہوئی کہ جب ابھی جدیدیت کی تحریک زوروں پر تھی تو یہ شرط لگائی گئی کہ جو ادیب یا

شاعر، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے واقف نہیں وہ شاعر یا ادیب ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ایسی تمام تحریریں مردود قرار پائیں، جن میں صحیح یا غلط موقع پہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا اسپینی ادیبوں کے حوالے نہ ہوں یہ الگ بات ہے کہ حوالے دینے والے ان زبانوں سے واقعی واقف تھے یا نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بتدی جو انگریزی زبان میں ایک جملہ بھی صحیح نہیں لکھ سکتے تھے وہ فرانسیسی اور جرمن شعرا کے اس طرح حوالے دینے لگے جیسے ان کو ان تمام زبانوں پر کامل عبور حاصل ہے۔ جہاں تک جوش کی انگریزی تعلیم کی بات ہے، یہ سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے آگرہ کے سینٹ پیٹرس، سے سینئر کیمرج تک تعلیم حاصل کی تھی جس کے معنی یہاں تک تو ہوئے کہ وہ انگریزی کتابوں کو خاصی روانی سے پڑھ سکتے تھے اور انگریزی خاصی روانی سے بول سکتے تھے (اس کا تجربہ آج کے کسی کانونٹ کے طالب علم سے گفتگو کر کے کیا جا سکتا ہے) مگر جوش اصولاً انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے تھے کہ جب ہر ملک اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتا ہے تو ہندوستانی اور خصوصاً اردو کا حلقہ، اپنی مادری زبان میں گفتگو کیوں نہ کرے۔ یہ جوش کا دفاع نہیں ہے بلکہ جملہ معترضہ کے طور پر یہ باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ جوش نے اپنی انقلابی شاعری کے لئے کارل مارکس اور اینگلز کی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں مگر پچھلے اوراق میں جو ہندوستان کی تحریک آزادی کے ساتھ، جوش کی نظم نگاری میں سے مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ ان کے عملی مطالعے کو تو ضرور ثابت کرتی ہیں۔ اس مسئلے میں کچھ لوگوں نے اقبال سے جوش کا مقابلہ کرنا چاہا ہے، جو مناسب نہیں۔ جوش اقبال کی بلندیٔ فکر اور شعری بلندی کو کبھی کبھی نہیں پہنچ سکے لیکن یہ بات صرف انگریزی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ دونوں کی طبیعتوں کی افتاد ہی الگ تھی۔ پھر فکر اور شعر میں اگر گہرائی پیدا کرنے کے لئے، انگریزی جاننا بہت ضروری ہوتا تو ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر دو کوڑی کے بھی نہ رہ جاتے۔

'انقلابی شاعری کو فکر و فن کی شاعری ضرور ہونا چاہئے، کہ اس سے اس میں مختلف سطحیں اور مختلف الجہاتی پیدا ہوتی ہے۔ تاہم تھوڑی سی لماتی ہنگامیت کبھی اس میں ہوا کرتی ہے۔ یہی وہ پہلا زینہ ہے جس سے بدلتے ہوئے وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جس کی ضرورت، ہر اس دور میں پڑتی ہے، جب ملکوں کی تقدیر بدلنے کا وقت آپہنچا ہو۔ یہ صورت مایکاوسکی کے یہاں بھی ہے اور روالٹ وہٹ مین اور آڈن سب کے یہاں ملتی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں، یہ وہی وقت ہے اور اس لئے جوش کی ایسی شاعری، گہرائی نہ رکھنے کے باوجود، اس قومی انقلاب کو سہارا دیتی ہے جس نے ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے، ملک کی تقدیر بدل دی۔ اس طرح جوش کی یہ انقلابی شاعری

انقلاب کی نقیب بھی ہے اور مددگار بھی۔ اور جنگِ آزادی میں جب اردو شاعری کے حصّے کی بات چلے گی تو جوش کی شاعری کا حصّہ اسی طرح اہم ہوگا جس طرح بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کا حصّہ، ہندی کے شعرا، میتھلی شرن گپت اور نوین کا حصّہ اور بس۔ جوش کی ایسی انقلابی شاعری کو یہیں تک محدود رکھنا چاہیے۔

جوش کی سیاسی انقلابی نظموں میں گھن گرج ہے، موضوعات کے ساتھ، انھیں پیش کرنے کی ان میں بے پناہ صلاحیت بھی ہے لیکن ان سے کسی سیاسی بصیرت کا احساس نہیں ابھرتا۔ ان میں ہنگامیت یقینی طور پر ہے اور وقت اور اس کے مسائل کے بدلنے کے ساتھ ساتھ، ان کی حیثیت صرف تاریخی رہ جاتی ہے۔ یہ نظمیں شعری حسن سے عاری تو نہیں لیکن ان میں ادبیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ نہ خضرِ راہ، بنتی ہیں، نہ مسجدِ قرطبہ، نہ ساقی نامہ، یہاں تک کہ ان میں ٹینسن کے چارج آف دی لائٹ بریگیڈ (CHARGE OF THE LIGHT BRIGADE) یا "بابِ یار" کی بھی کیفیت نہیں پیدا ہو پاتی کبھی کبھی کی چیخ پکار، کھلبلاہٹ اور کسی حد تک بھرتی کے خیالات میں جوش کے طرزِ شاعری کو بھی کافی دخل ہے۔ جوش کو اطناب کا فن بہت پسند ہے۔ اطناب کی صورت، ان کے یہاں کبھی کبھی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اکثر وہ ایک ہی بات کو دس بیس طرح سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'کسان' میں سے جو بڑے معرکے کی نظم ہے، اس میں سے بیشتر اشعار اگر خارج کر دیئے جائیں تو نظم شکل سے دس بارہ اشعار میں پوری ہو سکتی ہے اور سلسلۂ خیال اسی طرح قائم رہتا ہے۔ نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی صورت، 'حسین اور انقلاب' اور موجد و مفکّر، طلوعِ فکر، اور دوسری نظموں میں بھی ہے۔ لوگ جوش کو جب الفاظ کا جادوگر کہتے ہیں تو ان کا مطلب بھی اسی تطویل اور اطناب لفظوں کو بدل بدل کر ایک ہی خیال کو سو رنگ سے باندھنے سے ان کا مقصد ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم 'اعتراف' میں وہ خود اپنی کمیوں کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

الاماں، آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز
اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز

میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے
کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے

کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال
اک اچٹتا سا جمال، اک سر بزانو سا جلال

چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب
گہہ حریفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب

گاہ مرنے کے عزائم، گاہ جینے کی امنگ
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

تاہم ان کا خیال تھا کہ جب نئی دنیا، نئی نسل کے ساتھ آئے گی، تب اصل شاعری ہوگی اور میں تو اس
اصل شاعری کا خالی نقیب ہوں۔

فکر میں کامل، نہ فن شعر میں یکتا ہوں میں — کچھ اگر ہوں تو نقیب شاعرِ فردا ہوں میں

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں الفاظ کو ایک خاص قدرت حاصل ہے۔ انقلابی نظموں میں تو یہ الفاظ، اس طرح، اکثر، خیال پست کو دیتے ہیں، کہ الفاظ کی جھنکار سے رن اور جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ میر انیس کا اثر ہو کہ جوش پر انیس کی شا کا خاصا اثر ہے۔ انھیں الفاظ کے تمام DIMENSIONS ان کے صحیح صرف اور ان الفاظ کا سے ایک طرح کی اسیج بنا لینے پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ الفاظ، تصویر، جذبہ اور احساسات کے سا ایک فکری ہیولے کی بھی تعمیر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں، جذبہ، احساس اور متحرک پیکریت ان میں سے غائب ہو جاتی ہے، وہاں الفاظ کا یہ اجتماع محض ذخیرہ رہ جاتا ہے۔ دونوں طرح کی مثا ان کے یہاں موجود ہیں۔

بے زروں کی ڈوبتی آنکھوں میں فاقوں کے نقوش — اہل دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشا
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں — تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہے تدبیر

کر دیا تو نے یہ ثابت اے دلاور آدمی — زندگی کیا موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
کاٹ سکتا ہے رگِ گردن سے خنجر آدمی — لشکروں کو روند سکتے ہیں نہتّر آدمی
ضعف ڈھا سکتا ہے قصرِ افسر و اورنگ کو — آب گینے توڑ سکتے ہیں حصارِ سنگ کو

الفاظ کے اجتماع اور تواتر کی مثالیں بھی انقلابی نظموں میں ہیں، جن سے کوئی تاثر مترتب نہیں ہوتا۔

الاماں الحذر، میری کڑک میرا جلال — خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں کٹار — بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوا

زندہ مردوں کی ہے بستی کون سنتا ہے یہاں — تا کجا، چیخا کروں، ہندوستاں، ہندوستا

لیکن جب جذبات میں ٹھہراؤ، فکر میں بصیرت، اور ایک عالمی اخوت کی دھیمی لہریں، جوش کے طریق نظم:

پیدا ہوتی ہیں تو الفاظ کی یہی دنیا، ان کے تاثرات کو متشکل کر دیتی ہے۔ پھر نہ رجز کا موجزن دریا ہوتا ہے، نہ غزل سازی کی خواب آوری بلکہ ایک تاسف آمیز ادراک کا ریفلیکشن ان کی نظموں پر طاری ہوتا ہے جس میں بقول ایلیٹ، شاعر کی صرف اپنی آواز سنائی پڑتی ہے۔ ایسی نظموں میں ' ماتم آزادی ، گاندھی جی کے قتل پر لکھی ہوئی نظم ، سرود وخروش اور سموم وصبا کی اسی طرح کی دوسری نظمیں ہیں جنہیں انقلاب کی تہہ نشینی (EBBING) سمجھنا چاہئے۔ ابتدائی انقلابی نظمیں، جوش کے شعری آہنگ اور جذبات کا چڑھتا ہوا دریا ہیں۔ اور آزادی کے بعد کی نظمیں، انقلابی کیفیات کا اتار ہیں جس میں تاسف اور امید وبیم کی ملی جلی کیفیت ملتی ہے۔ ایسے لمحات میں نہ تو الفاظ کا بے جا جماؤ ہوتا ہے نہ کف در دہاں چیخ ، بلکہ جذبات کی سبک خرامی کے ساتھ الفاظ کی سوچتی ہوئی تصویریں بندوں میں متحرک نظر آتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اس بات کی وضاحت کریں گی۔

فٹ پاتھ ، کارخانے ، ملیں ، کھیت ، بھٹیاں ۔۔۔ گرتے ہوئے درخت ، سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقیں ، بھڑکتے ہوئے گماں ۔۔۔ ان سب سے اٹھ رہا ہے ، بغاوت کا پھر دھواں

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ ۔۔۔ وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

غدار تھے جو کل، وہ محبِ وطن ہیں آج ۔۔۔ بدخواہِ باغ ، ہمدم سرو وسمن ہیں آج
کل تک جو تھے سموم ، نسیم چمن ہیں آج ۔۔۔ خسرو کے جو غلام تھے ، وہ کوہکن ہیں آج
لچھمن کا دل ہے شدت غم سے پھٹا ہوا
در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

اس نامکمل سے مقالے میں ، جہاں بھی انقلابی شاعری کی بات کہی گئی ہے، اس میں یہی پیش نظر رہا ہے کہ انقلاب سے جوش کیا سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ، جوش کے دور میں ، ہندوستان کے سیاست داں 'انقلاب' کا کیا مفہوم لیتے تھے۔ اصلاً یہ انقلاب ، ایک محدود طریقے اور طبقے کا انقلاب ہے جسے اشتراکی انقلاب تک نہیں لے جانا چاہئے بلکہ اسے صرف جنگ آزادی کے دوران ، سیاسی کوششوں تک محدود رکھنا مناسب ہے۔ اسے ڈکٹیٹرشپ آف دی پرولیتیریٹ کے تصورِ انقلاب سے وابستہ کرنا مناسب نہیں۔ جوش کا جاگیردارانہ دور کا مزاج بھی، اس تبدیلی کو، ہندوستان کے مڈل کلاس، کی طرح ' انقلاب' سمجھتا رہا ہے۔ ڈکٹیٹرشپ آف دی پرولیتیریٹ کی منزل ابھی ہندوستان سے دور ہے۔ اس طرح اس مقالے میں جوش کی تمام انقلابی جدوجہد کو صرف اس تصور ، ماحول اور فضا پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی تمام سیاسی اور انقلابی شاعری کی اسی مخصوص فکری جہت سے توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ □

جوش ملیح آبادی

میرے پردادا
(فقیر محمد خاں گویا)

تہور جنگ حسام الدولہ نواب محمد فقیر خاں بہادر، گویا، ان کے دادا، یار بیگ خاں درۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد نامدار خاں، اور چھوٹے کا محمد بلند خاں، نامدار خاں درۂ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر ۱۲۳۴ھ میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنؤ آکر مقیم ہو گئے۔ اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپیہ ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پاکر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا۔ میں آزاد قبائل کا فرد ہوں۔ کھلی ہوا میں رہنے کا عادی ہوں۔ شہر میں میرا دم گھٹتا ہے، مجھ کو اطراف لکھنؤ کے کسی ایسے قصبے میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنؤ آؤں اور فرائض منصبی انجام دے کر شام کو وہاں چلا جاؤں۔"

نواب نے کہا کہ آپ اطراف لکھنؤ میں کوئی قصبہ منتخب کرلیں وہ زمین آپ کو دے دی جائیگی۔"

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے کنول ہار کو پسند کیا جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلہ ہے۔ زمین ان کو دے دی گئی۔ اور انھوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کرلی۔ اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنؤ جاتے اور شام کو کنول ہار پلٹ آتے تھے۔ کنول ہار میں انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد، ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بددل ہو کر ریاست اندور

چلے گئے اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کنول ہار سے چلتے وقت انھوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی، اپنے ساتھ اندور لے جائیں لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ میں تعلیم سے فراغت پاکر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھے سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بڑے بھائی نے ان کو بھی رسالداری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی غرض سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجا ہلکر نے بگل بجوا دیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔ اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا ـــــ "بھائی صبح ہوتے ہی میدانِ جنگ میں اترنا ہے۔ دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل میں بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چھوٹا بھائی علم حاصل کر کے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی کیوں نہ قتل کر دوں تاکہ خاندان کی عزت پر ضرب نہ آئے۔ لیکن برادرانہ محبت جوش میں آگئی۔ انھوں نے سوچا کہ جب میدانِ جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کا اٹھارہ سالہ چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے، یہ جواں مردی دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجا کا تعاقب کیا، بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اسے گرفتار کر لیا اور مہاراجا ہلکر کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس واقعے کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونوں بھائیوں کی بہادری کے۔ جب ان کی شجاعت کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کر کے ٹونک پہنچا تو نواب امیر خاں والی ٹونک نے مہاراجا ہلکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجا ہلکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھر رہ کیا جائے گا اور نہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے اس نے والی ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں۔ آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور

دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں۔ نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کو رسالدار بنا دیا۔ ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خاں اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اور چونکہ نواب میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے جانی دشمن تھے انھوں نے بڑے ولولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گوروں کے دوش بدوش، نواب میر خاں کی فوج سے برسرپیکار تھے۔ پنڈاروں نے سوچا کہ اگر فقیر محمد خاں کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہوگی۔ اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی، گولہ ان کی ران میں لگا۔ گھوڑے سے گر پڑے۔ ایک پنڈارا تلوار سونت کر ان کی طرف بڑھا لیکن انھوں نے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی۔ گھوڑا دوڑاتے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا اور چاہا کہ انھیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تاکہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو کس کر باندھ لیا ہے، سپاہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا آپ یہ توپ میرے قریب کر دیں۔ میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انھوں نے اس شدت کے ساتھ گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر، ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔ جب انھوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا۔ رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے بانسوں پر اپنے دوپٹے بندھوا کر ہوا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔ فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انھوں نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کیا۔ ان کی شجاعت اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا۔ جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر سے ملے اور سیاسی مسائل پر بحث چھڑی تو نواب اودھ نے کہا "خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانش مند اور ذی علم انسان بھی ہیں، میں آپ کو یہاں سے جانے

نہیں دوں گا۔" انھوں نے عرض کیا خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرا باپ
محمد بلند خاں آپ کی سرکار میں ملازم تھے وہ ملیح آباد میں موجود ہیں۔" غازی الدین حیدر نے کہا
پھر تو آپ حق بحق دار رسید کی طرح اپنے وطن ہی میں آجائیں گے۔
اس پر انھوں نے کہا "لیکن یہ بات آئینِ وفاداری اور اصولِ شرافت کے منافی ہے کہ میں
والیِ ٹونک کی رفاقت کو ترک کردوں۔"
نواب نے کہا خاں صاحب میں اس مسئلے کو حل کئے دیتا ہوں۔ اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب
معتمد الدولہ آغا میر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔ آغا میر کے آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ اپنی جانب
کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔ خط روانہ کر دیا۔ اور چند روز بعد آغا میر
نے ان کو مطلع کر دیا کہ والیِ ٹونک نے ہماری بات منظور کرکے آپ کو اودھ میں رہ جانے کی اجازت
دی ہے۔ انھوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں دیں گے۔
میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔
اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آگیا تو انھوں نے
شاہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی۔ اور یہ عرض کیا کہ حضور خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے
سے پیشتر، میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔"
غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین
سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب وہ تزک و احتشام کے ساتھ ملیح آباد
پہنچے تو نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آرہی ہے کہ نعرے لگا رہی ہے تو وہاں
کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ ادھر سے گزرنا غالباً سندیلے جا رہا ہے۔
اور ان کے باپ نے جب سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انھوں نے لوگوں
سے کہا: "ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے۔ یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے
بطور طنز یہ کہا جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آرہا ہے اور آپ کے کچے مکان میں دربار کرے گا۔"
اس پر محمد بلند خاں نے کہا "مسخرو سنتے کیا ہو اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔" اس کے
بعد جب وہ جلوس محمد بلند خاں کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گیا تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے
اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فقیر محمد خاں کی نظر اپنے باپ پر پڑی۔ انھوں نے ہاتھی کے
بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کے پیٹ پر سے "باوا باوا" کہتے کود پڑے، اور جاکر اپنے

باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ باپ نے "ارے میرا فقیرا" کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے جب وہ لکھنؤ واپس آئے غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالدار بنا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ انھیں "سرکار خیرآباد" کا گورنر بنا دیا۔ اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اس قطعے کے انھوں نے دو ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑے کا نام "احاطہ پختہ فقیر محمد خاں" اور دوسرے احاطے کا نام احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔ ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انھوں نے مرزا گنج میں سیکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنائے۔ آم کے باغ نصب کرائے۔

اسی اثنا میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھتو کیا، پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچا دی جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی۔ اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربوں میں سے ایک مرزا حاجی۔

مرزا حاجی نے دو راجپوتوں کو دس دس ہزار روپے رشوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم دامد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغا میر دروازے میں قدم رکھیں تم دونوں بہ یک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغا میر کے محل گئے۔ ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا اور جب آغا میر حکیم صاحب کی لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے آغا میر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ ان کی اس انوکھی درخواست سے آغا میر کے تمام رفقا دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ آغا میر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، خاں صاحب آپ کی تجویز منظور۔ بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں۔ فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا، راجپوت نے تلوار چلا دی، جس سے ان کا داہنا ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار سونت کر، انھوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے

تلواریں گر پڑیں، انھوں نے بھاگنا چاہا لیکن انھوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر، کلیجے سے لگا لیا، ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے کی فرمائش کی تھی اس وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔

اس کے بعد انھوں نے پوری سازش کا حال بتا دیا۔ مرزا حاجی کو کھڑے کھڑے حبسِ دوام کی سزا دی گئی اور آغا میر نے ان کو گلے لگا کر کہا " خاں صاحب آپ نے اپنی جان پر کھیل کر، میری جان بچائی یہ مجھ پر آپ کا احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔" شاہِ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ایثار سنا ان کی بے حد تعریف کی، سات پارچے کے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرما دیا۔

ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ، ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست، ان کی بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں، ان کے مشاعرے، ان کے شبستانوں میں راتوں کے مجرے، ان کی ادب نوازیاں اور اہلِ علم پر ان کی زرپاشیاں، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دینِ تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں۔ میری دادی جان کہا کرتی تھیں کہ بیٹا تمھارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیہ تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ تھیلوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ لیکن تول کے باوجود یہ بات ان کو پسند نہ تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گراؤں یا کسی قسم کی کوئی جائداد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے اخلاف دولت و عشرت کی فراوانی کے صیدِ زبوں ہو کر اوصافِ انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑے آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان میں

رہے بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کیے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں، لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑے کو لنگوری چال (گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر اچھلتا اور قوس سی بناتا زمین پر قدم رکھتا ہے) سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا "یہ سوار کون ہے" نائکہ نے کہا چپ رہ یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔"

یہ سن کر وہ غصے میں بھرے ہوئے گھر آئے اور بیٹے سے کہا "فقیرے! اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا۔" بیٹے نے سبب پوچھا تو انھوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا "دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا، باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بہی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے، لعنت ہزار لعنت چوک سے گزرنے والے پر۔"

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم "باغات" نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول ان کے پیچھے آتے اور ہزاروں پکے پکے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے ہیں۔"

یہ خبر سن کر فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام، لکھنؤ سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ یادا تمام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے۔ آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں، اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انھیں باغ میں نہ جانے دیا جائے۔"

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیرا امیر ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے۔ چلو میرے ساتھ میں آج فقیرے کو مزا چکھا دوں گا۔"

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شاہزادوں اور عمائد لکھنؤ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوب دار نے عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں۔"

فقیر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا میں اس بڑی الماری کے پیچھے

جا کر چھپ جاؤں گا، باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔" اتنے میں بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آ گئے۔ تمام محفل کھڑی ہو گئی انھوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہیں۔" حاضرین نے کہا "کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورد جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ وہ کہاں ہے۔"

خوشامد خوردوں کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ رہ گئے۔ لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا الٹا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔ محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے۔ بیٹے کو گھر کھرا کر الماری کے پیچھے سے نکالا اور گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والوں کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا۔ اور جب طمانچہ کھا کر انھوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس اس سے زیادہ اور ذلیل نہ کیجئے۔"

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا "باوا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا۔ فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا۔ اور شعرا نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انھوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔

ماخوذ "یادوں کی برات"

مولوی احمد حسین

میں نے زندگی میں دو ایک کے علاوہ ان کا سا پُر اسرار و صاحب کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔ ان کی دنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکار نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ کے ایک معمولی کلرک تھے، لیکن ان کی انسانی حیثیت اس قدر ارفع تھی کہ ایک میرا سا بیگانۂ یقین و بے عقیدہ شخص، یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروڑوں انسانوں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، علم کلام اور فلسفے پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی، لیکن افتادِ

مزاج کی بنا پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی کائنات کے حقائق، اور وحدت النفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ ان کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تخت طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے ان کی اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس لئے اس امر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ہز اکزالٹیڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی ذات سے ہے۔

یوں تو دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرمانروا جہالت پروردگی، گرم و سرد نہ چشیدگی، ہمہ وقت آرامیدگی، خوشامد گزیدگی، ذہن ژولیدگی، اور آمریت پیوستگی کے باعث اس قدر متکبر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تجبر اور ہامان و شیطان کا غرور ان کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ لیکن نظام۔ اللہ اکبر، جس طرح ان کی ریاست ہندوستان کی تمام ریاستوں سے بڑی تھی اسی طرح وہ تمام والیان ریاست سے عجب و غرور میں سب سے زیادہ قد آور انسان تھے، اور انسان نہیں خدا معلوم ہوتے تھے اور ان کے روبرو بڑے بڑے ہمالیہ کوب انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں اور بڑے بڑے سورماؤں کے زہرے آب ہو جایا کرتے تھے۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شیر افگن تھا اب سنئے، تیس روپلی ماہانہ کے ایک معمولی سے کلرک، مولوی احمد حسین کا واقعہ۔

حیدرآباد کی درگاہ میں جس کا نام ہے "خواجہ کا چلّہ" بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے ـــ چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرأت ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن جو قرآن کی جان ہے اس طرح پڑھنا شروع کر دی کہ تمام محفل جھومنے لگی۔

ابھی تمام ارباب درگاہ، قرأت کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجا کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے۔ رعب شاہی سے قاری کے رشتۂ آواز میں جھنگی پیدا ہوگئی اور قرأت ہکلانے لگی۔

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا۔ مگر واہ ری جرأت مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین
نے جھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرات میں باتیں کرنا سوء ادب ہے۔ آپ خاموش ہو جائیں۔
م نے مڑ کر ان کو دیکھا ـــــ ونکٹارا ما ریڈی کوتوال شہر جو پولس دستے کے ساتھ نظام کے
بردہات باندھے کھڑا تھا، ان کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا ـــــ لیکن نظام نے
نکو۔ (نہیں ـــ نہیں) کہہ کر اس کو روک دیا۔
قاری کی رندھی آواز کھل گئی، قرأت پھر پینگ لینے لگی اور لوگ جھومنے لگے لیکن ایک
عرصے ۰ قفنے کے بعد نظام نے مہاراجا کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کر دیا۔ یہ دیکھ کر
بپھر گئے پہلے تو انھوں نے "سوء ادب" ہی کہا تھا، اس بار انھوں نے بآواز بلند کہا "اثنائے
ت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے، خاموش ہو جائیے اور مزید بدتمیزی نہ کیجئے۔"
ان کی یہ آواز سن کر حاضرین تھرا اٹھے، قاری کی آواز گلے میں دفن ہو گئی، کوتوال پھر جھپٹا
ام "نکو نکو" ان کو گرفتار نہ کرو۔ ان کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آجاؤ کہہ کر کھڑے ہو گئے
رمہاراجا کشن پرشاد کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے۔
تمام حاضرین محفل اس دبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے جس کی بوسیدہ
بردانی کی آستینوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں
دبی ہوئی تعریف کرنے لگے۔
لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انھوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ
زوں کی موت نے، مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے، اب چونکہ وہ
وگ باقی نہ رہے اس لئے میں نیک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں، اور کوتوال جب ان کا نام
ور پتہ پوچھنے آیا تو انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد، اس سے یہ کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ
مجھے گرفتار کر لو، اور پھانسی کے تختے پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا
ہے۔ کوتوال ان کو حیرت سے دیکھنے لگا، اور اس کا کوتوالی کا گٹھا ہوا دبدبہ، پلپلا ہو کر اس کے
کھلے ہوئے منہ پر لٹکنے لگا۔
ابھی درگاہ سے آکر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے آکر کہا۔ مہاراجا
کشن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا بلا لو۔ مہاراجا نے ان کے سامنے ایک ایک
ہزار کے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب، یہ دس ہزار روپے سرکار دولت مدار نے آپ کی

جرأت ایمانی سے خوش ہوکر آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں، انھیں قبول فرما لیجئے۔

انھوں نے بڑی مسکنت سے کہا سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجئے میں ان کا ایک ادنیٰ سا نمکخوار ہوں، یہ ان کی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھ کو جزا دے رہے ہیں: لیکن مہاراج، سرکار کی خدمت میں جاکر عرض کر دیجئے کہ کلمۂ حق فروختنی نہیں ہوا کرتا، اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کر سکتا۔ مہاراجا نے ان کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ فرط جذبات سے کچھ بول نہ سکے، ان کے ہاتھ چوم لئے اور سر جھکا کر رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو نوکری سے سبکدوش کر کے گھر بیٹھے تین سو روپے تاحیات دیئے جائیں، اس کو بھی انھوں نے قبول نہیں کیا، اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے، میں تیس روپے ماہانہ میں اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھ کو تین سو روپے کی ضرورت نہیں۔

دیکھا آپ نے اس ہڈیوں کے مالے کا آہنی کردار؟ اس صدی میں اگر ان کا کوئی ہمسر گزرا ہو تو خدارا مجھے اس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وہ مجھ سے محبت کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہ اشتراک نہیں تھی وہ تھے مناجاتی اور میں تھا رندِ خراباتی خدا جانے وہ کون سی ادا تھی، جس نے ان کا دل موہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا تمام کلام الہامی ہے اور آپ کی شراب نوشی مراقبہ ہے۔ حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہامی ہے اور نہ میری شراب نوشی مراقبہ ہے۔

(یادوں کی برات سے) □

انتخاب کلامِ جوشؔ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟ — "دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا — بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر — تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر — نوعِ انسانی کے مستقبل کی بابت کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے — نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟ — سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟ — کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں — سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم — سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی — موت بھی کیسی، تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج — میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟ — یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے ؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں ؟
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ ؟
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی ؟
پوچھ لو اس سے تمھارا نام کیوں تابندہ ہے ؟
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے ؟
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو تم
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں ، اہلِ باطل کور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
گونج تاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
خیر اب سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں

شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے ؟
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے ؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی ؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے !
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے ؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا
سخت حیراں ہوں کہ اب کیوں درسِ حق دیتے ہو تم
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پلتے ہو تم
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں ؟
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں ؟
کیا خدانا کردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں ؟
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے ؟
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے ؟
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
لگ گئی آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؑ
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

میرا مرثیہ

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا
ارے اس عالمِ تعجیل خو نے یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا
جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا
مجھے گونگوں کی محفل میں جگہ دی مجھے سوتوں کے حجرے میں جگایا
مجھے دیووں کے جنگل میں اتارا مجھے بھوتوں کے کنڈل میں بسایا
مجھے بونوں کے پہلو میں جگہ دی مجھے مردوں کی ارتھی پر بٹھایا
مجھے اوہام کی بھٹی میں جھونکا مجھے اقوال کی لو پر جلایا
مجھے اندھوں کی محفل میں سنوارا مجھے بہروں کے حلقے میں بجایا
جہاں فکرِ جواں اگتی نہیں ہے مرا اس خاک پر پودا اُگایا
ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا
کمر میرے تجسس کی جھکا دی گلا میرے تفکر کا دبایا
مرے افکار پر کی سنگ باری اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا
مرے اشعار جھنڈے پر چڑھائے مرے افکار کو نکو بنایا
یہ رسمِ خویش نا فہموں نے اکثر مری تذلیل کی مجھ کو جھکایا
ہر اک سقراط آنکھیں بند کر کے مری نادانیوں پر مسکرایا
اکٹھا ہو گئے جب چند بقراط اشاروں سے مجھے گھامڑ بتایا
میں تھا بھی شاید اک ایسا معمہ کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
ستا سکتی نہیں اتنا اجل بھی مجھے اس عمر نے جتنا ستایا
اٹھائی خود ہی میں نے لاش اپنی ارے اتنا مجھے اتنا جلایا
انھیں بخشی وہ خوئے جاں نوازی کہ عہدِ شوق میں مرنے نہ پایا
بنا عشق ایک رسمِ وضع داری زمانِ شوق کو اتنا بڑھایا
پڑی وہ وقت کی ضربیں مسلسل کہ عشق اپنے لہو میں خود نہایا
بجھا کر مشعلِ رخسارِ جاناں کہ مرے احساس میں لوکا لگایا

لب و رخسار پر کی برف باری — اور اتنی اک شرر بجھنے نہ پایا
رخِ شاداب کی صبحِ طرب پر — غم آگیں جھٹ پٹے کا رنگ چھایا
جو طاقِ خال و خد میں جل رہے تھے — تہِ جلد ان چراغوں کو بجھایا
شبِ آخر کی ڈھلتی چاندنی نے — مرتب سطحِ دریا کو ہلایا
دریغا دھاریوں کو چور کر کے — گلابی پنکھڑی کو کھردرایا
سبک لچکے کی ڈوری توڑ ڈالی — سجل مکھڑے کے خیمے کو گرایا
قیامت ہے کہ پائے تیرگی پر — مرے ماہِ جبیں نے سر جھکایا
جہاں چلتے تھے پر وقتِ رواں کے — وہاں طوفان ماہ و سال آیا
مرے اشعار مرکز سے ہٹائے — مرے نغموں کو پردیسی بنایا
مری نظروں کے کنگن توڑ ڈالے — مری تخئیل کا زیور بڑھایا
جو تھی برکھا کی راتوں کا نشیمن — مجھے اس زلف میں تڑکا دکھایا
گلے پر حصر ہے جن کے سخن کا — مجھے بہم کلام ان کا سنایا
ارے نادان نقادوں کے ہاتھوں — مری نظموں کو سولی پر چڑھایا
انھیں میرا بنایا دشمنِ جاں — جنھیں میں نے کلیجے سے لگایا
مجھے قصرِ سلاطیں میں بٹھا کر — مری خودداریوں کا منہ چڑھایا
مری حالت پہ طاری کی گدائی — مری فطرت کو شاہانہ بتایا
مری ہر شام کو تسکین دے کر — مری ہر صبح کو دردر پھرایا
جو تھا مجھ میں غرورِ کبریائی — بحدِ بندگی اس کو گرایا
مورخ تھے جو میری زندگی کے — انھیں چن چن کے دنیا سے اٹھایا
مرے گلزار میں کانٹے اگائے — مرے شعلوں کو خاکستر بنایا
لگا کر آگ میرے خال و خد کو — اور اس کے بعد آئینہ دکھایا
جب ایک بوڑھا سا آئینے میں دیکھا — میں رویا قہقہہ سب نے لگایا
بتوں نے پھیر لیں مجھ سے نگاہیں — زمانے نے مجھے یہ دن دکھایا
یہاں المختصر ابرِ مسرت — جو چھایا بھی تو کچھ اس طرح چھایا
دہکتی خاک پر جس طرح پل بھر — کسی اڑتے ہوئے طائر کا سایا
نفس کی آمد و شد اللہ اللہ — مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

مقامِ رندی

سبو اٹھا کہ فضا نیم خام ہے ساقی
فرازِ چرخ پہ ماہِ تمام ہے ساقی

فلک ہے غلغلۂ دل نواز را رنگ
زمین زمزمۂ جشنِ عام ہے ساقی

نہ ہاتھ روک خدارا دہر میں اٹک
ریا حلال ہے، صہبا حرام ہے ساقی

جھکی ہوئی ہے صراحی، چنے ہوئے ہیں سبو
نیا قعود، نرالا قیام ہے ساقی

بتوں میں بھی ہیں بہت حوریاں مقصورات
یہاں بھی سلسلۂ صد خیام ہے ساقی

زوالِ عقل ہو جس سے وہ آبِ تاک حرام
جو اور ہوش میں لائے وہ جام ہے ساقی

جنوں کی پشت پہ ہو فکر تو جنوں ہے غلط
نرا جنوں ہو تو سودائے خام ہے ساقی

بنامِ آدم و حوا پلا کہ گرمِ سرود
نسیم روضۂ دارالسلام ہے ساقی

مرور بربط و مے کی سپر عنایت کر
کہ تیغ ارض و سما بے نیام ہے ساقی

یہ قول تجھ کو بھی شاید پسند آئے گا
جھکے نہ دل تو عبادت حرام ہے ساقی

بساطِ رنگ پہ لاکر ثوابت و سیّار
فضا پہ کون یہ گرمِ خرام ہے ساقی

بجا وہ طلبِ منصبِ الوہیت
ازل سے ذہنِ بشر تند گام ہے ساقی

نہ اسم و جسم، نہ نفس نہ سایہ و ثقل
یہ کیا دیار ہے یہ کیا مقام ہے ساقی

ربابِ فرش پہ رکھ دے کہ جوش ہے اس وقت
ضمیرِ عرشِ بریں ہم کلام ہے ساقی

متاعِ دوجہاں

فتنۂ دوراں سے اماں دیتا جا
کاہِ بے مایہ کو بھی کاہکشاں دیتا جا

اے مرے کوئے ظریفاں سے گزرنے والے
ان گداؤں کو بھی اندازِ شہاں دیتا جا

خس و خاشاک و خزف کو بھی مرے ابرِ کرم
موجۂ کوثر و گلزارِ جناں دیتا جا

یاں بشکرِ دلِ جوالہ و لعل
نفسِ زندہ احساسِ جواں دیتا جا

جس سے مردانِ سبک روح کو ملتی ہے نظر
دوشِ تخئیل کو وہ رطلِ گراں دیتا جا

پردۂ گل میں بصد ناز، چٹکنے والے — خارِ لب بستہ کے منھ میں بھی زباں دیتا جا
اے مرے مطربِ محرابِ حریمِ الہام — طبع کو زمزمۂ آبِ رواں دیتا جا
اے خدیوِ ادب و شپاہ سوار گردوں — دستِ فن کار میں گیتی کی عناں دیتا جا
اے بہر گام لچکتے ہوئے سروِ شاداں — غم پہ جو تیر چلائے وہ کماں دیتا جا
تجھ کو اس لرزشِ مژگاں کے دھندلکے کی قسم — دل جو یندہ و چشمِ نگراں دیتا جا
ہاں گدایانِ خرابات کو اے — منصبِ خواجگیٔ کون و مکاں دیتا جا
اے شناسندۂ اسرارِ حیاتِ ابدی — موجِ انفاسِ مسیحا دیتا جا
ہاں رگِ جاں کو بیک جنبشِ مضرابِ گناہ — لرزشِ زیر و بم نغمہ گراں دیتا جا
ہاں یہ بت کدۂ محتسباں و فقہا — جرأتِ بندگیٔ پیرِ مغاں دیتا جا
اپنے آہنگ ریاکوب کی تجھ کو سوگند — بانگ قل قل کے منارے پہ اذاں دیتا جا
صرف اک موجِ تبسم سے بہ اندازِ سحر — شب نشینوں کو متاعِ دو جہاں دیتا جا

جوش کے سنگِ درِ کفر کو اے مست خرام
دولتِ سجدہ صاحب نظراں دیتا جا

رباعیات

خود کو نہ کبھی فریب دینا اے دل — ناؤ نہ اس بحر میں کھینا اے دل
ناکامیٔ شاقصانِ عالم کی قسم — تعریف کا زہر چکھ نہ لینا اے دل

ہم بند کیے دل کے تقاضوں کی دکاں — تم قلب پہ لادے ہوئے اربوں ارماں
تم کثرتِ دولت کی بنا پر ہو گدا — ہم قلتِ حاجات کے بل پر سلطاں

کر روح میں بابِ کفر و ایماں مسدود — وہ فہم کی وحشت ہے یہ دانش کا جمود
انکار بہ ایں دماغِ کمزور و علیل — اقرار بہ ایں عقلِ ضعیف و محدود

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کی روایات کا بار

کل صبح اٹھا باغ میں جب پردۂ خواب
اللہ ری نزاکتِ دلِ خانہ خراب
انفاس اٹھا سکے نہ بارِ خوشبو
پلکوں سے سنبھل سکا نہ بارِ مہتاب

نوخواستہ شاعرو ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یوں ہی رہی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچو
کہتا ہوں کہ اپنوں کو نہیں پاؤ گے

لیلائے سخن کے گیسوؤں کو سلجھاؤ
جو میں نہیں کر سکا وہ تم کر کے دکھاؤ
اللہ کرے میرے کمسن شاعرو
تم مجھ سے ہزار چند آگے بڑھ جاؤ

کیسے آواز دوں

کس کو آتی ہے مسیحائی کسے آواز دوں
بول اے خونخوار تنہائی کسے آواز دوں

پڑھتے پڑھتے پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہیں پتلیاں
بجھ رہی ہے شمعِ بینائی کسے آواز دوں

چپ رہوں تو ہر نفس ڈستا ہے ناگن کی طرح
آہ بھرنے میں ہے رسوائی کسے آواز دوں

ہائے، اس غربت کے جنگل میں پکاروں تو کسے
کس سے ہے میری شناسائی کسے آواز دوں

یہ جماہی پر جماہی الحفیظ و الاماں
اف یہ انگڑائی پہ انگڑائی کسے آواز دوں

اف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی
اف یہ سناٹے کی تنہائی کسے آواز دوں

چل رہے ہیں زندگی پر چاندنی کے نیشتر
چبھ رہی ہے دل میں پروائی کسے آواز دوں

جوش کے بارے میں جناب سردار جعفری کے تاثرات

(سردار جعفری کے خطوط سے اقتباسات)

اس وقت جوش ملیح آبادی پر کوئی مضمون لکھنا میرے لئے ممکن نہیں۔ میں جوش پر اپنی کتاب "قبلۂ زندانِ جہاں" مکمل کر رہا ہوں جو تین ابواب پر مشتمل ہے:۔ (۱) جوش کی شاعرانہ شخصیت (۲) جوش کی صہبا پرستی (۳) جوش کی انقلابی رومانیت ــــ یہ کتاب بیسویں صدی کے ادارے سے شایع ہوگی۔

اگر آپ "الفاظ" کا کوئی جوش نمبر نکال رہے ہوں تو اس میں، میری کتاب "ترقی پسند ادب" سے جوش والا حصہ نکال کر شایع کر لیجئے۔ وہ ۱۹۵۰ء کی تحریر ہے۔ میری رائے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ صرف عقیدت اور محبت میں اضافہ ہوا ہے اور جوش کی عظمت کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ انھوں نے طوفانِ حوادث میں بھی اپنا سر بلند رکھا اور کج کلاہی کی ادا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج جوش نئی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کی عزت اور عظمت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان جوش کی شاعرانہ عظمت کو صحیح طور سے محسوس کرنے میں کچھ زیادہ وقت لے گا۔

آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ہے تو کیا
جوش کے افکار کو پائے گی مستقبل کی روح

سردار جعفری

شاعرِ انقلاب اور قبلۂ زنداں جہاں نے سخت سے سخت حالات کے باوجود آخر تک اپنا سر نہیں جھکایا، صرف اتنی فریاد کی ـــ "اے مری خونخوار تنہائی کسے آواز دوں" اور آنے والی نسلوں کے لئے یہ اطلاع فراہم کی ـ

مجھے قتل کر کے چھوڑا بہ گناہِ خوش نوائی
کہوں کس سے میں یہ جا کر مری قومِ بدگلو نے

ان کا ایک آخری زمانے کا شعر ہے جو آنے والے زمانے کے نقادوں کے لئے ایک چیلنج ہے ـ

میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں
میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوش

یہ شعر دیوانِ غالب یا دیوان شمس تبریز میں آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے ایک نوجوان شاعر اور ہندوستان میں حیدرآباد کے اختر حسن صاحب نے جوش کی تاریخ وفات اسی کی رباعی کے ایک مصرعے میں تلاش کی ہے ؎

میں شاعرِ آخرالزماں ہوں اے جوش

جوش پر اردو شاعری کا کلاسیکی دور ختم ہو جاتا ہے اور انھیں کی شاعری سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔

سردار جعفری۔ بمبئی

یادش بخیر

"جوش کی شاعری کی قدر و قیمت کو متعین کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا حجم بہت زیادہ ہے۔ ان کی شاعری مختلف اصناف پر پھیلی ہوئی ہے۔ مگر اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ جس طویل انقلاب کی زد میں ہماری زندگی گذشتہ دو سو سال سے، یعنی جب سے انگریزوں نے قدم جمائے ہم اپنی زندگی کی پرانی حقیقت سے مسلسل جنگ کرتے رہے ہیں کبھی آگے بڑھتے ہیں تو کبھی پیچھے بھی ہٹتے ہیں۔ لیکن وہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ جب تک کوئی بنیادی تبدیلی معاشرے کی ہیئت اجتماعی اور ہماری فکر اور نفسیات کی دنیا میں پیدا نہ ہو۔ یوں تو ہر انقلاب کے بعد ایک انقلاب ہے اور زندگی کا سفر غیر مختتم ہے، لیکن میں جس طویل انقلاب کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا تعلق اس انقلاب سے ہے جو ہمیں فیوڈل سماجی حقیقت اور فیوڈل ذہن سے باہر نکال کر جدید عہد میں لائے گا۔ ہم نے اس طویل انقلاب میں کئی منزلیں طے کی ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس انقلاب کے نقطۂ اختتام تک پہنچ گئے ہیں۔

چنانچہ اس پس منظر میں جوش کی شاعری کا ہماری زندگی سے ایک زندہ رشتہ ہے۔ انھوں نے اپنے نعروں سے اپنی مردہ قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے خطیبانہ انداز اور اس کی بلند آہنگی۔ ان دونوں کمزوریوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ لیکن وہ اس کا جواز اسی بات میں ڈھونڈتے کہ یہ قوم نازک اور سبک اشاروں سے جاگنے والی نہیں ہے۔ نئی نسل جوش کی ان توجیہات کو قبول نہیں کرتی ہے۔ اس لئے جوش سے اس کی دلچسپی کم ہے اسے جوش کا اسلوب شعر پسند نہیں ـــــ

روسو نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے یونان اور روم کی تہذیب میں تحریر فکر سے جدا نہ تھی جہاں تحریر ہوتی وہاں فکر ہوتی۔ مگر مسلمانوں نے اپنے علم انشا سے فکر کو تحریر سے جدا کر دیا۔

یہ بات روسو نے کچھ تعصب کی بنیاد پر نہیں کہی ہے۔ تاریخ یہ ہی کہ مسلمانوں نے علم انشا کو ترقی دی۔ انھوں نے انشا کو ایک ایسے فن میں تبدیل کر دیا کہ عبارت کے لئے فکر کوئی لازمی شے نہیں رہی۔ اس قسم کا انشا فارسی زبان میں خاص طور سے ملتا ہے۔ اور اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس انشا پردازی کا اثر جسے درباری زندگی نے جنم دیا تھا۔ ہماری درباری شاعری پر بھی پڑا اور پھر اس کا عمومی اثر ہماری شاعری پر۔ ہمارے شعرا ہمیشہ الفاظ کے معاملے میں مسرف رہے ہیں۔ مدح سرائی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے خزانوں کو لٹانا وہ منجملہ محاسن شعر تصور کرتے۔ جہاں جوش کی نثر پر ہماری اس انشا پردازی کا اثر ہے وہاں ان کی شاعری بھی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا ___

جوش کی شاعری حتیٰ کہ اقبال کی شاعری کو بھی نئی نسل کے شعرا نے جدید شاعری کا نام نہیں دیا۔ کیونکہ جدید شاعری انشا پردازی سے لفظ کے اسراف سے، خطابیات سے ہٹ کر اپنی راہ کالی ہے۔ اس پر مغرب کا اثر غالب ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ لیکن اب اثر مغرب کوئی بدعت نہیں ہے۔ یہ چند اشارات میں نے اس لئے مہیا کر دیئے ہیں کہ اس بات کو سمجھا جا سکے کہ ایسا کیوں ہے کہ باوجود اس بات کے کہ جوش اتنے اہم اور بڑے شاعر تھے۔ نئی نسل کو ان کی شاعری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا تعلق ان کے خیالات سے کم، ان کے اسالیب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ نئی نسل کچھ ان سے کم باغی نہیں ہے۔

(پروفیسر ممتاز حسین۔ پاکستان)

جوش کی شاعری کے کینوس پر پھیلی ہوئی رنگ و بو اور تلاش و جستجو کی ایک دنیا، ایک عالم آباد ہے۔ اس میں امیر، غریب، بچے، مرد، عورت، جوان، بوڑھے مختلف پیشوں کے لوگ گوالے، جامن والی تاجر، صنعت کار، مزدور، عالم، جاہل، مولوی، حجرے، مسجدیں، منادر، دریا گھاٹ، جنگل پہاڑ، چاندنی اور تاریک راتیں، گھر گلیاں، آنگن محل، محل سرائیں بوسیدہ اور زمیں بوس عمارتیں، جاگتی جگمگاتی سڑکیں، فیشن ایبل علاقے، تنگ و تاریک مزدوروں کی بستیاں، طوائف اور ان کے بالا خانے، کیا کچھ نہیں ہے؟ پھر آدمی کے حوالے سے اس کی مختلف النوع مزاجی کیفیات، مثلاً ہنستا کھلکھلاتا آدمی، روتا بسورتا ہوا آدمی، فطرت بہار اور وقت کے دھاروں پر بہنے والا آدمی، فطرت کے خلاف جنگ کرتا ہوا آدمی، ظالم، مظلوم، حاکم، محکوم، بوسیدہ لباس میں سچا اور کھرا آدمی، زربفت کے غلافوں میں لپٹا ہوا ریاکار اور فریبی آدمی

غرض جیتا جاگتا ایک ہجوم ہے جو جوش کی شاعری میں کچھ یہاں کچھ وہاں بکھرا پڑا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی تخلیقی فن پارہ آدمی اور اس کے مسائل، اس کی ضروریات زندگی کے لئے ترستی ہوئی دل کو تڑپا دینے والی دردناک تصویر نہ پیش کرتا ہو۔ لیکن ایسی بھی لاتعداد نظمیں ہیں، جن میں اس آدمی کا دوسرا رخ 'جوش باش، سرمست، زندگی کی مسرتوں کو سمیٹتے ہوئے بھی ملتا ہے۔ پھر بظاہر فطرت کی ایسی ولولہ انگیز تصویر کسی کی شاعری ہے جس کو ویرانوں میں بیٹھا ہوا آدمی پڑھے تو اس کے گرد و پیش، کلیوں کے چٹکنے کی آواز، شگوفوں کے کھلتے ہوئے لمحوں کی وہ خوشبو جو مشام جان کو معطر کر دے۔ گھٹاؤں کے اودے اور کالے کالے رنگ، بجلی کی تڑپ آسمان اور بادل گرجنے کی ہیبت ناک آوازوں سے لبریز ماحول میں تبدیل ہونے لگے۔ جوش کی شاعری کا یہ کمال ان کی ذات پر ختم ہے۔ بیسویں صدی کا کوئی شاعر محاکات کی شاعری میں ان کا ہمسر اور ہم پلہ نہیں ——

(عتیق احمد - پاکستان)

جوش نے اردو شاعری کو اس درجہ مالا مال کیا ہے کہ وہ زبان کو مالا مال کرنے کے باب میں قلی قطب شاہ، نظیر اکبرابادی اور میر انیس کی صف میں آکھڑے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری میں جوش اور انگریزی شاعری میں ملٹن کے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہ دونوں شعری زبان کے جملہ امکانات کھنگالتے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ جوش زبان پر اپنی بھرپور قدرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ وہ زبان کے طمطراق سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی فکر کی سچائی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ غزل کی روایت میں طویل فکری نظموں کے لئے راہ ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سینئر ہمعصر اقبال نے بھی یہی طریقہ کار اپنایا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جوش کے لئے ان کے بعض جدید ہمعصروں نے وہی سب کچھ کہا جو ایلیٹ اور اس کے ہم نواؤں نے ملٹن کے بارے میں کہا تھا۔ یہی کہ ملٹن کے یہاں زبان کی گھن گرج کے علاوہ اور کیا ہے۔ لیکن جس طرح ایلیٹ مآل کار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے خیال پر نظر ثانی کرتے ہوئے ملٹن کی "عظمت" تسلیم کی۔ بعینہٖ اسی انداز میں جوش کی عظمت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ بس زوائد کی شکایت پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ لیکن اگر ان زوائد کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے گنجائش پیدا کر لی جائے تو پھر جوش کی عظمت کے اعتراف میں آخری رکاوٹ بھی دور ہو سکے گی۔

(محمد علی صدیقی - پاکستان)

مغیث الدین فریدی نئی دہلی

قطعاتِ تاریخ

تواریخ سخنداں
۱۹۸۲ء

ماتمِ مرگِ شیریں کلام
۱۴۰۲ھ

بحرِ علم و دانش جوش ملیح آبادی و فراق گورکھپوری
۱۹۸۲ء

(۱)

اٹھ گئے دنیا سے دونوں باکمال | لٹ گیا اردو زباں کا طمطراق
ہے دلوں پر نقش تاریخِ وفات | عزت افزائے سخن جوش و فراق

۱۹۸۲ء

(۲)

اردو زباں کے لب پہ ہے غالب کی یہ فغاں | "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے"
جو آنکھ شعلہ بار تھی جو لب ترانہ سنج | وہ آنکھ بند ہو گئی وہ لب خموش ہے
نظم و غزل سنوارنے والے چلے گئے | بزمِ سخن میں اب نہ فراق اور نہ جوش ہے
لفظ و بیاں کا سحر جگانے جو آئے تھے | اب وہ کہاں ہیں، کون کہے کس کو ہوش ہے

از روئے فکر ہے یہی تاریخِ عیسوی
"بزمِ خیال میکدہ بے خروش ہے"

۸۰ + ۱۹۰۲ء = ۱۹۸۲ء

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

زندگی تو متنازع ہے ہی، موت بھی متنازع فیہ بن سکتی ہے۔ جوش کی موت پر حفیظ جالندھری نے بیان دیا کہ جوش کو بہت پہلے مرجانا چاہئے تھا۔ گویا شعرائے ہندو پاک کی درازیٔ عمر و قضا کا فیصلہ مسبّب الاسباب نے حفیظ صاحب کے سپرد کر رکھا ہے اور جوش ان کی مقرر کی ہوئی مہلتِ عمر سے زیادہ دنیائے آب و گل میں رہ لئے۔ جوش کا یہی ایک گناہ نہیں، ان کا جو اعمال نامہ حضرت حفیظ کے پاس محفوظ ہے، اس کی بنا پر انھوں نے یہ فیصلہ بھی صادر فرمایا کہ اب جوش اپنے زندگی بھر کے گناہوں کی سزا دوسری دنیا میں بھگت رہے ہوں گے ــــــ یعنی حفیظ صاحب صرف اس دنیا ہی میں ایک شاعر کی زندگی کے ماہ و سال کے شمار پر معمور نہیں، اس کے اعمال کی سزا و جزا کا آخرت میں بھی فیصلہ وہی فرماتے ہیں۔ جوش کو علم ہوتا کہ کراماً کاتبین کے علاوہ ایک تیسرا موزوں طبع فرشتہ بھی ان کی اعمال کی کتابت کر رہا ہے تو شاید وہ اپنے اعمال و عقائد کے برملا اعلان میں کچھ محتاط رہتے۔ حفیظ کے اس بیان پر خود پاکستان کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے ملامتی بیان جاری کیا۔ ہندوستان کے اردو حلقوں میں بھی اس کا ردِّ عمل ہوا۔ عموماً لوگ اپنے بدترین دشمنوں کو بھی ان کے مرنے کے بعد معاف کر دیتے ہیں یا مرنے والے نے جو ظلم کیا ہے، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے خاموش ہو رہتے ہیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی اللہ اور بندے کے مابین معاملہ ہے، اگر جوش نے شعایرِ مذہب کی پابندی اس طرح نہیں کی، جس طرح حفیظ صاحب چاہتے تھے، تو یہ معاملہ اللہ اور جوش کے درمیان ہے، جوش و حفیظ کا معاملہ نہیں ـــ حقوق الناس کی ادائیگی میں شاید جوش سے سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ انھوں نے حفیظ سے بہتر شاعری عمر کے ہر حصے میں کی ــــ جوش کو کوئی ناظم ہی کیوں نہ کہے، ان کی قوتِ نظم کا اظہار پست سطح پر بھی شاہنامے کی قافیہ پیمائی سے بہتر ہی رہا ــــ جوش حفیظ سے بہتر شاعری کر کے ہندوستان میں ہی رہتے، پاکستان ہجرت نہ کرتے تو شاید حفیظ کو ان کی زندگی کی درازی کا اتنا قلق نہ ہوتا۔ جوش کے

پاکستان جانے کے بعد بھی سب سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار حفیظ ہی نے کیا تھا۔ یہ ان کے اعتماد کی کمی اور فن کی کمزوری تھی جو جوش کے ورودِ پاکستان سے ہراساں تھی۔ وہی کمزوری جوش کی موت پر غصے کی شکل میں پھر مشتہر ہوئی۔

جوش پاکستان کیوں گئے؟ ان کا عذر تھا کہ اپنے اہل و عیال کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ جوش سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے سکونتِ پاکستان اختیار کی، اور ان کے بعد نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری ایسے ادیبوں نے ہجرت کی۔ ان کے ترک وطن میں ذاتی اسباب اور خانگی مجبوریاں کارفرما تھیں ــــ لیکن جوش کا معاملہ مختلف تھا، وہ ذمہ دار عہدے پر مامور تھے، وزیر اعظم اور دوسرے اکابرینِ سلطنت تک ان کی رسائی اور اثر تھا۔ وہ زندگی بھر نظریۂ پاکستان اور فرقہ وارانہ سیاست کے مخالف رہے تھے۔ ہندوستان کو چھوڑنا آسان ہو تو ہو، اپنے ماضی کو ترک کرنا ممکن نہیں ــــ جوش کا ماضی ان کے ساتھ رہا اور پاکستان میں انھیں وہ سب کچھ نہ ملا جس کی انھیں امید تھی وہ عزت و رسوخ جو ہندوستان میں انھیں میسر تھے، وہاں کبھی ان کے حصے میں نہ آئے "یادوں کی برات" ان کے اس شکوے کا خود نوشت دفتر ہے۔ جوش سے اگر شکایت تھی تو ہندوستان کی حکومت، مسلمانوں اور اردو والوں کو، لیکن سب نے انھیں معاف کر دیا۔ ان کی موت پر ہندوستان کے صدر اور وزیر اعظم نے بھی پیامات تعزیت بھیجے۔ ہندوستان کے رسائل دھڑا دھڑ نمبر نکال رہے ہیں۔ کراچی میں ان کی یاد میں جو مشاعرہ ہوا وہ بھی جوش کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ جوش کی شاعری کا رنگ ترکِ وطن کے بعد پھیکا پڑ چکا تھا، اور نئے رجحانات و تجربات کی یورش نے ان کی ہم عصر معنویت و اہمیت کو بڑی حد تک گھٹا دیا تھا ــــ اس معاملے میں فراق زیادہ خوش قسمت تھے کہ وہ تادمِ آخر عصری احساس و فکر کے ترجمان مانے جاتے رہے، اس کا ایک سبب تو دونوں کے وسائل اظہار کا فرق ہے۔ غزل کی اشاریت و رمزیت سیاسی و سماجی مسائل کو استعاروں کی زبان میں اپنے عصر سے ماورا بنا کر اسے ہر بدلتے ہوئے میلان سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ جوش کی نظمیہ شاعری کا بڑا حصہ براہِ راست برہنہ اظہار ہونے کی وجہ سے وقتی اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے اسلوب اور نظموں کی ریل پیل میں معنی کی وہ سطح جو 'ماورائے سخن' ہوتی ہے پامال ہو جاتی تھی، لیکن یہ بات ان کی پوری شاعری کے لئے صحیح نہیں ــــ ان کی شاعری کا جمالیاتی عنصر، طنزیہ لہجہ، اور نظموں پر ان کی خلاقانہ دسترس اردو شاعری کے سرمایے میں آج بھی اضافے ہیں۔ وہ عظیم نہ سہی، بہت اہم شاعر تھے، اور رہیں گے۔ فراق کی موت سے غزل کی کلاسیکی روایت

ختم نہیں ہوئی، اس لئے کہ غزل جدید سے جدید تر قالب میں بھی کلاسکیت سے یکسر منقطع نہیں ہوسکتی جوش کی موت سے نظم کی وہ کلاسیکی روایت جو نظیر، انیس اور ایک حد تک اقبال کے اسالیب میں کمال کو پہنچی تھی، ختم ہوگئی۔ جدید نظم کلاسیکی روایت اور لہجے سے بہت مختلف ہو چکی ہے۔ اور یہ انحراف وقت کے ساتھ ساتھ کم نہیں ہوگا بڑھتا جائے گا۔ اس لحاظ سے جوش کو اردو کا آخری کلاسیکی شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ان کی موت کے بعد ان سے عقیدت و محبت کا اظہار اپنی کلاسیکی روایت کے احترام کا ثبوت ہے۔ جوش کے منکر کلاسیکی روایت سے ناآشنا ہیں، اس لئے اپنے انکار میں قصوروار نہیں۔

حفیظ جالندھری کسی لحاظ سے کبھی بھی جدید حیثیت کے شاعر نہیں رہے۔ ان کی شاعری نظم میں ہو یا غزل میں یا گیت میں، ایک عہد میں غیر معمولی مقبولیت کے باوجود بڑی حد تک روایتی اور سطحی رہی۔ ان کا اسلوب اور لہجہ کلاسیکی روایت سے ماخوذ ہے، مگر خود کلاسیک کا درجہ حاصل نہیں کرسکا جب کہ جوش کو زندگی ہی میں کلاسیک کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ دونوں کا یہ فرق خود مذہبی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ حفیظ کا شاہنامۂ اسلام کمزور شاعری اور کبھی کبھی قافیہ پیمائی ہے اس سے قطع نظر کہ اسلام کی تاریخ کو شاہنامے کا عنوان دینا بجائے خود اسلام کی جمہوری اور انقلابی روح کی نفی ہے۔ ایران کی تاریخ کو شاہنامہ کہنے میں فردوسی حق بجانب تھا لیکن اسلام کا شاہنامہ لکھنا اسلام کی تعلیمات سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس کے مقابل میں جوش کی نعتیں، سلام اور مرثیے یا مسدس، خصوصاً حسین اور انقلاب، اسلام کی انقلابی روح، انکار شاہی اور جمہور دوستی کے ایسے فنی اظہارات ہیں جو جدوجہد آزادی کے دور سے آج کی جمہوری تحریکوں تک کے لئے معنویت و وقعت رکھتے ہیں۔ جوش نے کچھ رباعیات میں مذہبی فکر کا مذاق اڑایا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں جامد مذہبی فکر و شعایر نے کہیں کہیں حدِ ادب کو پار کیا اور اس کی وجہ سے کبھی کبھی مطعون بھی ہوئے۔ آزادی سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں ان کے اشعار پر احتجاج ہوا تھا، اور انھوں نے آگے شعر سنانے سے انکار کر دیا تھا۔ جوش کی شخصیت بجائے خود اتنی مستحکم اور پرشکوہ تھی کہ ان کے ساتھ کوئی وہ سلوک کرنے کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا جو یگانہ کے ساتھ بدقسمتی سے ہوا۔ یگانہ کو جوش کی سی شخصیت، مقبولیت حاصل نہ تھی حالانکہ ان کا شاعرانہ رتبہ اپنے بیشتر مجاہدین سے بلند تر تھا۔ باوجود اس کے کہ جوش نے کہیں کہیں مذہبی عقائد سے کھلواڑ کیا ہے، ان کی شاعری کو ملحدانہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان

کی ابتدائی مذہبی حسیت، رسولؐ، اسلام، حضرت علیؑ اور امام حسینؑ، شہدائے کربلا سے ان کی جذباتی و ذہنی عقیدت کسی دور میں ان کی شاعری سے الگ نہیں ہوئی ـــــــ جوش کی فطرت سے وابستگی اور خصوصیت سے ظہورِ صبح کے مناظر سے انھیں جو روحانی تجربہ حاصل ہوتا تھا، اس کی نمائندگی کے لئے ابتدائی دور کا ان کا یہ شعر ہی کافی ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ان کی مذہبی حسیت ان کے جمالیاتی تجربے پر مبنی تھی ـــــــ یہ ماننا پڑے گا کہ جو اس کی سطح سے جمالیاتی تجربے کو اردو کے کسی اور شاعر نے جوش سے زیادہ خوبصورت شاعرانہ زبان عطا نہیں کی۔ یہ تجربہ اس کی سطح سے اٹھ کر روحانی تجربہ بن گیا ہے، وہاں جوش کی شاعری عظمت کی حدوں کو چھوتی ہے، حفیظ مذہب کے ظاہر سے کتنی ہی وابستگی ظاہر کریں، وہ مذہبی شاعری میں بھی جوش کی اس سطح تک کہیں نہیں پہنچ سکے ـــــــ کیا اعمال کے محاسبے میں اچھی اور بری شاعری کی کوئی جزا و سزا نہیں؟

فراق کا شوق تھا کہ ان کے متعلق ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہے ـــــــ انھوں نے انگریزی اور اردو میں خود اپنے متعلق دوسرے ناموں سے بھی لکھا ـــــــ اپنے ایسے خطوط بھی چھپوائے جن کا مواد متنازع فیہ تھا ـــــــ جوش کو اس طرح موضوعِ بحث بننے کا شوق نہ تھا۔ لیکن ان کی فقرے بازی اور غیر محتاط تحریروں نے انھیں اکثر بحثوں ہی کا نہیں، بلکہ حملوں کا ہدف بھی بنایا۔ نیاز فتحپوری نے ان کی کسی بات سے ناراض ہو کر ان کے خلاف تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور علی اختر (حیدرآبادی) کو ان سے کامیاب نظم گو ثابت کرنے کی ناکام سعی کی۔ نیاز صاحب کے تنقیدی قلم سے اس دور کے اکابر غزل گو بھی نہ بچ سکے۔ یہ نیاز کی کمزوری تھی کہ وہ زبان کی اغلاط کی نشان دہی کے ساتھ اصلاح بھی دے دیا کرتے تھے۔ زبان، عروض اور فن جاننا ایک بات ہے اور اچھا شعر کہنا دوسری بات۔ جوش کی شہرت و مقبولیت پر ان تنقیدوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب وہ ترقی پسندوں کے سرخیل و قبلۂ و کعبہ بنے تو ترقی پسندی کے خلاف اعتراضات کا رُخ ان کی طرف بھی ہوا۔ ان کی انقلابی شاعری کو "کف در دہاں" بیرحج کہا گیا ـــــــ لیکن خود جوش "کف در دہاں" نعروں سے بیزار ہوئے تو ایشیا کی بیداری کی نمائندہ نظموں کے انتخاب "شکستِ زنداں"[1] پر ایک نظم لکھ ڈالی اور مرتب کو یوں نوازا ؎

آفریں بر غلامِ ربّانی ـــــ کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس

---

[1] مرتبہ غلام ربانی تاباں

یہ جوش کی شخصیت کا سحر تھا کہ اس کے باوجود ترقی پسند شعرا ان کا انکار نہ کر سکے۔

پاکستان میں افکار نے جو نمبر نکالا۔ نذیر احمد کی زبان پر جوش کی اصلاح سے خفا ہو کر شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا ضخیم جوش نمبر ان کے خلاف مضامین جمع کر کے شائع کیا۔ جوش کے ناقدین میں روایتی شاعری کے پرستار ترقی پسندوں کے مخالفین، مذہب اور پاکستان کے مویدین و مجاہدین کے ساتھ کچھ سنجیدہ ادیبوں کے نام بھی اس نمبر کے لکھنے والوں میں ہیں۔ ان میں سب سے اہم مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی کا ہے، جو اس سے قبل 'فکر و نظر، علی گڑھ' کے پہلے شمارے میں شائع ہو چکا تھا ــــ اس رسالے کے مدیر تو رشید احمد صدیقی تھے، جن سے علی گڑھ کے مشاعرے میں جوش کی چھڑپ ہوئی تھی، لیکن مجلس ادارت میں اوروں کے ساتھ ڈاکٹر عبدالعلیم کا بھی نام تھا ــــ اس لئے خلیل کے مضمون کی اشاعت کو محض مخالف ترقی پسند میلان کا نمائندہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ خلیل کی تنقید شواہد و دلائل پر مبنی ہے، ان کے اعتراضات بے بنیاد نہیں ــــ جوش کی صرف طنزیہ شاعری ان کی شدید تنقید کے حملے سے محفوظ رہی۔ جوش نے کسی رسالے میں اس کا مختصر سا غیر سنجیدہ جھنجھلایا ہوا جواب بھی لکھا تھا ــــ لیکن خود ساقی کا جوش نمبر اچھی تنقید کا نمونہ نہیں، شخصی مخاصمت و اختلاف کا آئینہ دار ہے۔ اس کے جواب میں جوش نے شاہد احمد دہلوی اور ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد پر شخصی حملے کئے ــــ

جوش نمبروں کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑا ہی تھا کہ "یادوں کی برات" آگئی ــــ اس کتاب پر بھی کافی لے دے ہوئی۔ لیکن ایک بات کا اعتراف مخالفین کو بھی کرنا پڑا کہ نظمیہ شاعری میں زبان کی قدرت کا جو مظاہرہ جوش کے یہاں ہوتا ہے، نثر میں بھی انھوں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ جوش کی زبان کا اسلوب پرانا ہے لیکن اس میں جو قوت ہے شخصیتوں، واقعات اور مکالموں کی ادائیگی میں پوری طرح بروئے کار آئی ہے ــــ اس خود نوشت میں جوش نے اپنے خاندان، بچپن، جوانی اور معاشقوں کو تخئیل آفرینی سے خوب رو ما نیا کر پیش کیا ہے۔ دوستوں کے ذکر میں بہ استثنائے چند اکثر کے مضحک پہلوؤں اور کمزوریوں کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظام حیدرآباد ایسے مطلق العنان و جلیل القدر حاکم کے سامنے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش برابر کے حریف ہیں۔ یہ محض مبالغے ہیں ــــ اپنے عشقوں کی گنتی گنانے میں اور اپنی 'محبوبیت' کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں وہ حقیقت اور توازن سے رشتہ توڑ بیٹھے ہیں اس کتاب پر اس کی اشاعت کے فوری بعد میں نے 'ہماری زبان' میں تفصیلی تبصرہ کیا تھا، اس لئے اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں ــــ صرف اتنا اشارہ

کافی ہے کہ جوش نے خود انھیں کی آنکھ سے اپنے کو جس طرح عمر بھر دیکھا "یادوں کی برات" اسی کی تصویر ہے۔ جوش سیاسی تحریک سے وابستہ رہے لیکن اس کتاب میں تحریک آزادی، ترقی پسندی، تقسیم، فسادات کسی کا ذکر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انقلاب تمام ہم عصر انقلابوں سے بے تعلق اور ماورا رہے۔ یہی رویہ ان کی انقلابی شاعری کو کمزور کرتا ہے۔ انقلاب بھی ان کے رومانی مزاج اور نرگسیت کے لئے محض ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنے اور اپنی شاعری کے خط و خال کو دیکھتے اور چمکاتے رہے۔

روسو کی اعترافات، ایک عہد آفریں خود نوشت تھی، بے باک اور عریاں حقیقت نگاری اور بر خود غلط خود احتسابی کا صحیفہ۔ روسو نے بھی اپنے معاشقوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محبت اس کے لئے ضروری تھی اور عورت جذبۂ رفاقت کا لازمہ۔ جوش کے یہاں محبت روحانی جذبہ ہے نہ جذبۂ رفاقت، وہ اس کی جسمانی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔ نہ انھوں نے روحانی کرب محسوس کیا جو زندگی بھر روسو کا مقدر رہا۔ عدم تکمیل کا احساس روسو کے "اعترافات" پر حاوی ہے۔ جوش نے مکمل اور بھرپور زندگی گزاری اور وہ کبھی عدم تکمیل کے اس تجربے سے دوچار نہیں ہوئے جو نہ صرف سماج و سیاست بلکہ فرد کی زندگی کے لئے بھی انقلاب کا سرچشمہ بنتا ہے —
"اعترافات" "یادوں کی برات" میں معاشقوں کا بیان بھی مختلف ہے۔ جوش نے مزے لے لے کر انھیں سلسلہ وار الگ عنوان کے تحت گنایا ہے جب کہ روسو نے انھیں اپنی زندگی کے بہاؤ سے الگ نہیں رکھا، اسی لئے وہ اس کے داخلی تجربات اور جذباتی ضرورت کا لازمی حصہ معلوم ہوتے ہیں ——— تین چیزیں "اعترافات" اور "یادوں کی برات" میں مشترک ہیں، فطرت ——— سے زیادہ وابستگی، حد سے زیادہ جذباتیت، جنسی نمائش پسندی۔ روسو مغرب میں رومانیت کی تحریک کا نقیب ہے، اور فطرت سے اس کی محبت سماجی تبدیلی کے فلسفے تک پہنچتی ہے۔ جوش کے یہاں فطرت کی محبت حواس کی جمالیاتی سطح تک محدود رہی۔ وہ اسے سماجی تبدیلی کے قبول کردہ انقلابی فلسفے سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہی ان کی شاعری میں فکری عنصر اور وجودی تجربے کی خامی کا سبب ہے۔ روسو کے زندگی اور خود نوشت میں "جنونِ سازش شکاری" ہے جو دیوانگی کی حد پر ختم ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں لذت کوشی کا رجحان ہے۔ "اعترافات" بیانِ صفائی ہے۔ "یادوں کی برات" خود پسندی نشاط کوشی کی داستان۔ روسو اور جوش دونوں کے یہاں بچپن سے جنسی نمائش پسندی کا سراغ ملتا ہے رقیق جذباتیت جو روسو کے اعترافات میں ہے جوش کے خطوط تک

تک مل جاتی ہے۔ شانتی نکیتن سے اپنی ، سالہ بیٹی سعیدہ کو لکھتے ہیں :

"دُکھیا باپ کا خط اس کی ہفت سالہ لڑکی کے نام ——— سعیدہ پیاری ! میں نے تیری ماں کا خط پڑھا جس میں لکھا تھا کہ تیرے پاس اب کپڑے بھی نہیں رہے۔ گرمی کی شدت ہے اور موٹے کپڑے پہنتے وقت تو رونے لگتی ہے ۔ آہ تیرے باپ کی بے کسی! اب وہ اپنی بیٹی کو گرمیوں کا لباس بھی نہیں پہنا سکتا بیٹی یہ خبر پردیس میں تیرے باپ نے سنی عین اس عالم میں کہ فکریں اس کے دل کو سانپ کی طرح ڈس رہی تھیں .... اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔"

"پیاری سعیدہ! تیرا مصیبت زدہ باپ یہ دکھ بھول نہیں سکتا، اس خبر کا داغ اس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔ سن تیرا باپ وصیت کرتا ہے کہ اس مبارک دن جب وہ مر جائے تیری اس خراب پوشاک کی یادگار میں اسے ایسے ہی موٹے کپڑے کا کفن دیا جائے۔"

(بحوالہ عصمت ملیح آبادی ، قومی آواز ، لکھنؤ)

جوش کی جاگیرداری اور زمین داری کے دعووں کی روشنی میں یہ واقعہ اور خط دونوں مبالغہ آمیز جذباتی التباسات معلوم ہوتے ہیں۔ رومانیت کا یہ رویّہ ادب ہی میں نہیں زندگی میں بھی التباس کا سہارا لیتا ہے ——— وطن اور دوستوں کی یاد ، عہدِ گزشتہ اور گم شدہ جوانی کے ذکر میں بھی جوش کا انقلابی مزاج رومان زدہ ماتم و فریاد کا شور بن جاتا ہے ۔ اس کے برخلاف روسو کی غربت و محرومی کچھ تو اس کے حالات کا نتیجہ ہے اور کچھ خود عائد کردہ ۔ اس نے بچپن میں گھر چھوڑا زندگی بھر کا بن باس لیا۔ مقبولیت کے عروج کے زمانے میں شہنشاہِ فرانس کی حضوری اور وظیفہ قبول نہ کیا۔ اس کے باوجود اس کے یہاں غربت و مجبوری کا نوحہ کہیں نہیں، اگر نوحہ و نالہ ہے تو اپنی جذباتی تشنگیوں کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رومانیت تصورِ مرگ کو بھی جذبۂ ترحم کے ابھارنے کا وسیلہ بنا دیتی ہے۔ عنفوانِ شباب ہی سے روسو بار بار اپنی قریب آتی مفروضہ موت کا ذکر کرتا ہے ، جوش کے خطوط اور تحریروں میں بھی موت کو جگہ جگہ خوش آمدید کہنے کا جذبہ نمایاں ہے لیکن محض ہمدردی و رحم کو ابھارنے کے لئے ، یہ حقیقی جذبہ معلوم نہیں ہوتا۔ جوش میں شہیدوں کی شان نہ تھی ، نہ شہادت ان کا مقدر تھی ——— آخر عمر میں حیدرآباد کا ڈھائی ہزار وظیفہ حکومت آندھرا پردیش نے ان کے لئے جاری کر دیا تھا جسے تین ہزار روپے ان کے

کھاتے میں جمع ہوئے ۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت بھی انھیں ماہانہ بارہ ہزار کا وظیفہ اور دوسری سہولتیں دیتی رہی ـــــ جوش اپنی فطرت پرستی اور عشق پیشگی کے باوجود روسونہ تھے اس لئے کہ ان کے یہاں فطرت اور عشق کا تجربہ اس انقلابی مفکر سے بہت مختلف نوعیت رکھتا ہے ۔ اسی لئے 'یادوں کی برات' کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ اپنے دور کے ایک بڑے قادر الکلام شاعر کی زندگی کا خود نوشت بیان ہے جو کسی گہری روحانی واردات سے یکسر مبرّا ہے ۔ ان خامیوں کے باوجود جوش کی نثر ان کے منفرد اور جاندار اسلوب کا ایسا کارنامہ ہے جسے مدتوں دلچسپی کے ساتھ لغات کے ایک بیش بہا ذخیرے کے طور پر پڑھا اور استعمال کیا جائے گا ۔

جوش کی شاعری کی اہمیت ان کی نثر سے کہیں زیادہ ہے ۔ فراق اگر زندگی بھر کسی کو اپنا حریف سمجھتے رہے تو وہ محض جوش تھے ۔ ترقی پسندوں نے اگر کسی کو آخر وقت تک " قبلۂ رندانِ جہاں " مانا تو وہ صرف جوش تھے ـــــ مخالف ترقی پسند نظریات رکھنے والوں اور جدیدیت کے کچھ میلانات کے طرف داروں کو اگر کوئی مناسب ہدف ملامت ملا تو وہ جوش ہی تھے ـــــ پرستش اور سنگ باری دونوں دیو قامت شخصیتوں کے حصے میں ہی آتی ہیں ـــــ جوش سے زیادہ ان کے کسی ہم عصر کو مقبولیت و شہرت ملی نہ ان سے زیادہ کوئی ہدفِ ملامت بنا ، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جوش ہمارے عہد کی بڑی شخصیت تھے ۔ اگر ان کی شاعری کا سختی سے اچھا انتخاب کیا جائے تو ان کے شاعرانہ مرتبے کو متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے ـــــ اپنی کمزوریوں کے باوجود جوش اردو کے اہم شاعروں میں ہمیشہ جگہ پائیں گے ـــــ ان کی کمزوریاں بھی ادب میں فیشن بنیں اور ان کی خطابت و لفظیات کی بھی برسوں تقلید ہوتی رہی ۔ رباعی میں وہ اردو کے سب سے بڑے نہیں تو چند بہترین شاعروں میں ضرور ہیں ۔ اسی کے ساتھ ان کی طنزیہ شاعری ہی نہیں جمالیاتی تجربے اور جسمانی عشق کی شاعری بھی اردو کے سرمایے میں منفرد ہے اور رہے گی ـــــ طنز و خوش مذاقی بڑے ادب کا ایک لازمی عنصر ہے ، اس عنصر نے جوش کو وقتی اہمیت کا شاعر ہونے سے بچا لیا ۔

جوش کی موت سے واقعی اردو ادب کا ایک دور ختم ہو گیا ـــــ نظم جوش سے کتنی ہی آگے بڑھ چکی ہو ، جوش کی نظم کا نہ سہی ، بحیثیت مجموعی ان کا قد اب بھی اس دور کے شعرا میں سب سے اونچا ہے ۔ قد کی یہ بلندی محض شاعری کی دین نہیں ، شخصیت کا بھی اثر ہے ۔ اب یہ امکان نہیں کہ جوش کی ایسی با اثر شخصیتیں اردو میں پیدا ہو سکیں ـــــ جوش نے خود کہا تھا ؎

بِلّٰہ الحمد کہ قوم شعرا میں اے جوش   مجھ سا کافر نہ اٹھا کوئی مسلمانوں میں

اس دعوائے کافری کے لئے جس قوتِ ایمانی کی ضرورت ہے اس کا اندازہ حفیظ صاحب کو نہیں ہو سکتا ۔ ☐

فکر تونسوی
نئی دہلی

میری مطالعہ گاہ

جب میں دنیا بھر کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا، تو میں نے ایک مطالعہ گاہ بنالی ـــــــ مجھے اپنی یہ حرکت بالکل یوں لگی، جیسے میرے ایک شاعر دوست نے سالہا سال میگساری کرنے کے بعد توبۃ النصوح کر لی تھی۔ تو اچانک ایک دن وہ مزارِ غالب پہ مل گئے۔ وہسکی کی بوتل بغل میں تھی میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا توبہ ٹوٹ گئی ہے"

بولے "نہیں۔"

"تو پھر یہ وہسکی کی واضح بوتل؟"

"یہ غالب کے مزار پر برسانے کے لئے لایا ہوں"

میں نے بھی اپنی مطالعہ گاہ اس لئے بنائی ہے۔ تاکہ اس پر مزارِ غالب کا شبہ ہو۔ توبہ کرنے والوں کے لئے سنہری چانس ـــــــ!

مطالعہ گاہ، مکان کی سب سے اوپر کی منزل پر تعمیر کی گئی ہے، سنا ہے، خدا عرش پر رہتا ہے۔ اس لئے عرش سے ادھر اپنا ایک مکان بنالیا۔ خیال تھا کہ عرش سے ادھر اپنا مکان بنائیں گے تو خدا سے براہِ راست تو تو میں میں ہو سکے گی۔ ویسے تو تو بھی میں ہی کروں گا اور میں میں بھی میں کیوں کہ اس کی خصلت میں تو خاموشی لکھ دی گئی ہے ـــــــ اور یوں بھی مطالعے کی نہ اسے ضرورت ہے نہ مجھے۔ ویسے میں نے اتفاقاً خدا کو آواز بھی دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ خدا کا ٹیلی فون یا تو ڈیڈ (DEAD) ہو چکا ہے۔ اور یا خدا خود ڈیڈ (DEAD) ہو چکا ہے۔

اور یا پھر مسلسل خاموشی کے سبب، بہرا ہو چکا ہے۔ شور و غوغا سے بھرپور ڈھیروں مخلوق پیدا کرے گا۔ تو کان کہاں تک سالم رہ سکتے ہیں۔

اور یا پھر میں نے سوچا، خدا سے میرے تعلقات چونکہ ہمیشہ ناخوشگوار رہے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے، مجھ سے گفتگو کر کے اپنی بلندی کو پستی میں نہ بدلنا چاہتا ہو۔ خودی اچانک بلند ہو جائے

کھاتے میں جمع ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت بھی انھیں ماہانہ بارہ ہزار کا وظیفہ اور دوسری سہولتیں دیتی رہی ـــــ جوش اپنی فطرت پرستی اور عشق پیشگی کے باوجود روسو نہ تھے اس لئے کہ ان کے یہاں فطرت اور عشق کا تجربہ اس انقلابی مفکر سے بہت مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ اسی لئے 'یادوں کی برات' کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ اپنے دور کے ایک بڑے قادر الکلام شاعر کی زندگی کا خود نوشت بیان ہے جو کسی گہری روحانی واردات سے یکسر مبرا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود جوش کی نثر ان کے منفرد اور جاندار اسلوب کا ایسا کارنامہ ہے جسے مدتوں دلچسپی کے ساتھ لغات کے ایک بیش بہا ذخیرے کے طور پر پڑھا اور استعمال کیا جائے گا۔

جوش کی شاعری کی اہمیت ان کی نثر سے کہیں زیادہ ہے۔ فراق اگر زندگی بھر کسی کو اپنا حریف سمجھتے رہے تو وہ محض جوش تھے۔ ترقی پسندوں نے اگر کسی کو آخر وقت تک "قبلۂ رندانِ جہاں" مانا تو وہ صرف جوش تھے ـــــ مخالف ترقی پسند نظریات رکھنے والوں اور جدیدیت کے کچھ میلانات کے طرف داروں کو اگر کوئی مناسب ہدف ملامت ملا تو وہ جوش ہی تھے ـــ پرستش اور سنگ باری دونوں دیو قامت شخصیتوں کے حصے میں ہی آتی ہیں ـــ جوش سے زیادہ ان کے کسی ہم عصر کو مقبولیت و شہرت ملی نہ ان سے زیادہ کوئی ہدفِ ملامت بنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جوش ہمارے عہد کی بڑی شخصیت تھے۔ اگر ان کی شاعری کا سختی سے اچھا انتخاب کیا جائے تو ان کے شاعرانہ مرتبے کو متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے ـــ اپنی کمزوریوں کے باوجود جوش اردو کے اہم شاعروں میں ہمیشہ جگہ پائیں گے ـــ ان کی کمزوریاں بھی ادب میں فیشن بنیں اور ان کی خطابت و لفظیات کی بھی برسوں تقلید ہوتی رہی۔ رباعی میں وہ اردو کے سب سے بڑے نہیں تو چند بہترین شاعروں میں ضرور ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی طنزیہ شاعری ہی نہیں جمالیاتی تجربے اور جسمانی عشق کی شاعری بھی اردو کے سرمایے میں منفرد ہے اور رہے گی ـــ طنز و خوش مذاقی بڑے ادب کا ایک لازمی عنصر ہے، اس عنصر نے جوش کو وقتی اہمیت کا شاعر ہونے سے بچا لیا۔

جوش کی موت سے واقعی اردو ادب کا ایک دور ختم ہو گیا ـــ نظم جوش سے کتنی ہی آگے بڑھ چکی ہو، جوش کی نظم کا نہ سہی، بحیثیت مجموعی ان کا قد اب بھی اس دور کے شعرا میں سب سے اونچا ہے۔ قد کی یہ بلندی محض شاعری کی دین نہیں، شخصیت کا بھی اثر ہے۔ اب یہ امکان نہیں کہ جوش کی ایسی با اثر شخصیتیں اردو میں پیدا ہو سکیں ـــ جوش نے خود کہا تھا ؎

بِللہ الحمد کہ قوم شعرا میں اے جوش ـــ مجھ سا کافر نہ اٹھا کوئی مسلمانوں میں

اس دعوائے کافری کے لئے جس قوتِ ایمانی کی ضرورت ہے اس کا اندازہ حفیظ صاحب کو نہیں ہو سکتا۔ □

فکر تونسوی
نئی دہلی

میری مطالعہ گاہ

جب میں دنیا بھر کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا، تو میں نے ایک مطالعہ گاہ بنا لی ——— مجھے اپنی یہ حرکت بالکل یوں لگی، جیسے میرے ایک شاعر دوست نے سالہا سال میگساری کرنے کے بعد توبۃ النصوح کر لی تھی۔ تو اچانک ایک دن وہ مزارِ غالب پہ مل گئے۔ وہسکی کی بوتل بغل میں تھی میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا توبہ ٹوٹ گئی ہے"

بولے "نہیں۔"

"تو پھر یہ وہسکی کی واضح بوتل؟"

"یہ غالب کے مزار پہ برسانے کے لئے لایا ہوں"

میں نے بھی اپنی مطالعہ گاہ اس لئے بنائی ہے۔ تاکہ اس پر مزارِ غالب کا شبہ ہو۔ توبہ کرنے والوں کے لئے سنہری چانس ———!

مطالعہ گاہ، مکان کی سب سے اُوپر کی منزل پر تعمیر کی گئی ہے، سنا ہے، خدا عرش پر رہتا ہے۔ اس لئے عرش سے ادھر اپنا ایک مکان بنا لیا۔ خیال تھا کہ عرش سے ادھر اپنا مکان بنائیں گے تو خدا سے براہِ راست تو تو میں میں ہو سکے گی۔ ویسے تو تو بھی میں ہی کروں گا اور میں میں بھی میں کیونکہ اس کی خصلت میں تو خاموشی لکھ دی گئی ہے ——— اور یوں بھی مطالعے کی نہ اسے ضرورت ہے نہ مجھے۔ ویسے میں نے اخلاقاً خدا کو آواز بھی دی۔ لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ خدا کا ٹیلی فون یا تو ڈیڈ (DEAD) ہو چکا ہے۔ اور یا خدا خود ڈیڈ (DEAD) ہو چکا ہے۔

اور یا پھر مسلسل خاموشی کے سبب، بہرا ہو چکا ہے۔ شور و غوغا سے بھرپور ڈھیروں مخلوق پیدا کرے گا۔ تو کان کہاں تک سالم رہ سکتے ہیں۔

اور یا پھر میں نے سوچا، خدا سے میرے تعلقات چونکہ ہمیشہ ناخوشگوار رہے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے، مجھ سے گفتگو کر کے اپنی بلندی کو پستی میں نہ بدلنا چاہتا ہو۔ خودی اچانک بلند ہو جائے

تو پستی کی طرف لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اقبال کی خودی کی کوالٹی کچھ مختلف تھی، کیوں کہ اس کے خدا نے خود بندے سے پوچھا تھا "بتا، تیری رضا کیا ہے"۔ مگر میرا خیال ہے، اس خودی میں شوخ رنگ زیادہ تھے۔ ورنہ بالکل ڈپلی کیٹ خودی تھی۔ جیسے آج کل ڈپلی کیٹ پنکھے بن رہے ہیں۔

میرے ایک دوست ہیں خورشید عالم، عمر کا بیٹا ساٹھ سال — کیوں کہ ساٹھ سال سے کم عمر کے لوگ مجھے دوست بنانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ عالم زیر و زبر میں ان کی خورشیدی کم ہو چکی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں نے زندگی کے باقی سانس ایک بلند پایہ مطالعہ گاہ کو ہی وقف کر دیئے ہیں تو وہ میری خیر و عافیت پوچھنے کے لیے اوپری منزل پر آ پہنچے۔ دم ان کا پھول گیا تھا اس لئے بجائے اس کے کہ وہ میری خیر و عافیت پوچھتے، میں نے ان کی خیر و عافیت پوچھی۔ چار درجن سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ ہانپ رہے تھے۔ میں نے شربت کا ایک گلاس پیش کیا تو بولے "میٹھی چیزیں مجھ پر ممنوع ہیں"۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ مجھے شوگر کا عارضہ ہے"۔

یقیناً ان پر کسی ڈاکٹر نے طبع آزمائی کی ہوگی۔ کیوں کہ ایک ڈاکٹر نے مجھے بھی ایک جھوٹا سرٹیفکیٹ بنا کر دیا تھا کہ یہ صرف گراؤنڈ فلور پر کام کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کے دل کی نلیاں ایک دوسرے سے مختلف راہ اختیار کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر حضرات ایسے سرٹیفکیٹ میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر نہیں دیتے بلکہ چند سکے جو ان کی جیب میں منتقل ہو جاتے ہیں انھیں ہی وہ انسانی تہذیب سمجھتے ہیں اور سرٹیفکیٹ لکھ دیتے ہیں۔ ان کی جیب ہی میڈیکل سائنس کی کتاب بن جاتی ہے۔ میرے ایک دوسرے ڈاکٹر دوست نے مجھے سنجیدگی سے کہا تھا "فکر صاحب! آپ سگریٹ نوشی ترک کر دیجئے، اس سے دمہ ہو جاتا ہے"۔

جب وہ یہ مشورہ دے رہے تھے تو خود بھی سگریٹ نوش فرما رہے تھے۔

دوسرا سگریٹ سلگانے کے لئے انھوں نے مجھے ایک طبی کتاب عنایت کر دی کہ آپ اس کا مطالعہ کیجئے، سگریٹ نوشی کے مضر اثرات میں یہ آپ کی رہنمائی کرے گی۔

میں نے کہا "کتاب تو آپ نے مجھے دے دی۔ آپ کے پاس کیا رہے گا؟"

بولے "دمہ"

بڑا خوش مزاج ڈاکٹر ہے اس لئے میں نے وہ کتاب قبول کر لی جو آج بھی میری مطالعہ گاہ میں موجود ہے۔ اسے پڑھنے کا ٹائم اس لئے نہیں ملتا کیوں کہ سگریٹ نوشی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

میں نے اپنے ساٹھ سالہ نووارد دوست سے کہا "جگن پرشاد جی! آپ کا استقبال دمے سے نہیں

ہوگا، ہارٹ اٹیک سے ہوگا۔"

وہ بولے "مگر ہارٹ اٹیک تو بلند پایہ لوگوں کو ہوتا ہے۔"

عرض کیا "نہیں جناب! وہ زمانہ گذر گیا، میرا مطالعہ ذرا مختلف ہے۔ ان بلند پایہ انسانوں نے اب جنم لینا بند کر دیا ہے۔ فطرت نے اپنی پالیسی بدل لی ہے، اس لئے اب دوسرے تیسرے درجے کے افراد کو ہی ہارٹ اٹیک ہونے لگا ہے۔"

اور یہ کہہ کر میں نے انھیں مطالعہ کے لئے آج کا اخبار پیش کر دیا جس میں چار نو بیاہتا دلھنوں کے مٹی کے تیل سے جل کر مرنے کی خبریں درج تھیں اور پانچ خبریں ہارٹ اٹیک سے مرنے والوں کی۔ یہ ہارٹ اٹیک والے، نو بیاہتا دلھنوں سے بازی لے گئے تھے، بلکہ ان میں پانچواں آدمی ایک سرکاری دفتر کا چپراسی تھا، جو رشوت کے بل بوتے پر روزانہ سکوٹر پر دفتر میں آتا تھا۔ سکوٹر سے دفتر کے سٹول پر آکر بیٹھا تو ہارٹ اٹیک سے یہ جا، وہ جا۔

یوں لگا جگن پرشاد جی کو شدید اعصابی صدمہ پہنچا ہے۔ کہ شاید فکر تونسوی مجھے ہارٹ اٹیک سے مارنا چاہتا ہے، اور گویا مجھے چپراسی سے زیادہ مرتبہ دیتا ہی نہیں۔ چنانچہ طیش میں آگئے۔ طیش کے ساتھ کھانسی بھی آگئی مگر جلدی جلدی چونکہ اپنا غصہ مجھ پر انڈیلنا چاہتے ہیں اس لئے کھانسی ختم ہونے کا انتظار کئے بغیر ہی کہنے لگے، "آپ کا مطالعہ انتہائی ناقص ہے۔ آپ کو علم ہی نہیں کہ ... ؟"

"ہاں مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اخبار میں ایسی خبریں لکھی ہیں کیوں کہ اخبار یہاں آجاتا ہے مگر میں اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ لیکن ٹھہریئے، میں نے غلط کہا، آپ کا انتقال واقعی دمہ سے ہی ہوگا۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ دنیا کے بڑے بڑے آدمی، پچاسی پچاسی برس تک جینے کے بعد دمے سے ہی مرے ہیں۔"

بڑا آدمی بن جانے پر خوش ہو گئے۔ بولے "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"کتابوں کے مطالعہ سے۔" اور میں نے الماری میں آراستہ ایک کتاب کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس کے پشتے پر تحریر تھا "انجام دنیا کے بڑے آدمیوں کا۔"

میری مطالعہ گاہ میں اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بظاہر حسین شاعرہ کا مجموعۂ کلام بھی موجود ہے۔ جس کے ہر صفحے پر وزن اور بحر سے خارج اشعار درج ہیں مگر میں اسے ادنیٰ کتاب نہیں سمجھتا کیوں کہ اسے ایک صوبے کی ساہتیہ اکیڈمی نے اعزازی انعام دیا تھا۔ یہ ادبیات

ہے کہ ان محترمہ کی اس کتاب کا جب جشنِ اجرا منایا گیا تھا تو میں اس میں شامل نہیں ہوا تھا، کیوں کہ وہاں ایک وزیر بطورِ چیف گیسٹ موجود تھے۔ (اکثر وزیر بحر اور وزن سے خارج ہوتے ہیں۔)

اور میری مطالعہ گاہ میں موٹی اور چھوٹی کتابیں بھی موجود ہیں مثلاً کلیم و شمیم دیوان میر تقی میر کے ساتھ ساتھ ایک مختصر بلکہ مختصر ترین شو جاپ گٹکا بھی رکھی ہوئی ہے، جسے میں نے ٹیگور کی گیتانجلی کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ یہ گٹکا میرے ایک دھرم زدہ مداح نے عنایت کیا تھا۔ میں نے پوچھا "آپ یہ گٹکا کس سلسلے میں عنایت فرما رہے ہیں؟"

وہ بولے "جس لمحے بھی آپ کو اشانتی پریشان کرنے لگے آپ اس گٹکے کا جاپ شروع کر دیجیے۔ فوراً شانتی مل جائے گی۔"

میں نے کہا "مگر مجھے تو زندگی کے ہر لمحے اشانتی رہتی ہے۔"

وہ بولے "تو پھر ہر لمحے یہ گٹکا پڑھتے رہیے۔"

ان کا مقصد شاید یہ تھا کہ ہمیشہ گٹکا پڑھتے رہیں گے تو کسی بھی دوسری کتاب کے مطالعے سے محفوظ رہیں گے کیوں کہ کتابیں پڑھنے سے بھی سکون کی موت ہوتی ہے۔ یا شاید مقصد دیگر بھی ہو۔ کہ باقی سبھی کتابوں کو ردی کاغذ، خالی ڈبے سمجھ کر بیچ دیجیے ___ اتھاہ شانتی ملے گی۔

مگر میں ان دنوں برنارڈ شا کے ڈراموں کا ایک منتخب مجموعہ لے آیا تھا۔ چونکہ مہنگا بہت تھا۔ اس لئے ایک لائبریری سے چرا کر لایا تھا۔ عام 'ادبا' کے نصیب میں یہی لکھا ہے کہ کتاب خریدو نہیں۔ بلکہ :-

۱۔ کسی سے مانگ کر لاؤ، واپس مت کرو۔

۲۔ کوئی اپنی کتاب بطور نذرِ عقیدت پیش کرے، فوراً قبول کرو۔

۳۔ چرا کر لے آؤ، کتابوں کے چور، چور نہیں کہلاتے، اہلِ ذوق کہلاتے ہیں۔

چنانچہ میں اس گٹکے کی بجائے برنارڈ شا کی کتاب پڑھنے کے لئے بے چین تھا۔ بلکہ شا کے ڈرامے کم اور ان کے دیباچے پڑھنے کا زیادہ آرزو مند تھا کیوں کہ وہ دیباچے ہی اصلی شا ہوتے ہیں۔ ڈرامے تو کتاب میں بطور گٹکا کے شائع ہوتے ہیں۔

چنانچہ میں شا کی کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا اور گٹکا اپنی بیوی کو دے دیا کیوں کہ وہ جب بھی میکے جاتی اپنے لئے اشانتی ساتھ لے کر آتی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ گٹکا تو اس کے میکے

سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا، کیوں کہ جس دن بھی وہ گنگا پڑھتی اس دن مجھے وقت پر نہ ناشتہ ملتا نہ چائے۔ بلکہ وہ مجھ سے کسی نہ کسی مسئلے پر جنگ آزمائی ضرور کر بیٹھتی اور یوں میری شانتی جو شانا کے دیباچے پڑھنے سے پیدا ہوتی، وہ بھنگ ہو جاتی۔ چنانچہ ایک دن میں نے بیوی سے کہا کہ "یہ گنگا تم مجھے واپس کر دو، پڑھا مت کرو۔"

وہ بولی "کیوں؟"

میں نے کہا "یہ تمھاری فہم سے بالاتر ہے کیوں کہ یہ ایک طرح کا تجریدی افسانہ ہے۔"

"تجرید کیا ہوتی ہے؟"

"جیسے تم سبزی میں مرچیں زیادہ ڈال دو اور میں کہوں، اس میں مرچیں کم اور نمک زیادہ ہے۔ یعنی مرچیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اور نمک میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یعنی مصنف بھی دکھی اور قاری بھی کہ نمک اور مرچ دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ہم مرچیں کھا رہے ہیں یا نمک۔ یہ الجھن ہوئی تجریدی فلاسفی۔ بیوی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ چونکہ میرے احباب کے اصرار پر مجھے وہ خاوند کی بجائے دانش ور تسلیم کر چکی تھی اس لئے اس نے وہ گنگا واپس کر دیا۔ اسے معجزہ ہی کہیے کہ دوسرے ہی دن سول وار بند ہو گئی اور میں نے وہ گنگا ٹیگور کی گیتا نجلی کے اوپر رکھ دیا۔ آسانی اس میں یہ ہوئی کہ گیتا نجلی اتنی گہری، اتنی ارفع اور اتنی خلائی پرواز والی شاعری ہے کہ میں نے اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ نچوڑ کر سیکڑوں مرتبہ اس پر ڈالا ہے مگر وہ ہر مرتبہ میرے لہو میں سے مچھلی کی طرح باہر نکل جاتی ہے اور پھر عمیق سمندر کے طواف میں پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے میں نے اب اسے پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ گنگا اور گیتا نجلی دونوں کے نام الگ الگ ہیں لیکن کام ایک ہی یعنی شانتی ڈھونڈنے بیٹھو، اشانتی ملے۔

مگر دونوں میری مطالعہ گاہ میں پڑی رہتی ہیں —— بڑی شانت!

نہ جانے کیسے، چوہوں اور جھینگروں کو معلوم ہو گیا کہ میں اب کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتا اس لئے وہ میری کتابوں کے مطالعے کے لئے نمودار ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک سٹوڈنٹ میرے پاس آیا۔ وہ ایم۔ اے۔ کی ڈگری کے لئے ایک ریسرچ پیپر تیار کر رہا تھا۔ مجھ سے بولا "جناب! کیا آپ کے پاس دیوانِ غالب موجود ہے؟"

"نہ صرف دیوانِ غالب بلکہ شرح دیوانِ غالب بھی موجود ہے۔"

میں نے دیوان غالب اٹھایا۔ کیا دیکھا کہ میرے بعد تو اس کا مطالعہ کوئی چوہا کرتا رہا ہے۔ نجانے وہ کون سا ریسرچ پیپر تیار کر رہا تھا۔ مگر بہ سلسلۂ ریسرچ اس نے دیوان غالب کے کئی صفحے دانتوں سے کتر ڈالے تھے مگر وہ کمال کا اہلِ ذوق چوہا تھا کہ اس نے غالب کے صرف وہی شعر کترے تھے جن میں شعریت کم اور ڈکشنری کے ادنیٰ الفاظ زیادہ تھے مثلاً ؎

شمار سبحہ مرغوب دل مشکل پسند آیا

اس شعر میں صرف "آیا" کا لفظ نہیں کترا گیا تھا۔

میں نے سٹوڈنٹ سے کہا :" معذرت چاہتا ہوں۔ غالب پر ریسرچ تو اس سے پہلے آپ سے زیادہ دانا و بینا صاحب کر چکے ہیں اور ہم انسانوں سے بہتر کر گئے ہیں۔ آپ ریسرچ کے لئے کوئی اور موضوع چن لیجیے۔ دیوان غالب کی کاٹ چھانٹ تو ہو چکی "

وہ بولا :" تو پھر کوئی شرح دیوانِ غالب ہی عنایت کر دیجئے "

میں نے شرح نکالی مگر چوہے نے ہر شعر کی تشریح کو اپنے دانتوں سے کنڈم کر دیا تھا۔ صرف شرح کرنے والے کا نام جلد بازی میں یا عبرت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔

اور ایک اور شاعر (جو اپنے آپ کو مشہور بھی کہتا تھا) چوہوں نے اس کے مجموعہ کلام کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اس کا ایک شعر بھی نہیں کترا، صرف شاعر کا نام دانتوں سے کاٹ دیا۔ اس لئے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس شاعر کا کلام ہے، کیوں کہ شاعر اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے مگر یہاں اسلوب ہی پوری کتاب میں غائب تھا۔ چونکہ اسلوب غائب تھا اس لئے چوہے نے نام بھی غائب کر دیا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ وہ کتاب پڑھی تھی۔ اس میں کچھ غزلیں غالب کے سٹائل میں لکھی گئی تھیں، کچھ اقبال کے اسلوب میں اور کچھ میر کے رنگ میں ـــــ میں نے صرف یہ کہہ کر اسے داد دی تھی کہ وہ شاعر ہر اسلوب کا ذوق رکھتا ہے، بڑا مرنجا مرنج قسم کا شاعر ہے۔

میری مطالعہ گاہ میں ایک چینی فلسفی کی ضخیم کتاب تھی۔ کتاب کا لب لباب یہ تھا کہ انسان کو شائستہ اور بے تکلف زندگی گزارنے کے لئے کون سے آداب اختیار کرنا چاہئیں ـــــ میں نے کتاب سے متاثر ہو کر چند آداب اختیار کئے تو طرز بیاک اہل دنیا نے سارے آداب کا ستیاناش کر دیا۔ ہندوستان میں کتابی آداب پر عمل کیا جائے تو انسان سوشل لائف سے کٹ جاتا ہے یا سوشل لائف اسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔

میں چاہتا تھا، وہ کتاب کسی لائبریری کو خیرات میں دے دوں کیوں کہ دان دیئے دھن نہ

گھٹے۔کہہ گئے بھگت کبیر۔ اور پھر خیرات دی جائے تو سنا ہے ۔ اگلے جنم میں آسانی یہ رہتی ہے کہ کتاب واپس نہیں ملتی بلکہ صرف اس کا سود ملتا ہے ـــــ چنانچہ اس چینی فلسفی کی کتاب کھولی تو اس کے ہر دوسرے تیسرے ورق میں جھینگر حضرات آرام فرمارہے تھے اور اپنے بول و براز سے کتاب کے پورے آداب غلیظ کر چکے تھے۔

میں نے ان جھینگروں سے پوچھا "آپ حضرات کون ذات شریف ہیں ؟"

وہ بولے "ہم چینی رفیوجی ہیں۔ کمیونسٹ انقلاب آیا تو وہاں سے فرار ہو کر یہاں آبسے"

میں نے کہا "جانتے ہو، یہ کتاب کیا ہے ؟"

"ہاں، یہ ہمارا رفیوجی کیمپ ہے"

چند اور کتابیں علامہ قسم کے نقادوں کی تھیں۔ دلآویز جلد، بیش قیمت کاغذ اور قدو قامت میں وجیہہ ـــــ میں نے انھیں کبھی نہیں پڑھا تھا۔ نہ صرف میں نے بلکہ چوہوں اور جھینگروں نے بھی انھیں نظر انداز کر دیا تھا کیوں کہ ہم سب جانتے تھے کہ ان میں زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے انٹلکچولز کے جملوں کے جوڑ توڑ اور حوالے شامل کئے ہیں۔ نقادی اور پھکنتی انھیں کے دم خم سے قایم ہے۔

مجھے یہ سہ رنگی اور دلفریب کتابیں دیکھ کر ہمیشہ اپنے اس رئیس دوست کا خیال آجاتا تھا کہ ایک مرتبہ میں اس کے امیر خانے (بمقابلہ غریب خانے) پر گیا تو ایسی ہی رنگین اور شوخ کتابوں سے اس کا بک شیلف بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ ان کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں؟"

وہ بولے "اجی کہاں ؟ فرصت ہی نہیں ملتی"

"تو پھر یہ کتابیں خرید کیوں ڈالیں"

"کمال ہے۔کل آپ کہیں گے میں نے یہ ٹیلی ویژن کیوں خریدا ـــــ دراصل میرے آرکی ٹیکٹ نے کہا تھا کہ ماڈرن کوٹھی میں ایک بک شیلف ضرور ہونا چاہئے۔ اس سے توقیر بڑھتی ہے"

میں نے پوچھا "تو کتنی توقیر بڑھی ؟"

"اجی، کوئی ملاقاتی آجائے تو اس کے دل میں میری توقیر کچھ نہ کچھ تو زیادہ ہو ہی جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں مطالعے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہوں"

میں نے اسے یہ کہنا توقیر و تہذیب کے خلاف سمجھا کہ اگر آپ کے یہاں بک شیلف نہ ہوتا تو آپ کے اعلیٰ ذوق کا کافی برا حشر ہوتا۔

خود ایک مرتبہ میرا برا حشر ہو چکا تھا کہ میرا ایک دوست نہایت پر تکلف قسم کی حسین و جمیل

ہومیو پیتھک کی کتاب میرے گھر میں بھول گیا۔ فراموش کاری میں اس نے دوبارہ مانگی نہیں اور اہل ذوق کہلانے کے لئے میں نے واپس نہیں کی۔ چنانچہ الماری میں یوں آراستہ کر رکھی ہے جیسے کچھ لوگ شوکیس میں پلاسٹک کا مور سجا کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اینٹی پوئٹری (ناشاعری) کی طرح اپنے پلے نہیں پڑی۔ دوسری مرتبہ اس کو اس لئے پڑھنے سے باز رہا کہ معلوم ہوا کہ شہر کا ہر تیسرا انسان ہومیو پیتھی کا ایکسپرٹ بن گیا ہے اور ہر چوتھا انسان رشوت لینے کا ایکسپرٹ۔

میری مطالعہ گاہ میں میری اپنی بھی کچھ تصانیف ہیں۔ باقی کتابوں کے برعکس انھیں کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں مگر اداس ہو کر سوچتا ہوں کہ میں اب لکھتا تو ان سے بہتر لکھ سکتا تھا لیکن چونکہ میری اپنی کتابیں ہیں اس لئے ان پر عظیم ہونے کا شبہ رہتا ہے۔ اپنائیت میں ایک عجیب طلسم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ مشہور ادیب اپندر ناتھ اشک نے مجھے ڈنر پر بلایا۔ کھانا آیا تو اس میں سالم بھنے ہوئے بینگن تھے۔ مگر ان کی بیوی کوشلیا جی نے جب بینگن پروسے تو اشک جی کی تھالی میں تین بینگن رکھ دیئے۔ میری تھالی کے نصیب میں دو بینگن۔ میں نے کوشلیا جی سے تفریحاً کہا: "بینگن بھی عجیب چیز ہیں۔ لڑھک جاتے ہیں تو تین ایک تھالی میں چلے جاتے ہیں اور دو دوسری تھالی میں"۔

کوشلیا جی سمجھ گئیں تو ایک اور بینگن لا کر میری تھالی میں رکھ دیا۔ میرے منہ سے نکلا "آہ! کوشلیا جی! آپ نے اپنائیت اور پتی برتا دھرم کا ستیاناش کر کے رکھ دیا۔

گذشتہ دنوں میرا نواسہ میری مطالعہ گاہ میں تشریف لایا۔ پوچھنے لگا۔ "نانا جی! کیا آپ نے یہ مطالعہ گاہ پڑھنے لکھنے کے لئے بنائی ہے؟"

میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں"۔

"کیا آپ سماج سے تنہا رہنا پسند کرتے ہیں؟"

"معلوم نہیں"۔

"آپ کے پاس یہ ڈھیروں کتابیں کہاں سے آئی ہیں؟"

"معلوم نہیں"۔

"آپ اپنی آپ بیتی یہاں بیٹھ کر لکھ سکتے ہیں؟"

"معلوم نہیں"۔

"لکھ پڑھ کر آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔"

اس پر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی خاموشی پر میں نے کہا "پوچھو پوچھو، اور کچھ پوچھو بیٹا! پوچھو گے نہیں تو علم کیسے حاصل کرو گے۔ عرش سے ادھر اپنی مطالعہ گاہ کیسے بناؤ گے؟" □

عارف نقشبندی
وزیر زراعت و سول سپلائز
۱۵۔ اشوکا روڈ، نئی دہلی

غزلیں

آئینۂ حیات جو دھندلا دکھائی دے
دل کو جگا ابھی یہ چمکتا دکھائی دے
سمجھو نہ وہ اکیلا ہے طوفاں بدوش ہے
جو شخص زندگی میں اکیلا دکھائی دے
روشن دماغ و دل ہیں تو روشن ہیں راستے
چاہے کوئی چراغ نہ جلتا دکھائی دے
آسائشِ حیات کے ساماں کے باوجود
کاندھے پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے
دھندلا سا دور، ٹوٹتا تارا امید کا
طوفاں میں زندگی کا منارا دکھائی دے
تہذیب نو یہ کیا ہوا، کچھ تو بیان کر
انسان ہر لباس میں ننگا دکھائی دے
نعرے فلک شگاف یہ امن و اماں کے ہیں
انساں پھر بھی خون کا پیاسا دکھائی دے
تو ساتھ وقت کا نہ دے، کچھ وقت کو بھی دیکھ
سایہ سا تیرے ساتھ ہی چلتا دکھائی دے
کس دور میں ہوئے نہیں عارف بتائیے
وہ لوگ جن کا عیب ہنر سا دکھائی دے

کیا فکر حوادث کی اگر دھوپ کڑی ہے
معلوم ہے زلفوں کی تری چھاؤں گھنی ہے
ہر لمحہ ترے آنے کا دیتی ہے دلاسا
زینے پہ شبِ غم کے تری یاد کھڑی ہے
شامل غمِ دوراں، غمِ انساں ہے اسی میں
مل جائے ترا درد تو دولت یہ بڑی ہے
تو عیش کے نغموں میں اسے سن نہ سکا ہو
ہنگامۂ دنیا میں صدا دل نے تو دی ہے
بے لطف ہے، محروم ہے کانٹوں کی خلش سے
جو زندگی پھولوں سے ہم آغوش رہی ہے
احباب وفادار ہیں کیا وقت کے بندے
چلتے ہوئے رستے میں ملاقات ہوئی ہے
یہ آج کہیں، کل ہے کہیں، دیکھتے رہنا
اڑ جائے گی عارف جو خیالوں کی پری ہے

عبد الصمد
پٹنہ

تہِ آب

شروع شروع میں جب ایسی بات ہوتی تھی تو لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور اکادکا واقعہ کا تو کہیں پر کوئی ذکر بھی نہیں ہوا تھا اور لوگوں نے اسے کوئی ایسی ویسی بیماری سمجھ کر بات ٹال دی تھی کہ لوگ بیماریوں کے بارے میں اپنی کم علمی سے اچھی طرح واقف تھے، پھر جب بات پھیلنے لگی تو اسے وبائی مرض سمجھ کر اطمینان کر لیا گیا لیکن جلد ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ یہ کوئی وبائی مرض نہیں بلکہ اس سے بھی سوا کوئی بات ہے، تب بات گویا پریشانی کی تھی۔

بات یہ تھی کہ لوگوں نے اچانک یہ محسوس کیا تھا کہ ان کے ہاتھ، ان کے ہاتھ نہیں، ان کے پیر، ان کے پیر نہیں، ان پر ان کا وہ اختیار باقی نہیں رہا جو ہاتھوں اور پیروں پر ہوا کرتا ہے۔ جب وہ اپنے ہاتھ نوالہ کے لئے اٹھانا چاہتے تو اس وقت وہ دعا کے لئے اٹھ جاتے اور جب دعا کے لئے اٹھانا چاہتے تو وہ ہاتھ نوالہ اٹھاتے۔ جب ان کی ہتھیلیوں پر سورج رکھ دیا جاتا تو وہ اس کی حدت سے بلبلا اٹھتے اور جب چاند رکھ دیا جاتا تو اس کی ٹھنڈک براہِ راست ان کے اندر پہنچتی، اس کے باوجود جب ان کے ہاتھ کوئی حرکت کرتے تو وہاں پر ان کی مرضی یا خواہش کا بالکل دخل نہ ہوتا۔ ان کے پیر اور جسم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، دونوں کا علیحدہ علیحدہ تصور ممکن ہی نہیں تھا، پیروں میں آبلہ پڑتا تو اس کی علیت سارے جسم میں سرایت کر جاتی اور جب جسم میں سرور و انبساط کی کوئی ہلکی سی لہر بھی داخل ہوتی تو تلوؤں تک میں گدگدیاں سی محسوس ہوتیں، اس کے باوجود قدم بعض ایسی جگہ اور ایسے اوقات میں اٹھتے جب مرضی اور خواہش کا کوئی مقام نہ ہوتا اور پشیمانی اور رسوائی مقدر ہوتے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ بات ہاتھوں اور پیروں تک ہی محدود تھی بلکہ جسم کے دوسرے اعضا نے بھی وہی روش اختیار کر لی تھی یعنی خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑ لیا تھا۔ جو باتیں ان کو سننا کبھی گوارا نہیں تھیں، اب وہ سب باتیں اپنے کانوں کے ذریعہ سننے پر مجبور تھے۔ اپنی ناک کے ذریعہ وہ سب کچھ سونگھنے پر مجبور تھے جن سے وہ ہمیشہ دور بھاگا کرتے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ سبھی منظر ننگے

خوابوں کی طرح کھلا ہوئے تھے کہ عام حالات میں ان کی وجہ سے آنکھوں کے دیدے پتھر بن سکتے تھے، لیکن شکر ہے کہ حالات عام نہیں تھے، ہنگامی تھے جن کے پردے میں بہت سی باتیں چھپائی اور برداشت کی جا سکتی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے ذہن و دماغ بھی ان کے قابو میں نہ رہے تھے۔ وہ جو کچھ اپنی مرضی سے سوچنا چاہتے۔ وہ بات تو ان کے قابو میں نہ آتی اور جو کچھ وہ نہیں سوچنا چاہتے وہ بات بلا خوف و خطر، ان کی مرضی کے خلاف، ان کے ذہن و دماغ کے دریچوں میں گھس آتی۔ وہ جب اپنی پسند کے نوالے توڑنا چاہتے تو ان کے دانت انھیں چبانے سے انکار کر دیتے اور مجبوراً کوئی ناپسندیدہ شے انھیں اپنے منہ میں دبا لینی پڑتی، کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ان کے شکم کے خالی رہ جانے کا پورا اندیشہ تھا۔

اس سے پہلے بھی ایک صورت حال ان پر گزر چکی تھی اور وہ قصہ ہے تب کا، جب ان کے ہاتھ پیر، کان، منہ، ناک، آنکھ اور دماغ انھیں کے قبضہ میں تھے اور ان میں سرکشی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے، لیکن وہ اپنی مرضی سے انھیں استعمال بھی نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ وہ ایک ایسی صورت حال تھی جس نے ان کے جسم کے سارے اعضا پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے نوالے، اپنی مرضی سے، اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتے تھے کہ اس کے لئے انھیں ایک مقررہ وقت کا منتظر رہنا پڑتا اور جب وہ وقت آتا تو پھر ان کی مرضی کا کہیں پر کوئی دخل نہ ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ان کے دل جذبات سے معمور ہوتے، اور تشکر کی موجیں ان کے اندر موجزن ہوتیں، ایسی حالت میں وہ بے ساختہ اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھانا چاہتے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اور جب ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے جاتے تو اس وقت ان کے اندر خالی خالی سی ایک کیفیت ہوتی جس میں جذبات کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں جب نیند کی لہریں غوطہ زن ہوا کرتیں تو اس وقت انھیں سرد کی محفلوں میں لا بٹھایا جاتا اور ان سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوں گے اور جب وہ سرور کے عالم میں ہوتے تو اس وقت انھیں نیند کی وادیوں میں ڈھکیل دیا جاتا۔ ان کے کانوں میں اس وقت شہنائی انڈیلی جاتی جب وہ سکون اور خاموشی کے متلاشی ہوتے اور جب ان کے کان خود کو شہنائی کے استقبال کے لئے تیار کرتے تو اس وقت وہاں خاموشی اور سکوا کا گزر ہوتا۔ ان کے نتھنوں میں اکثر ایسی بری بو گزرتی جس سے وہ بالکل نامانوس ہوتے او ان کے مانوس بو کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ آخر وہ کہاں گئی۔ حالات، پس منظر اور ماضی کی روشـ میں ان کے دماغ بہت سی ایسی باتیں سوچنا چاہتے جن سے آگے کی راہیں روشن کی جا سکتی تھیں، لیکہ

ہوتا یہ کہ وہ روشنی ہی گل ہو جاتی جس سے آگے کا سارے کا سارا راستہ ہی تاریک ہو جاتا۔
شروع شروع میں تو وہ اس پہرہ بندی سے خاصے محظوظ ہوئے تھے کیوں کہ ایک زمانہ ان پر وہ گزر چکا تھا جب وہ اپنے جسم کے اعضا کی طوائف الملوکی سے عاجز آگئے تھے۔ غیر ارادی طور پر ان کے اعضا سے ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتیں کہ وہ خود بھی اس پر نادم ہوتے لیکن وہ مجبور تھے، کچھ کر نہیں سکتے تھے کیوں کہ ان کا کچھ بس نہیں چلتا تھا۔ ان کے اعضا کی اپنی الگ خواہشیں، مرضی اور خود مختاری تھی اور وہ کسی ایک مرضی اور خواہش کے پابند نہیں رہے تھے۔
سے کا عجب نرالا کھیل جاری تھا۔ ایک طاری اور مسلط کی ہوئی فضا میں سانسوں کے آنے جانے کا تماشہ ہو رہا تھا۔
تب ہی انھیں گم شدہ تواریخ کے ایک بھولے بسرے باب کی طرح یہ بات یاد آئی کہ شاید ..... شاید اس منظر کو وہ بدل سکتے ہیں۔ شاید ..... کیوں کہ اس سے قبل بھی وہ اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر چکے تھے اور ان کی زندگی کا یہی ایک سنہرا باب تھا جو ہمیشہ روشن رہتا اگرچہ کبھی کبھی ایسے دھندلکے بھی آجاتے جس سے سب کچھ چھپ جاتا۔ یہ اس وقت ہوتا جب وہ تماشائی اور کردار میں تمیز کرنا بھول جاتے۔ پھر تو بھولنے اور چھپنے کا ایک سلسلہ سا چل پڑتا لیکن بہرکیف دھند ہمیشہ برقرار نہیں رہتی کہ اس کے بھی کچھ اصول تھے ـــــــ چنانچہ بارے دھند چھٹی اور گم شدہ تواریخ اپنے سنہرے باب کو دونوں ہاتھوں سے کھولے سامنے آئی تو انھیں اس کا اک ذرا احساس ہوا کہ .....
دراصل ہوتا یہ آیا تھا کہ جب بھی ان پر کوئی مشکل گھڑی آن پڑتی یا ان پر خوشیوں کی پھواریں پڑنی شروع ہو جاتیں تو وہ اپنے درمیان، لیکن اوپر استادہ اس کرسی کی طرف ضرور دیکھتے جو خود تو ہمیشہ دھند میں کھوئی رہتی لیکن اس پر بیٹھنے والے کا چہرہ ہمیشہ روشن رہتا لیکن منظر بدلتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل جایا کرتا۔ وہ اپنی ساری مصیبتوں اور ساری مسرتوں کی جڑ اسی کرسی کو قرار دیتے تھے اور ساری ذمہ داری اس پر بیٹھنے والے کے سر ڈال دیتے۔ وہ اس پر پھول اور پتھر دونوں کی بارش کرتے۔ اگر وہ دیوتاؤں کی طرح پھول اور پتھر دونوں کا ایک ہی مسکراہٹ سے استقبال کر لیتا تب تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کرسی پر بیٹھنے والے پر شدید گہرا ردعمل ہوتا تھا۔ اس پر جب پھولوں کی بارش ہوتی مارے خوشی کے اس کے چہرے پر ان گنت رنگوں کی بہاریں کھل اٹھتیں اور جب پتھر برستے تو مارے غصہ کے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اس کے جسم پر ان پھولوں اور پتھروں کے اثرات صاف دیکھے جاتے۔

پھر یوں ہوا کہ جب وہ منظر بدل گیا تو مستی و سرور کا ایک سماں سا چھایا رہا اور اس کی مسرت ایک نقاب کی طرح سبھوں کے چہرے پر پڑ گئی جس میں سبھی کچھ چھپ گیا۔ اتنے دنوں یہ نقاب اپنی جگہ پر رہا کہ خوشیوں کا موسم ختم ہوا اور تلخ حقیقتوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ وہ ایک ایسی لو تھی جس کی گرمی سے ہڈیوں میں چھید ہوا جاتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پہ اٹل تھی کہ ایک منظر بدل گیا تھا اور دوسرا منظر سامنے آگیا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ پہلا منظر دوسرے سے مختلف تھا اور اس تبدیلی کے صلے میں مسرتوں اور فخر کی جو دبی دبی چنگاریاں ملی تھیں، ان کی گرمی جھکڑ کے رتھ پر سفر کرتی لو پر بھی غالب آجاتی۔ وہ تو جب یوں ہوا کہ ہاتھوں نے ..... پیروں نے ..... اپنے آپ کو آزاد تسلیم کرلیا تب یہ عقدہ کھلا کہ جو چیز ہاتھ لگی تھی، وہ بہت زیادہ نفع بخش نہیں تھی اس سے پہلے والے منظر سے جب وہ عاجز آچکے تھے اور وہ منظر انھیں منہ پھاڑے ہوئے دیو کی طرح نظر آنے لگا تھا تو اس وقت انھیں سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں سوجھتی تھی کہ بس، وہ اس منظر سے چنگل سے کس طرح نکل بھاگیں، اس منہ پھاڑے ہوئے دیو سے وہ کس طرح بچ نکلیں۔ وہ منظر ان پر کچھ اس طرح مسلط ہوگیا تھا کہ وہ کوئی اور بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انھیں اور کوئی بات سوچنا ایک گناہ عظیم کی طرح لگتا۔ اس وقت بھلا وہ کوئی اور بات کیسے سوچ سکتے تھے جب کہ ان کے سامنے ایک بڑا مقصد تھا جس کے لئے کوئی قربانی بھی دی جاسکتی تھی۔

چنانچہ جب وہ اپنے اعضا کی بے پناہ آزادی سے عاجز آگئے اور اس کے صلے میں خود اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا اور قریب تھا کہ صرف آزادی رہ جاتی اور باقی سب کچھ فنا ہوجاتا کہ وہ لوگ ہمیشہ کی طرح پھر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اس سے پہلے ان کے دلوں میں، دماغوں میں اور ذہنوں میں فکر، تشویش اور غور و خوض کے نتیجے میں بہت سی لہریں پیدا ہوئی تھیں اور پھوٹ پھوٹ گئی تھیں سبھوں کے دل علیحدہ تھے، دماغ اور ذہن الگ الگ تھے لیکن سبھوں کے اندر پیدا ہونے والی لہریں ایک تھیں۔ اس لئے ایک امید پیدا ہوگئی تھی کہ شاید اس صورت حال کے نتیجے میں کوئی ایسا منظر سامنے آجائے جو پہلے کے تمام مناظر سے مختلف ہو۔ اس سلسلے میں ہر فرد ایک دوسرے کو بہت ہی پر امید نظروں سے دیکھا کرتا کیوں کہ زمانے نے اس کا اپنی ذات پر اعتماد متزلزل کر دیا تھا اور اس کی ساری توقعات اپنے آپ سے نہیں، دوسرے سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ لیکن ہوا یہی کہ دلوں، دماغوں اور ذہنوں میں پیدا ہونے والی اور پھوٹنے والی لہریں یونہی بن بن کر پھوٹتی رہیں اور ان سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکل سکا جو سطح آب پر کوئی نیا منظر سامنے لاسکے۔ اگر کوئی

منظر تیار بھی ہوا تھا تو وہ تہِ آب ہی رہ گیا تھا، سامنے آنے کی نوبت ہی نہ آ سکی تھی۔ بس یہ ہوا کہ سامنے کا منظر بدل گیا۔

کرسی پر بیٹھنے اور لا بٹھانے کا قصہ بھی عجیب تھا۔ ماضی کی دیمک زدہ کتاب سے ایک زندہ باب میں انھوں نے یہ آموختہ پڑھا تھا کہ یہ وہ ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرا اور کوئی نہیں۔ یہ سبق اب ان کو ازبر ہو چکا تھا اور وہ چاہنے پر بھی اسے بھلا نہیں سکتے تھے۔ اگر کسی طرح وہ اس رٹے رٹائے سبق کو بھلا جاتے تو اس بات کا پورا اندیشہ تھا کہ پھر وہ صفحۂ ہستی سے بھی مٹ جاتے اور داستانوں میں ان کی داستان بھی نہ ہوتی۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ سبق ان کو ہمیشہ ازبر رہے اور وہ اسے کسی طرح بھلا نہ پائیں۔ وہ ہر طرح کے آسائش و مصیبت اور خوشیوں سے جنگل میں راستہ بھلا جاتے لیکن اپنا سبق انھیں کبھی نہیں بھولتا تھا جس نے انھیں یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس کرسی پر ان کا مکمل اختیار ہے اور وہ اس پر کسی کو لا بٹھانے میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا حربہ تھا جسے انھوں نے اپنی بقا کے لئے اپنا لیا تھا اور نہ وہ ایک ایسی دھند تھی جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور بارے دھند چھٹتی تو کرسی پر بیٹھنے والے کا چہرہ انھیں نظر آتا اور وہ مارے خوشی کے دیوانے ہو جاتے۔ اس عالم میں وہ آنا پھینے، اتنی خوشیاں مناتے، یوں اچھلتے کودتے کہ اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھتے اور انھیں اپنی سدھ بدھ بھی نہیں رہتی۔ یہ تو ایک راز تھا کہ کرسی پر بیٹھنے والا، اس کام میں ان سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا تھا۔ صرف وہی اس سے واقف بھی تھا۔ انھیں تو مطلق اس کی خبر نہیں تھی۔ اور بیٹھنے والے کی مصلحت یہ تھی کہ یہ راز صرف اسی کی ذات تک محدود رہے۔ وہ ان کی خوشیوں اور اچھل کود میں اسی طرح شریک رہتا گویا وہ انھیں میں سے ہوا اور ان کا احسان مند ہو۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ تجربے بھی کر لئے تو وہ پھر سر جوڑ کر بیٹھے تاکہ اپنے آموختہ کو پھر دہرا سکیں اور اس میں مزید چار چاند لگا سکیں۔ سر جوڑ کر بیٹھنے کے نتیجے میں ان کے دلوں، دماغوں اور ذہنوں میں مختلف لہریں پھر پیدا ہونا شروع ہوئیں اور بن بن کر ٹوٹتی رہیں۔ یہ امید پھر پیدا ہوئی کہ شاید پھر کوئی ایسا منظر سامنے آ جائے جو پچھلے تمام منظروں سے قطعی مختلف ہو، اس سے آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل میں سرور پیدا ہو یا جسم میں کانٹے چبھیں۔ امید اور توقع تو بس ایک ایسے منظر سے وابستہ تھیں جو پچھلے تمام منظروں سے قطعی مختلف ہو۔ ہر فرد پھر اپنے آپ کو بھلا کر اپنی امیدیں دوسرے سے وابستہ کرنے لگا لیکن ہوا یہی کہ پھر کسی منظر کے سطحِ آب پر آنے کی نوبت نہ آ سکی اور اگر کوئی منظر تیار ہوا تھا تو وہ پھر تہِ آب ہی رہ گیا تھا۔ غور و خوض اور فکر

وتشویش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لہریں جو نتیجہ سامنے لائی تھیں، ان کا نچوڑ یہ تھا کہ لوگوں کو یہ آزادی اتنی مہنگی پڑی تھی کہ انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس سے قبل والے منظر ہی میں ان کی نجات پوشیدہ ہے ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ الٹے قدم چلنا شروع کر دیں کیونکہ اب ان میں اتنی سکت بھی باقی نہ رہی تھی کہ وہ آگے قدم بڑھانے کی سوچ بھی سکیں۔ وہ اپنے آپ سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ کوئی نئی بات کا خطرہ مول لینے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب وہ پیچھے کی طرف لوٹنے لگے تو سب سے پہلے انھوں نے اسی منظر کو پایا جو اس سے پہلے ان پر بیت چکا تھا لیکن ان کے سامنے اسے اپنا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ان کے بدلتے موڈ کو دیکھ کر، اس کمزور لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ، جسے انھوں نے اپنی دانست میں اٹھا کر کوڑے میں پھینک دیا تھا، دھند میں سے تین سرکش اور منہ زور گھوڑوں پر سوار ایک شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ برآمد ہوا تو لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا، اس کی گل پوشی کی، اس کی ہر ہر ادا پر جان قربان کرنے لگے، اس کی جا بے جا ضد پر سر تسلیم خم کر لینا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا۔

کرسی پر بیٹھنے والا بھی اب تجربہ کار ہو چکا تھا۔ اب وہ ان میں سے نہیں تھا جو چمک دمک کی گرمی سے اپنے دماغوں کو کھولا دیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ وہ ان سب سے جی بھر کے خوب خوب لطف اٹھا چکا تھا۔ ایک زمانہ اس پر یہ بھی گزرا تھا جب ہوا نے بھی اپنا رُخ بدل ڈالا تھا تب اس نے لوگوں کو بہت سمجھایا تھا، منت سماجت کی تھی، ہاتھ پیر جوڑے تھے لیکن وہ تو اس منظر سے عاجز آ چکے تھے جو ان پر مسلط ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں خود ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ان کا فیصلہ اپنی جگہ پر اٹل رہا۔ بعد میں لوگوں نے جانا کہ وہ پتھر نہیں ہیرا تھا تو وہ بہت نادم ہوئے اور انھوں نے ہر قیمت پر اس کا پسا لپٹنے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اب وہ بھی ہوشیار ہو چکا تھا، چنانچہ اب کے وہ یونہی کرسی پر آ کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کہ اس کرسی ہی کو تینوں گھوڑوں کے اوپر رکھ، اس کی سواری بنا کر زین کس ڈالی۔ تینوں گھوڑے بہت ہی شہ زور، بہت ہی منہ زور، بہت طاقت ور تھے۔ تینوں کے تین رُخ تھے اور وہ تینوں رُخ اپنی پوری طاقت کے ساتھ بھاگتے تھے اگرچہ اس میں سوار کے لئے بہت مشکلات تھیں۔ لیکن سوار جہاں دیدہ تھا، اس نے بہت ہی سوچ سمجھ کر یہ سواری اختیار کی تھی اور وہ بخوبی واقف تھا کہ ان کو سر کرنے کے کون سے گر ہیں۔ چنانچہ جب کبھی ایسا موقع آتا کہ اتفاق سے کوئی گھوڑا، بہت زیادہ سرکش ہو جاتا اور وہ ایک ہی رُخ کو دونوں گھوڑوں اور سوار سمیت بھاگنے کی کوشش کرتا تو اس وقت سوار اپنی ساری طاقت دونوں گھوڑوں

کی طرف لگا دیتا، اس طرح اُدھر زیادہ طاقت مل جاتی اور وہ تنہا گھوڑا اپنی سعی میں ناکام ہو جاتا اور شکست کے بعد اس کے ہانپنے کی آواز سے فضا میں دیر تک ارتعاش سا رہتا۔ ورنہ یہ وہ موقع تھا کہ اگر سوار ذرا سا چوک جاتا تو پھر وہ شہ زور گھوڑا اکیلا ہی سب کو اپنی سمت ہانک لے جاتا اور پھر یا تو کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا یا پھر صرف وہی گھوڑا ہوتا اور سب اس کے سامنے سرنگوں ہوتے۔

یہ تینوں گھوڑے نہ صرف یہ کہ الگ الگ سمتوں میں رواں دواں تھے بلکہ تینوں قد و قامت رنگ ڈھنگ اور شکل و شباہت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ صرف ان کی شہ زوری اور سرکشی تھی جو تینوں کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی۔ صرف یہی ایک نکتہ تھا جس پر وہ متفق ہو سکتے تھے لیکن مشکل یہی تھی کہ وہ اس پر بھی متفق نہیں ہوتے تھے اور ان کی راہیں واضح طور پر الگ الگ تھیں ورنہ یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر وہ صرف سرکشی ہی پر متفق ہو جاتے تو پھر سوار کا خدا حافظ تھا۔ لیکن سوار اس راز سے بخوبی واقف تھا کہ اگر کسی لمحہ وہ چوک گیا تو پھر داستانوں میں اس کی داستان بھی نہ رہے گی۔ جب اس نے ان کی سواری اختیار کی تھی تو اس نے تمام باریکیوں اور نکتوں پر خوب خوب سوچ لیا تھا۔ وہ ہر راز سے واقف ہو چکا تھا جن پر عام نگاہیں پڑ کر بھی نہیں پڑتیں۔ اس لئے اب اس کے جو بھی قدم اٹھتے، وہ ایسے نپے تلے ہوتے کہ زمین ان کی قیمت ادا کرنے سے معذور ہوتی اور آسمانوں میں سیر کرنے والی ہوائیں ان کو روکنے کی صلاحیت کھو بیٹھتیں۔ یہ ایک بہت بڑی مصلحت تھی کہ کبھی بھی ان تینوں کو یکجا نہیں ہونے دیا جائے اور وہ لمحہ کبھی آئے ہی نہیں کہ گھوڑے اپنے سوار کی سواری کر سکیں۔ گھوڑے کیسے ہی منہ زور اور سرکش کیوں نہ ہوں، ہمیشہ سوار کی سواری بنیں اور سوار کیسا ہی کمزور کیوں نہ ہو، ہمیشہ سوار ہی رہے۔

سوار کو اپنی حکمت عملی اور دور اندیشی کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا کہ گھوڑے قابو میں رہنے کے ساتھ ساتھ خوش بھی رہیں۔ کیوں کہ وہ اور گھوڑے ایک ان دیکھے معاہدے کے تحت پابند تھے کہ گھوڑوں نے اپنی طاقت، بل اور شہ زوری پر اس کو یہاں تک لایا تھا اور اسے گھوڑوں کو اتنی آزادی تو دینی ہی تھی کہ وہ اپنی محنت کی قیمت وصول کر سکیں۔ تینوں گھوڑوں کے عادات و اطوار اور رنگ ڈھنگ علیحدہ ہونے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کے آداب اور طریقے بھی مختلف تھے اور سوار کو یہ سب باتیں ہر حال میں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ مثلاً ایک گھوڑے کو اپنی مقررہ مقدار سے زیادہ کھانے کی عادت تھی، وہ دوسروں کے مال کو بلا تکلف اڑا لیتا اور کسی قسم کے احتجاج کی قطعی پروا نہ کرتا۔ لوگ سوار کے پاس فریاد لے کر آتے تو سوار اس وقت ایسا بن جاتا جیسے اس کے

کان نہ ہوں، آنکھ نہیں ہوں، دل نہیں ہو، دماغ نہیں ہو، ـــــــ احساس نہیں ہو۔ دوسرے گھوڑے کی عادت تھی کہ وہ جتنا کھاتا، اس سے زیادہ بچاکر رکھتا، حالانکہ اس کے اندر جو نوالے پہنچ جاتے، وہی اس کے لئے کافی تھے لیکن عادت تھی جس سے مجبور تھا اور اس کی تکمیل میں اس سے جو بھی بن پڑتا، کر گزرنے سے دریغ نہ کرتا۔ لوگ گھوڑے سے مقابلہ تو نہیں کر سکتے تھے کہ طاقت میں وہ ان سے کہیں زیادہ تھا اس لئے وہ آہ و فغاں بلند کرتے جو اگر آسمانوں میں جاکر چھید کرتی تھی تو اسے کسی نے دیکھا نہیں تھا لیکن نیچے یہ آہیں کچھ رنگ نہ لاتیں۔ سوار تو ان کے لئے اندھا، بہرا گونگا بن چکا تھا سو بنا رہا۔ تیسرے گھوڑے کی عادت تھی کہ وہ کھا پی کر، مستی میں آکر جسے چاہتا روند ڈالتا اور لوگوں کی چیخ و پکار، اور آہ و بکا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس کی لگام بھی اگرچہ سوار ہی کے ہاتھوں میں تھی، لیکن سوار نے اپنے آپ کو ہر طرف سے بند کر رکھا تھا جس سے اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا ورنہ یہ بات طے تھی کہ اگر وہ لگام کس دیتا تو دوسروں کا مال اڑانے والا گھوڑا اپنی حرکتوں سے باز آجاتا، مال بچانے والا گھوڑا اپنی عادت کو ترک کر دیتا اور روندنے والا گھوڑا اپنے ظلم و ستم سے توبہ کر لیتا۔ لیکن سوار یہ کیسے کر سکتا تھا۔ اسے جہاں اچھی طرح اس کی خبر تھی کہ اسے انہیں تین گھوڑوں نے یہاں تک لایا ہے، وہاں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہی گھوڑے اسے وہاں سے لے بھی جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ گھوڑوں کے رحم و کرم پر تھا لیکن یہ اس کا رکھ رکھاؤ، اس کی داشت تھی کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ گھوڑے ہی اس کے رحم و کرم پر ہیں۔

تینوں گھوڑے بہت ہی اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی سمتوں میں رواں دواں تھے۔ وہ جس جانبازی اور جانفشانی کے ساتھ اسے لائے تھے، اس کا انہیں پورا پورا معاوضہ مل رہا تھا۔ صرف یہی ایک بات تھی کہ انہیں من مانے ڈھنگ سے، کسی ایک سمت کو، سبھوں کو ہانک لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے یہاں تک لانے میں تینوں کی محنت شامل تھی، اس لئے کسی ایک کو ہانک لے جانے کی اجازت لے کر باقی کے حقوق کو کیسے دبایا جا سکتا تھا۔ تینوں کے حقوق یکساں تھے۔ اس معاملے میں سوار کا رویہ بہت ہی منصفانہ تھا اور کس کے منہ میں زبان تھی کہ اسے بے انصاف کہہ دیتا۔

ایسی بات نہیں تھی کہ سوار اگر کچھ کرتا نہیں تھا تو کچھ کہتا بھی نہیں تھا۔ بولنے اور کہنے میں تو اتنا خوبصورت اور شیریں تھا کہ اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہوئے دیکھتے تھے جسے لوگ

چن کر، سمیٹ کر اپنے اپنے گھروں میں لے جاتے اور اپنے بال بچوں کو دکھا کر، چمکار کر، ان کی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے۔

سوار کو یہ گُر پیدائشی طور پر نہیں ملا تھا۔ اسے تجربے نے یہ انمول رتن عطا کیا تھا کہ بھلے کچھ کرو یا نہ کرو لیکن خوبصورت باتوں اور خوشنما وعدوں میں کبھی کوئی کمی نہ کرو کہ اس میں پاس سے کچھ آتا جاتا نہیں۔ وہ لوگوں کی اس فطرت سے واقف تھا کہ ان کی یادداشت کمزور ہے، وہ خوشنما اور حسین وعدوں کے جال میں گھر کر اپنے سارے دکھ بھول جاتے اور اپنی پوری قوت اور ہمت سے ان وعدوں کے پورا ہونے کے خواب دیکھنے لگتے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ بیت جاتا اور وہ بالکل بھول جاتے تو جو شخص بھی خوبصورت وعدوں کے حسین پھول لے کر ان کے پاس آتا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے اور بہت ہی فراخ دلی کے ساتھ، نہ صرف یہ کہ اس کا پھول قبول کرتے بلکہ اس کے لئے آنکھیں بچھا دیتے، اپنے دل کے دروازے وا کر دیتے۔

اگر ان کے ساتھ کوئی دھوکہ ہوتا، ان کے سامنے سے کھانے کی پلیٹ غائب ہو جاتی، ان کے منھ سے نوالے چھن جاتے، سمندروں میں تیرتے ہوئے بھی ان کے حلق ایک بوند پانی کے لئے ترس جاتے بھری برسات اور تیز دھوپ میں ان کے سروں سے سائے غائب ہو جاتے، جب تیز سردیوں میں یخ بستہ ہوائیں، ہڈیوں کو چھید کرنے کے درپے رہتیں تو اس وقت ان کے جسموں سے ان کے لباس آناً فاناً غائب ہو جاتے، جب ان کے جسموں کے خون نامعلوم نالیوں میں بہہ کر غائب ہوتے رہتے، جب ان کی ہڈیوں کا گودا سوکھ کر برادہ بن جاتا، جب ان کی آنکھوں سے زندگی روٹھ کر کسی نامعلوم مقام پر جاتی، ان کے ہونٹوں کی شادابی مثالی ہوتی رہتی، سر سے پیر تک وہ آسیب زدہ دکھائی پڑتے تو وہ ان تمام چیزوں کو قیمت کا اٹل لکھا تسلیم کرتے جو ہر حال میں سامنے آکر رہتا، سو قیمت کے لکھے کے پورا ہونے میں واویلا کیسا۔؟

لیکن ہوتا یہ کہ جب ان کی اڑی ہوئی رنگت، آنکھوں سے رخصت ہوتی ہوئی زندگی، ہونٹوں سے جاتی ہوئی شادابی، نامعلوم نالیوں میں گم ہوتا ہوا خون، اور ہڈیوں کے خشک ہوتے ہوئے گودے کے صلے میں آنکھوں کو خیرہ کرنے والے جو چند ٹھیکرے ان کی جیبوں میں آتے تو اس وقت اچانک بجلی کے کوندے کی طرح ان کی آنکھوں میں زندگی، ہونٹوں پر شادابی، جسم میں خون، بدن پر رنگ اور ہڈیوں میں گودے آجاتے، ان کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہ پڑتے بلکہ وہ فضاؤں ہی میں معلق رہ جاتے۔ پھر بھی ان کی چال میں کوئی فرق نہ آتا کہ جیبوں میں مسکراتے ہوئے ٹھیکرے

ان کو چاروں طرف سے برقرار رکھتے۔ وہ اچھلتے کودتے بازاروں میں جاتے کہ ان ٹھیکروں کا کمال دیکھ سکیں تو سواری میں جتے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا اپنی مقررہ مقدار سے زیادہ کھا جاتا، دوسرا گھوڑا زیادہ بچا کر رکھتا، اور تیسرا کھا پی کر مستی میں آکر جسے چاہتا، روند ڈالتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک جیب میں پڑے ہوئے چمکدار ٹھیکرے اپنی رنگت کھوتے رہتے یہاں تک کہ وہ اپنا رنگ بالکل کھو بیٹھے اور جیبوں میں پڑے پڑے ایسے بوجھ بن گئے کہ انھیں سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے جاتے اور ہانپتے کانپتے واپس آجاتے۔ یہ سلسلہ جب دیر تک چلا تو کوئی اور راستہ نہ پاکر وہ سوار کے پاس گئے۔ سوار ان کی بات سن کر مسکرایا اور اس نے اپنی پشت پر لٹکے ہوئے جھولے سے مٹھیاں بھر بھر کر دانے نکالے اور انھیں اپنی ہتھیلیوں پر پھیلا کر ان کے سامنے یوں کر دیا جیسے پیارے گھوڑے، گائے اور بکریوں کو کھلاتے ہیں۔ وہ بلا تامل اس پر ٹوٹ پڑے اور جب یہ دانے ان کی شکم میں پہنچ گئے تب انھیں خیال آیا کہ بازاروں میں یہ شے تو تھی نہیں کہ گھوڑوں نے بازاروں کو اس لائق ہی کہاں رکھا تھا، کھیتوں اور باغوں میں بالو کے مرغولے اڑ رہے تھے اور گوداموں کے گودام زیر زمین ہو چکے تھے اور ان کی چابیوں کی جھنکار زمین کے اندر سے سنائی دیتی پھر رہی تھی تو پھر ——
تو پھر ——؟

ان میں کچھ لوگوں نے کہا کہ کھانے کی چیز آم ہے، گننے کی چیز گٹھلی نہیں ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ جو نوالے منھ میں جاتے ہیں، ان کے بارے میں انھیں یہ جاننے کا حق ہے کہ وہ کیا ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کس طرح آئے ہیں، کیوں آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپس میں یہ گفتگو سوار تک بھی پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا کہ اس کی برسوں کی محنت آخر کام آئی اور اس کا ساتھ دینے والا ایک طبقہ بھی پیدا ہوا چنانچہ اس نے اس طبقے کی ہر طرح سے پذیرائی اور دلجوئی شروع کر دی کہ اب گھوڑوں کے ساتھ ساتھ اسے مزید تقویت ملی تھی۔ وہ لوگ جو اپنے جاننے کے حقوق کو منوانا چاہتے تھے۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود قطعی بے اثر رہے۔ اس کا کھلا ثبوت اس وقت ملا جب لوگوں کو اس کی پوری توقع تھی کہ منظر نامہ اب اس دفعہ ضرور سطح پر آجائے گا کیوں کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، لیکن ہوا یہ کہ وہ منظر تو وہیں کا وہیں رہ گیا اور جب وقت آیا اور بارے دھند چھٹی تو وہی جانا پہچانا سوا اپنے منھ زور اور سرکش گھوڑوں پر سوار مسکراتا ہوا برآمد ہو رہا تھا۔ □

زبیر رضوی
۱۹۵۷ ۔ ترکمان گیٹ، دہلی

چار نظمیں

○

ماتحت
نئے آنے والے بڑے افسر کے "شوق" جاننے کے لئے
ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا
جتن کر رہے ہیں
پرانا باس
اپنے شوق پورا کرانے کا
ایک رسیلا ذائقہ
ان کی زبانوں پر چھوڑ گیا ہے

○

ان گنت شہروں کو ملانے والی
عظیم شاہراہ پر ہونے والے حادثوں کے
خوف نے
سفر پر نکلنے والی گاڑیوں کی پیشانیوں پر
خدا کا نام لکھ دیا ہے !

○

گھر میں
بستر، کرسیوں، دروازوں، کھڑکیوں
اور لان میں بچھی ہوئی
ہری گھاس پر اونگھتا ہوا اکیلاپن
میرے جسم کو
شہر کی اجنبی سڑکوں پہ پھینک دیتا ہے
اور میں
نامعلوم زمانوں کی چاہت میں
سگرٹ اور ماچس کے درمیان
رات گئے تک جلتا بجھتا رہتا ہوں !

○

سینٹ ملے ہوئے
بدبودار جسم
ڈائی کئے ہوئے
سفید بال
اور
ملمع کئے ہوئے چہرے
عمر کی بنجر زمینوں پر
شاداب فصلیں اگانے کا خیال چھوڑ دیں !

مرزا حامد بیگ

راولپنڈی

صیدِ زبوں

یہ گرمیوں کی ایک دوپہر کا قصہ ہے۔

جب سارا دن تیز گرم لو چلتی رہی تھی۔ بستی کی پُر پیچ گلیوں میں مٹی بولائی پھرتی تھی اور چیل انڈہ چھوڑ گئی تھی۔

ایسے میں اس بھری پُری آبادی میں ایک وہی تھی جو اپنے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ سب اس کے معمول کے خلاف تھا، لیکن ہُوا۔

بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ہے۔

اس ہنگام کی وجہ کیا تھی، کچھ پتہ نہیں۔ یہی کچھ سنا ہے کہ وہ ایک سانولا، متناسب کسا ہوا وجود تھا۔ اِس کی غزالی آنکھوں، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور صراحی دار گردن کی چھب نظروں میں نہیں سماتی تھی۔ ایک ہرنی تھی ہرنی، جو پوری آبادی میں قلانچیں بھرتی، دِلوں کو دھڑکن بھلاتی، ہر طرف بھر گئی تھی۔

سب اُسے دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا۔ اس کا کہا، کوئی ٹال نہیں سکتا تھا، اس کی مرضی سب کی مرضی تھی۔ لیکن اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

اس کا سولہواں سال تھا، جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

دھان پان سا راجہ، جس کی ابھی محض مسیں بھیگی تھیں، جانے کتنا عرصہ اُسے آتے جاتے سب سے ہنستے بولتے دیکھتا رہا تھا اور اس سے رہا نہ گیا تھا۔

اور وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اس چلچلاتی دھوپ میں راجہ آگے بڑھا، وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکا تھا۔ گلی ویران تھی اور دیکھنے والا کوئی نہ تھا، لیکن جانے کب اور کیسے، جیسے سب نے انھیں دیکھ لیا۔

میں نے بتایا نا کہ وہ قلانچیں بھرتی دِلوں کو دھڑکن بھلاتی، ساری آبادی میں بھری ہوئی

تھی۔ اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس دن سب نے اسے جھٹلا دیا۔

اس دن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔

کسی نے کہا:

"اِن کا روز کا ملنا جُلنا تھا۔"

کیمے نے اس کی بات کاٹی:

"تم کیا جانو ——— جو کچھ ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے۔"

نیکے نے لقمہ دیا:

"کیوں کمی تاجے، سب کو بتلا ہی دوں، جو کچھ کل رات ہوا ہے۔ ہم دونوں تو موقع کے گواہ ہیں۔"

بڑھتے ہوئے ہجوم کے بیچوں بیچ، وہ دونوں، مجرموں کی طرح نہیں۔ بلکہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سیدھے کھڑے رہے تھے لیکن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور حیص بیص جرح کر گئی تھی۔

پھر جانے کیا سوچ کر راجہ ایک طرف نکل کر بھاگا۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو ابھی مسیں بھیگی تھیں۔

اس کے نکل بھاگتے ہی سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کیمے نے نیکے کی ہاں میں ہاں ملائی اور نیکے کی تصدیق تاجے نے کر دی۔

ہوا کیا تھا۔

یہ جاننے کی کسی کو کیا پڑی تھی۔

اور یہ کہ اس کا سولھواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے۔

اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس دن اس کی کسی نے نہیں سُنی۔ وہ اپنی ایڑی کی جگہ میں ڈوب مرنا چاہتی تھی۔

پھر کسی نے اسے بازو سے پکڑا ہے اور اسے گھر تک چھوڑنے لوگوں کا بڑا ہجوم تھا، جو ساتھ چلا ہے۔

اس روز کے بعد وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن کر رہ گئی۔ پھر اسے کسی

نے نہیں دیکھا۔

اس کے بغیر بستی سونی تھی۔ ساری آبادی تو اسے دیکھ کر جیتی تھی، اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا۔ لیکن جب اس بات کا سب کو احساس ہوا ہے تو وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن چکی تھی۔

کیمے، نیکے اور تابجے نے سر جوڑے، تب راجہ کی ڈھنڈیا پٹی ہے۔ اب تک راجہ جانے کہاں چھپا رہا تھا۔ اس ہنگام کے دو روز بعد رات کا آخری پہر ہوگا۔ جب وہ سب سے چھپتا چھپاتا جرنیلی سڑک کو چڑھ گیا۔

زمانے بیت گئے، اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

بچوں نے اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا، اور بڑے بوڑھے اس سے نفرت کا اظہار کرتے، منہ سے کف اڑاتے، ہزیان بکتے، عمروں کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے۔

اس نے کیا ہی کچھ ایسا تھا کہ سب حیران تھے۔ اس کا جرم اپنے پرائیوں کے وہم و گمان سے باہر تھا۔ سب سنتے تھے اور سن رہ جاتے تھے۔ پر جب سب طیش میں آکر اٹھے تھے تو وہ غائب تھا۔ ڈھنڈیا پٹی، نیچے کی زمین اوپر اور اوپر کی نیچے کر دی گئی۔ اس کی کہیں خبر نہ ملی۔

زمانے بیت گئے، لوگ بھول بھلا گئے۔

ایک دن پتہ چلا کہ راجہ گزر گیا ——— خون تھوکتا ہوا۔

اس کی موت کی خبر نے نئی نسل کے ذہنوں میں اُس بھولی بسری یاد کو کروٹ دی۔ لیکن انھیں، اس گئے وقتوں کے قصے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

اِکا دُکا پرانے لوگوں نے راجے کی موت کا سنا اور ایک دوسرے سے پوچھا:

"اصل قصہ کیا تھا؟"

کوئی ایسا نہ تھا، جو آنکھیں دیکھی کہتا۔ بس ایک دوپہر کا قصہ تھا، جب کیمے نیکے اور تابجے نے آپس میں سر جوڑے تھے۔ اور یہ کہ حیص بیص جڑیں کر گئی تھی، پھر لوگ اکٹھے ہوتے گئے اور بس ———

کسی نے اس سانولے، متناسب کسے ہوئے وجود کو یاد کیا، جسے دیکھ کر سارا جگ ——— سانس لیتا تھا۔

اُدھر اپنے گھر کے تاریک گوشے میں اس نے بھی سنا۔

"گزر گیا ـــــ خون تھوکتا ہوا۔"

تب وہ ہڈیوں کا پنجر اور چیتھڑیوں کی مٹھی، سینہ کوبی کرتی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔

اس نے گلی میں نکل کر ہر آنے جانے والے کو روک روک کر بتایا۔

"لوگو ـــــ میرا سولھواں سال تھا جب وہ نامرد، مجھے پوری آبادی کے بیچ تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ آخر گزر گیا ـــــ خون تھوکتا ہوا۔

کون گزر گیا ـــــ

نئی نسل، اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ انھوں نے تو اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا تھا، اور بڑے اپنی عمر کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے تھے۔

اب وہ تاریک گوشے کی تاریکی، ہڈیوں کا پنجر اور چیتھڑیوں کی مٹھی، آبادی میں ہر طرف قہقہے لگاتی پھرتی ہے۔ اس سے تعفن کے بھبکے اٹھتے ہیں۔ جس دہلیز پر بیٹھ جاتی ہے، گھر اجاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

کون ہے جو اس کا سامنا کرے۔

غلاظت پھانکتی اور جوہڑ کا بدبودار گدلا پانی پیتی ہے اور کہتی ہے:

"غلیظ روح تو دنیا سے اٹھ گئی۔ اب کیسی غلاظت؟"

بستی اجڑ کر رہ گئی ہے۔

کیھے، نیکے اور تابے کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اور وہ ایک بار پھر آپس میں سر جوڑے ہوئے ہیں۔ □

توصیف تبسم

۳۹۱ - سیکٹر آئی ۹
اسلام آباد (پاکستان)

غزلیں

اک ورق اور بھی احوال پریشاں لکھو
صفحۂ دشت کو الٹو، وہی عنواں لکھو

سارے دریا کا لہو، دیدۂ گرداب میں ہے
قصۂ موج بہ اندازۂ طوفاں لکھو

پلکیں جھپکیں تو یہ آئینۂ حیرت ٹوٹے
یوں تھکی آنکھ سے مت خواب پریشاں لکھو

اشک قیدی ہیں جو رو لو تو رہائی پائیں
ورنہ تا عمر یوں ہی درد کو زنداں لکھو

اب نہ ابھرے گا کبھی شام کا ڈوبا سورج
شب کی محراب پہ ہر لفظ نمایاں لکھو

دیکھیں اہلِ گلستاں پہ چمن کے معنی
پردۂ رنگ میں ہر پھول کو عریاں لکھو

دلنشیں ہر لبِ خمدار ہے چاہو کس کو!
کون سا مطلعِ ابرو سرِ دیوار لکھو

جسے عزیز ہو جاں، راستے سے ہٹ جائے
یہی نسیم ہے صرصر جو رخ پلٹ جائے

جہاں کو دیکھنا چاہا تھا، یہ نہ چاہا تھا
مری نظر ہی یہاں منظروں میں بٹ جائے

گرفت میں نہیں آتا وہ خواب سا پیکر
بڑھاؤں ہاتھ تو کچھ اور دور ہٹ جائے

رکوں تو دور سے آوارگی صدائیں دے
قدم بڑھاؤں تو زنجیر پا لپٹ جائے

بیانِ ہجر سے آگے ہے وصل کا مضمون
جو تو سنے تو یہ سادہ ورق الٹ جائے

ابھی اڑا ہوں کسی حوصلے کی شہ پا کر
کسے خبر ہے کہ شہپر کہاں سمٹ جائے

خوشتر مکرانوی

بے باس کے گندھی کا لبُد

بادلوں کا کپاس سے رشتہ
رنگ و خوشبو کا آس سے رشتہ
ہے دھوئیں سے سراب تک قائم
صحرا بستی کا پیاس سے رشتہ
رنگیں کاغذ کے نرم پھولوں میں
یاسمینوں کے تن مہکتے ہیں
تازہ بے باس پشپ کے چہرے
کالے دھن کا وجود بے تحریر
ایک کمرے میں رات دن محبوس
رنگیں شاموں میں صبح کی نکہت
مردہ گھر میں حیات خوابیدہ
برف و کافور سنگِ مرمر
روشنیوں کی حکمرانی میں
اندھی آنکھوں کے ساتھ پرچھائیں

نوجوانی کے عکس کی قدریں
دیکھتی ہے ضعیف بینائی
امیوں کے محیط میں مہذب
تن کی رنگینیاں دکھاتے ہیں
مانگتی ہیں وقار تصویریں
زندگی کے نقوش میں رہ کر
سادہ شفاف کانچ کی چادر
آئینے کے بدن پہ چسپاں ہے
نیلے پیلے بے نکہتی اجسام
یاسمینوں میں بھی گلابوں میں
جوڑ لیتے ہیں زندگی اپنی
مندروں کے مشام سے جاکر
مسجدوں کے امام سے جاکر

اظہار مسرت اعجازی
۱۴۴۴۔ رام گنج بازار، جے پور

غزلیں

گرمی کی دوپہر سے گذرتی ہوئی ہوا
ڈس کر گئی ہے کتنوں کو پھنکارتی ہوا
دی تھی جنھیں حیات دسمبر کی دھوپ نے
جھلسا رہی ہے ان کو ہی اب جون کی ہوا
آندھی تھی تو شام کو پایا لہو لہو
سورج کو قتل کر کے خوش ہو گئی ہوا
پاؤں پہ خاک لوٹ رہی ہے بصد خلوص
سر سے گذر گئی ہے مگر سر پھری ہوا
کچھ لوگ بہہ رہے تھے ہوا کے بہاؤ میں
بدلا ہوا کا رخ تو بگڑنے لگی ہوا
پانی بھی خشک ہو گیا آتش بھی بجھ گئی
مٹی کے کالبد سے نکل کر چلی ہوا
میں نے دعا کی طرح سفر اپنا طے کیا
احباب کی مثال مخالف رہی ہوا

عرفان انصاری (علیگ

جتنے بھی ہمیں کافر و دیں دار ملے ہیں
سب اپنی انا ہی میں گرفتار ملے ہیں
بیگانہ سمجھتی ہے جنھیں ہوش سے دنیا
ان میں ہی ہمیں محرمِ اسرار ملے ہیں
غیروں نے بھی آزار نہ وہ ہم کو دیئے ہیں
جو اپنوں کے ہاتھوں ہمیں آزار ملے ہیں
بوسیدہ کھنڈر میں کہیں پیڑوں کے تنو
منسوب ترے نام سے اشعار ملے ہیں
جب ہجر کی شب حسن کی خلوت پہ نظر ر
وہ خود بھی مری طرح سے بیدار ملے ہیں
ساقی! یہ اثر ہے تری بیگانہ وشی کا
سب رند ہی میخانے سے بیزار ملے ہیں
انسانوں کی لاشوں ہی پہ تعمیر ہے ان کی
جو سر بفلک گنبد و مینار ملے ہیں
نادار فقیروں کو حقارت سے نہ دیکھ
ان میں ہی ہمیں صاحبِ کردار ملے ہیں
جس باغ کو سینچا تھا کبھی اپنے لہو سے
اس باغ سے عرفان ہمیں خار ملے ہیں

اسد محمد خاں
کراچی

فورک لفٹ ۳۵۲

پرولوگ :

حضرت شاہ، مینٹی ننس میکانک (رات ڈیوٹی) فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالن کا بیان ۔

... چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد جب میں رات میں اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ ۳۵۲ DAMAGED VEHICLES کی لائن میں کھڑی ہے اور اس کا ایک پہیہ تیل میں بھیگا ہوا پڑا ہے ۔
دستخط حضرت شاہ ایم ایم (نائٹ)

ملزم عبدالرحیم پرمانٹ/کلینر/ڈرائیور فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان ۔

میں نے چوبیس تاریخ کو صبح فلیٹ سیکشن میں دن کی ڈیوٹی پر رپورٹ کی تو مجھے ڈیوٹی سلپ دے دی گئی جس میں میری بکنگ فورک لفٹ ۳۵۲ پر کی گئی تھی ۔ اس فورک لفٹ کو ۱۶ ۔ ۱۵ نمبر برتھ پر کام کرنا تھا ۔ تیل پانی چیک کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے، سامنے الیکٹریشن عبدالرحیم بھوتیاں سے کہا کہ اس فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے ۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس گاڑی میں کچھ دن پہلے CHARGED بیٹری لگائی گئی تھی ۔ اب جو اس میں بیٹری نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گاڑی صحیح کنڈیشن میں نہیں ہے اس لئے میکانک نے اس کی بیٹری نکال کر رکھ دی ہے ۔ میں نے اس کی اطلاع بکنگ کلرک مسٹر جاوید کو دی انھوں نے ENTRY LOG BOOK میں ENTRY کرلی اس دوران وہاں LEADING DRIVER میر زمان بھی آگئے میں نے ان کو یہ صورت حال بتائی تاکہ ان کے ذہن میں رہے اور اونچ نیچ کی صورت میں مجھ کو ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے ۔ پھر انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب بھی وہاں آگئے میں نے ان کو بھی یہی بات بتائی انھوں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں یہ گاڑی DEFECTIVE ہے تم بیٹری لگا کر اسے ٹھیک کراؤ اور لے جاؤ ! انسپکٹر منور خان صاحب نے ایم ایم عبدالمجید کو خود کہا کہ اس گاڑی کو ٹھیک کر دو MAINTEANCE MECHANIC عبدالمجید نے

پرانی SPARE بیٹری لگا کر یہ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی کی اور سامنے سے RIGHT WHEEL اور ڈرائیور کے بیٹھنے کے حساب سے LEFT WHEEL میں SPANNER ڈال کر کچھ کام کیا جو میں نہیں دیکھ سکا اور گاڑی میرے حوالے کر دی اور کہا کہ اب یہ ٹھیک ہے اسے لے جاؤ جب انھوں نے کہا کہ گاڑی ٹھیک ہوگئی ہے تو میں گاڑی پر بیٹھ کر اس کو چلاتا ہوا برتھ نمبر ۱۶۔۱۵ اپر لے گیا۔ وہاں STEVEDORE کا فورمین موجود تھا میں نے اس سے کام کے لئے پوچھا تو اس نے کہا کہ فورک لفٹ کا کوئی کام نہیں ہے تم واپس چلے جاؤ مگر میں وہاں ساڑھے دس پونے گیارہ بجے تک بیٹھا رہا پھر میں نے فورمین سے کہا کہ میں گیراج جا رہا ہوں تمھیں ضرورت ہو تو وہاں سے بلوا لینا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے میں گاڑی کو لے کر گیراج کی طرف چلا۔ راستے میں مجھے بریک لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بریک لگانے پر آگے کا وہ WHEEL جس پر میکانک عبدالمجید نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور صرف SPANNER ڈال کر گھما دیا تھا وہ ایک طرف گھوم گیا اور بریک نہیں لگا۔ میں کسی نہ کسی طرح آہستہ آہستہ گاڑی کو گیراج تک لے آیا۔ جب میں گیراج میں داخل ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ انچارج انسپکٹر منور خان صاحب وہاں پہلے سے موجود ہے اور پتہ نہیں کیوں مسکرا رہا ہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے کیا بریک فیل ہوگیا ہے؟ (عالی جناب انکوائری افسر صاحب سے گذارش ہے کہ انسپکٹر منور خاں صاحب کے اس سوال کی نوعیت کو نوٹ فرمائیں) میں نے کہا جی ہاں میں اسی لئے واپس آرہا ہوں، مگر صاحب آپ کو کیسے پتہ چل گیا میں نے تو ابھی کسی سے ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ انھوں نے وہیں کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے میکانک فاروق چودھری کو حکم دیا کہ اس گاڑی کو چیک کرو۔ فاروق چودھری نے پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی کر کے میرے بتانے سے پہلے اسی ڈرم کو کھولنا شروع کر دیا جس پر میکانک مجید نے کام نہیں دیا تھا۔ اس پر میں نے فاروق میکانک سے پوچھا کہ کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس پہیئے میں DEFECT ہوگا تو وہ جواب دیئے بغیر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

عبدالمجید مینٹی ننس میکانک فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

... میں نے ڈھائی بجے جب دونوں وہیل چیک کئے تو RIGHT WHEEL سے بریک آئل بہہ رہا تھا۔ وہیل کھول کر میں نے دیکھا کہ ایک اسٹڈ NUT ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے گر جانے سے ڈرم کٹ گیا تھا، اور بریک لائیننگ اور شو BEND ہوگئے تھے۔ میں نے اس کی رپورٹ انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب کو دے دی۔ (بیان جاری ہے)

حضرت شاہ مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

سوال: کیا فورک لفٹ کے وہیل میں STUD NUT کے LOOSE ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسرے DEFECT کی وجہ سے فورک لفٹ چلاتے وقت ڈرائیور کو ان DEFECTS کا پتہ چل سکتا ہے؟

جواب: اگر STUD نٹ LOOSE ہوگیا ہے تو لامحالہ پہیئے میں سے آواز آئے گی اور ایک اناڑی شخص بھی یہ آواز سن کر جان لے گا کہ پہیئے میں کوئی گڑبڑ ہے۔

سوال: میں یہی سوال تم سے پھر پوچھتا ہوں —— خوب سوچ کر بتاؤ کہ فورک لفٹ کے چلانے میں اگر کسی وہیل کا کوئی STUD نٹ ڈھیلا ہو جائے تو کیا اس کا پتہ ڈرائیور کو چل سکتا ہے۔

جواب: جی ہاں، کیوں کہ اسٹڈ نٹ کے LOOSE ہونے سے فورک لفٹ کے پہیئے سے انجن کے شور سے اونچی اور مختلف آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور اگر ڈرائیور بہرا یا بدمعاش نہیں ہے تو سن سکتا ہے اور فوری طور پر مرمت کروا سکتا ہے اور VEHICLE کو بڑے نقصان سے بچا سکتا ہے۔ دستخط حضرت شاہ ایم ایم (نائٹ)

عبدالمجید مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

.... جواب: جی ہاں، اگر اسٹڈ LOOSE ہو کر ڈرم میں گھومتا رہے گا تو آواز سے ڈرائیور کو پتہ چل جائے گا۔ ویسے اگر اسٹڈ NUT اِدھر اُدھر پھنس جائے تو آواز نہیں ہوگی۔

(بیان جاری ہے)

غلام رسول، اے، ڈرائیور، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

جواب: جی ہاں۔ چلاتے وقت فوراً اس کا پتہ چل جاتا ہے کیوں کہ وہیل سے آواز آنے لگتا ہے۔ (دستخط غلام رسول)

عبدالمجید مینٹی ننس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

سوال: اسٹڈ LOOSE ہونے سے اتنا نقصان جو کہ ڈرم وغیرہ کو ہوا یہ کتنے عرصے میں ہوتا ہے اور آپ یہ بھی بتائیے کہ ڈرم کٹ کٹ کر اتنا برادہ جو ڈرم میں جمع ہوگیا اس کے جمع ہونے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟

جواب: اگر LOOSE STUD برابر رگڑ کھا رہا ہے تو کاٹنے کا اتنا کام تین چار گھنٹے میں ہو گا اگر زیادہ ٹائٹ ہے تو یہ نقصان دس منٹ میں بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ ڈرم کا لوہا نرم ہوتا ہے۔ اسے CAST IRON سے بنایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جناب والا، برابر رگڑ کھانے سے آواز بھی پیدا ہو گی جو کہ ہزاروں میل تک سنی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر سپرنگ وغیرہ میں اسٹڈ پھنس گیا ہے تو یہ آواز نہیں سنی جا سکتی مگر اندازہ ہو جاتا ہے ــــ ویسے پھنسنے کے بعد اسٹڈ رگڑ بھی نہیں کھائے گا۔

سوال: یہ بتائیے کہ اگر اسٹڈ زیادہ سختی سے رگڑ کھا رہا ہے تو کیا اس میں زیادہ آواز ہو گی اور ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو کیا کم آواز ہو گی؟

جواب: جی ہاں۔ اگر ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو اس میں معمولی آواز ہو گی جو ہو سکتا ہے کہ پکڑ میں نہ آئے مگر تاریخ اتنی ہلکی آوازوں کو بھی سن لیتی ہے۔

سوال: آپ نے ڈرم کھولا تو کیا STUD نٹ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا؟

جواب: ڈرم ہلانے کے بعد مشکل سے کھلا اور جب باہر نکالا گیا تو نٹ بھی گر گیا اس لئے معلوم نہیں کہ وہ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا یا آزاد تھا۔ مگر جیسا کہ جناب والا مجھ سے بہتر جانتے ہیں اس بات سے فرق کوئی نہیں پڑتا نقصان بہر حال ہو چکا ہے۔

سوال: وہ تو ٹھیک ہے مگر میں حقائق کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ جب تقریباً گیارہ بجے وہ واپس گیراج میں پہنچا تو فاروق چودھری میکانک نے پہیے کو چیک کیا اور عبدالرحیم کے اس سوال پر کہ کیا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ DEFECT اس پہیے میں ہو گا۔ میکانک فاروق کوئی جواب دیئے بغیر عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا بھی پھر جب اس نے ڈرم کھولا تو اس میں ڈرم کا برادہ وغیرہ موجود تھا اور اسٹڈ نٹ SPRING میں پھنسا ہوا تھا مگر اس کے برخلاف آپ کا کہنا ہے کہ گیارہ بجے نہیں بلکہ تقریباً ڈھائی بجے ڈرائیور رحیم نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ بریک فیل ہو گیا ہے اور فاروق نے نہیں بلکہ آپ نے ڈرم کھول کر چیک کیا تھا اور یہ کہ اسٹڈ NUT اسپرنگ میں نہیں پھنسا تھا ــــ آپ کے پاس ان سب باتوں کا کیا جواب ہے؟

جواب: اس گاڑی کا ڈرم تقریباً ڈھائی بجے خود میں نے کھولا تھا۔ فاروق بھی وہاں موجود تھا، دیگر یہ کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈرم کھولتے پر نٹ گر چکا تھا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ

وہ پہنا ہوا تھا کہ آزاد تھا۔

سوال از پرماننٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: یہ جو WHEEL گھماکر بریک چیک کئے جاتے ہیں تو کیا میکانک پہئے کو ہاتھ سے گھماکر چیک کرتے ہیں یا اسٹارٹ بھی کرتے ہیں۔

جواب از مجید: ہاتھ سے گھماکر بھی اور اسٹارٹ کرکے بھی دیکھا جاتا ہے۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: مجھے صبح گاڑی دینے سے پہلے آپ نے سیٹ پر کسی کو بٹھاکر اسٹارٹ گاڑی میں وہیل کو MECHANICAL PROPULSION دلوا کر دیکھا تھا؟ اور کیا آپ نے گھومتے ہوئے پہیوں میں بریک وغیرہ لگواکر دونوں پہیوں میں اپنا اطمینان کر لیا تھا؟

جواب: جی ہاں۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: سیٹ پر کون آدمی بیٹھا تھا۔ کیا میں تھا؟

جواب: نہیں آپ نہیں تھے۔ ROUTINE میں تو جیک اپ (JACK-UP) کی ہوئی گاڑی کی سیٹ پر خود گاڑی کا ڈرائیور ہی بیٹھا ہے اور میکانک چیک کرتا ہے۔ لیکن ڈرائیور کی عدم موجودگی یا متنازعہ موجودگی یا مشتبہ موجودگی کی صورت میں میں اپنے HELPER کو بٹھاکر اس کی مدد سے بھی چیک کرتا ہوں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ سیٹ پر اس وقت کس کو بٹھایا تھا۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: لیکن میں تو برابر موجود رہا ہمیشہ سے وہیں تھا۔ آپ کو اپنے ہیلپروں کی ضرورت نہیں پڑنا چاہیے تھی۔

جواب: ضرورت پڑی تھی اس لئے آپ وہیں تھے مگر وہاں نہیں تھے۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: آپ مسکرا کیوں رہے ہیں اور اس کے مسکرانے کے عمل میں آپ کے کتنے ہیلپر ہیں؟

جواب: سوال کے دونوں حصے IMPERTINENT ہیں اس لئے سوال کی حدود میں رہتے ہوئے جواب دینے کی بجائے میں ایک بونس کا جواب دے رہا ہوں ـــــ وہ یہ کہ میرا ایک ہیلپر ہے ہے۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم رحیم: کیا اس کا نام بتائیں گے؟

جواب: فاروق چودھری۔

سوال از انکوائری افسر: فاروق وہی جو ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا

جواب: جی ہاں ــــ مگر میں نے اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: میں نے اسے اور انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

جواب از انکوائری افسر: افسروں کے مسکرانے یا نہ مسکرانے کے بارے میں اس مرحلے پر کوئی سوال نہیں کیا جائے تو بہتر ہے۔

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: میں اس مرحلے پر اپنا مسکرانے کا حق محفوظ رکھتے ہوئے عبدالمجید ولدنا معلوم مینٹی ننس میکانک فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا سے سوال کرتا ہوں کہ مسٹر عبدالمجید ولدنا .....

سوال از انکوائری افسر: کیا غیر متعلق باتوں سے پرہیز کیا جا رہا ہے؟

سوال از پرمانٹ کلینر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: .... سوال کرتا ہوں کہ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ بریک فیل ہونے کے بعد آپ نے DAMAGED پہیئے کے ڈرم کو کھولا تھا تو یہ بتائیے کہ اس میں پڑا ہوا برادہ کیا بریک آئل سے تر تھا یا بریک آئل برادے تک بالکل نہیں پہنچا تھا؟

جواب: یہ برادہ تیل سے معمولی بھیگا تھا، زیادہ تر خشک تھا اس لئے کہ اس تک تیل پوری طرح نہیں پہنچا تھا کیوں کہ تیل پلیٹ سے بہہ بہہ کر WHEEL کے ٹائر پر گر رہا تھا۔ ویسے اس بارے میں INTERNATIONAL RED CROSS زیادہ اچھی طرح بتا سکے گا۔

سوال از انکوائری افسر: ڈرم ٹوٹنے سے کیا بریک آئل باہر آنے لگتا ہے؟

جواب: فورک لفٹ کے اس پہیئے میں ڈرم اور شوز اس بری طرح DAMAGE ہو گئے تھے کہ ان سے تیل نکل کر بہہ جانا لازمی تھا اگر معمولی نقصان ہوتا تو ممکن ہے تیل اندر ہی رہتا یا زیادہ سے زیادہ کچھ رسنے سا لگتا۔ مگر ایسا نہیں تھا پورا WHEEL تیل سے نہا گیا تھا۔

سوال از انکوائری افسر: (دہشت کی جھرجھری کے ساتھ) آپ دونوں یہ کہتے اور سنتے ہوئے مسکرا کیوں رہے ہو؟ (بیان جاری ہے)

انسپکٹر منور خان، انچارج فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان۔

سوال: کیا ڈرائیور ملزم عبدالرحیم۔ لائسنس یافتہ ڈرائیور ہے؟

جواب: نہیں جی اس کے پاس لائسنس نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اس کا عہدہ ڈرائیور کا نہیں ہے۔ PERMANENT CLEANER ہے جناب والا۔

سوال: کیا آپ کے پاس لائیسنس یافتہ ڈرائیور نہیں تھے؟
جواب: جناب والا۔ ہمارے پاس لائیسنس یافتہ ڈرائیور ہیں اور اس دن بھی تھے۔
سوال: کیا آپ اصولی طور پر اس بات کے حق میں ہیں کہ کلینروں کو محکمے کی قیمتی VEHICLES ...والے کر دی جائیں؟
جواب: جی نہیں۔
سوال: اگر اصول کے خلاف تھا تو یہ فورک لفٹ پر مانٹ کلینر ملزم عبدالرحیم کے حوالے ...یوں کی گئی؟
جواب: میں اس بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب والا۔
سوال: آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔ کیا میرا یہ سوال مضحکہ خیز تھا؟
جواب: کیا عرض کر سکتا ہوں۔
سوال: آپ کم از کم مسکرانے سے تو باز رہ سکتے ہیں۔؟
جواب: کھی کھی کھی کھی ہپ۔
سوال: مسٹر انسپکٹر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ انکوائری میں بیٹھے ہیں؟
جواب: قہہ قہہ قاہ قاہ قاہ۔
سوال: ہنسنا بند کرو۔ سنا نہیں؟
جواب: قاآآہ قاآآآہ۔ اودوہ اوددہ اوہ
سوال: ہنسنا بند کرو ہائنہ کے بچے۔ کتے میں تمہیں ڈسمس کرادوں گا۔ سمجھے؟
جواب: جناب والا میں معافی کا خواستگار ہوں۔ ویسے اجازت ہو تو جی میں کچھ کان میں گوش ...گزار کرنا چاہتا ہوں۔ جناب والا۔
سوال: ٹھیک ہے تم میرے قریب آسکتے ہو۔؟
جواب: پھُس پھُس پھُس پھُس کھس کھی کھی کھی۔
سوال: اوے کھی کھی اِی اِی ایہہ کیہہ کیہہ کیہہ؟
جواب: قہہ قہہ قاہ قاہ۔
سوال: قاہ قاہ قاہ قاہقاہ؟
سوال و جواب: قاہقاہ قاہ قاہ قاہ قاہ قہقاہ،!؟ □

یاد آوری کا شکریہ

● آپ کے ارسال کردہ الفاظ کے شمارے مل گئے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لوگ مادتا لے گ
کافی وقت سے واپس ملے ۔ الفاظ بے حد پسند آیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا معیاری رسالہ آج کل ہ
سے چھپ رہا ہوگا۔ میری اور میری بیوی کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں ۔ میں مبالغہ نہیں کرر
کا رسالہ بے حد اچھا اور متوازن ہے ۔ بڑی خوشی ہوئی ۔ کئی احباب نے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ سے
نمبر اول کی فرمائش کروں ۔ اگر زحمت نہ ہو تو ارسال کر دیجئے ۔

اردو سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے خاندان کے خون کی بوند بوند میں اردو رچی ہوئی ہے
ہم ۱۹۷۶ء میں کینڈا آئے تو چند احباب سے مل کر انجمن اردو کینیڈا قائم کی ۔ ہم لوگ باقاعدگی سے او
محنت سے آگے بڑھ رہے ہیں ۔ ہماری ان کوششوں سے لوگوں میں بے حد شوق پیدا ہوگیا ہے کبھ
نے کتاب یا رسالہ نہ خریدا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ اب لوگ اردو کی کتابیں اور رسائل شوق سے منگوار
اور سنجیدگی سے پڑھتے ہیں ۔ میں آپ کو انجمن کے متعلق کارکردگی کی رپورٹ آئندہ ارسال کروں گا۔ ا
اجازت دیجئے ۔

کرنل انوار احمد، اونٹاریو، کینیڈا (IRIO (CANADA

● الفاظ کا اشک نمبر ملا ۔ بیدی نمبر، پریم چند نمبر، ابن انشا نمبر، صلاح الدین پرویز نمبر
حسین نمبر۔ آپ کا اب ہر شمارہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی ایک ایک جلد بنتا جارہا ہے ۔ حیران ہوں
کا سلسلہ کہاں تک چلتا رہے گا ۔ شاید آپ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کو بھی پیچھے چھوڑنے کا ارادہ رکھ
اردو کے اس ریگستان یعنی آسٹریلیا میں اتنا اچھا اور مکمل پرچہ مل جانا کوئی ہم سے پوچھے ۔ آپ نے یہاں
کی سرگرمیوں کی خبروں کے لئے لکھا ہے ۔ انشا اللہ جلد ہی بھیجنے کی کوشش کروں گا ۔

متین عباس ، سڈنی، آ

● جناب سہام مرزا صاحب کے توسط سے آپ کی طرف سے بھیجا گیا الفاظ ملا ۔ اپنی کوت
شرمندہ ہوں کہ بہت دیر بعد اس نوازش کے لئے خط لکھ رہی ہوں ۔ واقعی اس عزت افزائی کے لئے
مشکور ہوں ۔ الفاظ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اردو ادب میں خوبصورت اضافہ ہے
آپ کو محنت کا صلہ ترقی کی صورت میں عطا کرے ۔

م ، اسلم ۱۵،۱۱ ؍

● الفاظ کا مشترکہ شمارہ ۵۔۶ روانہ کرکے آپ نے مجھ پر بڑی نوازش کی ہے۔ اردو رسائل
ہندوستان اور پاکستان سے یہاں پر آتے ضرور ہیں لیکن بہت ہی کم۔ اس لئے جب آجاتے ہیں تو اردو
پڑھنے والے بہت دنوں تک اپنے درمیان اس کے تبادلے کرتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ اردو لکھنے اور
پڑھنے والوں کی یہاں پر خاصی تعداد ہے اور یہ بڑھتی جا رہی ہے۔ میرا اشارہ یہاں کی نئی نسل کی طرف
ہے بلکہ ایمیگرنٹ (EMIGRANT) کی جانب ہے۔

الفاظ زندہ ہے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس میں یقیناً آپ کی اچھی صلاحیت کو دخل
ہے۔ کافی عرصہ پہلے بمبئی اور حیدرآباد میں اس کے کچھ شمارے بھی دیکھ چکا ہوں اور جس معیار کو
آپ نے برقرار رکھا ہے وہ بھی مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کو اس کامیابی مبارکباد دیتا ہوں۔
کینڈا میں میں نے اردو اکیڈیمی نارتھ امریکہ کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے تعاون سے دوماہی ادبی
"دور کے لوگ" کے اجرا کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ یہ پرچہ ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرے گا۔ آپ
کے تعاون کا طالب ہوں۔ خدا حافظ۔

رضا الجبار۔ ٹورانٹو۔ کینیڈا TORONTO (CANADA)

● اپندر ناتھ اشک کے تذکرے نے اردو افسانہ نگاری کے دور زریں کی یاد تازہ کر دی ہے۔
زیر نظر تازہ شمارے میں ڈاکٹر وحید اختر کے مضمون کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موصوف
[illegible] اور ساہتیہ اکادمی کے سلسلے میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اور میں
[illegible] کرتا ہوں لیکن اول تو انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اترپردیش اردو اکادمی کا انعام
[illegible] بھی ہوں، جب کہ اس معاملے میں جو فہرست ڈاکٹر صاحب موصوف نے جاری
[illegible] نامکمل ہونے کے سبب نہیں ہے۔
[illegible] ضروری بات یہ کہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے مذکور مضمون میں اردو کی سرکاری
[illegible] وہ سرتا پا غلط اور بے بنیاد ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھیں اس پورے معاملے
[illegible] میں انھوں نے کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں
[illegible] اردو کی سرکاری حیثیت کا جو قانون منظور ہوا ہے، وہ آندھرا میں برسوں پہلے
[illegible] قانون ابھی تک جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں صرف بہار میں بنا ہے۔ اترپردیش
[illegible] نے قانون بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دستور ہند کی سرکاری زبان
[illegible] زبان کے قانون میں ترمیم کرکے اسمبلی کے ووٹ کے ذریعے پوری ریاست
[illegible] ہندوستان میں ابھی تک صرف ریاست بہار میں بنائی گئی ہے اور آندھرا پردیش
[illegible] مقامی اور عارضی ہے۔ اس سلسلے میں ایکٹ کی صحیح نقل انجمن ترقی اردو بہار کی طرف
تقریباً تمام اردو اخبارات میں شائع کرائی جا چکی ہے۔
[illegible] سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی واقفیت کا حال اس بات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انھوں نے

یاد آوری کا شکریہ

● آپ کے ارسال کردہ الفاظ کے شمارے مل گئے تھے اور ہاتھوں ہاتھ لوگ مادتاً لے گئے کافی دقت سے واپس ملے۔ الفاظ بے حد پسند آیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا معیاری رسالہ آج کل ہندؔ سے چھپ رہا ہوگا۔ میری اور میری بیوی کی طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ میں مبالغہ نہیں کر رہا آ کا رسالہ بے حد اچھا اور متوازن ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کئی احباب نے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ سے اف نمبر اول کی فرمائش کروں۔ اگر زحمت نہ ہو تو ارسال کر دیجئے۔

اردو سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے خاندان کے خون کی بوند بوند میں اردو رچی ہوئی ہے۔ جب ہم ۱۹۷۶ء میں کینیڈا آئے تو چند احباب سے مل کر انجمن اردو کینیڈا قائم کی۔ ہم لوگ باقاعدگی سے اور بڑ محنت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہماری ان کوششوں سے لوگوں میں بے حد شوق پیدا ہوگیا ہے کبھی کہ نے کتاب یا رسالہ نہ خریدا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ اب لوگ اردو کی کتابیں اور رسائل شوق سے منگوا رہے ہیں اور سنجیدگی سے پڑھتے ہیں۔ میں آپ کو انجمن کے متعلق کارکردگی کی رپورٹ آئندہ ارسال کروں گا۔ اچھا اجازت دیجئے۔

کرنل انوار احمد، اونٹاریو، کینیڈا (NTARIO (CANADA

● الفاظ کا اشک نمبر ملا۔ بیدی نمبر، پریم چند نمبر، ابن انشا نمبر، صلاح الدین پرویز نمبر، انتظا حسین نمبر۔ آپ کا اب ہر شمارہ اردو انسائیکلو پیڈیا کی ایک ایک جلد بنتا جا رہا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ کا سلسلہ کہاں تک چلتا رہے گا۔ شاید آپ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کو بھی پیچھے چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اردو کے اس ریگستان یعنی آسٹریلیا میں اتنا اچھا اور مکمل پرچہ مل جانا کوئی ہم سے پوچھے۔ آپ نے یہاں ارد کی سرگرمیوں کی خبروں کے لئے لکھا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

متین عباس، سڈنی، آسٹریلیا

● جناب سہام مرزا صاحب کے توسط سے آپ کی طرف سے بھیجا گیا الفاظ ملا۔ اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں کہ بہت دیر بعد اس نوازش کے لئے خط لکھ رہی ہوں۔ واقعی اس عزت افزائی کے لئے بے حد مشکور ہوں۔ الفاظ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اردو ادب میں خوبصورت اضافہ ہے۔ اللہ آپ کو محنت کا صلہ ترقی کی صورت میں عطا کرے۔

خالدہ اسلم، کراچی

● الفاظ کا مشترکہ شمارہ ۵۔ ۶ روانہ کرکے آپ نے مجھ پر بڑی نوازش کی ہے۔ اردو رسائل ہندوستان اور پاکستان سے یہاں پر آتے ضرور ہیں لیکن بہت ہی کم۔ اس لئے جب آجاتے ہیں تو اردو پڑھنے والے بہت دنوں تک اپنے درمیان اس کے تبادلے کرتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی یہاں پر خاصی تعداد ہے اور یہ بڑھتی جارہی ہے۔ میرا اشارہ یہاں کی نئی نسل کی طرف نہیں ہے بلکہ امیگرنٹ (EMIGRANT) کی جانب ہے۔

الفاظ زندہ ہے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس میں یقیناً آپ کی اچھی صلاحیت کو دخل ہے۔ کافی عرصہ پہلے بمبئی اور حیدرآباد میں اس کے کچھ شمارے بھی دیکھ چکا ہوں اور جس معیار کو آپ نے برقرار رکھا ہے وہ بھی مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کو اس کامیابی میارکباد دیتا ہوں۔ یہاں کینڈا میں میں نے اردو اکیڈمی نارتھ امریکہ کی بنیاد رکھی ہے اور اس کے تعاون سے دوماہی ادبی پرچہ "دور کے لوگ" کے اجرا کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ یہ پرچہ ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرے گا آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔ خدا حافظ۔

رضا الجبار۔ ٹورانٹو۔ کینیڈا TORONTO (CANADA)

● اپندرناتھ اشک کے تذکرے نے اردو افسانہ نگاری کے دور زریں کی یاد تازہ کردی ہے۔

زیر نظر تازہ شمارے میں ڈاکٹر وحید اختر کے مضمون کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موصوف نے اردو اکادمیوں اور ساہتیہ اکادمی کے سلسلے میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اور میں اس سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، لیکن اول تو انھیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام واپس کرنے والوں میں ایک میں بھی ہوں، جب کہ اس معاملے میں جو فہرست ڈاکٹر صاحب موصوف نے جاری کی ہے اس میں میرا نام شاید گم نام ہونے کے سبب نہیں ہے۔

دوسری اور زیادہ ضروری بات یہ کہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے مذکور مضمون میں اردو کی سرکاری حیثیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہے معلوم ہوتا ہے انھیں اس پورے معاملے کی کوئی واقفیت نہیں اور اس سلسلے میں انھوں نے کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اتر پردیش اور بہار میں اردو کی سرکاری حیثیت کا جو قانون منظور ہوا ہے، وہ آندھرا میں برسوں پہلے بن چکا ہے۔ ایک تو یہ قانون ابھی تک جب یہ سطریں لکھی جارہی ہیں صرف بہار میں بنا ہے، اتر پردیش میں نہیں، جہاں صرف کابینہ نے قانون بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دستور ہند کی سرکاری زبان دفعہ ۳۴۵ کے مطابق باضابطہ زبان کے قانون میں ترمیم کرکے اسمبلی کے ووٹ کے ذریعے پوری ریاست کی سرکاری زبان اردو آزاد ہندوستان میں ابھی تک صرف ریاست بہار میں بنائی گئی ہے اور آندھرا پردیش کا قانون محض جزوی و مقامی اور عارضی ہے۔ اس سلسلے میں ایکٹ کی صحیح نقل انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے ہندوستان کے تقریباً تمام اردو اخبارات میں شایع کرائی جاچکی ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی واقفیت کا حال اس بات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انھوں نے

حیدرآباد کی اردو اکادمی کی اک ذرا تعریف اردو کے سرکاری و تعلیمی استعمال کے باب میں کی ہے وہا
ساتھ ساتھ کسی "بہار کی انجمن" (؟) کا ذکر خیر بھی کیا ہے۔ ہماری واقفیت کی حد تک بہار میں م
ایک "بہار کی انجمن" ہے جس کا صحیح نام انجمن ترقی اردو بہار ہے اور وہ شاخ ہے انجمن ترقی ار
ہند کی۔ چنانچہ اردو کی سرکاری حیثیت کے لئے جو کچھ کیا ہے اسی انجمن نے کیا ہے اور توقع کی جاتی
کہ انجمن ترقی اردو کا نام لینے میں کسی اردو دوست کو کوئی تامل نہ ہوگا۔

عبدالمغنی پٹنہ

تفہیم

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔
دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور رہوگا۔ ادارہ)

۱۔ زنجیر کا نغمہ	وحید اختر	زرافشاں، دودھ پور، علی گڑھ	۲۵/۰۰
۲۔ میری غزل	کرار نوری	روحِ عصر، کراچی	۳۵/۰۰
۳۔ پانی پر بہتا پھول	شبنم مناروی	سطور پرکاشن، نئی دہلی	۲۰/۰۰
۴۔ بارش	منظور ہاشمی	دائرے، علی گڑھ	۲۰/۰۰
۵۔ دیوارِ آب	محمد اظہار الحق	ابلاغ، اسلام آباد	۴۰/۰۰
۶۔ خوشبو کا سفر	فارغ بخاری	فنون پبلشرز، لاہور	۲۰/۰۰
۷۔ ابلاف	رؤف خیر	گل نو پبلیکیشنز، حیدرآباد	۱۰/۰۰
اور			
۸۔ اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ڈاکٹر ام ہانی اشرف	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۳۵/۰۰
۹۔ ماہنامہ "غالب" آسٹریلیا			
۱۰۔ ادبی مجلہ • شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور • سنہ اشاعت ۱۹۸۲ء			

پچھلے شمارے میں ہم نے ہندوستان و پاکستان کے چند شعری مجموعوں سے اپنے قارئین کا تعارف کرایا تھا۔ اس بار بھی ہمارے پیش نظر چند اور مجموعے ہیں ـــ ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری شعری روایات کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور ان میں توانائی پیدا ہو رہی ہے۔

زنجیر کا نغمہ وحید اختر کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے "پتھروں کا مغنی" اور "شب کا رزمیہ" منظرِ عام پر وحید اختر کی شاعری کا اعتبار قائم کر چکے ہیں۔ اب یہ تیسرا مجموعہ ہے جس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ وحید ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ مرثیے بھی کہتے ہیں ـــ شعر و شاعری کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین ادبی دنیا میں وقار حاصل کر چکے ہیں اور غور و فکر کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ وحید اختر بے باک انسان ہیں اور شاعری میں گرچہ باتیں لفظوں کا پردہ بنا کر کچھ اس طرح

کہی جاتی ہیں کہ کچھ گرہیں پڑتی ہیں تو کچھ کھلتی بھی جاتی ہیں لیکن وحید کے یہاں طنز کا لب و لہجہ موضوع کو اور تیکھا بنا دیتا ہے۔

وحید اختر ہمارے صف اول کے شاعروں میں ہیں۔ اور نظم و غزل دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ زندگی کے داخلی اور خارجی تجربات وحید اختر کے یہاں بڑی آسانی سے شعری پیکر اختیار کر لیتے ہیں اور خیال اپنی ہیئت خود ڈھونڈ لیتا ہے ـــــ وہ لکھتے ہیں "میں نے زمان و مکان کے وجدانی تناظر میں جو تخلیقی سفر کیا ہے وہ صرف شعری اظہار کا سفر نہیں، میرے وجود کا سفر ہے۔" وحید نے یہ سفر عملی زندگی میں طے کیا ہے اور ذات کے تجربۂ وجود کو اجتماعی تجربے کی سطح سے کم نہیں سمجھنا چاہیے ـــــ بلکہ بیشتر تو داخلی تجربے نسبتاً زیادہ آزادی کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں اسی لئے فن کار ان کو عزیز رکھتا ہے۔ وحید اختر نے خارجی زندگی کے المیہ کو سمجھا بھی اور برتا بھی ہے ـــــ اور یہ المیہ ایک جبر کی پیداوار ہے، چاہے وہ تاریخی جبر ہو یا عہد حاضر کا ـــــ سچی بات یہ ہے کہ المیہ کا تاثر اس کے جبر میں پنہاں ہے اور جب فن کار اس سے بلند ہونا چاہتا ہے تو تخلیقی سوتے پھوٹ پڑتے ہیں ـــــ وحید اختر فلسفے کے استاد ہیں ـــــ ان کا عالمی ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور یہ مطالعہ ان کے دائرۂ فکر کو نئی جہت سے آشنا کرتا ہے۔

"زنجیر کا نغمہ" وحید اختر کی خوبصورت نظموں اور غزلوں کو اسیر کئے ہوئے ہے۔ اردو افسانہ ہجرت کے کرب کا اظہار کرتا رہا ہے لیکن وحید اختر "ہجرت کا محور" میں زندگی کا محور تلاش کر لیتے ہیں۔

زندگی کا ایک ہی محور، ہمارے سو محور
کسی کا نام وطن ہے کسی کا ماضی ہے
کسی کا کنبہ، قبیلہ کسی کو گھر کہئے
ہزاروں رشتے ہیں ہر اک کو معتبر کہئے

فکر کا یہ انداز روح عصر کو اپنے دامن میں لئے ہوئے اور اسی لئے شاید وحید اختر کے اشعار ہمیں اپنے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔ غزلوں میں سے چند شعر نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

رشتہ رکھتے ہیں تجارت کا خدا سے بھی لوگ
غرض آلودہ ہر اک حمد و مناجات ملی

زخموں کی بوچھار میں روح و جسم کو تم عریاں نہ کرو
عمر کٹے گی زخموں ہی کی بخیہ گری میں میری طرح

میری غزل ہے شعلگیٔ گل خوشبو کی تلوار کی دھار
آگ سے کس نے کام لیا ہے نغمہ گری میں میری طرح

ہے یہ ہمارا ہی لہو اب تک رہا تو سرخ رو
ہم دیں نہ جس دن خون بہا بجھ جائے گا چہرا تیرا

کٹی ہے عمر فراغت کی آرزو کرتے
جو وقت ملتا تو ہم اپنی جستجو کرتے

وحید اختر کا یہ مجموعہ ان کی اپنی شعری روایت کو اور آگے بڑھا رہا ہے اور یقیناً ہر صاحبِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔

میری غزل کرتار نوری کا مجموعۂ غزلیات ہے ـــــ کتاب کا نام ظاہر کر رہا ہے شاعر کو

اپنے اوپر اعتماد ہے ــــ اور اس مجموعے نے ان کے اعتماد کو بجا طور پر ٹھیس بھی نہیں پہنچائی۔ اس مجموعے میں سو غزلیں ہیں اور سب کی سب بھرپور۔ کلام میں فنی پختگی ہے جو ایک وسیع تجربے کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے زندگی اور فن دونوں کو خوب خوب برتا ہے اور شاید اسی لئے تنہائی کا یہ احساس مصنوعی نہیں ہے، ان کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ تنہائی نوری کے ہر شعر سے ٹپک رہی ہے ــــ کہیں واضح ہے اور کہیں لفظوں اور خیالوں کے پردوں سے جھانک رہی ہے ــــ یہ تنہائی نہ صرف اپنے عہد کی ہے بلکہ اس کا ذمہ دار وہ معاشرہ ہے جہاں آواز پر ہی نہیں محسوسات پر بھی پابندی ہے ــــ جہاں زبان کھلتے ہی الفاظ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ایسے وقت غزل ان کی شکست کی آواز بن جاتی ہے کہ شاید اپنی بازگشت ہی کو دوئی میں تبدیل کر دے۔

کہے دیتا ہے یہ سناٹا گھر کا   کہ اپنے گھر میں اب تنہا نہیں ہوں
گھر کا سناٹا یہ مانا کہ ڈراتا ہے مجھے   پھر بھی گھر میں کوئی اپنا نظر آتا ہے مجھے

کہ ار نوری کے یہاں بازگشت کی رفاقت باعث تسکین ہے اور اس لئے یہ تنہائی بامعنی ہو جاتی ہے اور نوری کو مایوسی سے بچا لیتی ہے۔ جن لوگوں کو اردو غزل سے شکایت ہے وہ "میری غزل" کا مطالعہ کریں ــــ غزل اپنے حدود میں کتنی وسعت کرتی ہے اس کا اندازہ اس مجموعے کو پڑھ کر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا کرے زرد دیوار کان رکھتے ہوں   زمانہ گزرا ہے روداد غم سنائے ہوئے
ہے ذہن میں شاید کسی بجلی کا تصور   چپ چپ سے ہیں ارباب گلستاں کئی دن سے
میرے چپ رہنے سے کیا بات سنور جائے گی   لوگ خود بھی تو سمجھتے ہیں کہوں یا نہ کہوں
چلو ہم بھی کسی بار امانت کو اٹھا لائیں   جہاں میں تذکرہ پھر گردش ایام کا آیا

یہ اشعار اور ایسے کتنے اشعار ہیں جن سے نوری کی شاعرانہ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سچ ہے غزل کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ خوبصورت طباعت اور گٹ اپ نے گویا لباس حریر مہیا کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو دنیا میں اس مجموعے کا خیر مقدم ہوگا۔

پانی پر بہتا پھول شبنم مناروی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ ایک اور مجموعہ ہے جو ہمیں دعوت مطالعہ کے ساتھ ساتھ غور و فکر بھی عطا کرتا ہے۔ جدید شاعری لفظوں اور موضوعات کے دھارے سے نکل پڑی ہے۔ محمود ہاشمی نے شبنم کی شاعری کو عہد جدید کے انسان کا رزم نامہ کہا ہے۔ شاید رالف فاکس نے ناول کو بھی عہد جدید کا رزمیہ کہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب یہ منصب شاعری نے حسن و خوبی کے ساتھ سنبھال لیا ہے۔ شبنم کی شاعری ان تمام امکانات کا پتہ دیتی ہے جو رزمیہ سے وابستہ کئے جا سکتے ہیں جس میں وہ ایک نئے انسان اور ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں ؎

جس قدر نقش بگاڑے تھے خزاں نے آکر   وہ بھی نقش بہاروں میں بدل جائیں گے

شبنم کے یہاں تجربہ ہے لیکن ٹھہرا ٹھہرا ــــ یہ جھجک اس لئے نہیں کہ ان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں بلکہ بقول بلراج کومل " وہ تو اپنی حقیقی شعری قوت تجربے کی ناگزیر شدت میں دریافت کرتے ہیں ۔" وہ بڑے اعتماد سے قدم بڑھاتے ہیں ۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں جن میں نیا پن ہے ۔ "پانی پر بہتا پھول" ۱۹۸۱ء کا ایک مجموعہ ہے اور اچھی اور صحت مند شاعری کی بشارت دیتا ہے ۔ میں اچھے ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کا عادی نہیں ــــ البتہ یہ جانتا ہوں کہ مریضانہ شاعری کبھی بڑی شاعری نہیں ہوتی ۔ اس کا صحت مند ہونا ضروری ہے اور یہ صحت افکار سے بھی ظاہر ہونا چاہئے اور لب ولہجہ سے اور اسی لئے میں نے شبنم کی شاعری کو صحت مند کہا ہے ۔

شبنم مناروی کی نظموں میں "کچھ نہیں ہوتا"، " نئی نسل"، " وقت کی بانہوں میں"، " پامال دھرتی سے آسمانوں کا رشتہ"، " ارتقا" نمایاں حیثیت رکھتی ہیں ۔ شبنم کی نظموں اور غزلوں میں ان کا اپنا منفرد لب ولہجہ اور ان کی آواز سنائی دیتی ہے ۔

" پانی پر بہتا پھول " ہر اعتبار سے ایک خوبصورت مجموعہ ہے ۔ شاید ۱۹۸۱ء اردو کی نئی شاعری کے لئے فال نیک ثابت ہوا ۔

اب ملاحظہ ہو منظور ہاشمی کا مجموعہ کلام **بارش** ــــ اردو داں طبقے اور علی الخصوص مشاعرے کے رسیا منظور ہاشمی کے نام اور کام سے خوب واقف ہیں ۔ ان کا نرم لہجہ اور اس لہجے میں لفظوں کا نپا تلا انتخاب ــــ بڑی سی بڑی بات بڑے ہلکے پھلکے انداز سے کہہ دینا منظور ہاشمی کا کام ہے ــــ ان کے مصرعوں سے ہم ان کے لب ولہجے تک کو پہچان لیتے ہیں ۔ منظور صاحب غزل کے شاعر ہیں اور شاید غزل کی رمزیت نے ہی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے ۔ منظور ہاشمی کے یہاں شعری روایات کا احترام بھی ہے اور انحراف بھی جو غیر محسوس طور پر ان کے شعروں میں در آتا ہے ۔ "بارش" میں ان کی غزلوں کا ایک خوبصورت انتخاب ہے ۔ کوئی غزل ۵ یا ۶ اشعار سے آگے نہیں بڑھی ــــ یہ بارش طوفانی نہیں ہے بلکہ یہاں بھینی بھینی پھوار ہے جو دل و دماغ کو سیراب کرتی ہے ۔ ان کی شاعری میں تقریر کی وہ لذت ہے کہ بار بار خیال آتا ہے کہ یہ بات تو ہمارے اپنے دل کی ہے ۔ میں چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں ۔

ہر نئے موسم میں گھبرا کر یہی کہتے رہے ــــ رت جو اس کے بعد آئے گی سہانی آئے گی

کس کس کے گناہ سر لئے میں نے ــــ کس کس کی نجات ہو گیا ہوں

کوئی پوچھے تو نہ کہنا کہ ابھی زندہ ہوں ــــ وقت کی کوکھ میں اک لمحۂ آئندہ ہوں

بس اک خدا کی پرستش اصول تھا ان کا ــــ ہر ایک شخص نے اپنے ہی بت بنائے تھے

" بارش " منظور ہاشمی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اور بڑے اعتماد سے پیش کیا گیا ہے اور ایک شاندار مستقبل کی بشارت دے رہا ہے ۔ سبطین کا ٹائٹل بے حد جاذب نظر ہے ۔ شاید اسی کا نام سادگی اور پرکاری ہے ۔ اس کی اشاعت کے لئے دائرے پبلیکیشنز مبارکباد کا مستحق ہے ۔

دیوارِ آب محمد اظہار الحق کی غزلیات کا خوبصورت مجموعہ ہے جو ابھی حال ہی میں شایع ہوا ہے۔ یوں تو آج کے نوجوان شعرا کی غزلیں نئی غزل کے نام سے منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں لیکن ان میں کم ہی شاعر ہیں جن کے یہاں جدیدیت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر شاعر ایسے ہیں جو روایت سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ کچھ ایسے ہیں جنھوں نے لفظیات کی حد تک نئی شاعری کو اپنایا ہے۔ کچھ لوگوں نے فیض، ناصر کاظمی وغیرہ کی لے میں اپنی آواز کو کھو دیا ہے۔ غرض کم لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں نئے ہیں۔ محمد اظہار الحق ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جو لفظوں کے دائرے کو بڑھا رہے ہیں۔ غزل کی ایک نئی لفظیات کو پیش کر رہے ہیں۔ نئی بحروں کے تجربے کر رہے ہیں۔ احساسات کو دھندلا کر دل کی بات اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ لوگ چونک جاتے ہیں۔ "دیوارِ آب" کا پیش لفظ ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ مرزا حامد بیگ سلجھے ہوئے نقاد ہیں —— جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ ان کا پیش لفظ اس مجموعے کی شان میں یقیناً اضافہ کرتا ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعے یقیناً نئی غزل کی دریافت میں مدد کی ہے۔ میں انھیں اردو افسانے کا نقاد ہی سمجھتا تھا لیکن اپنے "ابتدائیہ" کے ذریعہ انھوں نے تفہیمِ شعر کا بھی ثبوت دیا ہے۔ یہ ابتدائیہ اس لحاظ سے روایتی پیش لفظ نہیں ہے۔ انھوں نے نبض پر بھی صحیح جگہ ہاتھ رکھا ہے۔ بہت کم لوگ جو تعصب سے بالاتر ہو کر ادب کی تفہیم کی کوشش کرتے ہیں ترقی پسند اور جدیدیت کی آویزش نہ صرف تخلیقی فن کار کو خانے میں بانٹ دیتی ہے بلکہ پڑھنے والوں کو بھی ایک عینک عطا کرتی ہے کہ وہ اسے لگا کر ادب کا مطالعہ کریں۔

مرزا حامد بیگ اس سے بالاتر ہو چکے ہیں اور اس لئے ان کے یہاں اظہار صاحب کی شاعری کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا عمل صاف طور پر نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں —— "غزل کی روایت میں بہت پہلے شعر سے اٹھائے جانے والے حظ اور جذبے کی ELOVATION کے محسوسات پر غور کرنے اور اس کا استقرا اور چھان پھٹک کرنے سے اوزان کا نظام وضع کیا گیا تھا۔ یہ نظام عروض کی کتابوں تک محدود سمجھنا بھی جہالت پر مبنی ہوگا، گو سہل پسندوں کے لئے ان مندرجہ بحور میں بھی شعر کہنا ممکن نہیں۔ اصول موزونیت کے ماتحت شعر کے نئے اوزان دریافت کرنے کا امکان کبھی ختم نہیں ہوا۔ اس ضمن میں محمد اظہار الحق کی بیشتر غزلوں میں اس "امکان" کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔"

اس مجموعہ کی ہر غزل ایک نیا لب و لہجہ اور نئے فکری احساس کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض نامانوس بحروں اور لفظوں کے استعمال سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ ہماری غزل کی زبان اور اس کا روایتی ترنم نہیں ہے لیکن بیشتر غزلوں اور اس سے پانچ گنا اشعار ہم کو اظہار الحق سے بہت جلد مانوس کرتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو ان سے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ غزل یقیناً توجہ طلب ہے۔ چند اشعار محض نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

اپاہج کھیتیاں ہیں جن پہ خوشے ہیں نہ پتے
اور اب میرا بیٹا اسے ڈھونڈنے گھر سے نکلا ہے

زمین اس بار تو نے بیٹیاں کیسی جنی ہیں
کہانی میں اظہار ابھی تک اڑن طشتری اڑ رہی ہے

نمک ان آنسوؤں میں کم تھا، پر نم بہت تھا — گھروں میں دانۂ گندم نہ تھا ماتم بہت تھا
سوکھی جھاڑیاں خوب جلیں گی — اس کے غم کو آگ لگا دیں
وہی مکاں وہی گلیاں مگر وہ لوگ نہیں — یہی مراد تو ہے بستیاں اجڑنے سے
شہ کے محافظ چلے گئے ہوں گے اور اک بے جاں بدن — سطح آب پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ابھرا ہوگا
سرد ہوا سے لپٹ لپٹ کر پیڑ آنگن کے روتے ہیں — پہلی کرن کے ساتھ مسافر گھر سے چلا گیا ہوگا
ہوا میں تخت اڑتا آ رہا ہے اس پری رو کا — محبت دل میں پھر قصہ کہانی بن کے اٹھی ہے

محمد اظہار الحق کی غزلیں پڑھ کر بار بار غزل کے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے ــــــ تعجب ہے کہ کچھ لوگ اسے اب بھی لائق گردن زدنی سمجھتے ہیں۔

خوشبو کا سفر اردو کے ممتاز شاعر فارغ بخاری کی نظموں اور غزلوں کا ہر اعتبار سے خوبصورت مجموعہ ہے۔ فارغ کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اگر خانوں میں بانٹنے کی روایت پر عمل کیا جائے تو وہ ترقی پسند ہیں لیکن چالیس سال سے اچھی شاعری کر کے وہ اس تقسیم سے بالاتر ہو گئے ہیں۔ "زیر و بم" اور "شیشے کے پیرہن" بہت پہلے فارغ کی شاعرانہ عظمت کو منوا چکے ہیں۔

میں محمد علی صدیقی کے اس بیان کی تائید کرنا چاہتا ہوں کہ فارغ بخاری ہمارا ہمعصر ہے، جدید عہد کے منطقی تقاضوں کا وکیل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے مسلک کے ساتھ مخلص ہے۔ خوشبو کا سفر جدید اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔" فارغ نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کی روح کو دریافت کر لیا ہے بلکہ وہ اس زمین کی بوباس سے بھی واقف ہیں جن پر ان کے قدم جمے ہوئے ہیں۔

فارغ نے غزل اور نظم دونوں میں اپنا سکہ منوا لیا ہے۔ "خوشبو کا سفر" اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اس میں شاید ہی کوئی شعر بھرتی کا ہو۔ ترقی پسند شعرا کے یہاں خیال کے جسم پر زبان کا لباس کبھی کبھی اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ بدن جھلکنے لگتا ہے لیکن فارغ کے اپنے دھیمے لب و لہجے اور نرم و نازک الفاظ کی مدد سے ایسا پیرہن دیا ہے کہ صحیح معنوں میں فن چھپ چھپ کر ظاہر ہو رہا ہے۔

ان کی نظمیں "نئے جہاں کا سلام تم پر"، "تیل کا پنچھی"، "موت کا رقص جاں بلب ہے" میرے اس بیان کی تصدیق کر سکتی ہیں۔

فارغ کی غزلیں نئی ہیں لیکن روایت کا تسلسل صاف طور پر نمایاں ہیں ؎

کتنی ایسی زندہ لاشیں ہیں جنھیں — احتراماً لوگ دفناتے نہیں
فن کی عظمت کے لئے لفظ کی حرمت کے لئے — آؤ سچائیوں کے ہاتھ پہ بیعت کرلیں
خزاں گزیدہ دنوں میں بھی ہم اداس نہیں — کہ تیرے دم سے یہ موسم ابھی سہانا ہے

میں جانتا ہوں مقفل ہیں سارے دروازے　　　مجھے جنوں ہے کہ گزروں مگر صدا کر کے
جنوں میں بات کوئی ٹھیک ہی کہی ہوگی　　　فقیہہ شہر کو کھٹکی ہے گفتگو اپنی

فارغ تھکے نہیں اور نہ تھکنے کے آثار دور دور نظر آتے ہیں ـــــ وہ اسی طرح رواں دواں جیسے اب سے برسوں پہلے تھے ۔ اس مجموعے کو پڑھ کر تو اس زور قلم کے لئے میرے دونوں ہاتھ اٹھ گئے۔

ایلاف رؤف خیر کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے پہلے "اقرار" شایع ہو چکا ہے جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ رؤف خیر نے ایک نئی صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے "ترائیلے" جو فرانسیسی فارم ہے اس میں آٹھ مصرعے دو قافیوں سے لکھے جاتے ہیں۔ پہلا مصرع چوتھے اور ساتویں مصرع کی جگہ اور دوسرا مصرع آٹھویں یا آخری مصرع کی جگہ دہرایا جاتا ہے۔ رؤف خیر سے پہلے نریش کمار شاد آنجہانی اس صنف کو منظر عام پر لائے تھے۔ رؤف خیر کو ان سے زیادہ کامیابی ملی۔ انھوں نے مترنم بحروں کا انتخاب کیا ہے اور بڑے ماہرانہ انداز سے اس کو پیش کیا ہے۔ غزل نے ہمارے شعرا کو سہل پسند بنادیا ہے۔ رؤف خیر کے ترائیلے پڑھ کر غزل کے مخالفین کے خیالات پر سنجیدگی سے غور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ رؤف خیر نے غزل کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دی اور نہ میں غزل کا مخالف ہوں۔ بلکہ میں تو اس کے رنگا رنگ جلووں کا مشتاق رہتا ہوں۔ لیکن "ایلاف" کے مطالعہ کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ "بیان" کو جہاں بھی "وسعت" ملے وہاں جانا چاہئے۔ ادب کی علاقائی اور ملکی تقسیم محض سہولت اور لسانی اعتبار سے ہے ورنہ ادب تو ہر ملک کا ادب ہوتا ہے۔ اس سے لین دین ہوتا رہنا چاہئے۔ رؤف خیر نے اپنی شعری صلاحیت کو جو موڑ دیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ نمونے کے طور پر ایک "ترائیلے" پیش کرتا ہوں:

اسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ　　　میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا
نہ جانے کس لئے سچائی سے گریزاں تھا　　　اسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ
اسے معاف کیا میں نے خوں بہا اپنا　　　ہزار کینہ سہی وہ شخص اپنا یار بھی تھا
اسی سے آس تھی جو ہے گواہِ برگشتہ　　　میں بے گناہ تو انصاف کا شکار بھی تھا

ڈاکٹر عالم خوندمیری نے بجا طور پر رؤف خیر کو صالح جدیدیت کا علمبردار کہا ہے۔ میں رؤف خیر کو اس کامیاب تخلیقی فکر پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ "پیروئ مغربی" ایک دن رنگ لائے گی اور "پیروئ خیر" ثابت ہوگی۔

اردو قصیدہ نگاری ۔ ڈاکٹر ام ہانی اشرف نے قصیدہ نگاری کے فن اور اہم اردو قصیدہ نگاروں پر نامور اہل قلم کے مضامین یکجا کر کے ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے اور اردو ادب کے طالب علموں کی ایک اہم دشواری کو دور کر دیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضامین کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ دراصل مرتب نے ڈاکٹوریٹ کے لئے قصیدے ہی

پر کام کیا ہے۔ ظاہر ہے اپنے تحقیقی کام کے دوران قصیدوں کا تمام سرمایہ اور اس سلسلے کے جملہ تحقیقی و تنقیدی مضامین ان کی نظر سے گزرے ہوں گے اور بار بار گزرے ہوں گے اور اسی وقت انھیں یہ اہم کام انجام دینے کا خیال آیا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ بعض مضامین تو مختلف رسالوں اور کتابوں سے منتخب کر کے من و عن شامل مجموعہ کر لئے گئے ہیں۔ بعض صورتوں میں کتابوں کے ابواب سے اخذ و انتخاب کر کے جامع مضامین تیار کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد جہاں خلا نظر آیا اس کے لئے اہل علم سے بطور خاص مضامین لکھوائے گئے ہیں اور اس طرح زیر تبصرہ مجموعے کو ہر لحاظ سے خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ابتدائیہ" میں ڈاکٹر صاحب نے قصیدے کے بنیادی مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ زیادہ اہم قصیدہ نگاروں پر ایک سے زیادہ مضامین شامل کتاب کئے گئے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اس مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اس کتاب کا مطالعہ قصیدے کا مطالعہ کرنے والوں کو دوسری بہت سی کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دے گا۔

—— ڈاکٹر اطہر پرویز

غالب ۔ میں نے شروع اپریل ۱۹۸۳ء میں سڈنی (آسٹریلیا) دیکھا اور وہاں دنیا کے بالکل دوسرے کنارے اردو کی پود کے لئے ایک بہت بڑے خشک ریگستان میں ایک کمال یہ بھی دیکھا کہ وہاں ایک ننھا منا پودا "غالب" کے بہت بڑے نام کے ساتھ وہاں کی ناموافق ہواؤں میں بھی سر اٹھائے کھڑا ہے۔ نہ صرف سربلند ہے بلکہ بضد بھی کہ زندہ رہوں گا، زندہ رہ کر دکھاؤں گا۔ اپنے سامنے پڑے اس چھوٹے سے جریدے "غالب" کی طرف دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں یہ پڑھ کر" دوسرا سال چھٹا شمارہ مارچ ۱۹۸۲ء" کوئی ضد سی ضد ہے۔ آفریں ہے اس کے مدیر متین عباس پر کہ جس کی کاوشوں سے وہاں اردو کا یہ ننھا سا چراغ روشن ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کب اپنے بڑے نام کی طرح ایک سورج جیسی روشنی سے وہاں کے ہزاروں گھروں کے ننھے منے چراغوں کو نئی روشنی عطا کر کے جگمگا ڈالے گا۔

غالب کے اداریے بڑے جاندار ہیں۔ سیاسی اور ادبی خبروں، نظموں، غزلوں، خطوں، افسانوں اور دوسرے متفرقات مثلاً خطوط غالب، دنیا میرے آگے، خواتین اور بچوں کے صفحات وغیرہ کے ساتھ اس کی قیمت صرف مٹی ہے۔ مٹی کا ایک ڈھیلہ۔ ہاتھ کا میل یعنی صرف پچاس سینٹ فی پرچہ یا آٹھ ڈالر سالانہ۔ اتنے میں اگر کوئی اپنے وطن کی زبان میں وطن کی خبروں، حالات اور معاشرے سے آگاہ رہتا ہے تو وہ متین عباس کو لوٹتا ہے مگر اس لٹنے میں کتنی خوشی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہ خزانہ لٹتا رہے۔

آسٹریلیا کے اردو داں طبقہ کے اس واحد ترجمان کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ عمر دراز پائے تاکہ ایسی آواز گونجتی رہے جو راستہ دکھاتی ہے۔

—— ھرچرن چاولہ

ادبی مجلّہ ۔ یہ شعبۂ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی کا ترجمان ہے ۔ اس کے قبل اس ادبی مجلہ کے دو شمارے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں شایع ہو چکے ہیں ۔ اس میں شعبہ کے اساتذہ اور طلباء کے علاوہ دیگر اہل قلم حضرات کے مضامین ہیں ۔

صوبۂ راجستھان سے کسی ادبی جریدہ کا اجرا بڑا مبارک قدم ہے اس لئے کہ اس صوبہ میں جرائد و رسائل کا فقدان ہے ۔ امید ہے کہ یہ روایت باقی رہے گی ، لیکن اسے راجستھان کے شعراء و ادباء کے سلسلے میں تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کرنا چاہئے ۔ اس ادبی مجلّہ کے دو تین مضامین بہت چونکا دینے والے ہیں ۔

ایک مضمون "اردو ادب میں علامتی رنگ" ہے ۔ اس مضمون میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کی معرکۃ آرا تصنیف "نئی علامت نگاری" اور ڈاکٹر ابن فرید کے مجموعہ مضامین "میں ہم اور ادب" کی روح جلوہ گر ہے ۔

ایک مضمون اسی شعبہ کے ریسرچ اسکالر رفعت اختر خاں کا ۔ عنوان ہے "ہیئت کی تفہیم" یہ مضمون واقعی خصوصی دلچسپی کا ہے اور بہت ہی عبرت ناک سرقے کی واضح دلیل ہے ۔ یہ مضمون ادبی مجلّہ کے صفحہ ۱۰۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۱۱ پر ختم ہوتا ہے ۔ خاصا طویل ہے ۔ مگر اس میں کوئی بھی نتیجہ خیز جملہ مضمون نگار کا نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر عنوان چشتی کی مستند کتاب "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" پر جو مستند ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ کا پیش لفظ ہے اس سے دیدہ دلیری سے چوری کی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو "ادبی مجلہ" میں ص ۱۰۸ کی عبارت:

"تخلیقی عمل ایک غیر منقسم عمل ہے جس میں خیال و احساس سے اظہار تک یا مواد سے ہیئت تک کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی ... لیکن ادب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں" (ادبی مجلّہ ص ۸)

یہی عبارت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے پیش لفظ میں بھی ملتی ہے ۔ ملاحظہ ہو ص ۱۰ :-

"تخلیقی عمل ایک غیر منقسم عمل ہے جس میں خیال و احساس سے اظہار تک یا مواد سے ہیئت تک کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی ... لیکن ادب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ایک دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں" (اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص ۱۰)

یہاں بارہ سطریں مضمون نگار نے چوری کر لی ہیں ـــــ اسی طرح سے اسی صفحہ ۱۰۴ پر پیرا انھوں نے "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" کے ص ۱۰ سے تین سطریں اور ص ۱۱ سے چند سطروں کا سرقہ کر لیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :- "اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" ہو ملٹن کی "فردوس گمشدہ" اگر ان کے مطالب کو نثر میں لکھا جائے تو حالانکہ موضوع وہی رہے گا لیکن وہ بات نہیں رہے گی کیوں کہ جو چیز بیچ سے غائب ہو گئی وہی ہیئت ہے" (ادبی مجلہ ص ۱۰۸)

اب یہی عبارت اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے میں ملاحظہ فرمایئے :-

"اقبال کی "مسجد قرطبہ" ہو یا ملٹن کی "فردوس گمشدہ" اگر ان کے مطالب کو نثر میں لکھا جائے تو اگرچہ مضمون وہی رہے گا لیکن وہ بات نہیں بنتی کیوں ؟ جو چیز بیچ سے غائب ہو گئی ، یعنی ہیئت ، کیا شاعری وہی ہے" (اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص ۱۰)

مندرجہ بالا عبارتوں سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنے خوبصورت فریب سے کام لیا گیا

ہے۔ اسی طرح سے درج ذیل عبارت بھی پڑھ لیجئے۔

"کیا وجہ ہے کہ غزل ہی ہیئت میں ایک موضوع پر شاعر کے دو شعروں میں سے ایک شعر دوسرے سے بدرجہا بہتر ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ ہیئت کے وہ اجزا بھی ہو سکتے ہیں جو رسمی فنی ہیئت سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً رمز و ایما، استعارہ کنایہ، یا بیان کا ایسا پیرایہ یا لفظوں کے استعمال کی ایسی شکلیں جو غیر معمولی تخلیقی حس کی دین کا نتیجہ ہو۔ ان سب کو اسلوبیاتی ہیئت اور ہیئت کے کل تصور کو ترکیبی یا نامیاتی ہیئت کہا جا سکتا ہے۔ جسے ڈاکٹر عنوان چشتی نے عضوی ہیئت کا نام دیا ہے۔"

(اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص ۱۱ ڈاکٹر عنو

ادبی مجلہ کے مضمون نگار رفعت اختر خاں اس عبارت کو اس انداز سے سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ڈال

"کیا وجہ ہے کہ غزل ہی کی ہیئت میں ایک ہی موضوع پر دو شعروں میں سے ایک شعر دوسرے شعر سے بدرجہا بہتر ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ ہیئت کے وہ اجزا بھی ہو سکتے ہیں جو رسمی فنی ہیئت سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً رمز و ایما، استعارہ کنایہ، یا بیان کا ایسا پیرایہ یا لفظوں کے استعمال کی ایسی شکلیں جو غیر معمولی تخلیقی حس کا نتیجہ ہوں۔ سب کو اسلوبیاتی ہیئت اور ہیئت کے کل تصور کو ترکیبی یا نامیاتی ہیئت کہا جا سکتا ہے۔ جسے ڈاکٹر عنوان چشتی نے اردو میں مخصوص ہیئت کا نام دیا ہے۔"

(ادبی مجلہ ص ۱

یہ مثالیں صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پورا مضمون اسی طرح کی عبارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کتاب "اردو نظم اور یورپی اثرات" اور ڈاکٹر سید اطہر جاوید کی تصنیف سے دل کھول کر عبارتیں بغیر کسی حوالے کے اڑائی گئی ہیں۔

دوسرا مضمون بعنوان "نیا افسانہ، سمت و رفتار" ہے۔ یہ مضمون بھی کمار پاشی کی تالیف کے مقدمہ "نیا اردو افسانہ، احتساب و انتخاب" سے بری طرح متاثر ہے اور محل نظر ہے۔ تجزیہ کا موقع نہ تھا۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ —— (ڈاکٹر) محمد اشفاق

ہے۔ اسی طرح سے درج ذیل عبارت بھی پڑھ لیجئے۔

"کیا وجہ ہے کہ غزل ہی ہیئت میں ایک موضوع پر شاعر کے دو شعروں میں سے ایک شعر دوسرے سے بدرجہا بہتر ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ ہیئت کے وہ اجزا بھی ہو سکتے ہیں جو رسمی فنی ہیئت سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً رمز و ایما، استعارہ کنایہ، یا بیان کا ایسا پیرایہ یا لفظوں کے استعمال کی ایسی شکلیں جو غیر معمولی تخلیقی حس کی دین کا نتیجہ ہو۔ ان سب کو اسلوبیاتی ہیئت اور ہیئت کے کل تصور کو ترکیبی ہیئت یا نامیاتی ہیئت کہا جا سکتا ہے۔ جسے ڈاکٹر عنوان چشتی نے عضوی ہیئت کا نام دیا ہے۔"

(اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص ۱۱ ڈاکٹر عنوان چشتی)

ادبی مجلہ کے مضمون نگار رفعت اختر خاں اس عبارت کو اس انداز سے سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ڈالتے

"کیا وجہ ہے کہ غزل ہی کی ہیئت میں ایک ہی موضوع پر دو شعروں میں سے ایک شعر دوسرے شعر سے بدرجہا بہتر ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ ہیئت کے وہ اجزا بھی ہو سکتے ہیں جو رسمی فنی ہیئت سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ مثلاً رمز و ایما، استعارہ کنایہ۔ یا بیان کا ایسا پیرایہ یا لفظوں کے استعمال کی ایسی شکلیں جو غیر معمولی تخلیقی حس کا نتیجہ ہوں سب کو اسلوبیاتی ہیئت اور ہیئت کے کلی تصور کو ترکیبی ہیئت یا نامیاتی ہیئت کہا جا سکتا ہے۔ جسے ڈاکٹر عنوان چشتی نے اردو میں مخصوص ہیئت کا نام دیا ہے۔"

(ادبی مجلہ ص ۱۰۸)

یہ مثالیں صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پورا مضمون اسی طرح کی چوریوں سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کتاب "اردو نظم اور یورپی اثرات" اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی تصنیف سے دل کھول کر عبارتیں بغیر کسی حوالے کے اڑائی گئی ہیں۔

دوسرا مضمون بعنوان "نیا افسانہ، سمت و رفتار" ہے۔ یہ مضمون بھی کمار پاشی کی تالیف اور مقدمہ "نیا اردو افسانہ، احتساب و انتخاب" سے بری طرح متاثر ہے اور محل نظر ہے۔ تجزیہ کا موقع نہیں کتابت و طباعت اچھی ہے۔ —— (ڈاکٹر) محمد اشفاق اللہ



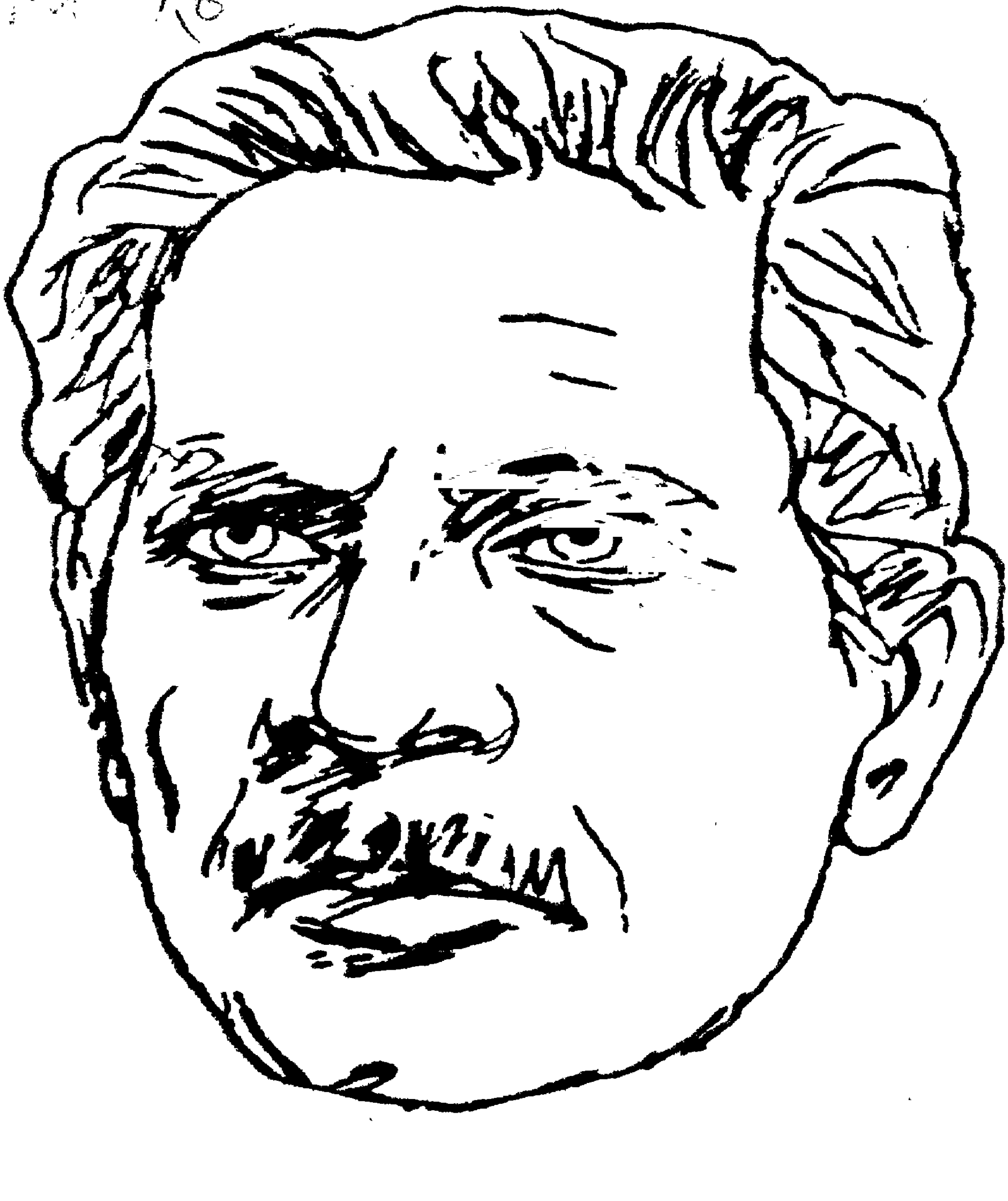
[illegible] No. L-ALG/[illegible] July, Aug. Sept., Oct. 1982

ALFAZ Aligarh

[illegible] with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/76

دوماہی

الفاظ



دوماہی

الفاظ

علی گڑھ

| جلد ۷ | نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء | شمارہ ۶ |

زرِ سالانہ ----- ۱۶ روپے	مجلسِ ادارت
قیمت ----- ۳ روپے	نورالحسن نقوی اطہر پرویز
	اسد یار خاں
پرنٹر پبلشر ----- اسد یار خاں	
مطبوعہ ----- جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی	
کتابت ----- ز۔ رشید، الٰہ آباد	
مقام اشاعت	مینجنگ ایڈیٹر
ایجوکیشنل بک ہاؤس	احمد سعید خاں
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱	

سرورق پر : فراق

پتہ : دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۳۷۶۸

خاص خاص مطبوعات

اقبالیات

- کلیات اقبال (اردو) صدی ایڈیشن -/۳۰
- اقبال معاصرین کی نظر میں — وقار عظیم -/۵۰
- اقبال بحیثیت شاعر — رفیع الدین ہاشمی -/۴۵
- اقبال کی اُردو نثر — عبادت بریلوی -/۲۰
- اقبال شاعر اور فلسفی — وقار عظیم -/۲۰
- فکر اقبال — خلیفہ عبدالحکیم -/۴۰
- اقبال فن اور فلسفہ — ڈاکٹر نورالحسن نقوی ۵۰/۰
- تصورات اقبال — مولانا صلاح الدین احمد -/۱۵
- بانگ درا (عکسی) — علامہ اقبال -/۱۰
- بال جبریل " " -/۸
- ضرب کلیم " " -/۸
- ارمغان حجاز " (اُردو) " ۴/۵۰

غالبیات

- غالب: تقلید اور اجتہاد — پروفیسر خورشید الاسلام -/۳۰
- دیوان غالب (عکسی) — نورالحسن نقوی -/۱۳
- اطراف غالب — ڈاکٹر سید عبداللہ -/۲۰

فیض

- کلام فیض (عکسی) — فیض احمد فیض -/۳۰
- نقش فریادی " " -/۶
- دست صبا " " -/۶
- زنداں نامہ " " ۵۰/۰
- دست تہ سنگ " " -/۶

لسانیات وجمالیات

- جمالیات شرق و غرب — پروفیسر ثریا حسین -/۱۵
- اُردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۲
- اردو زبان اور ادب — ڈاکٹر مسعود حسین خاں -/۱۰
- ادب میں جمالیاتی اقدار — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی -/۱۰

مثنوی

- اُردو مثنوی کا ارتقا — عبدالقادر سروری ۵۰/۲
- انتخاب مثنویات اُردو — مغیث الدین فریدی -/۶
- مثنوی گلزار نسیم — ظہیر احمد صدیقی -/۶
- مثنوی سحرالبیان -/۵

افسانے و ناول

- چار ناولٹ — قرۃ العین حیدر -/۳۰
- کشتی کی رفتار -/۴
- پریم چند کے نمائندہ افسانے — ڈاکٹر قمر رئیس -/۱۲
- نمائندہ مختصر افسانے — محمد طاہر فاروقی -/۶
- چوٹیں — عصمت چغتائی -/۳۰

- ہمارے پسندیدہ افسانے — ڈاکٹر اطہر پرویز -/۱۵
- بیدی اور بیدی کے افسانے " -/۱۵
- کرشن چندر اور کرشن چندر کے افسانے " -/۱۵
- اردو کے تیرہ افسانے " -/۱۲
- منٹو کے نمائندہ افسانے " -/۱۲

ڈرامے

- اُردو ڈراما کا ارتقا — عشرت رحمانی -/۴۰
- اردو ڈراما تاریخ و تنقید " -/۴۰
- یونانی ڈراما — عتیق احمد صدیقی -/۲۰
- آغا حشر اور اردو ڈراما — انجمن آرا -/۳۰
- انارکلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن -/۹

ادب وتنقید

- مضامین نو — خلیل الرحمن اعظمی -/۲۵
- تنقیدیں — پروفیسر خورشید الاسلام -/۳۰
- شناسا چہرے — ڈاکٹر محمد حسن -/۱۵
- ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ — رشید حسن خاں -/۲۵
- تنقیدی تناظر — ڈاکٹر قمر رئیس -/۲۰
- پریم چند شخصیت اور کارنامے " -/۳۰
- احساس و ادراک — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی -/۲۲
- انیس شناسی — ڈاکٹر فضل امام -/۱۶
- چہرہ بہ چہرہ — ڈاکٹر ابن فرید -/۲۵
- میں ہم اور ادب " -/۲۰
- غزل کا نیا منظر نامہ — شمیم حنفی -/۱۰
- غزل و درس غزل — اختر انصاری -/۸
- اُردو میں قصیدہ نگاری — ڈاکٹر ام ہانی اشرف -/۳۵
- رومانیت و کلاسیکیت -/۱۲
- نثر نظم اور شعر — منظر عباس نقوی ۵۰/۷
- لفظ و معنی — شمس الرحمن فاروقی -/۳۰
- ناول کا فن — ابوالکلام قاسمی -/۱۵
- سرسید اور علی گڑھ تحریک — پروفیسر خلیق احمد نظامی -/۲۵
- سرسید ایک تعارف " -/۲
- سرسید اور ہندوستانی مسلمان — ڈاکٹر نورالحسن نقوی -/۲۰
- انتخاب مضامین سرسید — آل احمد سرور -/۶
- مطالعہ سرسید احمد خاں — عبدالحق -/۱۵
- اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی -/۹
- موازنہ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام -/۱۲
- مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی -/۱۲
- امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی -/۱۲
- مجموعہ نظم حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۵۰/۴
- مولوی نذیر احمد کی کہانی — مرزا فرحت اللہ بیگ ۷۵/۳
- آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی -/۱۴

- غزل اور مطالعہ غزل — ڈاکٹر عبادت بریلوی
- داستان سے افسانے تک — وقار عظیم
- نیا افسانہ "
- شہرت کی خاطر — نظیر صدیقی
- تنقید اور احتساب — ڈاکٹر وزیر آغا
- ستارہ یا بادبان — محمد حسن عسکری
- انسان اور آدمی "
- اسلوب — سید عابد علی

سیاسیات و تاریخ

- دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی
- تاریخ افکار سیاسی (ہسٹری آف پولیٹیکل تھاٹ) "
- جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) "
- مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) "
- مبادیات علم مدنیت (ایلیمنٹس آف سوکس) "
- تاریخ و تہذیب عالم (ورلڈ ہسٹری) ۷/۵۰
- اسلامی تاریخ "

متفرق

- ایڈوانسڈ اکاؤنٹس — ڈاکٹر محمد
- جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء
- اصول تعلیم "
- عام معلومات "
- ایجادات کی کہانی "
- تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — مسرت زمانی
- رہبر صحت "
- علم خانہ داری "
- بچوں کی تربیت "
- گلدستہ مضامین و انشاء پردازی — ڈاکٹر محمد عارف
- اُردو صرف — ڈاکٹر انصار
- اُردو نحو "
- فیروز اللغات جیبی، عکسی
- فیروز اللغات اردو جامع (رنگین)
- اردو ہندی لغت (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے)
- انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم سلیم

ایجوکیشنل بک ہاؤس

دو ماہی

الفاظ

علی گڑھ

شمارہ ۶	نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء	جلد ۷

مجلسِ ادارت

نور الحسن نقوی   اطہر پرویز

اسد یار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

زر سالانہ ——— ۱۶ روپے

قیمت ——— ۳ روپے

پرنٹر پبلشر ——— اسد یار خاں

مطبوعہ ——— جواہر آفسیٹ پریس نئی دہلی

کتابت ——— ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق پر : فراق

پتہ : دو ماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ فون نمبر ۳۷۶۸

آئینہ

گوشۂ فراق

ساحر لدھیانوی۔ جیلا بانو

دو مضامین اور

افسانے ہی افسانے

نظمیں اور غزلیں

اور

اداریہ

آزادی کے بعد جب ہر طرف رونق نظر آنے لگی تھی تو صرف اردو زبان ہی تھی جس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں پہلے سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں میں اس کی تدریس کا معقول انتظام تھا، آزادی کے بعد بعض ریاستوں میں اسے نصاب سے خارج کر کے اسکولوں سے باہر کر دیا گیا۔ اتر پردیش میں تو یہ عالم ہے کہ صرف یونیورسٹیوں میں آکر ہی طالب علموں کو اردو پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں کے دروازے اردو کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

اس کا اثر مختلف شعبوں پر پڑا۔ پہلے اردو کی کتاب ایک ہزار کی تعداد میں چھپتی تھی، اب نوبت صرف پانچ سو اور ڈھائی سو پر پہنچ گئی ہے۔ اگر اردو اکیڈمیاں انعامات نہ دیتیں تو شاید اردو کتابوں کی اشاعت اور بھی محدود ہو جاتی۔ حالانکہ مصنفین کو انعام تو مل جاتا ہے لیکن کتابوں کی فروخت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے کتاب پر انعام تو مل جاتا ہے لیکن کتاب کوئی نہیں خریدتا۔

کتابوں کی فروخت کی کمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی قوت خرید بہت کم ہے اور کتابوں کی قیمت بھی بہت بڑھ گئی ہے کیوں کہ کاغذ، طباعت اور کتابت کے نرخ کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔

اس صورت حال سے نپٹنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہمیں اردو لائبریریوں کی تعداد کو بڑھانا چاہئے۔ ہر محلہ میں لائبریری قائم کرنی چاہئے۔ اگر ہندوستان میں پانچ سو لائبریریاں قائم ہو جائیں جو اپنے پڑھنے والوں کے لئے ادبی کتابیں فراہم سکیں، تو کتابوں کی اشاعت بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اس کا اثر اخباروں اور رسالوں کی اشاعت پر بھی خاطر خواہ پڑے گا۔

اردو کتابوں کی اشاعت بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اگر اردو اکیڈمیاں لائبریریوں کو نقد امداد دینے کے بجائے ادبی کتابیں خرید کر دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ بات سننے میں آئی ہے کہ لائبریریاں اکیڈمیوں کی امدادی رقم کو ادبی کتابیں خریدنے کے بجائے جاسوسی اور سستے رومانی ناولوں پر استعمال کرتی ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اس طرح اردو لائبریریوں کا قیام ایک تحریک کی شکل اختیار کرے گا۔ اردو سے محبت کرنے والوں کو اپنی زبان کی بقا کے لئے خود ہی کچھ کام کرنا ہے۔ حکومت پر آس لگائے رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اور اگر ہم یہ بھی نہ کر سکے تو ایک دن اردو کتابوں کی طباعت اور زیادہ محدود ہو کر رہ جائے گی۔

—— مجلسِ ادارت

چھپتے چھپتے

ابھی یہ اطلاع موصول ہوئی کہ اردو کے ممتاز شاعر اور نقاد **پروفیسر وحید اختر** کو اس سال کا **مخدوم ایوارڈ** ملا ہے۔ اس سے پہلے یہ انعام سردار جعفری اور عصمت چغتائی کو مل چکا ہے۔ وحید اختر صاحب کو یہ انعام ان کے تنقیدی کاموں پر ملا ہے۔ یہ انعام اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ڈاکٹر وحید اختر آزادی کے بعد کے لکھنے والوں میں سے ہیں اور ابھی ایسے انعامات عموماً بزرگوں کو ہی دیئے گئے ہیں ـــ یہ غالباً پہلا بڑا انعام ہے جو اس روایت سے ہٹ کر ملا ہے۔

ادارۂ "الفاظ" ڈاکٹر وحید اختر کو اس موقع پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ـــ مجلسِ ادارت

رباعیاتِ فراقؔ

ہر جلوے سے اک درسِ نمو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

○

جب تاروں نے جگمگاتے نیزے تولے
کچھ سوچ کے خلوت میں بصد ناز اس نے
جب شبنم نے ملک سے موتی رولے
نرم انگلیوں سے بندِ قبا کے کھولے

○

تنہائی میں ہم کسے بلائیں اے دوست
اس دولتِ وقت سے تو دم گھٹتا ہے
تم دور ہو کس کے پاس جائیں اے دوست
یہ نقدِ شب کہاں بھنائیں اے دوست

○

اے معنیٔ کائنات مجھ میں آجا
سوتا سنسار جھلملائے تارے
اے رازِ صفات و ذات مجھ میں آجا
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

○

صحرائیں زماں، مکاں کے کھو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراقؔ
صدیاں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

○

محمد حسن عسکری

اردو شاعری میں فراق کی آواز

فراق صاحب اردو شاعری میں ایک نئی آواز، نیا لب ولہجہ، نیا طرزِ احساس، ایک نئی قوت بلکہ ایک نئی زبان لے کر آئے۔ کیوں کہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ فراق نے بہت سے نئے لفظ ہماری شعری زبان میں داخل کئے ہیں اور معمولی سے معمولی لفظوں کو ایک نئی معنویت اور نئی فضا دی ہے۔ خیر یہ تو ۳۵ء میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اردو میں ایک بڑا شاعر پیدا ہو رہا ہے۔ مگر شروع شروع میں گمان ہوتا تھا کہ فراق کی شاعری ایسی چیز نہیں جو زیادہ مقبولیت حاصل کر سکے۔ مگر بڑی شاعری اپنا مذاق خود پیدا کر لیتی ہے۔ چنانچہ دس سال کے عرصے میں فراق کی شاعری اور تنقید نے اردو پڑھنے والے کے ذوق بلکہ طرزِ احساس کو بدل کے رکھ دیا ہے اور ایسے چپکے چپکے کہ خود اپنی طبیعت کو پتہ نہیں چلنے پایا۔ اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔ فراق کے محاورے سنائی دیتے ہیں، فراق کی آواز لرزتی ہے ـــــــ بالکل اسی طرح جیسے غزل گو شعراء کے یہاں میر اور غالب کا احساس اور محاورہ جابجا لپک اٹھتا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں جو اردو غزل کا احیاء ہوا ہے وہ ۷۵ فی صدی فراق کا مرہون منت ہے۔ فراق کی شاعری نے اردو میں ایک ادارے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ شاعر تو شاعر، عام پڑھنے والے کے شعور میں فراق کی شاعری رچتی چلی جا رہی ہے۔

فراق کی شاعری کا یہ اٹھان ۳۵ء سے شروع ہوا ہے اور خود فراق صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ۳۵ء سے لے کر اب تک کی شاعری کے تو دو تین انتخاب شایع ہو چکے ہیں۔ مگر اس اعتراف اور اس قسم کے انتخابات سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ۳۵ء سے پہلے فراق کی شاعری محض نومشقی کی شاعری یا تجرباتی چیز ہے۔ حال ہی میں فراق نے اپنے ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک کے کلام کا انتخاب "رمز وکنایہ" کے نام سے شایع کیا ہے، جس میں کچھ غزلیں ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک بھی ہیں۔ اس انتخاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فراق صاحب کے یہاں اس دور میں وہ رفعت وہ گھلاوٹ اور رسیلا پن، وہ پہلو دار شعر تو نہیں ہیں مگر پھر بھی اس شاعری کو ہم مشق کی شاعری کسی

طرح نہیں کہہ سکتے۔ اس انتخاب میں بیسیوں شعر ایسے ملیں گے جو بہت سے استادوں کے دیوانوں پر بھاری ہیں۔ اس دور کی شاعری میں بھی فراق صاحب کے مخصوص طرزِ احساس کے بنیادی عناصر ان کے مزاج کے مخصوص مسائل، ان کے لب و لہجے کے بنیادی خد و خال سب موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ بڑی شاعری دفعتاً ظہور میں نہیں آجاتی۔ بڑی شاعری مدتوں شاعر کی شخصیت میں پکتی رہتی ہے۔ تب کہیں جا کر سامنے آتی ہے۔ بڑے شاعر کی عظمت کا راز اس کی ابتدائی شاعری میں بھی نظر آجاتا ہے۔ چنانچہ فراق کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس ابتدائی شاعری کے انتخاب کو بھی پڑھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا بعد کی شاعری کو اور اس کتاب کی اہمیت محض تاریخی نہیں ہے بلکہ بذات خود یہ کتاب ایک شعری کیفیت کی حامل ہے۔

فراق صاحب کے یہاں بنیادی مسئلہ فراق کا ہے۔ فراق کو وصال تبدیل کرنے کا، یہاں فراق کے وہ معنی نہیں ہیں جو اکثر اردو شاعری میں ہوتے ہیں، یعنی محبوب سے علیحدگی۔ اس وجہ سے نہیں کہ محبوب کے رشتہ دار حائل ہیں یا محبوب جفا کار اور تغافل پسند ہے۔ یہاں فراق کی اصلی وجہ دو مخصوص دو فردوں کی بنیادی علیحدگی ہے۔ فراق صاحب کو اس بنیادی اور عنصری فعل کا جیسا دردناک اور پُر جلال احساس ہے وہ اردو شاعری میں بڑا کمیاب ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کا احساس اردو میں بالکل غائب ہے۔ یوں ہونے کو تو دردؔ کا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آگیا ؎

آخر الامر آہ کیا ہوگا
کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

یہ شعر بھی کچھ کم تڑپا دینے والا نہیں۔ نہ معلوم شاعر نے کتنا خون جگر جلایا ہوگا جب ایسا شعر ہوا ہوگا۔ مگر فراق کے یہاں یہ کیفیت اتفاقی نہیں۔ ان کے یہاں شروع ہی سے یہ احساس بڑی شدید اور انتہائی شکل میں موجود ہے اور شروع سے ان کے غور و فکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔ چنانچہ فراق صاحب کا محبوب بھی عام اردو شاعری کا تغافل پسند اور بے نیاز قسم کا محبوب نہیں ہے۔ بلکہ ان کا محبوب تو خود عاشق کی ناز برداریوں کو تیار رہتا ہے۔ چنانچہ فراق نے اپنے عاشق اور اپنے محبوب کے تعلقات بڑے دل میں چٹکی لینے والے انداز میں بیان کر دیئے ہیں:

حسن سرتاپا تمنا، عشق سرتاپا غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

ان کے عاشق کے مطالبات محبوب سے یہاں تک ہوتے رہتے ہیں کہ ؎

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے
آج منالے، آج منالے

ظلم وجور، تغافل اور بے نیازی سے فراق کا محبوب اتنا دور ہے کہ آج تک کسی اردو شاعر کا محبوب نہ ہوا ہوگا۔
مومن نے کہا ہے ؎

شکوہ کرتے ہو بے نیازی کا
تم نے مومن بتوں کو کیا جانا

اس کے مقابلے میں فراق کا شعر دیکھئے۔ جو گداز، جو عصری حسیت، جو نرمی، جو ٹھنڈک، جو اضطراب اور جو سکون فراق کے یہاں ہے۔ اس کی پرچھائیں تک مومن کے شعر پر نہیں پڑی ؎

مائل بیدار وہ کب تھا فراق
تو نے اس کو غور سے دیکھا نہیں

فراق نے محبوب کی نفسیات سے متعلق کوئی آخری فیصلہ پہلے سے کر کے نہیں رکھ لیا۔ انھیں لمحہ بہ لمحہ محبوب کی شخصیت کے نئے سے نئے پہلو نظر آتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کے استعجاب میں اضافہ کرتا ہیں۔ فراق صرف محبوب کو حاصل کرنے کی لگن نہیں رکھتے۔ ان کے دل میں محبوب کے لئے بے پایاں ہمدردی، احترام اور خالص انسانی لگاؤ ہے۔ محبوب سے محبت کرنے کا یہ اسلوب اردو میں بالکل نیا ہے۔ کم از کم اتنی شدید اور رچی ہوئی شکل میں پہلے کبھی نمودار نہیں ہوا تھا۔
اچھا تو پہلے فراق کے محبوب کی دو چار تصویریں دیکھ لیجئے پھر فراق کے عشق اور ان کے ہجر و وصال کو بھی سمجھ سکیں گے۔

اس کے آنسو کس نے دیکھے اس کی آہیں کس نے سنیں
چمن چمن تھا حسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا

مٹ کر بھی ہم سمجھ نہ سکے جس کی منتیں
نگاہ ناز تری تھی تمام قول و قسم

سنتے ہیں اس نظر کی شکایت ہے دور دور
کسی کو ہو بھی نہ سکتا تھا کچھ گمان فراق

تجاہل سے تغافل ہے کشاکش بے تکلف ہے
سے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں

اذائے توبہ توسے وہ ہمارے ہوتے رہتے ہیں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

اک اداسی بھی لئے ہے کیوں نگاہ ناز یار
یہ پیام زندگی شاید کوئی سنتا نہیں

فراق کو محبوب کی بدلتی ہوئی کیفیتیں دیکھ کر جو معصومانہ اور بھولی بھالی حیرت ہوتی ہے۔ اس میں ایک عجب کسک، عجب سرشاری، عجب درد اور عجب سکون ہے۔ فراق کی شاعری کا بنیادی مسئلہ یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ ایسا محبوب پا کر بھی اس سے وصال اور مکمل یگانگت کا احساس حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ عاشق اور محبوب کے درمیان ہزار خلوص اور تپاک سہی لیکن دو انسانی شخصیتیں ایسی متوازی لائنیں ہوتی ہیں جو کوشش کے باوجود دوسرے سے نہیں مل سکتیں۔ یہی عشقیہ زندگی کا سب سے المناک پہلو ہے۔ بعض لوگ اس الم میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں اور بعض لوگ اس بے چارگی سے نئی زندگی اور قوت حاصل کرتے ہیں۔

فراق نے اپنی شعری شخصیت کے زور سے ان پتھروں میں سے پانی نکالا ہے اور غم و خوشی کی سرحدوں کو ایک کر دیا ہے۔

آپ فراق کا محبوب دیکھ چکے اب ذرا ان کا ہجر و وصال اور عشق بھی دیکھئے۔

محبت کی مصیبت میری جاں المختصر یہ ہے ۔۔۔ وہی ہم دونوں چاہیں پر بعنوانِ دگر چاہیں

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو ۔۔۔ وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

وصال کو بھی بنا دے جو عین دردِ فراق ۔۔۔ اسی سے چھوٹنے کا غم سہا نہیں جاتا

چھوڑ نہ مجھ کو، چھوڑ نہ مجھ کو ۔۔۔ یوں تو ہیں یکساں وصل اور فرقت

عشق ابھی سے تنہا تنہا ۔۔۔ ہجر کی بھی آئی نہیں نوبت

چھڑا رکھا ہے تجھ سے وسوسوں نے وصل و فرقت کے ۔۔۔ انہی وہموں سے اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

ہجر اور وصال کی نفسیات پر جتنے پہلوؤں سے فراق نے نظر ڈالی ہے اور اس نفسیات کو جس طرح شعریت میں تبدیل کیا ہے۔ وہ اردو کی بڑی سے بڑی شاعری ہی نہیں، مغرب کے ادب سے پہلو مارتی ہے۔ فراق نے اردو شاعری کا دائرہ شعور حیرت ناک طور پر وسیع کر دیا ہے۔ اور نفسیاتِ عشق کو پوری زندگی اور پوری انسانی شخصیت کی نفسیات بنا دیا ہے۔ فراق کے یہاں عشق کا مسئلہ محض چاہنے اور چاہے جانے کی بات نہیں رہتا بلکہ ہمہ گیر ہو کر پوری زندگی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس عشق سے انسان کی پوری شخصیت بلکہ اس کے ماحول تک کو ایک نئی تازگی نئی زندگی اور نئی قوت ملتی ہے۔ فراق کا عشق وقتی لگن اور طلب سے بلند ہو کر، پوری کائنات سے متعلق ایک رویّہ، ایک اندازِ نظر بلکہ ایک مکمل فلسفہ حیات بن جاتا ہے جس میں زندگی کے سارے تضاد، سارا جبر و اختیار، سارے جدلیاتی عناصر آ کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ

۶

ہو جاتے ہیں ؂

دل دکھے ہوئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

پھر فراق کے عشق میں ایک نیا عنصر یہ ہے کہ ان کی محبت محض کسی محبوب کی لگن نہیں ہے بلکہ اپنی شخصیت کے امکانات کو وسیع کرنے کا ہمہ گیر تقاضا ہے۔ اپنی ہستی کو کائنات میں سمونے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کر لینے کی طلب ہے۔ خود زندگی کو بڑھ کے گلے لگا لینے کا اشتیاق ہے۔ یہ وہ خواہش نہیں جو پوری نہ ہو تو آدمی کی شخصیت اور سکڑ سمٹ کے گھٹ کے رہ جائے۔ اس طلب کا نتیجہ، فراق یا وصال، غم یا خوشی نہیں، بلکہ ان سب سے ماورا اک سکون آمیز اور بھرپور کیفیت ہے جو زندہ آدمی کی زندگی کا ماحصل ہونا چاہئے ؂

ترک محبت کرنے والو کون ایسا جگ جیت لیا
عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا تھا

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی امید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

دل سے تری قسم اب تجھے ہم پائیں یا نہ پائیں
لالچ ہے دور دور، قناعت ہے دور دور

دنیا میں آج کوئی کسی کا نہیں رہا
اے لطفِ یار تیری ضرورت ہے دور دور

فرصت ضروری کاموں سے پاؤ تو رو لو بھی
اے اہل دل یہ کار عبث بھی کیے چلو

مختصر یہ کہ فراق کا عشق نشاط و غم، ہجر و وصال، نیاز و ناز کی اصطلاحات سے بلند ہو کر مکمل اور محض اثبات کا نام ہے۔ فراق نے ہماری نئی نسل کے شعور میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کی ہے۔ ہمیں عشقیہ زندگی کی نئی اقدار دی ہیں اور ہمیں واقعی عشق کرنا سکھایا ہے۔ یہ فراق کا سب سے بڑا احسان ہے کہ انھوں نے جنسی کشش کو زندگی اور شعور کے پورے نظام میں وہ جگہ دے دی ہے جہاں یہ جذبہ دوسرے عناصر سے علیحدہ نہیں، بلکہ سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر عمل کر سکے۔ فراق کی شاعری تو اردو شاعری کی روایت میں ایک زبردست اضافہ ہے۔ مگر نئی نسل کی ذہنی اور جذباتی زندگی پر یہ شاعری بڑا گہرا اثر چھوڑ جائے گی، بلکہ یہ شاعری ہمارے شعور میں واقعی اسی طرح رچنا شروع ہو گئی ہے کہ ہمیں ان اثرات کا پوری طرح اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

آخر میں فراق کا ایک اور شعر سن لیجئے۔ فراق کے بارے میں یاد نہیں پڑتا کہ کسی شاعر نے فراق کی کیفیت کو اتنا وسیع باعظمت اور ہمہ گیر بنایا ہو۔

وہ بے قراری دل وہ فضائے تنہائی
وہ سرزمین محبت وہ آسمان فراق

ایک آخری شعر اور ؂

قسم ہے بادہ کش چشم مست ساقی کی
بتا کہ ہاتھ سے کیا جامِ مے سنبھلتا ہے

ظ۔ انصاری

جوشؔ و فراقؔ ـــ اور گھر کا بندھن

ہمارے دو آخر الزماں شاعر دو ہفتے کے اندر یکے بعد دیگرے سدھار گئے اور قبیلہ پہلے سے بھی زیادہ مفلس ہو گیا تو میری اُس سوچ میں پھر تلاطمُ برپا ہوا جو برسوں سے ستا رہی تھی کہ آخر فنکار اور قبیلہ داری کا، یا یوں کہیے کہ خانہ داری کا باہمی تعلق کیا ہے، کیا ہوتا آیا ہے، کیا ہونا چاہیے ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے یا صاحب حیثیت سماجی وجود کے ساتھ فنکار کو گھر سے، گرہستی سے اہل خانہ سے کہاں تک نباہنا چاہیئے اور کہاں سے دامن بچا لینا چاہیئے۔

جو بات آخر میں کہنی ہے، وہ بالکل شروع میں ہی کہہ ڈالوں کہ جوشؔ و فراقؔ کی زندگی کے آخری پچیس تیس برس کا گہرا مطالعہ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے کہ گھر اور گھر والوں کی محبت کی شدت فنکار کی راہ میں اکثر کانٹے بوتی رہی ہے، فن کی تکمیل کے تقاضے اور "حُبِّ اہلِ بیت" یا اولاد و اعزا کے تقاضے ایک دوسرے پر حاوی آنے کی کوشش کریں تو فنکار کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ وسیع تر تہذیبی مفاد کی خاطر یا تو خود کو گھر سے بے نیاز کر لے یا "کج دار و مریز" کی پالیسی اپنائے جسے آسانی کے لئے، ہم سماجی BRINKMANHIP کہہ سکتے ہیں۔

صوفیا نے اسے معاملات دنیا کے تعلق سے "باہمہ و بے ہمہ" کی اصطلاح میں بیان کیا تھا اپنے عمل سے اس کے نمونے بھی پیش کر دیئے تھے۔ اس کی تفصیل طولانی ہے، غور کیجیے تو وہاں بھی ایک طرح کی BRINKMANSHIP نظر آئے گی۔ جس آدم زاد کے سامنے کچھ آدرش ہوں۔ اور ان آدرشوں اور قدروں کی خاطر راحتوں آسائشوں کے کھو دینے کا حوصلہ بھی ہو، اسے بالآخر یہیں پہنچنا پڑتا ہے۔ ورنہ آدرش مارے جاتے ہیں اور مقتل میں بلند بانگ فنکاروں کی لاوارث لاشیں پڑی ملتی ہیں۔ لاوارث لفظ میں نے اس معنی میں کہا کہ جس گھر کی اور جس گھرانے کی خاطر فنکار آدرشوں سمیت اپنی جان سولی پر ٹانگ دیتا ہے اس گھر یا گھرانے میں مقتول کے صحیح وارث اور جانشین نہیں نکلتے۔ وہاں تو "نزدیکانِ بے بصر" کا مجمع ہوتا ہے اور کہیں قدر دانوں، مداحوں یا فن شناسوں

میں "ذوراں باخبر" کا پتہ نشان ملتا ہے ــــــ یعنی انھیں میں جن سے فنکار نے اپنے اہلِ بیت کی شدتِ الفت میں آنکھیں چرائی تھیں۔

اس نتیجے کو گول مول لفظوں میں یہیں چھوڑ کر آئیے اب معاملے کی تفصیل میں چلتے ہیں۔

ادب کی دنیا میں ایسے ہم عصر بھی شاید ہی ملیں جن کی زندگی آخری نقطے پر پہنچنے تک یوں متوازی لائنوں پر ساتھ ساتھ چلی ہو۔ دونوں کا سال ولادت ایک (۱۸۹۶ء) اور سال وفات بھی ایک (۱۹۸۲ء) آمد و رفت میں بھی چند روز کا فاصلہ، دونوں شمالی ہند کے اوپری درمیانہ طبقے میں پیدا ہوئے۔ ہر طرف خوش حالی بے فکری اور بزرگوں کے طور طریق کی پاس داری۔ دونوں کو کالج کے شروع سال تک ایک سی تعلیم، ایک سا نصابِ تعلیم اور تعلیمی ماحول نصیب ہوا۔ تہذیبی ماحول بھی کم و بیش یکساں تھا۔ جوش کے یہاں جاگیرداری کے بندھن بہ نسبت گورکھپور کے وکیل صاحب (منشی گورکھ پرشاد عبرت والدِ فراق) کے کچھ زیادہ مضبوط رہے ہوں گے۔ فراق بی۔ اے کر چکے تھے، شادی ہو چکی تھی، شاعری کے لئے پر تول رہے تھے۔ بمشکل ۲۲ برس کے ہوں گے کہ خاندان کے خوش ذوق اور خوش معاش کفیل باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہی صورت جوش کو پیش آئی اور انھیں اپنا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" شایع کرتے ہی خاندان کی معاش کی فکر لگ گئی۔ (۱۹۲۱-۲۲)

جوش کے یہاں کم کم اور فراق کے ہاں اکثر اونچی آواز میں اپنی خانگی زندگی، ازدواجی تعلق اور گھر بار کے بندھن سے سخت بیزاری کا اعلان ملتا ہے تو یہ برائے بیت نہیں۔ دونوں نے ایسے اشعار میں، جنھیں آپ بیتی سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس کوفت کے اعتراف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ازدواجی زندگی کی ناہمواری پر بہت جلی کٹی باتیں لکھی ہیں۔ اسے اپنی زندگی کا ایک رِستا ہوا ناسور بتایا ہے۔

ابھی ۲۳، ۲۴ برس کے ہیں کہ قومی آزادی کی تحریک سے دل و دماغ روشن ہونے لگتے ہیں۔ فراق پورم پور کانگریسی ہو گئے، گرفتار ہوئے، سال بھر جیل میں رہے، وہیں انھوں نے سیاسی تحریکوں اور سرگرمیوں اور رہنماؤں کا مطالعہ کیا اور نیشنلزم کی آزاد خیالی سے ہوتے ہوتے اشتراکی تحریک کے ہمسائے میں آن بسے، ویسی اشتراکیت جیسی جواہر لال کی تھی۔
جوش کی بے قرار اور آزادی پسند طبیعت شروع سے سرکشی کی جانب رواں تھی لہذا

ہو ان کا کٹر حنفی پٹھان سے اثنا عشری شیعہ ہو جانا اور اسی باعث نکاح نامہ اور وراثت نامہ فسخ ہو جانا) انھیں بھی یہ ہوا لگی تھی۔ فراق کا سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو جانے کے باوجود اس میں شامل نہ ہونا اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر میں انڈر سکریٹری کی حیثیت قبول کر لینا۔ جوش کے یہاں ڈپٹی کلکٹری کی پیش کش کو ٹھکرا کر چلے آنا۔ اور پھر فکر معاش میں مبتلا رہنے کے باوجود اس وضع کی شاعری جو کسی حاکمانہ طاقت کے سلسلے میں کیریئر کے خلاف پڑتی ہو ــــــ یہاں تک دونوں کی اٹھان ایک سی ہے۔ جوش بھی قومی تحریک کی آنچ میں ہاتھ سینکنے کے بعد رفتہ رفتہ اشتراکی نظریے کی جانب جھکتے ہیں، جھکنے کی ایک وجہ تو وہی کہ سیر چشم اور بے چین بوٹ کسی ایک منظم اور محدود پروگرام اور نظریے پر گردن جھکائے دیر تک نہیں چل سکتی اور دوسری مگر خاموشی سی وجہ گاندھی جی کی مدھم لے اور ڈسپلن کی سختی۔ جوش نے بعض مصرعوں میں اور فراق نے اپنی کہانی میں صاف کہا ہے:

"... مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نہ علوم کی اہمیت سمجھتے ہیں، جس میں ادب فلسفہ اور سائنس اور تمام دیگر علوم شامل ہیں، نہ ان یونیورسٹیوں کی اہمیت سمجھتے ہیں نہ مغرب کے ان اداروں کی اہمیت سمجھتے ہیں جن کو اپنائے بغیر افریقہ اور ایشیا کا کوئی مستقبل ہو ہی نہیں سکتا۔ گاندھی جی کی عظمت صرف انگریزی حکومت سے لڑنے کے لئے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے تمام ہندوستانیوں میں ایک قوت ارادی کا اور باغیانہ جذبات کا جگا دینا تھا..."

"شاہکار" الہ آباد۔ فراق نمبر ص۲۷۶

ایسوں کو ذرا گرم، بے باک اور مصلحت پسندانہ ریاکاری سے پاک نظریہ اور عمل ہی تسکین دے سکتا ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء) سے دو ایک سال پہلے تک جوش اور فراق دونوں ہی کمیونزم اور انقلاب کے نظریوں اور روپوش تحریکوں سے قریب پہنچ چکے تھے۔

جوش کی باقاعدہ تعلیم درمیان سے ٹوٹ گئی اور ان کی صحت بھی ویسی نہیں رہی جیسی یونیورسٹیوں میں میسر آجاتی ہے۔ تاہم اس خلا کو انھوں نے حیدرآباد کے دارالترجمہ والے دس برسوں میں اہل علم کی صحبت اور شوق مطالعہ سے بھرنے میں آسائش پسندی کو حائل

نہیں ہونے دیا۔

جو لوگ جوش و فراق کی شراب نوشی اور عیش پسندی بلکہ "بداطواری" کی شہرتوں میں سے جھانک کر انھیں دیکھتے رہے ہیں انھوں نے کبھی شب بیداری کے ان دریچوں میں نہیں جھانکا ہوگا۔ جہاں مسائل حیات پر غور و فکر اور باقاعدہ کتابی مطالعے کے انہماک میں ان دونوں نے اپنی جوانی کے سالہا سال ٹپکا دیئے ہیں۔ علاوہ اور کئی غیر معمولی صفات کے، غیر معمولی ذہن، غیر معمولی فطانت، غیر معمولی تلاش اور فنی تجربے میں جوش و فراق ہم عصر ہی نہیں۔ ہم سر بھی ہیں۔ یہاں ان کے فنی کارناموں سے بحث ہمارا موضوع نہیں، البتہ علمی، ذہنی اور ادبی سرگرمیوں اور شبانہ روز کی مصروفیتوں میں ان کا ایک ہی سمت میں رواں رہنا اصل مبحث کو سمجھنے کے لئے لازم ہے۔

فراق کے فراق بننے سے کافی پہلے جوش فضا پر چھا چکے تھے۔ ان کی قادر الکلامی گھن گرج اور شادکامی کی تہہ میں کہیں غم و غصے کی احتجاجی لہر، کوئی کسک، ایک منکرانہ کچلاؤ جو نظموں میں سیلابی پاٹ بن جاتی ہے، رباعیوں میں تھما ہوا چینل بناتی ہے اور جوش کی رباعی میں پتہ چلتا ہے کہ مردانہ جنگی رجز اور حکیمانہ فکر میں جوش نے کیسے ٹانکا لگایا ہے رباعی کی صنف کو، جو فراق کی طبیعت سے میل کھاتی ہے، فراق نے ذرا دیر سے اختیار کیا اور اسے جوش کی رباعی سے الگ کیا تو اس میں، جہاں انفرادیت پسندی اور ارادے کو دخل ہے، وہاں اس پس منظر کا ہاتھ بھی ہے جو اپنی اندرون خانہ زندگی کی ناکامی اور تمناؤں کی تشنگی کے سبب دونوں کے ہاں مشترک بھی ہے اور قطعاً مختلف بھی۔

کھایا پیا، سخت کوش اور بلانوش بدن کسی قدر رفرق کے ساتھ دونوں کو ملا تھا اور آسودگی کی تلاش دونوں کو گھر سے باہر رسوائی کے کوچہ و بازار میں لئے پھری ہے اور دونوں نے ہی یہاں کے تجربات سے ذہنی کمائی کا کھاتہ کھولا ہے اور فنی پاس بک میں سود در سود وصول کیا ہے۔ ذرا یہ بیان ملاحظہ ہوں۔

ترا فراق تو اس دن ترا فراق ہوا جب ان سے پیار کیا، جن سے کوئی پیار نہیں

یا

تو ایک تھا، مرے اشعار میں ہزار ہوا اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

یا

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

اور جوشؔ کہتے ہیں:

"... جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے جی بھر کر لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر۔ عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں، عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں۔ عیاشی نے لذت حواس سے دوچار کیا، عاشقی نے نشاط شعور سے سرشار کیا... عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا، عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور قلبِ گداختہ کی دولت بیدار مرحمت فرما کر مجھ کو شاعری اور محبتِ نوعِ انسانی کا راستہ دکھایا۔ میرا جسم بھی متمول ہے، میری روح بھی مالامال ہے..."

(یادوں کی برات، لکھنؤ ایڈیشن ص ۴۹)

جوشؔ اور فراقؔ دونوں نے فطرت پرستی کی زد میں غیر فطری عیاشیاں بھی کیں اور ان کے لئے غیر معمولی تاریخی ہستیوں کے سندِ جواز بھی نکال لی۔ فراقؔ نے اس کی تشہیر کی، جوشؔ نے صرف اثبات میں گردن جھکائی لیکن روزمرہ کی عادات میں دونوں شریک تھے اور انعام رسوائی میں بھی۔ پی کر بہک جانے اور رائف ہو جانے میں فراقؔ کی دکھی نوجوانی اور غم زدہ، دل برداشتہ احساسِ محرومی کو تسکین ملتی تھی، یا یوں کہہ لیں کہ نشے کی آسائش ان کے لئے تب تک ادھوری رہتی تھی جب تک وہ بھی زندگی میں اپنی ناکامیوں کا اور حق تلفیوں کا بھرپور انتقام نہ لے لیں اب چاہے انتقام کی زد میں اقبال آئیں یا جوشؔ آنند نرائن ملا آئیں یا علی سردار۔

جوشؔ کے ہاں ناکامی کے ساتھ کامرانی کا طنطنہ اور کوچۂ رسوائی کی آڑ میں بیوی بچوں کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ یہ ڈوران کے ہاتھ سے شاید ہی کبھی چھوٹی ہو۔ عالم سرخوشی میں بھی وہ (غالب کی طرح) اوروں کی ناخوشی کے طلب گار، اپنے اور دوسروں کے زن و فرزند سے، ننگ و ناموس سے بیزار نہیں ہوتے تھے۔

اپنی اپنی ناپسندیدہ بیویوں سے اولاد دونوں کو ہوئی۔ فراقؔ نے فاصلہ رکھ کر اولاد کی تعلیم و تربیت کی۔ اولاد کے ساتھ اس کا درد بھی پالا پوسا۔ لیکن اس پال پوس کو اپنی پوری زندگی نہ بننے دیا۔ جوشؔ نے اولاد کو، اس کے عزیزوں کو، اس کی ننھی آسائش طلبی کو کلیجے سے لگا کر رکھا۔ اس پر جان چھڑکی۔ چنانچہ جب چھت گری تو شہتیر الٹ گیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا سیاسی

سماجی ڈھانچہ درہم برہم ہونے لگا تو ہمارا شیرانہ ہمہ کا شاعر اپنے ذہنی اور فنی فرزندوں کی لاج رکھنے کے بجائے اولاد پر جھک گیا، اپنے پوتوں نواسوں کے مستقبل کی فکر اس کے کلیجے کی ٹیس بن گئی۔ انجام معلوم ہے۔

کہتے ہیں، جینا ایک آرٹ ہے۔ ہاں بہت سی ذاتی حدوں میں ضرور آرٹ ہے، لیکن وہ جسے آرٹ کی خاطر جینا ہو، اسے زندگی کرنے کا، ترازو کے دونوں پلڑے ہم وزن رکھنے کا سلیقہ تبھی میسر آتا ہے جب وہ جینے کو سائنسی انداز سے برتے۔ بظاہر یہ بات قولِ محال (PARADOX) نظر آئے گی، لیکن جنھوں نے اس موضوع پر مطالعے اور تجربے کرنے میں عمریں تیر کر دی ہیں، وہ زندگی سائنس اور آرٹ کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچتے۔

ہم جوش و فراق کے تعلق سے بات کر رہے ہیں۔ جوش معاملات کے ناپ تول سے بالکل غافل کبھی نہیں رہے، غافل ہوئے بھی تو اس غفلت کو آرٹ بنا لیا " دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند" اس طرح کی غفلت میں جوش و فراق برابر کے شریک ہیں —— ایک اہم فرق کے ساتھ، کہ فراق کی خارا شگاف نظر زندگی کے سائنسی رویے کی بہتر شناخت رکھتی تھی اور چند اصولوں میں انھوں نے اسے زندگی بھر ضائع نہیں ہونے دیا۔ مثلاً یہی کہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی لکچرر شپ اختیار کی تو مقررہ تنخواہ کو ماہانہ وظیفہ شمار کر لیا اور تیس برس پڑھانے کے باوجود لکچرر سے ریڈر یا پروفیسر بھی نہیں ہوئے۔ اندر سے انھوں نے سوچ رکھا ہوگا کہ اس جز وقتی کام پر قناعت کر کے وقت کی بچی ہوئی دولتِ بیدار کو ادبیات کے وسیع مطالعے اور شعری و تنقیدی تصنیف پر خرچ کرتے رہیں چنانچہ انھیں نہ اپنی بیتی ہوئی جوانی سے کوئی شکایت ہے، نہ اپنے زمانے سے، جسے جوش بار بار کور ذوق اور بد وضع قرار دیتے ہیں۔ تمام تر عالی ظرفی کے باوجود جوش وقت کی یہ سائنسی تقسیم نہیں کر سکے اور گزرے ہوئے لمحوں کا ماتم کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس رویے میں ان کے گھریلو بندھنوں کا (جس میں ضرورت مند احباب اور اعزا شامل ہیں) بڑا دخل تھا۔

رنگوں، آوازوں، موسموں اور ذہنی کیفیتوں کا گہرا رشتہ ہے۔ فنکار کے لب و لہجہ پہ، اس کے پسندیدہ راگوں اور تصویری لائنوں مرقعوں، پیکروں، خموں، گولائیوں پہ، مطلب یہ کہ

اسٹائل کے اجزا پر ان ظاہری آثار کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ کیوں کر اور کس قدر کا جواب آج آرٹ اور تنقید کی زبان میں دیا جاتا ہے، کل سائنسی عمل گاہوں سے دیا جائے گا۔ فنکار کی شخصیت کا وہ کون سا خاص پہلو ہے جو کسی خاص موسمی حالت سے، شب و روز کے کسی خاص وقت سے، آواز سے، ہوا کے بے آواز بہاؤ سے، فضا میں بکھرے ہوئے کسی مدھم یا شوخ رنگ سے ذرا زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے، کچھ زیادہ ہی حرکت میں آتا ہے اور تخلیقی عمل کی ذرا زیادہ ہی تحریک کرتا ہے۔

میر کے ہاں بہار میں ہوا کی زنجیر کی جھنکار ہے اور اس کا رنگ نارنجی ہے۔ جتنا غور کیجیے میر کی شاعری کی آوازوں کے در و بست پر ان کی زندگی کی عمومی کیفیت بلکہ ایک عام سی اصطلاح میں کہا جائے تو، ایک رنگ و آہنگ حاوی ہے۔ ان کی خانگی زندگی کا اجاڑ پن اور واقعات بھرے شب و روز کی حسرتوں کا لہجہ، سفر و حضر میں بار بار مقام اور حیثیت کا بدلتے رہنا میر کے آرٹ کی کسک بن گیا ہے، وہ ایک شہر، ایک قبیلے یا کنبے، ایک حیثیت کے بجائے خانہ جنگی کے ایک بے یقینی دور کی صدائے پرشوق ہیں جو صبح سویرے کے سہانے پن میں کچھ اور بھی دل گرفتہ ہو جاتی ہے۔

حافظ شیرازی اوّل شب اور شبِ بہار کے نغمہ سرا ہیں۔ غالب رات ڈھلے کے شاعر ہیں۔ آمد بھی ان پر ایسے ہی وقتوں میں ہوتی ہے۔ پوشکن برسات کے تین مہینوں کی رم جھم میں خود اتنا برستا تھا کہ پچیس[۲۵] برساتوں میں نثری اور شعری تصانیف کا انبار لگا گیا۔ نیتشے اور شوپن ہار تقریباً متضاد جرمن معاصر ہیں۔ ان کے پسندیدہ اوقات میں بھی وہی تضاد ہے۔ تالستائے اور ژیدا کے ہاں جملوں اور پیراگرافوں کی طرح اوقات بھی دست بستہ ادب سے کھڑے ہیں۔ انھوں نے سویرے سے لے کر دن چڑھے تک کے اوقات اپنے بس میں کر رکھے تھے۔ دستوئیفسکی کے سوانح اگر معلوم نہ ہوں تب بھی ہم اس کی تحریروں سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ وہ آدھی رات کا مصنف ہے۔ لکھتے وقت راتوں کو صبح کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ تورگنیف کو دھوپ کے دن اور جنگلوں سبزہ زاروں سے جتنا پیار تھا وہ اس کے موضوعات اور طرزِ بیان سے (یہ بڑا ہی صاحبِ طرز روسی افسانہ طراز ہے) چھلکا پڑتا ہے۔ یہ مختلف نام ایک ساتھ یوں یاد آ گئے کہ ان کے طرزِ بیان اور انتخاب موضوعات کا ان کی نجی خانگی، بلکہ ازدواجی زندگی سے، گرہستی سے خاص تعلق ہے، یہ تعلق اب کوئی راز نہیں، دنیا کے علم میں آ چکا ہے۔ اسی طرح کا تہ در تہ تعلق رنگوں، آوازوں، موسموں اور وقتوں کا فنکار کی اندرونی کائنات سے، اس کے تاثرات اور لب و لہجہ سے، تلاش کرنے پر اپنے ہاں

بھی ملے گا۔ سید انشا سے لے کر فیض احمد فیض تک (جنھیں میں اپنی سہولت کے لئے "شامِ انتظار کا تنہا شاعر" کہتا ہوں) اسی سلسلے کی بکھری ہوئی کڑیاں ہیں۔

ذرا اِس پہلو سے دیکھئے تو جوشؔ و فراقؔ کے پسندیدہ رنگ، موسم اوقات الگ الگ نظر آئیں گے اور گہرائی تک ٹٹولتے میں ان کی خانہ داری کا رمز اور خانگی زندگی سے ان کا برتاؤ بھی کھلے گا۔ جوشؔ نے اپنی آپ بیتی کا ایک پورا باب "موسموں کے تاثرات" پر لکھا ہے اور اس میں موسم گرما کو خونی ریچھ اور لاگو بھیڑیا کہا ہے۔ خوب مقفیٰ گالیاں دی ہیں گرمیوں کی دوپہر کو اور استقبال کیا ہے موسم سرما کا۔ اب ذرا ان کے شب و روز ملاحظہ ہوں۔ دن نکلنے سے پہلے بلا ناغہ گھر سے نکلنا اور دن نکلتے ہی نہا دھو کر کاغذ قلم سنبھالنا۔ آدھی رات تک باہر مردانے میں۔ یعنی زنان خانے سے فاصلے پر رہنا، اور صبح کی پہلی کرن سے پہلے اپنے گھر کے بستر پر پایا جانا۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب، یہ دو وقت ہیں جنھیں جوشؔ نے اپنے کلام میں تقدس بخشا ہے۔ وہ دِن چھپنے کے بعد ملنے جلنے والوں کو اپنے گھر بلانے سے ہچکچاتے اور انھیں اپنی سخت گیر بیوی کا ہوّا دکھاتے تھے۔ مگر شاعری میں وہ چڑھتے دن کی کیفیت رکھتے ہیں اور کسی موضوعاتی نظم کا نقطۂ عروج ان کے ہاں اسی طرح ہوتا ہے جیسے چڑھتی دھوپ کا کلائمکس تپتا دوپہر، بے تحاشا بے محابا ایسی دوپہر کا شاعر [یا آرٹسٹ] پناہ لینے پر آئے تو ماں اور بیوی کے دامن میں پناہ لے گا ـــــ اور یہ وہ دامن ہیں جن پر نماز پڑھنے کی عادت پڑ جائے تو اچھا بھلا ہنگامہ خیز ہنگامہ پسند آدمی راحت طلب ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ وہ "اصل" کی طرف رجوع کرے اور اپنے عمل کی سمتوں کو اس دامن کی کھینچ سے طے ہونے دے جیسے پتنگ کو اس کی ڈور۔ خاندانی رئیس زادے جوشؔ نے جب اپنی اصل ملیح آبادی گھرانے کی طرف رجوع کیا اور ساٹھ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے جب اس کی مردانہ مدافعت کمزور پڑنے لگی تو وہ بیوی، بیٹی، پوتے نواسے کے مستقبل کے مفاد کی طرف ایسا جھکے کہ اپنے پورے تنا ور اٹھان سے لوٹ گئے۔ فرقہ پرستی، دو قومی نظریہ، پاکستان، فوجی آمریت، مذہبی احکام کی عملداری اور اسی قبیل کے تمام مظاہر جن سے وہ متنفر رہے تھے، سب انھیں قابلِ قبول ہو گئے، سب ان کو پناہ گاہ نظر آنے لگے صرف اس خیال سے کہ وہاں گھر والوں کی آسائش کا امکان روشن ہے۔ تمام بڑے بڑے آدرش ان کا منہ تکتے رہ گئے۔ اور انھوں نے اپنے آموں کے بور، کوئل کی کوک اور شام اودھ کو، جہاں سے شاعری کے کھیت میں آبیاری ہوتی تھی۔ بڑے درد کے ساتھ

تج دیا۔

گھر کی چار دیواری کا اور اس میں پلنے والی زندگی کا ایک خفیہ قانون یہ رہا ہے کہ انھیں جتنا زیادہ چاہو اتنا ہی وہ تمھیں چاہے۔ تم جتنا انھیں سینے سے لگاؤ، لپٹو، چومو، آغوش میں بھرو اتنا ہی وہ تمھیں بھینچ بھینچ کر گلے لگائیں گی، یہاں تک گلے لگائیں گی کہ تمھاری پسلیاں، ذہنی اور فنی پسلیاں جٹخ جائیں، غور و فکر کے بال و پر مسل کر رہ جائیں اور فن کار وہیں پھڑپھڑاتا رہے۔ اسی کو مرکزِ حیات قرار دے کر پھیل پڑے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد جوش پر، چڑھتی دوپہر اور تیز روشنی کے شاعر پر، شعلہ بار آوازوں کے طبل پر یہی سانحہ گزرا۔

فراق کو کون سی راحت تھی! ازدواجی زندگی اور خانگی زندگی کی جتنی تپک انھوں نے سہی تھی اس کو آدھی رات کی، تاروں بھری آدھی رات کی خنکی میں معتدل کیا۔ زندگی نے جو راحتیں، روپ، تھال، چندن، پھول سنگھار کی نہیں دی تھیں، بلکہ ان کی آدھی ادھوری تمنائیں اور حسرتیں سوکھے پھولوں کی طرح ان کے آنگن میں بکھیر دی تھیں، انھیں گملوں اور گلدانوں میں سجالیا۔ روپ کی رباعیوں میں جو منظر، مشاہدے اور تجربے نظر آتے ہیں وہ دراصل رات بھر کی جان لیوا بیداری کے بعد تخیلی تجربے اور حسرت کے کینوس پر کھینچے ہوئے مشاہدے ہیں۔ ان کے ہاں "رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے۔" فراق یکبارگی گھر سے ایسے بیزار ہوئے کہ گھر اپنی راحتوں کے ساتھ ان سے برگشتہ ہوگیا۔ چار دیواری سے وہ ایسے بھڑکے کہ چار دیواری نے انھیں چھوڑ دیا۔ وہ مرتے دم تک وہی کہتے اور لکھتے رہے، اشتعال انگیز لفظوں میں کہتے اور لکھتے رہے، جو ان کی فکر میں اور مزاج میں رچ بس گیا تھا۔ یہاں جوش ایک انتہا کی طرف گئے۔

عمرِ عزیز و لذیذ کے ساٹھ ساٹھ برس تقریباً ایک نہج پر گزار چکنے کے بعد جب کمر سیدھی کرنے کا وقت آیا، مزاحمت اور مدافعت کی قوت کمزور پڑی تو جوش کو اچھا سا، شاندار سا بشتینی گھر کا بدل بنانے کی سوجھی۔ گھر بن گیا۔ جوش بکھر گئے۔ اولاد اور در اولاد کے مستقبل کا ٹھیکہ بھلا کس نے لیا ہے۔ شاہی خانوادوں کے مستقبل ہمارے سامنے ہیں۔ فن کار کا خانوادہ اس کا ذریعۂ اظہار اور دائرۂ قبول ہے۔ خوبصورت فرانسیسی شاعرہ ژار ژسان (GEORGE SAND) ملیے جوتے اور میلے کار کی قمیص پہنے پیرس کے کوچہ و بازار میں گھومتی ہے اور اپنے بطن کے بچے ان کے باپوں کے سپرد کرتی ہے کہ میں فن پالوں گی، تم اپنے اپنے بچے پالو۔ بے خانماں دنیا سے گئی ـــ مگر اس کے کلام کا خانماں آباد ہے۔ فرانس کے اندر اور فرانس کے باہر اس کے عقیدت مندوں کے ہزاروں

گھر آباد ہیں۔

جوش کو فراق کی جدت پسند ذہانت اور جودتِ ذہن پر رشک آتا تھا اور یہ شکایت بھی تھی کہ:

"... وہ بلا کے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں اور یہ وہ ذکاوت مخصوص ہے جو دنیا کے تمام عظیم فن کاروں میں پائی جاتی ہے .... قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنی رفیقہ حیات سے جو برتاؤ ہے وہ سینۂ انسانیت کا ایک گھاؤ ہے، اور ان کے شدائد سے تنگ آکر ان کا بیٹا خودکشی کر چکا ہے ... وہ ایک دوہری شخصیت کے انسان ہیں ... کبھی مہکتے گلزار، کبھی اُپی تلوار...۔"

("یادوں کی برات" لکھنؤ ایڈیشن ص۴۲۵)

اور فراق نے کبھی کسی سے حسد کی حد تک رشک کیا تو جوش سے، جوش کی طربناک آپ بیتی سے، جوش کی بے پناہ قادرالکلامی اور مردانہ لہک سے (یہاں تک کہ وہ قادرالکلامی کی صفت کو ہی حقیر اور معمولی سے کہنے لگے تھے۔) کبھی جوش کی اپنے گھر اور گھر والوں سے والہانہ وابستگی پر فراق نے رشک نہیں کیا تو اچھا ہی کیا ورنہ وہ اپنے اجاڑ بنگلے میں آنولے کے پیڑ تلے آخر دم تک یوں زندہ سرگرم اور بے باک اور نہایت باخبر زندگی کیسے گزارتے۔ □

شمیم حنفی

بسیرا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فراقؔ صاحب

اک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدہ میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

میں جب فراقؔ صاحب کے یہاں پہنچا اس وقت دوپہر کے غالباً بارہ بج چکے تھے۔ برآمدے میں پیروں کی چاپ سنتے ہی ان کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھیں۔

"کون ہے" حسب عادت وہ اپنی بھاری آواز میں چلائے اور جواب دینے کی بجائے میں دھیرے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ تنہا اداس اور اپنی محرومیوں کے زخم سے چور فراقؔ صاحب بستر پر پڑے ہوئے تھے۔

"آیئے صاحب" انھوں نے خلاف معمول دھیمی اور کسی حد تک خستہ آواز میں کہا۔ اور میں پلنگ کے سامنے پڑی ہوئی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ ایک چھوٹی سی تپائی پر شراب کی کھلی ہوئی بوتل، گلاس، پانی سے بھرا ہوا جگ، سگریٹ کے چند پیکٹ اور ماچس کی ڈبیاں، کچھ اخبارات، کتابیں اور رسائل۔ دوپہر کا سناٹا پوری فضا پر حاوی تھا۔ کچھ دیر تک میری موجودگی سے بے نیاز فراقؔ صاحب فنون کے ایک شمارے کے کسی صفحہ پر نظریں جمائے پڑے رہے۔ اور سسکتی ہوئی فضا میں پلنگ کے نیچے سر جھکائے بیٹھے کتے کے منہ چلانے کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ابھرتی رہی۔

چند لمحوں بعد ان کی دہشت زدہ اور بے قرار پتلیاں رسالے سے ہٹ کر مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

"کہاں سے آرہے ہو!" انھوں نے آہستہ سے سوال کیا۔

"یونی ورسٹی آیا تھا سوچا کہ آپ کو بھی دیکھتا چلوں"۔

"ہاں بھائی" وہ قدرے اداس لہجے میں بولے۔ پھر فنون کے اس شمارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں اس میں احمد فراز کی ایک نظم دیکھ رہا تھا صاحب!" اب یکبارگی ان کی آواز تپے ہوئے لوہے کی طرح بھاری ہو گئی۔ "اس نے معلوم نہیں کیسے میری زندگی کے اصل درد کو سمجھ لیا"۔ اور اتنا کہہ کر انھوں نے احمد فراز کی وہ نظم ترنم سے سنانی شروع کی جس کے چند مصرعوں سے میں نے اس خاکے کی ابتدا کی ہے۔ یہ نظم احمد فراز نے فراق صاحب کی تازہ تصویر دیکھ کر کہی تھی تصویر غالباً نقوش میں شائع ہوئی تھی جس میں فراق صاحب کے چہرے پر "اجاڑ زندگی کے لمحات کی ان گنت خراشیں اور آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں روٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں" نظر آرہی تھیں۔ اس نظم نے ان پر غیر معمولی اثر کیا تھا اور وہ اس وقت ہمیشہ سے زیادہ مضمحل اور پژمردہ نظر آرہے تھے۔ میں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ گفتگو احمد فراز کی اس نظم سے ہٹ کر سیاست، ادب تعلیم، فلسفہ اور بھانت بھانت کی باتوں پر گھومتی رہی پھر بھی وہاں سے اٹھنے کے بعد کافی دیر تک میں یہ سوچتا رہا کہ آج فراق صاحب ہمیشہ سے کچھ مختلف کیوں نظر آرہے تھے۔

اور یہ سوال اتنا پیچیدہ نہیں کہ اس کا جواب آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے فراق صاحب کے ماضی کو کریدنا ہوگا۔ وہ ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ ان کی شادی ہوگئی اور زندگی کا یہ موڑ جس کے لئے جوانی تصورات کے کتنے رنگ محل تیار کرتی ہے، فراق صاحب کے لئے بڑا بھیانک ثابت ہوا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی "ٹریجیڈی" ان کی ازدواجی زندگی رہی ہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں ازدواجی زندگی کا غم ایک زہر بن کر ان کی رگ رگ میں اور لہو کے ہر قطرے میں حل ہو گیا تھا اور انھیں ایسا لگتا تھا کہ یہ زہر مسلسل ان کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ فراق صاحب کتنے ہی اچھے موڈ میں ہوں بس ایک لمحہ کے لئے آپ اس پہلو کی طرف اشارہ کر دیجئے وہ یکبارگی تپ اٹھیں گے پیشانی پر پھیلا ہوا لکیروں کا جال کچھ اور گھنا ہو جائے گا، آنکھوں میں بے قرار پتلیوں کی وحشت کچھ اور بڑھ جائے گی۔ سانس تیز تیز چلنے لگے گی۔ آواز میں ٹھہراؤ کی جگہ ایک تلاطم کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور اس کے بعد آپ نے دور اندیشی سے کام لینے کے بجائے ذرا بھی ادھر ادھر ہاتھ پھیلایا تو فراق صاحب آپ ہی پر برس پڑیں گے۔

شادی کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر کی ذمہ داریوں نے اچانک ان پر مسائل کی یورش شروع کر دی۔ ابھی ان کی تعلیم مکمل بھی نہیں ہو سکی تھی کہ ایک پورے کنبے کی گاڑی کھینچنے کا

بوجہ ان کے شانوں پر آ گرا اور فراق صاحب کسی نہ کسی طرح اسے جھیلتے رہے۔ وہ ذہین آدمی تھے اور ان میں دنیاوی سوجھ بوجھ کی کمی نہ تھی اس لئے صرف یہی نہیں کہ بہنوں کی شادیاں کیں۔ اور بھائیوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی مکمل کر لی اور اس طرح ان کے لئے ایک اچھے مستقبل کے دروازے کھل گئے..... انھیں آئی سی ایس کے لئے بھی منتخب کر لیا گیا۔ لیکن یہاں تو یہ عالم تھا کہ ہر ذاتی مسرت ان کے لئے ایک تازیانہ بن کر آتی تھی۔

"کس کے لئے خوش ہوتا؟" اکثر وہ یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی اس انتہاپسندی کے بھی شکار ہو جاتے ہیں کہ محض اپنی ازدواجی زندگی کی وجہ سے انھوں نے یہ بھی نہیں چاہا کہ وہ آئی سی ایس بنیں کیونکہ جس کے لئے ان کے دل میں جوالا مکھی پھوٹ رہے تھے اسے بھلا وہ اعزاز کیونکر دے سکتے تھے کہ ایک آئی سی ایس کی شریک حیات بن کر وہ اپنا سماجی مرتبہ اونچا کر سکے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب سیاست امیروں کا شوق تھی اور غریبوں کے لئے ایک ضرورت۔ کیونکہ برطانوی تسلط سے نکلنے کے لئے ہندوستان بڑی شد و مد سے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ فراق صاحب بھی سب کچھ تیاگ کر اس میدان میں کود پڑے۔ کئی برس تک وہ نہرو جی کے ساتھ رہے کچھ دن جیل میں بھی گذارے اور اس طرح کچھ وقت سیاسی مصروفیتوں میں کٹتا رہا اور تنہائیوں کے کچھ لمحے شاعری کے اس ذوق کے نذر ہوتے رہے جو کچھ تو انھیں فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور کچھ اپنے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت مرحوم سے ورثے میں ملا تھا۔

پھر ایک منزل وہ بھی آئی جب سیاست کے ہنگاموں سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا بھری دنیا میں وہ خود کو تنہا سمجھنے لگے۔ اور ان کی سیماب صفت فطرت نے اس وادی کو بھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ انھوں نے ادبیات انگریزی میں ایم۔ اے بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور ادب کے ہو کر رہ گئے۔

اب انھیں کوئی معاشی الجھن نہیں تھی۔ وہ یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ زندگی کا ایک ڈھرا بن چکا تھا۔ پھر بھی ازدواجی زندگی کی تلخی ان کی شخصیت پر چھائے ہوئے شدید احساس افسردگی و تنہائی کو دور نہ کر سکی۔ بچپن سے ان کا مزاج عام انسانوں سے یوں بھی کچھ مختلف سا تھا۔ مختلف کیوں بلکہ یہ کہئے کہ ہر جذبے میں انتہائی شدت نے ان میں کچھ نیم وحشیانہ صفات پیدا کر دی تھیں۔ جلدی برس پڑنا اور اس حد تک مغلوب الغضب ہو جانا کہ بس چلے تو آ

شخص کو قتل ہی کر دیا جائے جس پر غصہ آیا ہو۔ غصے میں ان کی حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔ میں نے اکثر یہ منظر دیکھا ہے کہ وہ خاصے اچھے موڈ میں شام کو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ان کی کرسی سے ملی ہوئی تپائی پر شراب کی بوتل، گلاس اور پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا ہے۔ ارد گرد دو چار کرسیوں پر اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ادب، فلسفہ، جمالیات، کلچر، جنسیات، شعر و شاعری، سیاست اور ادھر ادھر کے مختلف موضوعات پر اچھی بھلی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں اگر کسی شخص نے جو بیچارہ فراق صاحب کا مزاج شناس نہ ہو اکوئی ایسی بات زبان سے نکالی جس نے فراق صاحب کے ذہن میں سوئے ہوئے غصے کے تاروں کو اک ذرا جنبش دے دی پھر طوفان آجائے گا۔ پہلے تو فراق صاحب اسے سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔ ضبط کرنے کی ناکام کوشش کریں گے اور اگر اس پر بھی معاملہ نہیں سلجھا تو ان کا سارا وجود ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بن جائے گا۔ ان کی تپی ہوئی آواز میں ایک ایسی کرختگی پیدا ہو جائے گی جو شام کے افسردہ اور پر اسرار سکوت کے پرخچے اڑا دے گی۔

ان کے مزاج کی اس سوداویت نے ان کی تنہائیوں میں اور اضافہ کر دیا اب وہ زمانہ تو نہیں رہ گیا جب عقیدت مند شاگرد استاد کی گالیاں بھی سنتے جاتے تھے اور چلمیں بھی چڑھاتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ان کے ایسے بہت سے عقیدت مند بچھڑ گئے۔ جو شام ہوتے ہی فراق صاحب کے یہاں پہنچ جاتے۔ فراق صاحب کی وحشت کچھ کم ہو جاتی اور وہ باتوں میں کھو جاتے اور یہ صحبت ختم ہوتے ہی وہ منزل آتی جب آدھی رات کی سحر انگیز فضا میں فراق صاحب خیال کی پریوں کو بلاتے :-

اب آؤ میرے کلیجے سے لگ کے سو جاؤ
یہ پلکیں بند کرو اور مجھ میں کھو جاؤ

لیکن ان کا یہ خواب جب اس کربناک حقیقت سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا جو زمانے کی نظروں میں ان کی رفیقۂ حیات ہو کر بھی "ان کے واسطے بنی ہی نہ تھی"۔ اور جس نے فراق صاحب کی پوری شخصیت کو "نفرتوں کا اگن کنڈ" بنا کر رکھ دیا تھا تو وہ اپنی اس شکست پر جھنجھلا کر شراب کی طرف ہاتھ بڑھاتے پگھلی ہوئی آگ ان کی رگوں میں پھیل جاتی اور وہ ایک اندرونی جلن سے چور ہو کر آنکھیں بند کر لیتے جیسے جیسے زندگی کے سرپر مسائل کے ادلے گرنے کی رفتار تیز ہوتی گئی زندگی نے بھی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا شام کی صحبت میں جمنے والے کچھ تو پاکستان چلے گئے جو یہاں بچ رہے تھے ان میں سے کچھ تو بے چارے زندگی کی ڈور تھامے ہانپ کر اس

ے ساتھ بھاگ رہے تھے جنھیں فرصت کے چند لمحے میسر تھے وہ بھی فراق صاحب کے مزاج
ں سوداویت کے خوف سے اب ان سے کترانے لگے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھی بھلی زندگی تنہائیوں
ے تھپیڑے کھا کھا کر نڈھال ہو گئی۔ سانسوں کی تھکن، بدن کی ٹھنڈک آخر اس احساس سے
ب تک لہو لیتی تنہائیوں کے ساتھ ساتھ ان کی وحشتیں اور اداسیاں بھی بڑھتی گئیں۔

اور ایسے عالم میں تو اچھے اچھوں کی حالت بگڑ جاتی ہے پھر بھی فراق صاحب انتہائی
ر اعتدالیوں کا شکار رہنے کے باوجود مجاز اور میراجی کی طرح بالکل تباہ نہیں ہوئے۔ اور اس
ں وجہ صرف یہ تھی ان کی بظاہر اجڑی اجڑی سی، بے نیاز، لاپروا، نیم مدہوش اور نیم وحشیانہ
شخصیت کے خول میں چھپا ہوا بیداری کا احساس انھیں ہمیشہ ٹھوکے لگاتا رہا۔ انھیں کے
لفاظ میں توازن اور مصلحت اندیشی کے کھونٹے سے بے اعتدالیوں کی رسی بندھی رہی اور
نھوں نے جب بھی شدت غم سے چور ہو کر رسی تڑانی چاہی بے چارے بھاگ تو نہیں سکے
یوں کہ گرہ مضبوط تھی۔ یہ ضرور ہوا کہ منہ کے بل گر پڑے، جھنجھلائے، کراہے، چیخے چلائے اور
خر تھک ہار کر کسی نہ کسی طرح پھر کھڑے ہو گئے۔ اس توازن نے جہاں انھیں اس شرمندگی سے
بچایا کہ بالکل قلاش ہو کر کبھی کبھی شخصیت کا بوجھ اٹھائے رسوائیوں کے چوراہے پر فکر و فن کی
ر دکان لگائے آنے جانے والوں سے سہارے کی بھیک مانگتے وہیں اپنی ان ذمہ داریوں سے
سبکدوش ہونے میں مدد بھی دی جو ایک ناگزیر حلقۂ زنجیر کی طرح اس کے گلے میں پڑی ہوئی
تھیں۔ وہ یونی ورسٹی میں باقاعدگی کے ساتھ طلبا کو انگریزی ادبیات پر لکچر دیتے رہے۔ لڑکیوں
کی شادیاں کیں صاف ستھرے طریقے سے گھر میں کھانے پینے اور رہن سہن کا چرخہ بھی چلتا رہا۔
روزانہ شام کو شراب بھی آتی رہی اور شوق کے سامان بھی مہیا ہوتے رہے۔

فراق صاحب نے اپنی شاعری میں جنسیت کو بھی بقول سجاد ظہیر روحانی بلندیاں
بخشی ہیں وہ سیج پر لپٹی ہوئی سہاگن کے ان لمحات کی منظر کشی بھی جب :

کچھ سوچ کے خلوت میں بصد ناز اس نے
نرم انگلیوں سے بند قبا کے کھولے

کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ فرشتے شرم سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے عقیدت سے اپنا سر جھکا
دیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں، نظموں اور خاص طور سے روپ کی رباعیوں میں ایسے صدہا
نازک موقعوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے جس کے تصور ہی سے ثقہ لوگ ایک لاحول پڑھ کر نجات

کی دعائیں مانگنے لگیں۔ لیکن یہاں بھی ان کے یہاں ننگ دھڑنگ تماشی یا عریانیت پاکیزگی
ہزاروں چلمنوں کے پیچھے چلی جاتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کی محرومیوں نے ان میں فطرت کی طرف
سے ڈھیروں ودیعت کی ہوئی جنسیت زدگی کی میراث کو اور ہوا دی۔ انھوں نے خود لکھا
کہ بچپن میں کسی حسین مرد یا عورت کو قریب دیکھ کر ان کی ہڈیاں اندر ہی اندر سلگ اٹھتی تھیں
اس شدید احساس حسن اور جنسی ہوس کے جذبے نے ان کی عملی زندگی کو بھی اتنا گلنار کیا کہ جو
لوگ فراق صاحب کو جانتے ہیں وہ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف نظریں اٹھائے بغیر نہیں
رہ سکتے۔ لیکن جب وہ خارجیت کا چولا اتار کر تخیل کی وادیوں میں اسی احساس حسن اور اسی
بدنام زمانہ جنسیت کے ست رنگے نقشے کھینچتے ہیں تو جانے کہاں سے ایک خواب ناک، پراسرار
عظمت، پاکیزہ اور مقدس فضا امنڈ آتی ہے۔ یہ "تضاد" ان کی روزانہ زندگی میں بھی نظر آتا
ہے۔ کبھی کبھی وہ سڑی گرمی میں بھی کئی کئی دن نہیں نہائیں گے، کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑے
بکھرے رہیں گے۔ پھٹے پرانے اخبارات و رسائل گردسے اٹے پڑے ہوں گے۔ اگر کبھی نفاست
پسندی کی لہر ابھری تو وہ کمرے کو صاف کرائیں گے ہر چیز قرینے سے رکھ دی جائے گی۔ بستر کی
چادریں اور تکئے کے غلاف بدلے جائیں گے۔ الماریوں کی گرد جھاڑی جائے گی لیکن ٹھیک
اسی وقت اگر انھیں کھانسی آگئی اور اگالدان قریب نظر نہ آیا تو وہ بے جھجک چم چلاتے ہوئے فرش
پر تھوک بھی دیں گے۔ ان کا شیو تین دن کا بڑھا ہوا ہو اور انھیں کسی ایسی دعوت میں جانا ہو
جہاں معززین شہر کا مجمع ہوگا اور ان کا موڈ نہ آئے تو نہ وہ کپڑے بدلنے کی زحمت مول لیں گے
اور نہ شیو بنوائیں گے۔ وہ زندگی میں سلیقے اور تنظیم کے صد درجہ قائل ہوتے ہوئے بھی سلیقے اور
تنظیم کے جال میں خود کو بے دست و پا نہیں چھوڑ سکتے (اسی آزاد پسندی نے انھیں کسی ازم
کا غلام ہونے سے بھی بچایا اور کسی مخصوص ادبی تحریک اور مکتبہ فکر سے مکمل ذہنی وابستگی محسوس
کرنے کے باوجود وہ اس کی گرفت میں نہ آسکے) لیکن جب کبھی وہ اسی مجذوبانہ ہیئت میں حفظان
صحت کے عام اصولوں اور سلیقے اور صفائی کی باتیں کریں تو اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں
نفاست کی آخری حدیں بھی ان کے پاؤں کی گرد بن جائیں گی۔ اسی طرح کھانا کھاتے وقت
وہ دہی یا اس طرح کی کوئی اور چیز چمچے کے بجائے دو انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کھائیں گے
اور وہ بھی اس طرح کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ ایک مسلسل چٹخارے کے راگ سے محظوظ ہوتے
رہیں۔ اگر وہ پلنگ پر بیٹھے ہیں اور ٹہلنے ڈولنے میں دھوتی کا چھور یا پائجامے کا پائینچا ذرا اوپر

اٹھ گیا تو سامنے بیٹھے ہوئے لوگ چاہے آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں فراق صاحب اس سے بے نیاز رہیں گے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ عام مجلسی رکھ رکھاؤ اور اٹھنے بیٹھنے یا کھانے پینے کے طور طریقوں سے واقف نہ ہوں۔ وہ یہ سب خوب جانتے اور سمجھتے ہیں لیکن تنہائی اور محبت سے محرومی کے شدید احساس نے ان کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ جان بوجھ کر ان چیزوں کی طرف سے لاپروا ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ان کی یہ خواہش رہتی ہے کہ کوئی انھیں اس عالم میں دیکھ کر بے نیازی سے آگے نہ بڑھ جائے بلکہ ان پر شفقت اور محبت کی ایک نظر ڈالے انھیں ٹوکے، چمکارے اور ایک بچے کی طرح انھیں بنائے سنوارے محبت کے ایک بول کے لئے فراق صاحب کیا کچھ نہیں کر سکتے بے چارگی اور بے بسی کا احساس زندگی کے ہر لمحے میں ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔

ایک بار مسوری کے ایک ہوٹل میں آدھی رات کے وقت فراق صاحب تقریباً نیم بیہوشی کے عالم میں لڑکھڑاتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور ساری فضا سپید کہر کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ غسل خانے تک پہنچتے پہنچتے وہ کئی بار گرتے گرتے بچے ان کے حلق سے درد میں ڈوبی ہوئی ایک کراہ نکلی اور وہ اپنے آپ سے بولے۔

غلط شادی نے مجھے تباہ کر دیا

بڑی دیر تک وہ اسی طرح زیر لب بڑبڑاتے رہے۔ ان کی آواز میں زندگی کا سارا درد سمٹ آیا تھا آخر تھک ہار کر سو گئے۔

کچھ تو اس کربناک تنہائی نے اور کچھ ان کی معلمانہ زندگی نے انھیں لگاتار گھنٹوں بولتے رہنے کا عادی بنا دیا ہے۔ گفتگو کو وہ دماغ کا تنفس کہتے ہیں۔ پھر ان کے پاس موضوعات کی کمی نہیں لیکن حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ جس طرح وہ طلوع آفتاب، خوشبو، رنگ، چاندنی، شفق، کہکشاں اور قوس قزح پر گھنٹوں باتیں کر سکتے ہیں اسی طرح مشاق ریاضی داں کے اعتماد کے ساتھ وہ یہ حساب بھی لگا لیں گے کہ روزانہ دنیا میں لوگ کتنے سگریٹ پی جاتے ہیں۔ اور سگریٹ کے بچے ہوئے حصے میں کتنی مالیت کا تمباکو ضایع ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فراق صاحب کی ذہانت کا طلسم خلوت و جلوت ہر جگہ حاوی نظر آتا ہے۔ وہ بڑے بڑے جغادری قسم کے عالموں کی صحبت میں بھی سب سے الگ اور کسی حد تک سب پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ

کسی موضوع پر ان لوگوں سے کم ہی دسترس رکھتے ہوں جن سے وہ مصروف گفتگو ہیں لیکن یہاں بھی میدان انھیں کے ہاتھ رہے گا۔ کیونکہ ان کا علم اکتسابی نہیں [کوئی بھی نیا خیال ان کے ذہن میں داخل ہونے کے بعد ہزاروں خیالات کو جنم دے دیتا ہے]۔ ان کی گفتگو بقول مجتبیٰ سین (کراچی) کنول کے پھول کی طرح دھیرے دھیرے کھلتی ہے پھر اس میں ان گنت گوشے پیدا ہو جاتے ہیں ایک موضوع سے سینکڑوں موضوعات جھانکنے لگتے ہیں ایک بات سے ہزاروں باتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن فراق صاحب عام طور سے بھٹکتے نہیں ان کا تربیت یافتہ ذہن موضوع کے مرکز کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ خود اپنے الفاظ میں وہ موضوع کے مرکز پر سورج کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے گرد ہزاروں شعاعوں کا جال پھیل جاتا ہے۔ یہ عالم تقریر و تحریر میں ہر جگہ یکساں طور پر برقرار رہتا ہے۔ مزاج میں حد درجہ لاابالی نظر آنے کے باوجود ان کے یہاں باقاعدگی کی بھی کمی نہیں۔ اگر وہ یہ طے کر لیں کہ انھیں کوئی مضمون ایک نشست میں مکمل کرنا ہے تو کوئی بھی الجھن یا حادثہ اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روک نہیں سکتا۔ انگریزی ESSAYS کی ایک کتاب انھوں نے ایک مہینے میں مرتب کر ڈالی تھی۔ میں نے اکثر یہ منظر دیکھا ہے کہ وہ صبح صبح چائے پی چکے ہیں۔ اخبار ختم کر چکے ہیں کچھ لوگ آگئے جن سے گفتگو ہو رہی ہے فلسفے اور ادب کی گفتگو جس کے دائرے میں کالی داس اور بھوبھوتی، ملٹن اور شکسپیر سعدی و حافظ، کلچر اور سیاست سبھی سمٹ آئے ہیں اور ٹھیک اسی وقت وہ صاحب آگئے جنھیں فراق صاحب کو اپنے ESSAYS بول کر لکھواتے ہیں۔ (بول کر اس لئے کہ وہ خود لکھنے سے تقریباً معذور ہو چکے ہیں۔) اور وہ ہائی اسکول کے طلباء کے لئے دیہاتی پوسٹ مین، ریلوے انجن، سائیکل کی سواری۔ اور ریل کے سفر پر فی البدیہہ مضمون لکھوانا شروع کر دیں گے۔ مضمون ختم ہوتے ہی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ اور فراق صاحب ہائی اسکول والی سطح سے اٹھ کر پھر اپنی جگہ پہنچ جائیں گے۔ فلسفہ، ادب، کلچر اتنی جلدی ایک سطح سے دوسری سطح تک پہنچ جانا ان کا مزاج بن چکا ہے۔ اکثر وہ فطرت کی پاکیزگیوں کا ذکر کرتے کرتے گفتگو میں کوئی گرہ آجانے پر اچانک ایک موٹی سی گالی بھی بک جائیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ اس گالی کا استعمال محض شدت اظہار کے لئے ہوگا۔ گالی برائے گالی نہیں۔

اس سلسلے میں ایک بار ایک دلچسپ واقعہ بھی ہوا تقریباً دو سال قبل دلی میں ایک شام کو ہاتھ میں جام لئے فراق صاحب ایک چھوٹی سی نشست میں اشعار سنا رہے تھے۔

غیر رسمی سی نشست تھی جس میں صاحب خانہ نے چند مخصوص دوستوں اور اعزا کو مدعو کر رکھا تھا! چند خواتین بھی تھیں۔ سبھی بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔ کسی کو وقت گذرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ دفعتاً ایک خاتون جو مرحوم وزیر اعظم نہرو کے ذاتی عملے سے متعلق تھیں گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ فراق صاحب کا بے حد احترام کرتی تھیں اور فراق صاحب بھی ان پر شفقت فرماتے تھے انھیں اس طرح اچانک اٹھتا دیکھ کر فراق صاحب سرور میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔

"یہ حرام زادی کہاں چل دی"

خاتون کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ کوئی جواب دیئے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ہم سب ایک لمحے کے لئے چونکے پھر بات آئی گئی ہو گئی لیکن صاحب خانہ نے نشست ختم ہوتے ہی تنہائی میں مجھ سے اس واقعہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ دوسری صبح انھوں نے بہت دبے لفظوں میں فراق صاحب سے رات کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے خود ہی یہ تاویل بھی پیش کر دی کہ اس وقت "حضور شاید عالم کیف میں تھے لیکن فراق صاحب یہ سنتے ہی بپھر گئے اور قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہے میں قطعی نشے میں نہیں تھا۔ اس کمبخت کو میں اپنی بیٹی کی طرح مانتا ہوں میں نے یونہی پیار میں کہہ دیا تھا"

صاحب خانہ نے بھی جرح نہیں کی اور خاتون کو فون پر سمجھا دیا اور غالباً وہ بھی فراق صاحب کی اس ادا کو سمجھ کر زیادہ دیر تک گالی کھا کے بے مزہ نہ رہ سکیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ فراق صاحب کی شخصیت میں پیچ در پیچ اتنی تہیں اور اتنے زاویے ہیں کہ انھیں ایک مرکز پر جمع کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ان کی شخصیت بظاہر متضاد نظریات کا مجموعہ ہے وہ ہندوستانی ثقافت اور کلچر سے شدید پیار کرتے ہیں۔ لیکن مغربی طرز زندگی کو جدید ہندوستان کا واحد ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے سماجی یا معاشی استحصال کے کٹر دشمن ہیں لیکن ادب کو ان باتوں سے الگ وجدان کی چیز سمجھتے ہیں وہ عام انسانوں سے بالکل الگ نظر آتے ہیں لیکن ان کی آواز ہزاروں انسانوں کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے۔ وہ غصے میں پاگل ہو جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت میں اتنی ہی گھلاوٹ اور نرمی بھی ہے۔ ان کا مزاج انتشار اور تنظیم کا ایک عجیب و غریب مرکب ہے۔ وہ دیوانے بھی ہیں اور ہشیار

بھی اور بکار خویش ہی نہیں بلکہ برائے دیگراں بھی ہشیار ہیں ان میں شعلے کی تڑپ بھی ہے اور شبنم کا گداز بھی بلندی بھی ہے اور پستی بھی لیکن خود انھیں کے قول کے مطابق پستیوں تک آنے کے لئے انھیں اپنی سطح سے اترنا پڑتا ہے۔ ان کی زندگی ایک جھلسی ہوئی نا آسودہ، غم زدہ، نڈھال اور احساس کے زخموں سے چور زندگی رہی ہے لیکن اس کے باوجود ان میں زندہ دلی کی کمی نہیں وہ ہلکی پھلکی تفریحوں میں بھی پوری دلچسپی لیتے ہیں۔۔۔۔ لیکن مشینی تفریح (MECHANISED PLEASURE) کے قائل نہیں۔ انھیں ریڈیو اور گراموفون سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سنگیت کا لطف وہ اسی وقت لے سکتے ہیں جب مغنی کا چہرہ ان کی نظروں سے دور نہ ہو۔

ابھی کچھ ہی دنوں پہلے کا واقعہ ہے کہ گرمی اور پھر الہ آباد کی گرمی! خدا کی پناہ! فراق صاحب پسینے میں شرابور سول لائنس کے ایک بار میں گئے (دخت رز کا وظیفہ اب وہ روزانہ نہیں بلکہ طویل وقفوں کے بعد پڑھتے ہیں) ڈرائی جن کی ایک بوتل خریدی اور شیروانی کے بٹن کھول کر کرتے کی جیب میں سے روپئے نکالے تو نوٹ بالکل بھیگے ہوئے تھے۔ دوکاندار نے دھیرے سے کہا۔

صاحب یہ نوٹ بالکل تر ہیں۔

فراق صاحب نے فوراً بڑی شستہ انگریزی میں جواب دیا

"OH YES! I AM GIVING YOU WET MONEY FOR 'DRY GIN'

لیکن ان کی یہ زندہ دلی مجھے کڑوی کسیلی دوا کی وہ گولی معلوم ہوتی ہے جس پر شکر کا غلاف لپٹا ہوا ہو۔ وہ رات کی تنہائیوں میں شاید اپنی ناکامیوں پر روتے بھی ہیں۔ اکثر یہ آنسو اشعار میں ڈھل کر ان کے پڑھنے والوں تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اور دن کے ہنگاموں میں اپنے بے تکلف دوستوں اور طالب علموں کی موجودگی میں قہقہے بھی لگاتے ہیں اپنی زندگی سے بھرپور، تپی ہوئی بھاری اور کائنات پر چھا جانے والی آواز میں لیکن کبھی کبھی میں ان بلند آہنگ قہقہوں کو سن کر کانپ اٹھا ہوں۔۔۔۔

اور مجھے غیر شعوری طور پر ہارڈی کا یہ جملہ یاد آگیا ہے "THE PEOPLE WHOSE HEARTS ARE ALWAYS ACHING ARE THE ONES WHO JOKE MOST"

اور میں فراق صاحب کے اس انتہائی نامکمل خاکے کو اپنی معذوریوں کے احساس سے پریشان ہو کر یہیں ختم کرتا ہوں۔ بوتل میں جن کو قید کرنے کے قصے میں نے بھی سنے ہیں۔ لیکن خدا کی قسم یہ فن مجھے نہ آسکا۔ □

کلامِ فراق

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس دردِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
آج ہی خاطرِ بیمار شکیبا بھی نہیں

ہم اسے منہ سے برا تو نہیں کہتے کہ فراق
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

○

رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہیں زمان و مکاں میں ہے نام کو بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شبِ فراق اٹھے دل میں اور بھی کئی درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

○

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں، داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

عشقِ بے پروا بھی اب کچھ ناشکیبا ہو چلا
شوخیٔ حسنِ کرشمہ ساز کی باتیں کرو

عشق کی کایا پلٹ دی جس کی فرقت نے فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

○

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں

جنوں سے بھول ہوئی دل پہ چوٹ کھانے میں
فراقؔ دیر ابھی تھی بہار آنے میں

اب ان کو مہرِ قیامت کی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
ہوئے جو کھیپ کسی کی حیا اٹھلانے میں

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں ہوائے چمن
فراقؔ خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہاں گزراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم، جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے ایک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

آج پھر عشق دو عالم سے جدا ہوتا ہے
آستینوں میں لئے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

○

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحن سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم تیز
جینے میں جیسے دیر ہوتی جا رہی ہے آج

برہم سا کچھ مزاج عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اک موجِ دود سینے میں لرزاں ہے اس طرح
ناگن سی جیسی شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراقؔ
ہر چیز اک فسانہ ہوتی جا رہی ہے آج

○

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق کا دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گذر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوت نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکشِ جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گذری ہے
اتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

اگرچہ بے خودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

فراقؔ کے متفرق اشعار

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایہ

تجھ سے چھٹ کر بڑی فراغت ہے
اب مجھے کوئی کام کاج نہیں

خراب ہو کے اٹھا ہوں تری نگاہوں سے
مرا خیال ہے دنیا سنور گئی ہو گی

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

تھا ذکر کرم فراق اس کا کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے
دیکھ رفتارِ انقلاب فراق کتنی آہستہ اور کتنی تیز
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں خیر تم نے تو بے وفائی کی
عجب کیا کھوئے کھوئے سے جو رہتے ہیں ترے آگے ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقین نہ کوئی امید مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا
تجھے تو ہاتھ لگایا ہے بارہا لیکن ترے خیال کو چھوتے ہوئے میں ڈرتا ہوں
مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے
تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں
مانگتے مہر و ماہ کی دولت سوزِ پنہاں یہ آنچ آئی تھی
آئے جاتی ہیں دوست کی یادیں بڑھتی جاتی ہے میری تنہائی
میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراق آج جس کی نرم لو ہے شمع محرابِ حیات
اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے
کافی دنوں جیا ہوں کسی دوست کے بغیر اب تم بھی ساتھ چھوڑنے کو کہہ رہے ہو خیر

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

□

آغا سہیل
صدر شعبۂ اردو
ایف سی کالج، لاہور ۱۶

عہد زوال

جیسے ہی مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب سارے لوگ سو رہے ہیں اور رات بہت گہری ہو چکی ہے تو میں آہستہ سے اٹھا، دروازہ کھولا اور ریخ بستہ اندھیری رات میں کمبل کا بکل مار کر سیدھا اس جگہ جا پہنچا جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے اوپر سے اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اور اندر سے نہائی ہوئی تھی میں نے شیشے کی اس عمارت پر سے دھند اور کہر کو صاف کیا اور شیشے کی دیوار سے آنکھیں چپکا دیں۔ بستر پر وہ لیٹی ہوئی تھی، اس کے دونوں بازوؤں میں خون اور گلوکوز کی سرنجیں لگی ہوئی تھیں، سارا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا، دل کی دھڑکنوں کو ریکارڈ کرنے والی مشین چل رہی تھی اور گراف بنا رہی تھی چند نرسیں اور چند ڈاکٹر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ آپس میں کچھ بولتے اور بحث کرتے جا رہے تھے مگر آواز نہیں آسکتی تھی، شیشے کی دیواروں نے آوازوں کا راستہ روک رکھا تھا مریضہ کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت کر رہی تھی اور بار بار اپنے گرد و پیش میں لگے ہوئے تیسری دنیا کے نقشوں اور ننگی بھوکی سیاہ فام مخلوق کے مدقوق جسموں پر مرکوز ہو جاتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹروں کو کسی بات پر سخت اختلاف رائے ہے۔

یہ اختلاف رائے کتنے ہی دنوں سے جاری ہے۔ مریضہ جاں بلب ہے، کب سے مر رہی ہے، لیکن نہ تو مر چکتی ہے کہ سارا پاپ کٹے اور نہ صحت یاب ہوتی ہے اور میرا عذاب یہ ہے کہ نہ تو میں اُن کی آوازیں سن سکتا ہوں نہ ان تک پہنچ سکتا ہوں، نہ اپنی بات ان تک پہنچا سکتا ہوں۔

یا اللہ میں کیسے کرب میں مبتلا ہوں اور یہ کیسا عذاب ہے جسے میں جھیل رہا ہوں آخر مریضہ سے میرا تعلق کیا ہے، میں کیوں اُس تک پہنچنا چاہتا ہوں، پہنچ بھی جاؤں تو کیا کر سکتا ہوں، شاید کچھ بھی نہیں، لیکن میں ان طبیبوں کی گفتگو سننا چاہتا ہوں جو اس کا علاج کر رہے ہیں اور میں تو ان کو پہچانتا بھی نہیں، سوائے اس کے کہ ایک لمبا تڑنگا، سُرخ و سپید آدمی ہے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا ہے اپنے لمبے چوڑے جبڑے کو خوب فراخ صورت میں

بے تحاشا کھولتا ہے ہاتھ خوب زور زور سے چلاتا ہے۔ دوسرا ہے تو گورا چٹا مگر سرخ زیادہ ہے
گول ہے، جسم بھی فربہ ہے، جبڑے کو بھینچ بھینچ کر اور آنکھوں کو میچ میچ کر غراتے سے بولتا ہے۔
دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی اس کو تو کبھی اس کو، لیکن کوئی اس کی مسیحائی نہیں کر

جب بھی ذرا سی آہٹ ہو تو میں الٹے پاؤں واپس جا کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتا ہو
نیند نہیں آتی، اٹھتا ہوں، لیمپ کا بٹن آن کر کے اپنی پسندیدہ کتاب کھول لیتا ہوں اور ہزار بار ک
ہوئی عبارت کو پھر پڑھتا ہوں: چنانچہ پائلٹ نے ٹیک آف کیا، کیپٹن نے روایتی اعلان کیا کہ ہم
اتنے ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل پر اتنے گھنٹے اور اتنے منٹوں میں
جائیں گے اور پائلٹ نے جیسے ہی آسمان کی بلندیوں پر پہنچ کر نشیب پر نگاہ ڈالی اور سواد ا
نگاہ سے چھپا، وہ زمان و مکان کی طنابوں کو تڑا کر پھر وہیں پہنچ گیا، جیسے ایک بلند پہاڑی کی چ
پر ایک کٹیا میں سفید براق سی داڑھی اور سفید براق سی لمبی لمبی زلفیں بھنویں اور پلکیں تک برف
طرح سفید ہاتھ میں بڑی سی تسبیح لئے ہوئے وہ بولا کہ بیٹا تو کہیں بھی جائے گا ہرگز سکھ نہ پائے گا
کرب کا زہر تیرے رگ و پے میں دوڑا ہوا ہے اور تو اس شکنجے کو نہیں توڑ سکتا۔

میں نے کئی بار غصے میں کتاب بند کی، پاؤں پٹخے اور چاہا کہ اس تصویر کو ذہن سے جھٹک
دوں اس نورانی شبیہ کو ذہن سے مٹا دوں مگر مجھے ہر طرف وہی شکل نظر آتی ہے اور بہ تکرار عہد
عہد زوال کی تسبیح سنائی دیتی ہے۔

مسجدوں اور خانقاہوں میں دل کا سکون تلاش کیا، مرشدوں اور پیرانِ حق کی جو صحبت ا
بیٹھا، حتیٰ کہ بعض دوسرے ادیان کے ماننے والوں کی مجلسوں اور محفلوں میں بھی گیا لیکن ہر ہر جگہ۔
عہد زوال کی تسبیح خوانی کے الفاظ کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیا۔

ایک روز تو میں ایک دوست کے کہنے سے ایک مسیحی گرجا گھر بھی پہنچ گیا، لوگ جوق در جوق
آرہے تھے اور آآ کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھتے تھے میں بھی جا بیٹھا، سفید براق گاؤن پہنے پادری۔
بائبل کھول کر بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا، جو یوسف کو نہیں جانتا تھا○ اور اس نے
اپنی قوم کے لوگوں سے کہا دیکھو اسرائیل ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں○ سو
آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں
اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور

ملک سے نکل جائیں۔ اس لئے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کئے جو اُن سے
سخت کام لے لے کر ان کو ستائیں سو انھوں نے فرعون کے لئے ذخیرہ کے شہر پتوم
اور رعمسیس بنائے۔ پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور
پھیلتے گئے اس لئے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکر مند ہو گئے۔ اور مصریوں
نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کر کے ان سے کام کروایا۔ اور انھوں نے ان سے سخت
محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لے کر
ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں۔

پھر پادری نے بائبل کے تمام متعلقہ حوالہ جات کا اعلان کیا:

[بائبل کتاب مقدس: پرانا اور نیا عہد نامہ: ماخوذ از پرانا عہد نامہ: خروج:
۵۰-۱۷ اب ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، اور ۱۴-]

اور کتاب کو بند کر کے چوما اور آہستہ سے کتاب کو ریک پر لٹکا کر آنکھیں بند کر لیں: اس کے بعد پورے ہال میں خاموشی چھا گئی لوگ آہستہ آہستہ سرکنے لگے، میں بھی اٹھا اور سینے میں دل کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ جیسے کوئی چور دل کے اندر ہی چھپا بیٹھا کہہ رہا ہے کہ "اور جب یہ اپنی سفید بادبانی کشتیوں سے اپنے سفید براق گاؤن پہنے اپنی بغلوں میں بائبل دبائے ہوئے ہمارے ساحلوں پر اترے تو ہم نے جانا کہ اللہ نے آسمان سے زمین پر فرشتوں کو ہماری ہدایت کے لئے اتارا ہے لیکن جب رات دن اِن کی سپید بادبانی کشتیاں ہمارے پیارے وطن کی سرزمین پر پھیلا ہوا سونا سمیٹ سمیٹ کر اپنے وطنوں کو جانے لگیں تو ہم چونکے اور اب جب کہ سارا سونا ان کے ملکوں کو پہنچ چکا ہے اور یہ فرشتے نما مخلوق جو سفید براق سے گاؤن پہنے اپنی سفید بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر ہمارے ساحلوں سے واپس جا رہی ہے تو ان کی بغلیں خالی ہیں اور بائبل ہماری بغلوں میں دبی ہوئی رہ گئی ہے۔

کچھ حاصل نہیں، قرار کہیں نہیں ہے، سکون اور طمانیت عنقا ہے یہ سچ مچ عہد زوال ہے۔ میں عبارت سے نگاہ ہٹاتا ہوں، کتاب بند کرتا ہوں کمرے میں بار بار ٹہلتا ہوں اور پھر کمبل کا بکل مار کر نکلتا ہوں اور شیشے کی دیوار سے جا کر نگاہیں چپکا دیتا ہوں، وہی منظر، وہی مریضہ، وہی جانکنی اور نزاع کا عالم وہی نرسوں اور ڈاکٹروں کا جم غفیر وہی خون اور گلوکوز کی سرنجیں اور وہی بجھتا بجھتا کہ جس کی آواز ہم تک نہیں آتی شیشے کی دیواریں آوازوں کا راستہ روکے کھڑی ہیں میں کچھ سن نہیں سکتا، مگر دیکھتا، دیکھتا ہی رہتا ہوں، میں دیکھنے سے عجیب و غریب کرب میں مبتلا ہوں، لوٹتا ہوں، کمرے

بے تحاشا کھولتا ہے ہاتھ خوب زور زور سے چلاتا ہے۔ دوسرا ہے تو گورا چٹا مگر سرخ زیادہ ہے چہرہ گول ہے، جسم بھی فربہ ہے، جبڑے کو بھینچ بھینچ کر اور آنکھوں کو بیچ بیچ کر فراٹے سے بولتا ہے۔ مریضہ دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی اس کو تو کبھی اس کو، لیکن کوئی اس کی مسیحائی نہیں کرتا۔

جب بھی ذرا سی آہٹ ہو تو میں الٹے پاؤں واپس جا کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتا ہوں، نیند نہیں آتی، اٹھتا ہوں، لیمپ کا بٹن آن کرکے اپنی پسندیدہ کتاب کھول لیتا ہوں اور ہزار بار کی پڑھی ہوئی عبارت کو پھر پڑھتا ہوں: چنانچہ پائلٹ نے ٹیک آف کیا، کیپٹن نے روایتی اعلان کیا کہ ہم اتنے اتنے ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل پر اتنے گھنٹے اور اتنے اتنے منٹوں میں پہنچ جائیں گے اور پائلٹ نے جیسے ہی آسمان کی بلندیوں پر پہنچ کر نشیب پر نگاہ ڈالی اور سواد ارض نگاہ سے چھپا، وہ زمان و مکان کی طنابوں کو تڑا کر پھر وہیں پہنچ گیا، جیسے ایک بلند پہاڑی کی چوٹی پر ایک کٹیا میں سفید براق سی داڑھی اور سفید براق سی لمبی لمبی زلفیں بھنویں اور پلکیں تک برف کی طرح سفید ہاتھ میں بڑی سی تسبیح لئے ہوئے وہ بولا کہ بیٹا تو کہیں بھی جائے گا ہرگز سکھ نہ پائے گا کہ کرب کا زہر تیرے رگ و پے میں دوڑا ہوا ہے اور تو اس شکنجے کو نہیں توڑ سکتا۔

میں نے کئی بار غصے میں کتاب بند کی۔ پاؤں پٹخے اور چاہا کہ اس تصویر کو ذہن سے جھٹک دوں اس نورانی شبیہہ کو ذہن سے مٹا دوں مگر مجھے ہر طرف وہی شکل نظر آتی ہے اور بہ تکرار عہد زوال عہد زوال کی تسبیح سنائی دیتی ہے۔

مسجدوں اور خانقاہوں میں دل کا سکون تلاش کیا، مرشدوں اور پیرانِ حق کی جو صحبتوں میں بیٹھا، حتیٰ کہ بعض دوسرے ادیان کے ماننے والوں کی مجلسوں اور محفلوں میں بھی گیا لیکن ہر ہر جگہ مجھے عہد زوال کی تسبیح خوانی کے الفاظ کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیا۔

ایک روز تو میں ایک دوست کے کہنے سے ایک مسیحی گرجا گھر بھی پہنچ گیا، لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور آ آ کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھتے تھے میں بھی جا بیٹھا، سفید براق گاؤن پہنے پادری نے بائبل کھول کر بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا:

> "تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا، جو یوسف کو نہیں جانتا تھا۝ اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا دیکھو اسرائیل ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں۝ سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور

ملک سے نکل جائیں ۝ اس لئے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کئے جو اُن سے
سخت کام لے لے کر ان کو ستائیں سو انھوں نے فرعون کے لئے ذخیرہ کے شہر پتوم
اور رعمسیس بنائے۔ پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور
پھیلتے گئے اس لئے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکر مند ہو گئے ۝ اور مصریوں
نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کر کے ان سے کام کروایا ۝ اور انھوں نے ان سے سخت
محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لے کر
ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں ۝

پھر پادری نے بائبل کے تمام متعلقہ حوالہ جات کا اعلان کیا:

[بائبل کتاب مقدس: پرانا اور نیا عہد نامہ: ماخوذ از پرانا عہد نامہ: خروج:
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، اور ۱۴ - باب ۱۷-۵۰]

اور کتاب کو بند کر کے چوما اور آہستہ سے کتاب کو ریک پر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں: اس کے بعد پورے ہال میں خاموشی چھا گئی لوگ آہستہ آہستہ سرکنے لگے، میں بھی اٹھا اور سینے میں دل کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ جیسے کوئی چور دل کے اندر ہی چھپا بیٹھا کہہ رہا ہے کہ 'اور جب یہ اپنی سفید بادبانی کشتیوں سے اپنے سفید براق گاؤن پہنے اپنی بغلوں میں بائبل دبائے ہوئے ہمارے ساحلوں پہ اترے تو ہم نے جانا کہ اللہ نے آسمان سے زمین پر فرشتوں کو ہماری ہدایت کے لئے اتارا ہے لیکن جب رات دن اِن کی سپید بادبانی کشتیاں ہمارے پیارے وطن کی سرزمین پر پھیلا ہوا سونا سمیٹ سمیٹ کر اپنے وطنوں کو جانے لگیں تو ہم چونکے اور اب جب کہ سارا سونا ان کے ملکوں کو پہنچ چکا ہے اور یہ فرشتے نما مخلوق جو سفید براق سے گاؤن پہنے اپنی سفید بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر ہمارے ساحلوں سے واپس جا رہی ہے تو ان کی بغلیں خالی ہیں اور بائبل ہماری بغلوں میں دبی ہوئی رہ گئی ہے۔

کچھ حاصل نہیں، قرار کہیں نہیں ہے، سکون اور طمانیت عنقا ہے یہ سچ مچ عہد زوال ہے'
میں عبارت سے نگاہ ہٹاتا ہوں، کتاب بند کرتا ہوں کمرے میں بار بار ٹہلتا ہوں اور پھر کمبل کا بکل مار کر نکلتا ہوں اور شیشے کی دیوار سے جا کر نگاہیں چپکا دیتا ہوں، وہی منظر، وہی مریضہ، وہی جانکنی اور نزاع کا عالم وہی نرسوں اور ڈاکٹروں کا جم غفیر وہی خون اور گلوکوز کی سرنجیں اور وہی بکشم بکشا کہ جس کی آواز ہم تک نہیں آتی شیشے کی دیواریں آوازوں کا راستہ روکے کھڑی ہیں میں کچھ سن نہیں سکتا، مگر دیکھتا، دیکھتا ہی رہتا ہوں، میں دیکھنے کے عجیب و غریب کرب میں مبتلا ہوں، لوٹتا ہوں، کمرے

میں آتا رہتا ہوں۔ لیمپ جلا کر پھر کتاب کھولتا ہوں وہی ہزار بار کی پڑھی ہوئی عبارت، پائلٹ نے ٹیک آف کیا۔۔۔۔ اور ـــــ اور پھر جیسے ہی پائلٹ نے نشیب پر نگاہ ڈالی اور سواد ارض نگاہ سے چھپا وہ زمان و مکان کی طنابیں تڑا کر پھر وہیں پہنچ گیا ـــــ مگر یہ کیا، وہ پہاڑی اور اس پر بنی ہوئی کٹیا کہاں گئی اور وہ نورانی چہرے والا بزرگ کہاں ہے یہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار کیسا بنا ہے ہاتھ میں تلوار لئے خونخوار نگاہوں سے تکنے والا مہیب شکل کا یہ کون شخص کھڑا ہنس رہا ہے۔ شاید میری نگاہ کا دھوکا ہے میں اٹھ کر آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارتا ہوں کہ مبادا میری آنکھ لگ گئی ہو اور یہ شخص اصلیت میں وہ نہ ہو جو مجھے نظر آرہا ہے، فریب نظر ہو۔ یا نیند کے غلبے میں مجھے میرا ہی خیال تجسیم بن کر ڈرا رہا ہو مگر یہ کیا یہ تو سچ مچ وہی ہے جو میں پڑھ رہا ہوں، وہ عبارت کہاں غائب ہو گئی کہ جس میں ایک نورانی صورت بزرگ بلند پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمائے کٹیا میں بیٹھے تھے اور ان کی سفید براق سی داڑھی تھی اور سفید براق سی لمبی لمبی زلفیں تھیں حتیٰ کہ ان کی بھنویں اور پلکیں تک برف کی طرح سفید تھیں ہاتھ میں بڑی سی تسبیح لئے ہوئے تھے اور عہد زوال عہد زوال کی تسبیح خوانی کر رہے تھے ان کی جگہ یہ خونخوار گھوڑے سوار ہاتھ میں برہنہ شمشیر لئے آموجود ہوا ہے اور اس کی پشت پر انسانی کھوپڑیوں کا مینار چنا ہوا ہے، یہ سب کیا چکر ہے اور کیسا معمہ ہے۔

یا اللہ یہ کیسا عذاب ہے اور میں کس کرب میں مبتلا ہو چکا ہوں، کیا اس سے قبل بھی انسانی بستیاں عہد زوال کے مصائب میں اس طرح جا پھنسی تھیں کیا اسی قسم کے عذاب میں مبتلا ہو ہو کر وہ صفحہ ہستی سے ناپید ہوتی رہیں کہ اب جن کے صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔

میں پھر کتاب بند کرتا ہوں، آنکھوں کو دیر تک ملتا رہتا ہوں سر کو دیر تک ہتھیلیوں کے تکیوں پر ٹکا کر سوچتا رہتا ہوں کہ مبادا یہ سب خواب ہو، شاید میں خواب میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور حقیقت میں یہ سب کچھ نہ ہو جو مجھے نظر آرہا ہے، صورت حال شاید مختلف ہو مگر وہ مریضہ ـــــ مریضہ کا خیال آتے ہی میں پھر کمبل کا بکل مار کر باہر نکلتا ہوں شیشے کی دیوار سے آنکھیں لگا کر اندر کا احوال مشاہدہ کرتا ہوں وہی مریضہ، وہی جانکنی وہی نرسوں اور ڈاکٹروں کا جم غفیر اور مریضہ کا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اطراف و جوانب میں بہ حسرت و یاس ایک ایک کا چہرہ تکنا اور ہر ہر چہرے پر اپنے لئے ہمدردی اور پیار کے آثار تلاش کرنا۔ نہیں نہیں بس اتنا بہت ہے اب اور زیادہ دیر تک میں اسے نہیں دیکھ سکتا، میں لوٹتا ہوں اور کمرے میں آکر لیمپ جلاتا ہوں بے خیالی میں کتاب کھولتا ہوں اور بے خیالی میں ورق الٹ کر پھر اسی جگہ کی عبارت پڑھتا ہوں، پائلٹ نے ٹیک آف کیا اور پھر پائلٹ

نے جیسے ہی نشیب پر نگاہ ڈالی اور سواد ارض نگاہ سے چھپا وہ زمان و مکان کی طنابیں تڑاکر پھر وہیں پہنچ گیا مگر یہ کیا وہ عبارت جو یہاں تھی کہاں گئی نہ وہ کٹیا نہ وہ بزرگ، نہ وہ سوار اور اس کی خونخوار تلوار اور انسانی کھوپڑیوں کا میناران کی جگہ یہ ایک وادی ہے جس میں انسانی بستیوں سے آگ کے شعلے بلند ہیں اور دھواں آسمان تک پہنچ رہا ہے ایک زبردست دھماکہ ہوا تھا کہ سارا آسمان روشن ہو گیا تھا کہ رات پر دن کا گمان گزرتا تھا اب تو انسانی چیخوں اور فریادوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا خاک اور خون کا لاوا بہہ رہا ہے اور آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور دھواں آسمان تک جا رہا ہے اور پس منظر سے چپکے چپکے عہد زوال کی تسبیح خوانی کر رہا ہے وہ اسی نورانی چہرے والے بزرگ کی آواز ہے جس کا چہرہ غائب ہو چکا ہے۔

یہ کیسی بستی ہے یہ کیسی آگ ہے اور یہ کیسا انسانی کرب ہے۔ میں گھبرا کر کتاب بند کر دیتا ہوں، کمرے میں ٹہلتا ہوں، کتاب کی ادلتی بدلتی عبارتوں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ یہ کیا طلسم ہے آگے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عبارتیں بدل جاتی ہوں آخر پہلے والی عبارت کہاں غائب ہو جاتی ہے نئی عبارت کہاں سے آجاتی ہے اور یہ پائلٹ جو سفر ہی میں رہتا ہے اور ہمیشہ ٹیک آف کر کے جہاز اڑاتا نظر آتا ہے، نیچے کیوں نہیں اترتا، زمین پر کیوں نہیں آتا، کیا وہ بھی میری ہی طرح شیشے کی دیوار کے پیچھے جاں بلب مریضہ سے نگاہیں چراتا ہے کیا اس طرح حقائق سے فرار کر کے وہ حقائق کے تلخ زہر کو اپنے رگ و پے میں اتارنے سے محفوظ رہ سکے گا۔

میں ٹہلتا جاتا ہوں اور سوچتا جاتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر اس مریضہ کو بہر حال مرنا ہے اور میں اسے نہیں بچا سکتا اور نہ اسے نرسوں اور ڈاکٹروں کے نرغے سے نکال سکتا ہوں تو میں اسے ضرور مرتے ہوئے دیکھوں گا اور اب بہر حال اسے مر ہی جانا چاہئے کیوں کہ ڈاکٹروں سے اختلافات کے استنداد کا منطقی نتیجہ یہی ہے پس فیصلہ کن انداز میں کمرے سے نکلتا ہوں اور باہر جا کر شیشے کی دیوار سے نگاہیں چپکا دیتا ہوں وہی منظر ہے بعینہٖ وہی ہے کوئی فرق نہیں وہی کرب ہے اور وہی مریضہ کا جانکنی کا عالم ہے۔

تو گویا صرف یہ منظر ہے کہ نہیں بدلتا، اور کتاب کی عبارتیں ہیں کہ بدلتی جا رہی ہیں اور بدلتی ہوئی عبارت کا مفہوم بدل جاتا ہے مگر مفہوم کے سیاق و سباق میں عہد زوال کی تسبیح خوانی کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا، میں تھک جاتا ہوں، مریضہ نہیں مرتی اور نہ اس کی جانکنی ختم ہوتی ہے میں پلٹ کر کمرے میں آتا ہوں، کتاب اپنی جگہ موجود نہیں ہے میری کرسی پر کوئی شخص بیٹھا

ہوا ہے مگر اس کا چہرہ غائب ہے اس کی وردی پائلٹوں جیسی ہے میں اس کے چہرے پر رکھی ہوئی ٹوپی ہٹاتا ہوں، چہرہ پھر بھی غائب ہے تو یہ بول نہیں سکتا، پھر یہ آیا کہاں سے ہے اور یہ ہے کون، اور یہ کب آیا، مجھے کچھ خبر نہیں یا اللہ یہ کس عذاب میں مجھے مبتلا کر دیا گیا عہد زوال میں تشکیلیں مسخ ہو جائیں گی اور ــــ فیس لیس پیپل سے سابقہ پڑے گا۔ تو پھر میں، میں کب تک اپنا چہرہ سنبھال کر رکھوں گا، ممکن ہے کہ میرا چہرہ بھی غائب ہو چکا ہو ــــ میرا چہرہ ــــ ہاں ہاں کیا تعجب، میں آئینے کی طرف جاتا ہوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں، کہ میرا چہرہ بھی غائب ہے۔ □

دیوندر ستیارتھی

او پچھلے موسم کے ساتھی!

بمبئی میں ساحر کا گھر، سمندر کے کنارے
میں اس کا مہمان!
" ہمیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں!" ہم مل کر گنگناتے رہے۔
جیسے سمندر کی لہریں بھی ہمارے ساتھ سُر میں سُر ملا کر گا رہی ہوں۔
ساحر کو میں نے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح پیار کیا۔
کئی بار میں نے اسے ناراض بھی کیا ہوگا۔
اس کی ماں میری ماں تھی، اس کی بہنیں میری بہنیں۔۔ اس کا کلام میرا ہم سفر۔
بمبئی میں میرے اور بھی بہت سے دوست رہتے ہیں۔ مگر ساحر کا گھر ہی میرا گھر تھا۔
اس کی موت کی خبر سن کر مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
لاہور میں ان گنت بار میں نے سنت نگر سے پیسہ اخبار سٹریٹ جا کر اس کو سوتے سے جگایا تھا۔
جانے کتنی بار ہم انار کلی کے نظام ہوٹل میں ایک ساتھ چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔
میں نے ہی اسے پہلی بار لاہور کی دھنی رام سٹریٹ میں پنجابی کی شاعرہ امرتا پریتم سے متعارف کرایا تھا۔
کبھی لاہور سے امرت سر اور کبھی لاہور سے لائل پور ایک ساتھ سفر کیا۔
بمبئی میں اس نے مجھے بچن دیو برمن اور بمل رائے سے ملایا۔
سچن دیو برمن کے روبرو اس نے مجھے اردو کا ادیب" بتانے کے فوراً بعد" ہندی کہج کل " کا سمپادک
بتایا تو برمن دادا اچرج میں پڑ گئے۔
ساحر کی کتاب" پرچھائیاں" چھپ رہی تھی جس کا پیش لفظ علی سردار جعفری نے لکھا تھا۔
مجھ سے" پرچھائیاں" کے ڈسٹ کور پر اظہار خیال کی فرمائش کی گئی تو میں نے فوراً اس کی تعمیل کر ڈالی۔
" ادب کے نئے معمار" کے سلسلے میں ساحر نے اپنے جادو بھرے انداز میں جس طرح میری نوک زبان پر اترا

کی تصویر پیش کی تھی، اس کا یہ پر ہمیشہ قرض رہےگا۔

"ساحر اور اس کی شاعری" مرتبہ پرکاش پنڈت میں پرچھائیاں سے متعلق میری ناچیز رائے محفوظ ہے مگر یہی کتنا ہوگا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

جن دنوں ساحر نے تاج محل پر اپنی مشہور نظم لکھی، میں نے بھی پنجابی میں ایک نظم کہی تھی، جس کا تخاطب کسی فرضی محبوبہ کی بجائے اپنی بیوی سے ہی رہا۔

میرے موڈھے سر دھر کے
وِچ اداسی بھاری
تاج محل دی سوہج سندرتا
کی تکنی ایں پیاری

میرے کندھے پر سر رکھ کر، انتہائی اداسی کے عالم میں ـــــ تاج محل کی خوبصورتی کو تم کیا سوچ کر نہار رہی ہو، پیاری؟

اپنی پنجابی نظم میں میں نے بیوی کو یقین دلایا تھا کہ یہ مت سمجھو کہ تاج محل شاہ جہاں نے ممتاز محل کی یاد میں بنوایا۔ یہ تو ہر مرد نے ہر عورت کے لئے تعمیر کرایا ہے!

ملک کی تقسیم سے پہلے مجھے بارہا پنجابی اور اردو کے شاعروں میں ساحر کے ساتھ اس کی نظم تاج محل کے بالمقابل اپنی پنجابی نظم پیش کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ اور ہر بار میں نے اقرار کیا کہ ساحر کی نظم کے روبرو میری کاوش معمولی ہے۔ جب کہ ساحر یہ کہنے پر بضد رہتا کہ دونوں نظمیں اپنی اپنی جگہ معقول ہیں۔

پچھلے دنوں، جب پنجاب سرکار نے مجھے بطور "ہندی لیکھک" پانچ ہزار روپئے کا انعام پیش کیا تو ساحر لدھیانوی کو بھی بطور اردو شاعر یہی انعام پیش کرتے ہوئے دو پرانے دوستوں کو پبلک کے روبرو بغلگیر ہونے کا موقع دیا۔

ساحر نے "اچھے دن" دیکھنے سے پہلے تنگی اور ترشی کے دن بھی خوب دیکھے تھے لاہور میں ہی نہیں، بمبئی میں بھی۔

رام پرکاش اشک ہمارے اس تربینی سنگم کے تیسرے ساتھی تھے۔ اسے بمبئی کی فلمی دنیا میں سنگھرش کرتے کرتے گلے کے کینسر کا شکار ہو جانا پڑا۔

ساحر نے رام پرکاش اشک کو علاج کے لئے امریکہ کے ایک مشہور اسپتال میں بھجوایا۔

بعد ازاں ساحر نے رام پرکاش کو واپس بمبئی بلا لیا۔ کیوں کہ اس کے بھائیوں کا یہی تقاضہ تھا۔

ساحر بمبئی میں رام پرکاش کے پاس موجود تھا، جب اس کی موت ہوئی۔
میرے جیسا بدنصیب کون ہوگا، جو ان دنوں بمبئی میں ہونے کے باوجود رام پرکاش کے انتم درشن نہ کر سکا۔
ساحر نے کہا تھا۔ "ستیارتھی تمہیں قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔"
میں نے بار بار نیائے شرما کا نام لیا کہ انھوں نے مجھے کہیں اور الجھائے رکھا لیکن ساحر مجھ پر بہت خفا ہوا۔
ساحر کی شاعری میں ہندوستان کے لوک یان کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔
یان اور مہایان کا نام لیوا لوک یان۔
ساحر کے روبرو بمبئی میں برمن دادا نے مجھے "فوک لور" کے لئے "لوک یان" کا لفظ استعمال کرتے دیکھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ مگر ساحر نے بھنڈا پھوڑ کر دیا کہ یہ لفظ تو ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے دماغ کی اختراع ہے۔ اس کے باوجود برمن دادا کہتے رہے کہ شبد تو "برہم" کا روپ ہوتا ہے۔
دسمبر ۱۹۵۹ء میں مجھے لاہور جانے کا موقع ملا — بطور پنجابی شاعر۔
پاکستان میں یاترا کے دوران مجھے کراچی میں ناصر کاظمی سے ملاقات کے جانے کتنے موقعے نصیب ہوئے
کراچی میں سمندر کے کنارے گھومتے ہوئے ناصر کاظمی نے ان گنت بار ساحر کو یاد کیا۔
ناصر کاظمی کی ایک غزل غلام علی نے گائی ہے

او پچھلے موسم کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

ساحر کے بغیر مجھے دنیا عجیب سی لگتی ہے۔
حال ہی میں پنجابی کی پتریکا آرسی میں ساحر پر بہت سے لوگوں کے تاثرات شائع کئے گئے۔
لیکن آرسی کے سمپادک پرتیم سنگھ کو جانے کیا سوجھی کہ ادب کے نئے معمار والا ساحر کا وہ ریکھا چتر جانے کہاں سے ڈھونڈ نکالا اور اسے آرسی کے اسی شمارے میں چھاپ ڈالا۔ اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ دراصل ساحر زندہ ہے، موت تو میری ہوئی!... □

فارغ بخاری
پشاور، پاکستان

غزلیں

تیری خاطر یہ فسوں ہم نے جگا رکھا ہے
ورنہ آرائشِ افکار میں کیا رکھا ہے
ہے ترا عکس ہی آئینۂ دل کی زینت
ایک تصویر سے البم کو سجا رکھا ہے
برگِ صد چاک کا پردہ ہے شگفتِ گل سے
قہقہوں سے کئی زخموں کو چھپا رکھا ہے
اب نہ بھٹکیں گے مسافر نئی نسلوں کے
ہم نے راہوں میں لہو اپنا جلا رکھا ہے
ہم سے انساں کی خجالت نہیں دیکھی جاتی
کم سوادوں کا بھرم ہم نے روا رکھا ہے
کس قیامت کا ہے دیدار ترا وعدہ شکن
دلِ بیتاب نے اک حشر اٹھا رکھا ہے
کوئی مشکل نہیں پہچان ہماری فارغ
اپنی خوشبو کا سفر ہم نے جدا رکھا ہے

جب سے جنونِ چاک گریباں نہیں رہا
گلشن سا پھول کھلنے کا امکاں نہیں رہا
ویرانیاں برسنے لگیں، نخلِ دار پر
سر میں جو کجکلاہی کا ارماں نہیں رہا
اس شورشِ جنوں میں بھلا کس کو ہوش ہے
دامن نہیں رہا کہ گریباں نہیں رہا
اس اہلِ فن کا خاک بھروسہ رہا کہ جو
جلتی ہوئی رتوں میں غزل خواں نہیں رہا
اجڑی ہوئی بہاروں کا منظر ہے خیمہ زن
جیسے کوئی بھی چہرہ گلستاں نہیں رہا
سناٹے کے بگولے برستے ہیں چار سو
جیسے کسی بھی درد کا درماں نہیں رہا
راہیں ہیں سوگوار کوئی ہمسفر نہیں
ہیں قافلے ملول، حدی خواں نہیں رہا
کیا رندِ پاک باز تھا فارغ سیاہ مست
اس جیسا کوئی صاحبِ ایماں نہیں رہا

عصمت چغتائی

تجزیہ بازی

یہ کمبخت تجزیہ بازی بھی عجیب بازی گری ہے۔ جو چند ہی جملوں میں کبوتر کو بلی اور بلی کو کبوتر ثابت کر دیتی ہے۔ جس تحریر پر یہ سانحہ بیتتا ہے وہ صورت سے بے صورت ہو جاتی ہے۔ اس چیر پھاڑ کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ معصوم قاری خود کو احمق سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنے پہلے تاثر کو حماقت سمجھنے لگتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ لوگ ان تجزیوں اور تنقیدوں کے ورق الٹ جاتے ہیں اور کہانی پڑھ کر خود اپنا فیصلہ کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

جیلانی بانو کی کہانی آئینہ پڑھنے کے بعد دیر تک اس قدِ آدم آئینے میں آس پاس کی دنیا کے عکس ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ ہزاروں چہرے نظروں کے سامنے تیر جاتے ہیں۔ جینے کے وسائل کو حاصل کرنے کی تگ و دو۔ چھین جھپٹ، بوربور چادر کو زندگی کے گرد سمیٹنے کی جدوجہد، قلت مہنگائی ضروریات زندگی کا عام انسان سے دور تر ہوتا جانا۔ محرومی گھٹن مجبوری جو انسانوں کو چکناچور کر دیتی ہے یہ وہ اندوہ ناک المیہ ہے جو آج نہ جانے کتنے گھروں میں برپا ہے۔ نہ جانے کتنے اسلم سگھڑ بیویوں کی جادوگری کے سہارے ابھی سیدھے کھڑے ہیں۔ جب کہ چھت کے نیچے سے سب ہی سہارے ہولے ہولے سرکتے جا رہے ہیں۔ کتنے اکرم مستقبل کے اندھیروں کی چاپ سن کر اپنے میلے وجود پر تھوک کر جی ٹھنڈا کر رہے ہیں کہ ابھی ماں کے آنچل سے پیسے چرا کر گنے جا سکتے ہیں۔ کتنے نوخیز بچے وٹامن کی کمی سے اپاہج بن رہے ہیں۔ چاند سے ٹکڑے والی بیویاں سوکھی کھٹائی کی گرہ بن رہی ہیں۔ اور بزرگ چھپے چوری بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر اپنے حلق میں ٹھونس رہے ہیں۔

تو اسلوب احمد بے ساختہ اِس کامیڈی پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ انھیں زخموں سے چور چور انسانیت کو دیکھ کر بے حد ہنسی آتی ہے۔ وہ سوکھا ہاتھ گھاس کی طرح اجاڑ سفید سر چھکے سے چراتی ہوئی بوڑھی دادی ایک گھناؤنے رستے ہوئے ناسور کے بجائے شگفتہ پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ بجائے غم و غصہ کے اس "طربیہ" منظر کے تصور سے دماغ باغ و بہار بن جاتا ہے۔ زندہ رہنے

کی جد و جہد کو حرص اور للچاہٹ کا نام دیتے ہیں۔

فرانس کی ملکہ بھی مسکرا پڑی تھی کہ "یہ احمق روٹی نہیں ہے تو کیک کیوں نہیں کھاتے۔" اسے یہ بھی بڑی شغول کی بات نظر آئی تھی۔ اس نظام میں نرم نرم گدیوں پر بیٹھے بڑے حیرت زدہ ہیں۔ کہ آرام سے مرغن غذائیں کھانے کے بجائے احمق لوگ مارے لالچ کے چوریاں کرتے ہیں۔

احمد عباس نے ایک فلم بنائی تھی "دھرتی کے لال" جس میں ایک مجبور ماں اپنا جسم بیچ کر بچے کے لئے دودھ لاتی ہے۔ جب وہ بچے کے منہ میں دودھ کی بوتل دیتی ہے تو اس کی بوڑھی ساس جو بھوک سے نیم پاگل ہو چکی ہے وہ بوتل لب دم بچے سے چھین کر منہ میں لگا لیتی ہے۔ ساس بہو کی چھین جھپٹ میں دودھ زمین پر گر جاتا ہے۔

جب سکرین پر یہ سین آتا تو بہت سے تماشبین اسی طرح قہقہہ لگانے لگے تھے۔ اور ہال سے نکل کر خوب غل مچایا تھا۔

"کہ ہمارے پیسے واپس کرو۔" اس "طربیہ" پر ہنسنے کے بعد بھی پیسے وصول نہیں ہوئے تھے۔

عباس نے سب کے ٹکٹوں کے دام واپس کر دیئے۔ کنگال ہونا قبول کیا مگر بھینس کے آگے بین بجانے سے انکار کر دیا۔

جیلانی بانو کے قلم کی نوک آہستہ آہستہ دھار دار ہوتی ہی جا رہی ہے۔ اس میں زہر بھی اتر رہا ہے۔ یہ کہانی بڑی بھرپور ہے پوری ناول کئی ناولوں کا مواد ایک کہانی میں عجب طنزیہ انداز سے سمو دیا ہے۔ یہ طنز کہانی کے کردار پر نہیں بلکہ اس نظام اور ماحول پر ہے جو انسان کا تماشا بنا دیتا ہے اور پھر ان کی بوکھلاہٹ پر قہقہے لگاتا ہے۔

بہت عرصہ کے بعد کسی کہانی نے مجھے اس شدت سے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ ایک ایک حرف میں نے خون کے گھونٹ کی طرح پیا ہے ایک فلم سی دماغ میں چل رہی ہے جس میں ان گنت جانے اور انجانے دور اور قریب چہرے تیر رہے ہیں۔

جب کوئی اچھی کہانی لکھی جاتی ہے تو تجزیوں اور تنقیدوں کی کلہاڑیاں ادبی فضا میں رقص کرنے لگتی ہیں۔ بے معنی تحریروں کو الجھے چکر کھاتے جملوں کی مدد سے شاہکار ثابت کیا جاتا ہے اور دکھتی رگ کو چھونے والی تحریر کو یا تو نظر انداز کیا جاتا ہے یا اس کا مطلب خبط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مگر جیلانی بانو کا یہ آئینہ ٹیڑھی لکیر ثابت ہوگا۔ یہ آئینہ ہر گھر میں موجود ہے۔ یہ خوشگوار دِنوں کی آخری نشانی جو بڑے بزرگانہ انداز میں حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ سچ بولتا آئینہ کباڑیے کی دکان میں بھی بولتا رہے گا۔ تجزیوں کے قفل اس کے لبوں کو بند نہ کر پائیں گے۔

نوٹ: یقیناً "کفن" جیسے طربیہ کو پڑھ کر تو اسلوب احمد صاحب کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں گے۔ ☐

صلاح الدین پرویز

خوشبو ترے وصال کی

خوشبو ترے وصال کی آنکھوں میں بند ہے
اب خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی
سنتے تھے چاند میں کوئی آباد ہے پری
دونوں ہتھیلیوں سے بناتی ہے چاندنی
دیکھا ہے جب سے چاند بنا تیرے ہات میں
ہم کو پری کے چاند سے الفت نہیں رہی
اب خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی
پڑھتے تھے اک کہانی بہت پُر ملال سی
اک نازنیں کے عشق میں اک باکمال کی
جس دن سے تجھ کو پڑھ لیا دل کی کتاب میں
ایسی کہانی پڑھنے کی عادت نہیں رہی
اب خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی
رویا کریں گے ہجر میں تیرے وصال کو
مانگا کریں گے وصل میں ہم تیرے ہجر سو
تو ہی خدا بنے تو بنے ورنہ میرے یار
ہم کو خدا کی پاک عبادت نہیں رہی
اب خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی
خوشبو ترے وصال کی آنکھوں میں بند ہے

صلاح الدین پرویز

ہمارے گاؤں میں

ہمارے گاؤں میں
تمھاری یاد کی چادر کو اوڑھے
روز اک سورج نکلتا ہے
ہمارے گاؤں میں
تمھاری یاد کی چادر کو اوڑھے
روز اک مہتاب ڈھلتا ہے
ہمارے گاؤں میں
بہت پہلے رہا کرتے تھے
ہم جس گاؤں میں
اب وہ تمھارا ہے
ہمارا دل، تمھاری آنکھ میں
آنسو کا ڈیرا ہے
ہمارا ہونٹ بوسے کا
تمھارا ہونٹ ٹھہرا ہے
ہمارے گاؤں میں
ہمارے گاؤں میں اب ہم نہیں رہتے
ہمارے گاؤں میں اب روز اک جوگی نکلتا ہے
تمھاری یاد کے سورج کو ہاتھوں سے بجاتا ہے
تمھاری یاد کے مہتاب کو آنکھوں سے ملتا ہے
ہمارے گاؤں میں
تمھاری یاد کی چادر کو اوڑھے
روز اک سورج نکلتا ہے
ہمارے گاؤں میں
تمھاری یاد کی چادر کو اوڑھے
روز اک مہتاب ڈھلتا ہے
ہمارے گاؤں میں

صلاح الدین پرویز

سکھی کی حمد

سکھی تیری زلفوں میں سیاں کی کلیاں
سکھی تیری باہوں میں سجناں کی گلیاں
سکھی تیرے ادھروں میں چمبن کی جھڑیاں
سکھی تیرے نینوں میں بادل کی بتیاں
سکھی ہے ہمارے دکھے دن کی ساتھی
سکھی رنگ بھرے تھال میں ہے اداسی
سکھی سوندھی مٹی کا فانوس بھی ہے
سکھی حمد ہے اور طاؤس بھی ہے

سکھی سب درختوں کے میگھا میں چھن چھن
سکھی درد کے سارے رتبوں میں چُمبن
خدوخال اس کے مرے چمبنوں میں
سکھی رہ رہے ہیں دکھی مندروں میں
سکھی تیرے مندر میں بیلا چنبیلی
سکھی تیرے بنگلے کی بالا ہو جیوتی
سکھی مجھ کو بندیا سی ماتھے پہ رکھ لے
سکھی میرے ہونٹوں کو ہونٹوں سے سی دے

سکھی تیری زلفوں میں سیاں کی کلیاں
سکھی تیری زلفوں میں
سکھی تیری زلفوں میں

صلاح الدین پرویز

پیا کے لئے ایک نظم

پیا تیرے کارن میں جوگن بنوں گی
ترے گھر کے جنگل سے لپٹی رہوں گی

پیا تیرے کارن

پیا تیرے کارن میں دھڑکن بنوں گی
ترے من کے دریا میں ڈوبی رہوں گی

پیا تیرے کارن

پیا تیرے کارن میں آنگن بنوں گی
ترے تن کے صحرا میں بیٹھی رہوں گی

پیا تیرے کارن

پیا تیرے کارن میں چمبن بنوں گی
ترے گرم ہونٹوں میں سوتی رہوں گی

پیا تیرے کارن

پیا مجھ کو ہونٹوں کی جوڑی میں رکھنا
پیا مجھ کو باہوں کی توڑی میں رکھنا
پیا بن تمھارے کوئی بھائے نا
پیا بن پیا کے پیا جائے نا
پیا جائے تو پھر جیا جائے نا

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج پیالہ
پیا باج پیالہ

رشید امجد
راولپنڈی

لا = ؟ (۲)

اس نے زہر پی لیا ہے، اور اب موت کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ بھی کہتے ہیں کہ یا تو چپ چاپ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے آؤ، یا پھر زہر پی لو۔

وہ زندہ رہنا چاہتا ہے، لیکن یوں بغیر جانے بوجھے زندہ رہنا بھی کیا؟ زندگی کے رنگوں کو اپنی آنکھ دیکھنا، اپنے کانوں سننا، سوال کرنا، لیکن سوال کرنے کی اجازت ہی نہیں، بس دوسروں کے جواب ہی میں سے اپنا سوال تلاش کرنا ــــ

سوار گھوڑے سے اتر کر لمحہ بھر توقف کرتا ہے، پھر کہتا ہے ــــ "جناب آپ واپس چلے جائیں۔"

"کیوں؟"

"شہر کے لوگ نہیں چاہتے کہ آپ ان کے پاس آئیں۔"

"لیکن کیوں؟ انھوں نے تو خود ہمیں خط لکھ کر بلوایا ہے، اب ان کے دل کیسے بدل گئے؟"

"دل تو ان کے اب بھی آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں ــــ"

اور وہ کہتے ہیں چپ چاپ چلے آؤ، بولو کچھ نہیں،

زندگی کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا بھی عجب تجربہ ہے۔

نیزے پر ٹنگا سر آنکھیں کھولتا ہے، مسکراتا ہے ــــ "میں کٹ کر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔"

یہ بات سن کر وہ غراتے ہیں، اور دوڑتے ہوئے گلیوں میں گھس جاتے ہیں، صحنوں میں لوریاں دیتی عورتیں سہم جاتی ہیں، وہ جھپٹ کر بچوں کو پنگوڑوں میں سے اٹھا لیتے ہیں اور پھر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھے کہے، کرے، بچوں کی گردنیں مروڑ کر انھیں پنگوڑوں میں پھینک

دیتے ہیں۔

مروڑی ہوئی گردنوں والے بچے پنگوڑوں میں جوان ہوتے ہیں۔ طوفانی اندھیری رات میں ندی کی لہروں پر تیرتی ٹوکری میں سلامت گردن۔ آپ ہی سکراتا ہے۔

دور کنارے پر منتظر گوپیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرماتی ہیں، اور وہ جو ان سب میں نکھری نکھری سی ہے سر اٹھا کر ندی کی سمت دیکھتی ہے۔

"اس نے کہا تھا جب طوفان ندی کی تہوں میں اترنے لگے گا تو میں آؤں گا وہ غراتے ہوئے دوسری گلیوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ عورتیں پنگوڑوں میں پڑے بچوں کو اٹھا کر اندر والے کمروں میں بھاگ جاتی ہیں۔

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

"چپ —— چپ"۔

"لیکن"۔

"لیکن کچھ نہیں —— یا چپ یا پھر یہ زہر ——"

سارے راستے بند ہیں۔

وہ اپنا دھنش پھینک کر منہ موڑ لیتا ہے —— "میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا"۔

کالے گھور بادلوں میں سکراہٹ چمکتی ہے —— "یہ تو اپنی بقا ہے"۔

"لیکن کیسی بقا ہے جس کے لئے فنا کے دریا سے گذرنا پڑتا ہے"۔

سکراہٹ گھنی ہو جاتی ہے —— "بقا، فنا ہی کی ٹہنی کا پھول ہے"۔

منتظر گوپیوں میں وہ نکھری نکھری سی سر اٹھا اٹھا کر ندی کی طرف دیکھے جاتی ہے —— "وہ ضرور آئے گا، وہ دکھ میں آنے کا پابند ہے، اور میں نے اسے پکارا بھی تو ہے"۔

"حاضر جناب"

"تمھارا نام"

"جناب میرا کوئی نام نہیں —— نام تو اب ایک سوکھی ٹہنی ہے، میرا تو اب صرف نمبر ہے ۲۴۷۸۲۰-۴۰-۲۱۱، جناب یہاں اب محلوں اور گلیوں کے بھی نمبر ہی ہیں، نام تو اب بس گئے دنوں کی خوشبو ہیں اور خوشبو لوٹ کر کب آتی ہے"۔

"تو تمھارا شہر"۔

"جناب میرا شہر کئی اب نمبر ہے، ذپ نمبر، پھر اس کے اندر نمبر ــــ شہروں کے اندر شہر اور ان کے اندر اور شہر ــــ تہہ در تہہ شہر ہی شہر۔"

وہ کسی بہت ہی اندر کے شہر کی بہت ہی اندر کی گلی کے، بہت ہی اندر کے مکان میں پیدا ہوا ہے اور اب اندر اندر سے رس رس کر بہت اوپر اوپر آنا چاہتا ہے ــــ

وہ کہتے ہیں ــــ "تو چلے آؤ ــــ بے شک چلے آؤ، لیکن بولنا مت۔"

وہ کہتا ہے ــــ "لیکن۔"

لیکن "کچھ نہیں۔"

وہ کہتا ہے ــــ ؟

وہ کہتے ہیں ــــ ؟

کوئی کچھ نہیں کہتا، بس تماشا دیکھتا ہے کہ تماشا دیکھنے سے کسی کا کوئی حرج نہیں ہوتا۔

لیکن تماشا بھی آخر کب تک دیکھا جا سکتا ہے، اس لئے اس نے زہر پی ہی لیا ہے اور اب موت کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن موت تو اس شہر ہی سے روٹھی ہوئی ہے۔

اور تماشا دیکھتے دیکھتے اب خود تماشا بن بیٹھا ہے۔

زہر اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کئے جا رہا ہے۔ لیکن موت نہیں آتی، بس ٹکر ٹکر موت کی راہ دیکھے جانا۔

تو پھر اس نے زہر پی ہی لیا ہے! ☐

فرحت احساس

نئی دہلی

غزلیں

۱

زندگی سے میں تمھارا رابطہ بن جاؤں گا
میں تمھارے جسم و جاں کا راستہ بن جاؤں گا

مجھ سے کہہ دینا اگر حائل کبھی ہونے لگوں
اک قدم پیچھے ہٹوں گا فاصلہ بن جاؤں گا

چلتے چلتے جب تمھیں تنہائیاں محسوس ہوں
میں بکھر جاؤں گا اور اک قافلہ بن جاؤں گا

روز کی یکسانیت سے اوب جاؤ گی اگر
گھر سے نکلوں گا اور تمھارا حادثہ بن جاؤں گا

تم مری دنیا میں آجاؤ تو اس کے بعد پھر
میں تمھارے روز و شب کا ذائقہ بن جاؤں گا

۲

وہ لوگ کیا تھے جو اک رہگذار لگتے تھے
درخت جن پہ گھنے سایہ دار لگتے تھے

وہ پہلے شہر پہ کس کے لبوں کا سایہ تھا
تھکے تھکائے بدن آبشار لگتے تھے

نہ جانے کون سی موجودگی میسر تھی
مکان اجڑے ہوئے واگذار لگتے تھے

انھیں یقین بہت تھا کسی کے ہونے کا
وہ ایک ہوتے ہوئے بیشمار لگتے تھے

ہزار ٹوٹے ہوئے تھے وہ دوسروں کے لئے
ہمارے گھر تھے، ہمیں شاندار لگتے تھے

۳

سب در و دیوار مٹ جائیں مکاں باقی رہے
صرف بد روحوں کی خاطر یہ جہاں باقی رہے

شہر بننے سے ہمارے دشت و صحرا چھوٹ جائیں
مرنے والوں کے لئے جائے اماں باقی رہے

بس دھندلکے میں ہی دنیا اچھی لگتی ہے ہمیں
اس زمیں پر اے خدا تیرا گماں باقی رہے

وہ جو میرے بعد آئیں ان کے رہنے کے لئے
کیا کروں ایسا کہ یہ سارا جہاں باقی رہے

کوئی بھی آئے زمیں پر حکمرانی کے لئے
بس ترا چہرہ ہمارے درمیاں باقی رہے

ہم کو اپنے زندہ رہنے کا بڑا افسوس ہے
کیا ہوا ہم سے جو کوئی داستاں باقی رہے

(۴)

مجھے لیا ہے تو میرے یہ زخم بھی لینا
تمام عمر تمنا کی تازگی لینا

سیاہ جسم پھلانگو اگر بہادر ہو
تو یہ ڈری ہوئی معصوم روشنی لینا

کہ سر قلم ہوا میرا، کتاب پوری ہوئی
یہ بوند بوند ٹپکتی ہوئی خوشی لینا

یہ میری راہ میں حائل ہے ایک مدت سے
زمانے والو ذرا میری زندگی لینا

جو تم کو عشق ہوا ہے تو پہلے ناؤ بنو
پھر اپنی ریت میں ڈوبی ہوئی ندی لینا

جو سارے شہر کی بدصورتی کا باعث ہے
مجھے کسی نے کہا ہے کہ بس وہی لینا

(۵)

مری شبیہہ کو تاریک تر بناتی ہوئی
کسی چراغ کی لو مجھ سے دور جاتی ہوئی

یہ اس کے وعدہ نبھانے کی آخری شب ہے
یہ ہلکی ہلکی صدائے سحر سی آتی ہوئی

کسی کے ہاتھ مجھے چاک پر چڑھاتے ہوئے
کوئی ہوا مرے نقش و نگار ڈھاتی ہوئی

کسی بدن پہ مرا اختیار ہوتا ہوا
کسی خیال کی رو پھر مجھے رلاتی ہوئی

سنوارنے بھی نہ پایا تھا اپنے آپ کو میں
چلی گئی وہ مجھے آئینہ دکھاتی ہوئی

دیارِ غیر میں اپنے مکان بنتے ہوئے
سپاہِ غیر مکانات کو گراتی ہوئی

(۶)

اب دل کی طرف درد کی یلغار بہت ہے
دنیا مرے زخموں کی طلبگار بہت ہے

اب ٹوٹ رہا ہے مری ہستی کا تصور
اس وقت مجھے تم سے سروکار بہت ہے

پانی سے الجھتے ہوئے انسان کا یہ شور
اس پار بھی ہوگا مگر اس پار بہت ہے

ہر سانس اکھڑ جانے کی کوشش میں پریشاں
سینے میں کوئی ہے جو گرفتار بہت ہے

مٹی کی یہ دیوار کہیں ٹوٹ نہ جائے
روکو کہ مرے خون کی رفتار بہت ہے

حسین الحق
پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو
مگدھ یونیورسٹی۔ بودھ گیا (گیا، بہار)

گھنے جنگلوں میں

میں نے آہستہ سے ذرا سی لحاف سرکائی ——

چاروں طرف سردیوں کی گھپ اندھیری رات بکھری پڑی تھی ——

"کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں پر کہاسہ اتر رہا ہوگا۔" میں نے سوچا ——

میں نے سوچا، اور دیکھا، اور سنا۔

میرے دائیں طرف ایک چارپائی پر چچا نصیر احمد اور بائیں طرف ایک چارپائی پر حمید احمد نیند کے گھنے جنگل میں گم تھے اور کھپریلوش دالان کی چھپرے ٹھنڈی ہواؤں کے تیر چل رہے تھے اور دالان کے دروازے پر ٹاٹ کے پڑے پردے ہل رہے تھے اور پردوں سے ہوا کی آنکھ مچولی کے سبب دھند میں کھوئے بیرونی آنگن میں لگے امرود لیموں اور نیم کے درخت یوں ہلتے لگ رہے تھے جیسے ۱۸۵۷ء کے سپاہی زخم کھا کھا کر جھوم رہے ہوں۔

"سوا سو برس کا فاصلہ کیسے طے ہوگا؟" میرے من میں ایک آشنکا نے سر اٹھایا۔

آشنکا کے تیز زہریلے دانتوں والا ناگ پھنکاریں مارتا رہا، میں محسوس اور غیر محسوس کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا.... کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں پر کہاسہ گرتا رہا اور کہیں دور سے چوکیداروں کی آوازیں آتی رہیں.... ہو.... ہو.... ہو....." مجھے یاد آیا، جب دن میں محال وارث علی کی بنجر زمینوں اور قبرستانوں میں چکر لگا رہا تھا، تب بھی ایک آواز بار بار ابھر رہی تھی.... ڈوب رہی تھی.... مگر شاید عصر کی کثافتوں یا اژدحام میں وہ آواز اپنا راستہ بھول گئی....

یا میں اس آواز تک پہنچنے کا راستہ کھو بیٹھا۔

خبر نہیں.... خبر نہیں....."

تحریر فرمایا حضرت قاضی وحیدالحق آنذاردی نے کہ بزرگ ہمارے مثل مخدوم غلام اشرف اور مولانا غلام یحییٰ عالی مرتبت بزرگ تھے، مقدم الذکر بارہ برس تک مسلسل روزہ رکھتے رہے اور

وقت اتھا امرود کے اس درخت سے جسے حضور نے خود لگایا تھا اور جو سال بھر پھل دیا کرتا تھا، ایک امرود تناول فرمایا کرتے اور تونس ندی سے جھک کر ایک چلّو پانی نوش فرمایا جاتا۔۔۔۔اللہ بس باقی ہوس موضع الذکر بزرگ کی شخصیت ہنوز تشنۂ تحقیق ہے کہ یوپی اور بہار دونوں جگہ کئی غلام یحییٰ پیدا ہوئے اور سب ہی کسی نہ کسی طرح عہدہ قضا سے وابستہ رہے اور تحریر فرمایا مورخ فیروز شاہی نے کہ بزرگ ہمارے مثل قاضی تاج الدین (قاضی بدایوں) مقامِ فنا کی اس منزل پر واقع تھے جہاں رسول اکرمؐ ان کی تشبیہ و تجسیم اختیار کر کے مشتاقانِ دید کی پیاس بجھاتے ؏ تیرے کرم پہ منحصر میرے خدا کی آبرو۔

میں نے لحاف ذرا اور اوپر سرکالی کہ دسمبر کی سرد ہوا کے بے فیلے جھونکے آنکھ اور ناک میں تیر کی طرح گھسے چلے جا رہے تھے، طاق میں جلتی مدھم لالٹین کی بتی ہی کمزور روشنی میں دالان کا سارا منظر بڑا ہی پُر اسرار اور رومانی بنا ہوا تھا اور چچا نصیر احمد اور چچا حمید احمد نیند کے سمندر میں شاید خوابوں کی کشتی کھے رہے تھے۔

دیواروں پر سائے تیر رہے تھے۔
اور باہر چاروں طرف رات بکھری ہوئی تھی۔
"یہ سوا سو برس کے بعد تمہیں کیا سوجھی میاں؟"
"ماضی مجھے بہت پریشان کرتا ہے حضرت؟"
"واپسی ناممکن ہے۔"
مگر شہزادے بھی کب کسی کی تقدیر بنا ہے؟"
"عملِ تحرک صرف دائروی نہیں ہے"

مجھے بہت زوروں پہ ہنسی آئی جی چاہا یاد دلاؤں کہ عہدِ زوال کی پیداوار تو دراصل آپ ہی لوگ ہیں۔ یہ سارا فلسفیانہ نقطۂ نظر تو گویا گریز کی ایک تکنیک ہے، جب ٹکڑی میں آپ کے رشتہ داروں کے دروازوں پر جنگ لڑی جا رہی تھی، اس وقت آپ کائنات کیا ذات سے تئیں بھی مخلص نہ ہو سکے اور ہر چہار اطراف پھیلتی تیز آگ سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں نکالی گئی، راستے تو صرف دو ہی تھے یا تو مولف سیر المتاخرین والا راستہ جو ناصر الملک سے ہو کر گزرتا ہے یا مرشد آباد والا راستہ جس کے شروع وسط یا آخر کہیں کوئی اور منزل نہیں۔

"خبر نہیں۔۔۔۔خبر نہیں۔۔۔۔"

دھندلی چاندنی چاروں اور تنی رہی ۔۔۔۔ رات یا ہر چاروں طرف بکھری رہی ۔
"اور ۔۔۔۔۔۔"

" حضرت کی تشریف آوری غالباً سکندر پور سے ہوئی ؟" میں نے مودبانہ انداز میں سوال کیا۔

" ہاں میاں ۔ اب کے قافلے والوں کو بہت دور کا سفر طے کرنا نہیں پڑا ۔" خالص یو پی والے لہجے میں جواب دیا اور گردن تسبیح کر کے سامان آتارنے میں مشغول کسی مزدور کی طرف متوجہ ہوئے
"ای تو کا کرت ہا ؟ وارث تو ہیں کچھ سمجھ میں آوت ہے کا نا ؟ ای بکسہ تو ہیں سا جائے کی نے چاہی ؟"
نوجوان کے چہرے پر خفیف خفت کے آثار جھلکے اور فوراً بکس مزدور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

" اِس بکس میں شاید زیورات ہوں ۔" دل میں اِک گمان گزرا اور فوراً بزرگ میری طرف مخاطب ہوکر بولے " نہیں میاں اس میں موئے مبارک اور نقشِ پائے مبارک حضرت سرورِ کائنات اور جائے نماز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام محفوظ ہے ۔"

محفلِ سماع میں جب قوال اس شعر پر پہنچا ؎

ہر قلم چوں کشد تیغ نہم سر بہ سجود
او بہ ناز نے مجھے من بہ نیاز سے بجھے

تو صاحبِ سجادہ حضرت مولانا غلام یحییٰ مثل ماہی بے آب تڑپا کئے اور صاحبزادے ، قاضی وارث علی شتےٗ اور لاشئےٗ کے گرداب میں ابھرتے ڈوبتے رہے اور مراقبہ سے سر نہ اٹھایا اور محفل سماع برپا رہی ۔

تب ماضی کا مکان ماضی بعید میں گم ہوگیا اور قطب الدین مدنی نے صفیں آراستہ کیں ۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔ قلب و جناح و میمنہ و میسرہ کو اس طرح پر ترتیب دیا کہ بسواری دلدِ اکبر امیر سید نظام الدین کے سید احسن ولد سید محمد و شیخ منہاج الدین سرداران لشکر کو بہ ہمراہی پیادگان تیر اندازکے مقرر کیا و بسر کردگی امیر قیام الدین ولد اوسط کے سید یوسف قتال و سید محمد غوث عرف گوسائیں و سید پیا کو میمنہ پر مقرر کیا اور بافسری امیر تاج الدین ولد اصغر کے شیخ حاجی جمال و شیخ ضیاالدین مفسر و شیخ حسام الدین غوری سرخیلان کو میسرہ پر مامور کیا اور شیخ شہاب الدین

محمدی و شیخ ثنا و شیخ بہاء الدین سالاران کو پشت لشکر پر روانہ کیا ......
.... مجبور ہو کر دوڑتے فوج راجہ کے دست بقبضہ کمان اور تیر سے گیا اور
قتل او لوں کے تیر برسانا شروع کئے کہ اس میں راٹھور مع اپنی فوج سے روگرداں
ہو، اس بھاگنے میں بہت فوج راجہ کی ماری گئی اور شکست فاش راجہ راٹھور کو اور
فتح عظیم نصیب لشکر اسلام کو ہوئی ...."
پھر "آئینہ اودھ" مصنفہ مولانا ابوالحسن مانکپوری کے اوراق ہواؤں میں بکھر گئے
اور میں ان بکھرے ہوئے شکستہ اوراق کو سمیٹنے کے لئے ہر چہار اطراف پاگلوں کی ط
دوڑتا رہا اور ایک تیز بھیانک آندھی مجھے خزاں میں درخت سے گرے زرد، کمزور، بے ج
پتوں کی طرح اپنے طاقتور جھکڑوں کے بھنور میں گھیرے آگے بڑھتی رہی یہ آندھی کدھر جائے
میں کدھر جاؤں گا؟
میں کدھر جا سکتا ہوں؟
مجھے تو ابھی تمام رستوں کا پتہ بھی نہیں ہے۔
یہاں بھی تو لوگوں سے پوچھتا پوچھتا پہنچا ہوں، سہسرام سے بکسر، بکسر سے اجیار گھاٹ، دہا
سے ساگر جالی ..... وہاں ایک ہوٹل میں چائے پینے کے بہانے گھس گیا، چائے پیتا رہا، چہروں
پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔
آنڈاری کے راہی کینے سے پائے، جائی جی؟"
"روا کے گھر بہار جا کا؟"
(جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو") جی .... ج .... جی .... (ہپ) .... ناہیں تو!
"ناہیں کیسے بندھو، آپ کی بھاشا بتلا رہی ہے کہ آپ اس چھیتر کے نہیں ہیں۔"
دُھت تری لسانیات کی ایسی تیسی!"
"چلئے آپ کو آمڈاری پہنچا کر اسی اور سے معصوم پور پرستھان کر جاؤں گا۔"
"پتہ نہیں وہ آنڈاری سے روانہ ہو کر معصوم پور پہنچے کہ نہیں کہ میں تو ....."
کہ میں تو ....."
دروازے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ چوکیدار نے دور ہی سے آواز لگائی "کسے ہ؟"
کیا لفڑا لگا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟ حسنی حسینی سیدوں کے یہاں بھی اموی اثرات سے

پھٹکارا نہیں؟"

قاضی صاحب ہنس کر کہنے لگے "چپ رہو .... چپ رہو .... ملت کا مفاد مجروح ہوتا ہے" آپ لوگوں نے تقیہ کے لئے جواز تلاش کیا ہے۔"

"تیرے خاندان میں شیعت کبھی نہیں رہی نالائق؟" انھوں نے ہنستے ہوئے میرے کان اینٹھے اور مجھے لئے ہوئے صدر دروازے سے بیرون حویلی، پھر دالان، پھر ایک بڑا دروازہ، پھر ایک بڑا کمرہ اور پھر ایک بڑی دالان سے گزرتے ہوئے اندرون حویلی میں پہنچے۔

"اِس سے ملی ہو؟ یہ ۱۹۴۹ء میں پیدا ہونے والی ہماری سات پشت آگے کی ایک آزاد خیال مگر بے چین روح ہے۔"

بی بی صاحبہ مسکرایا کیں اور میں چھ سات پشت پہلے رہنے والوں کے کھنڈرات میں مارا پھرا۔

"یہاں سے محال وارث علی شروع ہوتا ہے ..... اور وہ"... نصیر چچا نے بتایا....

قاضی وارث علی کا مکان تھا.... یہ .... نصیر چچا نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا.... یہاں سنا ہے کہ قاضی صاحب کی بیرونی بیٹھک تھی ..... یہ ..... ایک اور طرف انھوں نے انگلی اٹھاکر بتایا..... یہ قاضی صاحب کی کچہری تھی ......"

یہ زمینیں ......؟؟
علاقے کے کرمیوں کے قبضے ہیں۔

بغل میں حاجی رحمت اللہ عراقی کے پختہ مکان کے پختہ برآمدے میں قصبے کے کسی قضیے کا تصفیہ ہو رہا تھا۔

زوالِ آدم خاکی .....؟؟

"واضح باد کہ آباء و اجداد ہمارے آنڈاری ضلع بلیا کے باشندے ہیں، شاہان اسلام سے ان کے لئے معافی و جاگیرات و نذرات بہت کچھ ملے ہوئے تھے بالخصوص حضرت مخدوم غلام اشرف اپنے وقت کے غوث تھے، سب لوگ مطیع و مسخر رہے اور غایت یہ کہ بادشاہ وقت بھی دلدادہ حضور کا تھا، اس کے بعد حضرت سید شاہ قاضی عبدالحکیم تک لوگ قاضی و مفتیٔ صوبہ مقرر ہوا کئے...."

"ارے سنو تو ....." میں نے ملفوظ حضرت مسرور سہسرامی ثم اورنگ آبادی بند کر دیا۔

"اسی میں تاکیں یہ بھی لکھا ہے کہ ایسی بھی پانچ جگہوں کی حصہ داری میں دادا وغیرہ کا نام

درج ہے..... اس کو پیچھے کی کوئی صورت نہیں ہے؟ (ہمارے ابن عم مرکزی حکومت سے کما ریونجوسے وابستہ ہیں۔)

وحشیانہ رقص..... پراسرار، بھیانک اور اندھیری رات چاروں طرف چھائی رہی..... کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں پر کہاسہ اترتا رہا اور ہارا ہوا سپاہی آنڈار ی کے کھلے میدانوں میں اپنے آپ سے بے خبر رقص کرتا رہا اور گاتا رہا۔ ؎

منم عثمان ہاروَنی کہ یارِ شیخ منصورم
ملامت می کند خلقے و من بردار می رقصم

اور بستی کے باہر گماشتہ جی بیل گاڑی لئے انتظار کرتے رہے.... اور جب آدھی رات ادِھر اور آدھی رات اُدھر کا پہر ٹھہرا تو ایک بوڑھا، ایک بڑھیا..... اور ایک لڑکا بستی کی گلیوں سے چھپتا چھپاتا نکلا اور بیل گاڑی پر سوار ہو گیا۔

" چلا ہا نتھو بھائی..... تنک بیلن سب کے ایک سمان دوڑیا تو..... گماشتہ جی نے بیل گاڑی پہ آگے چڑھتے ہوئے نتھو گاڑی وان سے کہا۔

بیل گاڑی روانہ ہو کر کچھ دور ہی چلی تھی کہ بوڑھے کو کچھ یاد آگیا۔

" گماشتہ جی۔ ذرا رکئے"

"کا بات ہا سرکار؟"

" ذرا روکئے تو گاڑی۔"

گاڑی رک گئی۔

" میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔" بوڑھے نے بستی کی طرف رُخ کیا تو گماشتہ جی دوڑکر آئے آگئے۔

" سرکار بات کا ہا؟ ؟"

گماشتہ جی! ہمارے بزرگوں کی روایت رہی ہے کہ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ نقلِ وطن کرتے ہیں تو متروک گھر کی کوئی اینٹ یا تھوڑی سی مٹی ساتھ لے جاتے ہیں اور نئی جگہ بننے والے گھر کی بنیاد میں اسے رکھ دیتے ہیں..... میں صبح سے یاد کئے ہوئے تھا، اسی وقت بھول گیا...."

گماشتہ جی ابھی سامنے سے ہٹے بھی نہ تھے کہ ایک طرف سے گردوغبار کا طوفان سا اٹھا اور ہواؤں کے ریلے کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں۔

"سرکار..... "گماشتہ جی نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بوڑھے سپاہی کو گود میں لے کر بیل گاڑی پر رکھ دیا اور خود لپک کر آگے بیٹھتے ہوئے چیخ کر بولے..... دشمن در دبنے پر آ گئیں اسرکار.... ہانکا ہو نتھو..... بھاگا ہو نتھو....."

تازہ دم جوان بیل ابلق کی رفتار سے ایک سمت بھاگے جا رہے تھے اور دوسری سمت سے ابلق پہ، سوار درانہ دوڑتے ہوئے بستی میں داخل ہو رہے تھے....."

ساری رات بستی کے محلات اور کھنڈرات میں چاپ ابھرتی رہی اور ڈوبتی رہی....."

ساری رات.... سردیوں کی گھپ اندھیری رات .... چاروں اور بکھری پڑی رہی۔"

کھیتوں کھلیانوں اور میدانوں پر کہاسہ اترتا رہا....."

چچا نصیر احمد اور چچا حمید احمد نیند کے سمندر میں جانے کاہے کی کشتی کھیتے رہے...."

اور میں ساری رات..... ہاں لوگو ساری رات....."

منہ اندھیرے جب میں پہلی بس پکڑنے کے لئے بستی سے روانہ ہوا، تیز تیز قدموں سے چلتا..... بستی سے نکل رہا تھا تو حال وارث علی کے قبرستانوں سے گزرتے ہوئے جی چاہا کہ رک کر فاتحہ پڑھ لوں مگر یاد آیا کہ ابا سے جھوٹ بول کر آیا ہوں کہ گیا جا رہا ہوں اگر یہ بس چھوٹی تو سہسرام چھ سات بجے شام سے پہلے نہیں پہنچ سکوں گا....."

"اور ابا ٹھہرے اختلاج قلب کے شکار....."

تو میں قبرستانوں سے گزرتا آگے بڑھتا رہا.... قبرستانوں میں قبروں کے پٹ کھلے رہے.... مردے اپنی اپنی قبروں میں رقص کرتے رہے.... اور نعرۂ مستانہ بلند کرتے رہے.... اللہ ہو.... اللہ ہو..... اللہ ہو....."

(چوکیدار کی آواز رات بھر آتی رہی تھی.... ہو..... ہو..... ہو.....")

"آواز اور آواز کے درمیان کیا رشتہ ہے؟" میں نے بس پر چڑھتے ہوئے سوچا۔

"ابن عم ایک ٹرک سے نیچے لیٹا، بڑے اطمینان کے ساتھ، ٹرک کی مرمت میں مصروف تھا۔"
میں نے یکسر بس ڈپو کے آس پاس ٹہلتے ٹہلتے دیکھا ——

گماشتہ جی! ہمارے بزرگوں کی روایت رہی ہے کہ....."

"..... دشمن بچھو نیچ انگاری ماں پہنچ گیا ہے.... بھاگا ہو بھائی جی.... گلین ماں چاروں اور چھپا ہو گئیں بابیا.... اتاری اتاری جیا.... اہو میر صاحب....." □

شہپر رسول

۹۳، ضیاء الدین، ایم۔ ایم۔ ہال
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

غزلیں

کیا تھا درد نے روشن جو داغ چھین لیا
ترے خلوص نے ہم سے چراغ چھین لیا
کوئی سوال جو آئے تو دل تلک آئے
کہ ہم سے پیکرِ گل نے دماغ چھین لیا
بجھا کے دید کی مشعل وہ سامنے آئے
اگر شراب عطا کی، ایاغ چھین لیا
بھری بہار میں یک تحفۂ خزاں دے کر
کسی نے سبز امیدوں کا باغ چھین لیا
وہ اپنے آپ میں رہتا ہے کس قدر مصروف
کہ اس نے اپنے ہی دل سے فراغ چھین لیا
ہمارے ہاتھ بھی بے جاں نہ تھے مگر شہپر
ہوا کے ہاتھ نے ہم سے چراغ چھین لیا

گاؤں کے پیپل کی وہ کم کم جوانی کیا ہوئی
تھی کسی لمحہ کی اک زندہ نشانی کیا ہوئی
خواہشیں مایوسیوں کے دشت میں کیوں آگئیں
جسم و جاں سا ملکِ دل سی راجدھانی کیا ہوئی
حسرتوں کے ساتھ ماضی پوچھتا ہے حال سے
اک عمارت راستہ میں تھی پرانی کیا ہوئی
اب مجھے سچائی بھی لگتی ہے لفظوں کا فریب
اب وہ تیرے جاں نثاروں کی کہانی کیا ہوئی
سوچ کی وسعت پہ سناٹے نے پر پھیلا دیے
بات ان ویران آنکھوں سے زبانی کیا ہوئی
اس سے کل کی گفتگو کو سوچ کر حیران ہوں
لفظ کے پیکر تو ہیں روحِ معانی کیا ہوئی
میرے ہی شعروں نے مجھ کو سب میں تنہا کر دیا
اک قیامت ہو گئی جادو بیانی کیا ہوئی
شہپر اپنے دوستوں سے پوچھنا کچھ روز بعد
کیا ہوا میدانِ جنگ اور خوں فشانی کیا ہوئی

مظہر الزمان خان

H.NO. 256 - SPL, C
C.B.I. KACHIGUDA
HYDERABAD (500027) A.P.

چھوڑا ہوا گھر

(انتظار حسین کے لئے)

پیلی پیلی نرم دھوپ، راستوں، درختوں اور گھروں پر پھیلی ہوئی تھی اور پرندے زمین پر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے ـــــ ادھیڑ عمر کے نر نے تھیلے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور گھر کے آہنی گیٹ پر پیتل کا بڑا سا تالا ڈال دیا۔ اور پھر چند لمحے ٹھہر کر پورے گھر کو اپنی مناظر گزیدہ آنکھوں میں اتارتے ہوئے بیٹھی ہوئی آواز میں اپنی ہم عمر مادہ سے کہا ـــــ "لو! اب تم بھی اس زمین کو اور اس گھر کو اس طرح اپنی آنکھوں میں بھر لو کہ یہ تمہاری آنکھوں سے نکل کر کبھی فرار نہ ہو سکے کہ اس زمین اور اس پر کھڑی ہوئی دیواروں کے ساتھ ہمارا بڑا گہرا تعلق رہا ہے کہ وہ ہمارے متعلق ہم سے زیادہ جانتی ہیں۔

"یہ زمین اور اس پہ کھڑی ہوئی خواب خواب دیواریں تو اسی وقت سے میری آنکھوں میں آکر منجمد ہو گئی ہیں۔ جب ہم یہاں پہلے پہلے آئے تھے۔" مادہ نے بڑی ٹھنڈی آواز میں نر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "اب چلے چلو کہ دل حلق میں آکر پھڑ پھڑانے لگا ہے۔"

"ہاں! چلو چلیں کہ ہمیں بڑی دور جانا ہے اور سیڑھیاں سب ٹوٹ چکی ہیں، سمندروں میں پانی چڑھتا چلا جا رہا ہے، کشتیاں کناروں پر قطار در قطار پھیلی ہوئی لیکن چھلنی ہیں، اور تمام ناخدا جل چکے ہیں اور ان کی تاریخی ہڈیاں گرم ریت پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں اور ہمیں بڑی دور جانا ہے لیکن کیا ہمارے پاؤں اس زمین تک ہمیں پہنچا دیں گے ـــــ جہاں ہمیں جانا ہے؟"

"جب تک وہ ساتھ دیں، تب تک چلتے رہیں گے اور جب ساتھ چھوڑ دیں گے تو ہم زمین ہو جائیں گے۔ مادہ نے نر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ" یہ پاؤں ہی ہیں جو ہمیں یہاں، اس زمین پر لے آئے تھے اور پھر یہی پاؤں ہمیں، اب اس زمین سے چھڑا کر لے جا رہے ہیں۔

"بڑے عجیب ہیں یہ پاؤں بھی کہ اوپر سے نیچے چلے آئے، لیکن نیچے آکر بھی جم نہ سکے اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔" نر نے اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے تھیلے کو قدرے اوپر اٹھایا اور بائیں

ہاتھ میں پکڑے ہوئے بکس کو سیدھے ہاتھ میں لے کر مادہ سے کہا ــــ "تمھاری پیٹھ پر جو تھیلا ہے کہیں وہ تم سے زیادہ وزنی تو نہیں ہوگیا۔ ؟"

"نہیں! مادہ نے کہا ـــ ابھی مجھ میں بہت سی چیزوں کو اٹھائے اٹھائے گھومنے کی قوت ہے۔ جس دن وہ چلی جائے گی ــــ میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تمام چیزیں بکھر جائیں گی۔

"چیزیں تو سب کی سب ازل سے بکھری بکھری ہیں۔ اور ہم انھیں سمیٹ سمیٹ کر اکٹھا کرنے کی کوشش میں خرچ ہو رہے ہیں اور اب تک اتنے خرچ ہو چکے ہیں، اتنے خرچ ہو چکے ہیں کہ اب خرچ ہونے کی گنجائش کم رہ گئی ہے۔

"ہاں! مادہ نے اکڑی ہوئی آواز میں نر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ــــ "اس وقت مجھے برسوں پہلے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ عرصے سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ اور آسمان دھوپ دھوپ تھا اور جھیل کے کنارے اُگے ہوئے ببول کے بے شمار درختوں پر بھانت بھانت کے پرندے آباد تھے اور ان پرندوں پر گرم موسم آکر ٹھہر گیا تھا اور وہ اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر زمین پر پھدک پھدک کر اور ایک دوسرے کو نوچ نوچ کر نہ صرف لہولہان ہو رہے تھے بلکہ وہ اپنی فطرت بھی بھول گئے تھے کہ ایک دن اچانک دو بالکل نئے قسم کے پرندے کہیں دور سے اڑتے ہوئے آئے تھے ـــ اُن کی چونچوں میں گھاس کی خشک پتیاں تھیں اور ان کے پیروں سے پانی ٹپ ٹپ ٹپکتا تھا ـــ بس اس کے بعد ہی اچانک موسم بدل گیا تھا اور ساری گرمی یک لخت کم ہوگئی تھی اور پھر اس زور کی سردی پڑی تھی کہ جھیل کے کنارے اُگے ہوئے تمام درختوں کو آگ لگ گئی تھی اور وہ بھُر بھُر بھُر جلنے لگے تھے۔ تو تحفظ کی خاطر اپنی فطرت سے بھٹکے ہوئے وہ سارے باقی پرندے اپنے اپنے میلے گھونسلوں میں جا کر دبک گئے تھے لیکن آگ نے ان سبھوں کو مع درختوں کے راکھ میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ راکھ فضا میں دنوں تک اڑتی رہی تھی ـــ تب کہیں جا کر زمین صاف ہوئی تھی اور پھر وہاں نئے نئے پرندے آئے تھے اور نئی نئی بولیوں سے ماحول تازہ ہوگیا تھا ـــ"

یاد ہے وہ واقعہ؟ مادہ نے ٹھہری ہوئی آواز میں نر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"

"ہاں! نر نے سر کے اوپر اڑتے ہوئے بے شمار گدھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جن کے سائے زمین پر جگہ جگہ متحرک تھے ـــ" ایک دن مجھے بھی اچانک ہُدہُد کا خیال آیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔؟ اور میں دیر تک ہُدہُد ہُدہُد پکارتا رہا تھا کہ دفعتاً مجھے نیند کی جھپکی آئی تھی تو میں نے دیکھا کہ کتوں کی پیٹھوں پر بلیوں کی شکل کے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سروں پر کوّے کائیں کائیں کر رہے

تھے۔"

"ہوں! مادہ نے قدرے آنکھ اٹھا کر نر کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ کیا تمھیں وہ منظر یاد ہے جب ہمارے آنگن میں دھاگے سے ایک گنجھ پیچ پھندے کو ایک چڑے اور چڑیا نے اپنی اپنی چونچوں سے کھولنے کی دیر تک کوشش کی تھی۔ تاہم کھلا نہیں تھا چنانچہ دھاگے کا وہ گنجھ پیچ پھندا آج تک جوں کا توں ہمارے اسباب میں، ہمارے ساتھ ساتھ زمین پر سفر کر رہا ہے۔"

"ہاں!" نر بولا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب زمین کو دیکھ کر آنکھیں دکھنے لگتی تھیں کہ وہ تصور زدہ ہوگئی تھی اور آنکھوں میں پانی ختم ہو کر رہ گیا تھا کہ بڑی سے بڑی چبھن پر ان سے ایک قطرہ بھی نہیں گرتا تھا۔

"کوئی چیز چھوٹ تو نہیں گئی؟ لفظ چبھن پر مادہ نے دفعتاً چونک کر کہا۔"

"نہیں!" نر بولا ـــــ "سب چیزیں اپنی اپنی جگہ برابر رکھی ہوئی ہیں۔ تاہم بہت سی اِدھر اُدھر ہوگئی ہیں کہ اِدھر اُدھر ہو جانا چیزوں کی فطرت ہے۔"

"ہوں! میرے پاس بھی سب برابر ہی لگتی ہیں۔" مادہ نے ٹھنڈی آنکھوں سے نر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر وہ زمین چھوٹ گئی ہے جس کو ہم سے چھوٹنا نہیں چاہیئے تھا کہ ہم اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔

"ہاں!" نر نے مادہ کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "ہم نے اس زمین کو کتنا سنبھال کر رکھا تھا کہ اس پر کھڑی ہوئی دیواروں میں کیل تک نہیں ٹھونکتے تھے کہ ان میں ہماری بو باس پوشیدہ تھی۔

"مگر اب ان پر گرد کی تہیں آ کر جم جائیں گی۔" مادہ نے گرتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس کی آنکھوں سے پانی اُبل گیا۔

"کوئی چیز چھوٹ تو نہیں گئی؟!" اچانک نر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا ـــــ "نہیں کچھ بھی نہیں چھوٹا۔ تاہم اتنا چھوٹ چکا ہے اتنا چھوٹ چکا ہے کہ اب چھوٹ جانے کا عمل بھی دہرائے جانے لگا ہے کہ بار بار وہی چیزیں چھوٹ رہی ہیں جو پہلے بھی چھوٹ چکی تھیں کہ ہم ازل سے ہی چھوڑ کر بھول جانے کے عادی ہو گئے ہیں ـــــ سنو!" نر نے چلتے چلتے ایک لمحہ کے لئے رک کر مادہ سے کہا۔

"ہوں! مادہ۔ رُکی اور نر کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب کچھ دیر کے لئے ٹھہر جانا چاہیئے کہ یادوں کے بے شمار پرندے ذہن میں آ کر پھڑپھڑانے

لگے ہیں۔ اور پھر پانوں بھی اب ساتھ چھوڑ رہے ہیں کہ وہ بہت سفر کر چکے ہیں۔

"ہاں!" مادہ نے تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "میرے پانوں تو اسی وقت سے میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے جب وہ اوپر سے نیچے چلے آئے تھے۔ پھر بھی میں ان کا ساتھ دے رہی ہوں کہ پانوں کو مصروف رکھنا ضروری ہے ـــــ" اور تبھی اچانک سائے کا ایک بڑا سا ٹکڑا زن سے اس کے جسموں پر سے گزر گیا کہ دھوپ اس کا تعاقب کر رہی تھی اور پھر کچھ دور کے تعاقب کے بعد دھوپ سائے سے ٹکرا کے کھا گئی تھی پیلی پیلی نرم دھوپ اب تیز ہو چکی تھی کہ اس میں ناخن پیدا ہو گئے تھے۔ اور درختوں پر چیلیں کرتے ہوئے پرندے، پتوں کے بیچوں بیچ دبک کر اونگھنے لگے تھے اور ساری زمین خالی ہو گئی تھی۔ اور صرف وہ دونوں ہی باقی رہ گئے تھے۔

"کوئی چیز چھوٹ تو نہیں گئی؟ مادہ نے کمزور آواز میں، پانوں کو زمین پر بچھاتے ہوئے کہا ـــــ" نہیں۔ کچھ بھی نہیں چھوٹا۔ سب برابر ہے۔ تاہم بہت کچھ چھوٹ چکا ہے۔" نر نے بھی پانوں کو زمین پر بچھاتے ہوئے کہا۔

"ہم کتنا سفر کر چکے ہیں؟ مادہ نے اپنے پانوں کے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے نر سے کہا۔

"اتنا سفر کر چکے ہیں، اتنا سفر کر چکے ہیں کہ اب راستے دہرائے جانے لگے ہیں۔

"آخر اور کب تک سفر کرتے رہیں گے۔؟

"جب تک حکم نہیں ہو گا۔!

"اب زمین خالی ہو کر رہ گئی ہے ـــــ بھر کر بہت ابل گئی تھی کہ اس کا خالی ہو جانا بہت ضروری تھا۔ سو اب بالکل خالی ہو چکی ہے۔ لیکن ہم دونوں ہنوز باقی ہیں۔ اس لئے مجھے خوف ہے کہ کہیں زمین پھر سے نہ بھر جائے۔"

"ایسا نہیں ہو گا کہ اب وہ چیز ہم میں باقی نہیں رہی جو پہلے تھی ـــــ" نر بولا ـــــ "ہم اسے بہت خرچ کر چکے ہیں۔ اور خواہ مخواہ خرچ کر چکے ہیں۔ اور پھر اب خوابوں میں ریچھ بھی دکھائی نہیں دیتے کہ پہلے وہ بہت دکھائی دیتے تھے کہ جب ہم نکلے تھے تو ہماری کھوپڑیوں میں ریچھ آکر بیٹھ گئے تھے۔ سو اب ریچھ غائب ہو گئے ہیں اور زمین اب خالی ہو گئی ہے۔

"ہوں! مادہ نے پانوں سمیٹ کر اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا ـــــ" وہ جو آنے والے تھے۔ کیا وہ آکر چلے گئے؟"

"ہاں!" نر بولا ـــــ "وہ آئے، بہت پہلے اور اندھیروں میں سورج کو اتار کر چلے گئے۔ ورنہ

اس قدر اندھیرا تھا کہ ہمیں اپنے ہاتھ پاؤں بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اسی لئے ہمارے ہاتھ پاؤں بہت کچھ کرگئے جو انھیں نہیں کرنا تھا ـــــ اب دیکھو زمین کتنی دور دور تک خالی دکھائی دے رہی ہے۔ اور کس قدر سناٹا ہے۔ ورنہ اس قدر شور تھا کہ آوازیں اپنا مفہوم کھو چکی تھیں۔ اور الفاظ کی شناخت ختم ہوکر رہ گئی تھی کہ ایک دن اُن کا ختم ہوجانا ضروری تھا کہ وہ بہت بے سلیقہ ہو گئے تھے۔

"وہ دیکھو کہ گدھیں اب بھی ہمارے اوپر منڈلا رہے ہیں کہ ہم دو ابھی باقی ہیں۔

"ہم دو نہیں بلکہ ابھی زمین بھی باقی ہے اور جب تک زمین باقی رہے گی کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔

"وہ جو آکر چلے گئے ـــــ انھوں نے کہا ـــــ؟ مادہ نے نر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"انھوں نے کہا کہ زمین کیلے کے چھلکے کی طرح ہے اور تم سب اس پر رقص کر رہے ہو اور تمھارے پاؤں مسلسل پھسل رہے ہیں۔

"ہم نے کوئی چیز چھوڑ تو نہیں دی۔؟ مادہ نے نر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ لیکن بہت کچھ چھوٹ گیا ہے۔

"تمھارا تھیلا کھول کر دیکھو کہ شاید کوئی چیز چھوٹ گئی ہو کہ مجھے عرصے سے کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے کہ کوئی چیز چھوٹ چکی ہے اور نر نے تھیلا کھول کر ایک ایک چیز کو دیکھا ـــــ سب برابر تھے۔ حتیٰ کہ گندم کا وہ دانہ بھی محفوظ تھا۔

"میرے تھیلے میں بھی سب کچھ موجود ہے"۔ یہ کہہ کر وہ درخت سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی تو اس کی نظر چکوا چکوی پر جاکر ٹھہر گئی جو درختوں کی گھنی شاخوں پر چہلیں کر رہے تھے۔ اور ان دونوں کا بچہ گھونسلے سے اپنی گردن نکال کر انھیں تک تک دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً تبھی مادہ چیخ پڑی اور پھر نر کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ـــــ ہائے غضب ہوگیا کہ ہم نے اپنی سب سے زیادہ اہم چیز چھوڑ دی۔

"ہم نے کون سی اہم چیز چھوڑ دی ہے۔ نر نے اتھاہ گہری آواز میں کہا اور حیرت سے مادہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ جو تمام چیزوں سے اہم تھی ـــــ وہ چیز ہم نے چھوڑ دی۔" مادہ نے گھونسلے سے گردن نکال کر جھانکتے ہوئے چکوا چکوی کے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر ڈوبتی آواز میں بولی۔ اب ہم کتنے بے احساس ہوکر رہ گئے ہیں:

"ہاں! اب ہم کتنے بے احساس ہوکر رہ گئے ہیں۔" نر نے ویران آواز میں کہا۔ پہلے احساس

کفن کی طرح ہوتا تھا کہ ذری سی چبھن کھڑی سوئی کی طرح اس کے اندر اتر جاتی تھی اور برسوں ٹیسیں ہوا کرتی تھیں۔ مگر اب ہمارا احساس پتھر ہو کر رہ گیا ہے کہ بڑی سے بڑی چوٹ بھی پانی بن جاتی ہے۔

"ہاں اب ہم مجسمے بن کر رہ گئے ہیں۔ مادہ نے کہا اور اس کی آنکھوں سے پانی ڈھل ڈھل ڈھل اس قدر زمین پر گرا کہ وہاں سبزہ اگ آیا۔ اور وہ نر کے دونوں کندھوں کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ چلو کہ واپس چلیں اور پھر وہ دونوں درخت کے نیچے سے اٹھے اور اسباب کو وہیں چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے اور پھر ایک لمبے سفر کے بعد جب وہ اپنے چھوڑے ہوئے گھر کو پہنچے تو آہنی گیٹ غائب ہوگیا تھا اور گھر کی دیواریں آسمان کو جا لگی تھیں! اب ـــــ □

جے۔ اے۔ بہادر محشر بریلوی
ایف۔ اے۔ اینڈ سی۔ او۔
نارتھ ایسٹ ریلوے۔ گورکھپور

غزلیں

آگ کو برف کہو، زہر کو شربت اے دوست
جو بھی کہلائے کہو، دورِ سیاست اے دوست

تم بھی فٹ پاتھ پہ سامانِ سیاست بیچو
اس سے بہتر نہیں اب کوئی تجارت اے دوست

اس طرح دل سے مٹا نقشِ وفا نقشِ خلوص
اٹھ گئی جیسے زمانے سے محبت اے دوست

ایک جینے کا سہارا تھا سو وہ بھی نہ رہا
کھا گئی "لوح و قلم" بیچ کے غربت اے دوست

ہر قدم خون کی بارش ہے ہر اک موڑ پہ قتل
آج کل کچھ بھی نہیں جان کی قیمت اے دوست

کیسے اس دورِ پُر آشوب میں ہنس لیتے ہو
مجھ کو ہوتی ہے تمھیں دیکھ کے حیرت اے دوست

شوق سے ترک کرو مجھ سے تعلق محشر
یاد کر لینا مگر وقتِ ضرورت اے دوست

سنگ دل ہو گیا، بے وفا ہو گیا
آدمی کو خدا جانے کیا ہو گیا

ایک انسان تھا وہ بھی میری طرح
دیکھتے دیکھتے جو خدا ہو گیا

موسمِ گل میں وہ تیز آندھی چلی
پتہ پتہ شجر سے جدا ہو گیا

تجھ سے بدلہ نہ لے پھر زمانہ کہیں
پھر ترا ظلم حد سے سوا ہو گیا

عشرتوں کا نہ اب تذکرہ کیجئے
عشرتوں کا زمانہ ہوا ہو گیا

اس زمانے سے اتنا تو پوچھو کوئی
جو زمانہ تھا پہلے وہ کیا ہو گیا

پھر اٹھی میری جانب نگاہِ کرم
زخم پھر دل کا محشر ہرا ہو گیا

انجینیر محمد نور الاسلام نشتر
کوچۂ غزل، لیچی باغ
نور الحسن لین، دربھنگا

علاماتِ غزل اور غالب

غزل کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے ہر دو مصرعے میں ردیف اور قافیہ کی پابندی ہوتی ہے اور بعد کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ پابندی برتی جاتی ہے۔ ہر شعر حرکت اور سکون یعنی اوزانِ بحور کے اعتبار سے ایک بحر میں ہوتا ہے۔ مختلف غزلیں مختلف بحور میں ہوتی ہیں۔ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص دیتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ جہاں تک غزل کی صورت کا تعلق ہے یہ پابندیاں ضروری اور لازمی ہیں کیوں کہ انھیں کے بنیاد پر غزل کی صنفی صورت دوسرے اصنافِ شعری سے متغائر اور ممیز ہے۔

معنوی اعتبار سے غزل کی کوئی حد اصولی طور پر مقرر نہیں کی گئی ہے۔ البتہ غزل ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق عاشقانہ ماحول سے مدتوں رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا مزاج یا اس کے مایۂ خیال (THOUGHT CONTENTS) کا ڈھانچہ عاشقانہ، نرم، طناز، شوخ، مبہم اور پہلو دار ہو گیا ہے۔ غزل نے عام طور پر ایسے ماحول میں نشوونما پائی جہاں حیات کشاکش سے گزر کر تھکن مٹانے کے لئے دم لیتی ہے۔ عربی میں اوّل اوّل غزل قصائد کی تشبیب میں آتی تھی۔ عربی میں تشبیب کے معنی ہی ایامِ شباب کا ذکر، معشوق کی صفت میں شعر گوئی، عشق کا بیان اور آگ سلگانے کے ہیں۔ اس طرح غزل کا مقصود معنوی جذباتی گفتگو کر کے دل میں گرمی پیدا کرنا ہو گیا۔ عرب قومیں خانہ بدوشی اور مشقت کی زندگی میں مبتلا تھی۔ ان کے جغرافیائی اور موسمی احوال شدید تھے۔ ان کی تفریح اور تسکین کا محور نخلستان اونٹ اور عورت تھے۔ اس لئے ان کے طویل قصائد کا ایک حصہ ان کے بیان کے لئے مخصوص کر لیا گیا۔ چونکہ ان تینوں کا تعلق بدوی عرب کے سکون آرام اور آسائش کے تصور سے تھا۔ اس لئے فطری طور پر اس میں تسکین جبلت کا غلبہ ہو گیا۔ تنہائی اور مناسب حال ماحول میں گھڑی دو گھڑی کو بیٹھ کر دل خوش کرنے کے لئے قصائد اپنی طول کی وجہ سے نامناسب پڑتے تھے اس لئے اس میں سے تشبیب کا حصہ نکال کر الگ گایا جانے لگا۔ اس طرح غزل ایک جداگانہ صنف کی حیثیت اختیار کر گئی۔

عرب کے مشکل اور دشوار گزار جغرافیائی علاقے سے نکل کر جب غزل ایران کے مرغزاروں میں پہنچی تو

اس میں آبشاروں کی موسیقی، لالوں کی مہک، گلابوں کی مہک، طائروں کی چہک، سبزوں کی نرمی، عارضوں کی گرمی، لبوں کی آنچ، جسموں کے گداز کے ساتھ ساتھ فکر کا ساز، آگہی کا سوز، تصوف کا کیف حقیقت کی تلاش، مجاز کا ذوق، حس کی لذت، وجدان کی وسعت اور بیان کی نزاکت سبھی مل گئے انسانی ذہن کی ان گنت سطحوں کے متوازن اور یگانہ اشتراک سے ایک ایسا عجیب وغریب آمیزہ تیار ہوا جس میں داخلی اور خارجی کوائف کے ابلاغ و ترسیل کا بے پناہ امکان موجود تھا۔ ایرانی نسلی مزاج بنیادی طور پر عاشقانہ اور سریع الفکر تھا غالباً جمالیاتی اور رومانی میلان اس پر فکری دقت پسندی کے مقابلے میں زیادہ غالب تھے لیکن اس آریائی نسل کی دوسری شاخ یعنی ہندوستان میں جمالیات، رومانیت اور دقتِ فکر تینوں یکجا ہوگئیں۔ ہندی اور ایرانی آریائی نسل کے اس بنیادی فرق سے متعلق ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب "ایران میں مابعد الطبیعاتی افکار کا ارتقا" میں اس کی وضاحت کی ہے۔ جب غزل ایران سے ہندوستان پہنچی تو اس میں بھی دقتِ فکر اور تسلسل کا امکان پیدا ہوگیا۔ عرب سے ایران اور ایران سے ہندوستان آتے آتے غزل کے مزاج میں کافی فرق ہوگیا یعنی عرب کی تشبیب کا محور سطحی تلذذ، ایران کی غزل کا محور جسمانی، ذہنی، روحانی اور فکری دقت پسندی کا کیف ہوگیا۔ عرب سے ہندوستان تک کے اس سفر میں ہم نے دیکھا کہ دیار بہ دیار غزل کا افق پھیلتا گیا گو چھوڑے ہوئے دیار کی تمام خصوصیات کے ساتھ نئے مستقر کی خصوصیتیں ملتی اور ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ یہ فرق غزل کے مایۂ خیال میں ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ اس کا پیکرِ حسی (MATERIAL FORM) کسی غیر معمولی تغیر سے دوچار نہیں ہوا۔ یعنی ردیف، قوافی اور بحور کی پابندی اور اشعار کا فرد فرد ہونا برقرار رہا ایسی صورت میں دو ہی مصرعوں میں پھیلتے ہوئے ذہنی پیش منظر کو سمیٹنے کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ پھیلاؤ کے سمیٹنے کا یہی محرک وضع علامات کا سبب بنا طویل ذہنی، حسی، جذباتی، روحانی، جمالیاتی کوائف کے بیان کے لئے مختصر سے مختصر ایسے نشانات مرتب اور معین کرنے کی ضرورت پیش آئی جو غزل کے دو ہی مصرعوں میں پورے تجربے کو ظاہر کر سکے جیسے بادہ، مستی، خنجر، تیشہ، ساغر لالہ وغیرہ ایسے نشانات ہوئے جن میں پھیلی ہوئی کیفیات بکھرے ہوئے تجربات اور وسیع احوال کو سمیٹا گیا۔ ان علامتوں کے وضع کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ یہ بیک وقت مختلف سطحوں کے کوائف کے اظہار کی کفایت کر سکے۔ اس طرح مختصر سے مختصر ترسیل یونٹس (UNITS) میں وسیع سے وسیع تجربات اور حالات کو سمیٹا جا سکا جیسے "شب ہجر" کرب تنہائی، تیرگی ہم نشیں کی خواہشات لذتِ بوس وکنار کی تمنا، دوست، ساتھی یا محبوب کی دوری سے مرتب ہونے والے ذہنی جسمانی مسائل جیسے پھیلے ہوئے اور وسیع معاملات ایک لفظ شبِ ہجر اور اس سے بھی کم ہو کر 'ہجر' میں سمٹ گئے دوسری طرف روحانی عقائد اور ادیان میں پیش کئے گئے تکوینی تصورات جو وحدت الوجود پہ منتہی ہوتے ہیں اصل کی

وحدت اور عشق کی مسرت کے اظہار کے لئے بھی اسی علامت 'شب ہجر' اور 'ہجر' سے موجودات کی اپنے ماخذ سے دوری کے اظہار کا وسیلہ بن گئے۔ اس طرح ایک ہی علامت 'ہجر' یا 'شب ہجر' بیک وقت طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی دونوں سطحوں پر یکساں طور پر کارآمد ہوگئی جب غزل میں جسمانی اور روحانی مسائل کے علاوہ فکری مسائل نے بھی سر ابھارا اور اس کے مایۂ خیال میں داخل ہوگئے تو ایسی علامتوں کو وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی جن میں جسم، فکر اور روح خواہش منطق اور جذبہ تینوں سطحوں کے کفایت کرنے کی صلاحیت ہو۔ اردو غزل مایۂ خیال کے ارتقائی سفر کا وہ موڑ جہاں یہ سطحیں پوری طرح اجاگر ہوگئیں وہ موڑ ہے جس پر غالب کھڑا ہے۔ نتیجے کے طور پر غالب کے حصے میں وضع علامت کی مشقت آئی۔ یہاں پر یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ "ہر عہد میں وضع علامت کا دور فنکار کے لئے تلوار کی دھار ہوجاتا ہے کیوں کہ ان کے قارئین اور سامعین علامتوں کے میدان عمل (FIELD OF APPLICATION) سے کما حقہ نہ تو واقف رہتے ہیں اور نہ ایسے فنکاروں کے لئے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوں۔"[1] عام طور پر انھیں چیستاں گو، یاوہ گو اور ہرزہ سرا جیسے خطابات سے نوازا جاتا ہے اور غالب کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا کیوں کہ موج نگاہ، وادیٔ خیال، فردوس گوش، جنت نگاہ، آتش خیال، حلقۂ دام خیال ــــ 'جوہر اندیشہ، دام موج، بساط عجز، دہان زخم، شعلۂ حسن، چراغ رہ گزار، وبال تکیہ گاہ، عندلیب گلشن ناآفریدہ وغیرہ جیسی لاتعداد علامتیں غالب کو اس لئے وضع کرنی پڑیں کہ اس کے شعری پیش منظر میں جسم، روح اور فکر تینوں موجود تھے۔ ایک طرف وہ ہندوستانی فلسفیانہ افکار کے تسلسل فکر اور دقت نظر سے آشنا تھا تو دوسری طرف وہ ماورائی لطافت ذہن سے اور تیسری طرف آدمی ہونے کی وجہ سے جسم اور اس کے مطالبات سے۔ نتیجے کے طور پر جب غزل کے پیکر حسی میں اس کے مایۂ خیال کو ابلاغ کو ترسیل کی منزل سے گزرنا پڑا تو اسے زیادہ وسیع زیادہ پھیلے ہوئے، زیادہ دور رس، زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مختلف النوع معاملات کو ایک ایک نشان میں سمیٹنے کا مشکل فریضہ انجام دینا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی کے ایسے مرتبہ شناس شاگرد نے بھی ؎

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جیسے عصر آفرینی شعر کو مبالغے اور غلو کے ضمن میں ڈال دیا[2] کیوں کہ جوہر اور اندیشہ دونوں تجربات حالی کے افق فکر و نظر سے ورا تھے۔ اکرام آئی۔ سی۔ ایس جیسے بالغ نظر شخص نے عبدالرحمٰن بجنوری کے حوالے سے غالب

[1] اردو غزل میں جدید علامتیں از ڈاکٹر مرتضیٰ اطہر رضوی۔

[2] یادگار غالب از مولانا الطاف حسین حالی مرحوم۔

کی وضع کردہ علامتوں کو استعارے اور تشبیہات کی صنف میں رکھ دیا ہے[1]۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالباً پہلی بار غالب کے خلاق ذہن کا احساس کیا تھا جب انھوں نے مرزا کو الفاظ ساز اور گہرے مشاہدے والا شاعر قرار دیا[2]۔ اکرام آئی۔ سی۔ ایس نے یادگار غالب پر گفتگو کرتے ہوئے روداروی میں ایک بہت ہی اہم اور معنی خیز بات کہہ دی ہے جس سے میرے زاویۂ نگاہ کو جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، بڑی تقویت ملتی ہے۔ کلام غالب کی خصوصیات کا بیان کرتے ہوئے حالی کی بیان کردہ چوتھی خصوصیت جسے ڈاکٹر بجنوری نے بہت سراہا ہے "بعض لوگوں کو بہت پسند ہے[3]" حالی کے مطابق چوتھی خصوصیت ایسے اشعار کی بہتات ہے جن کے ایک سے زائد معنی لئے جاسکتے ہیں[4]۔ اکرام صاحب لکھتے ہیں ہندوستان میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں جن کے لکھنے اور سمجھنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑے..... .... ایسے اشعار کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے[5]۔" اکرام صاحب کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غزل ہندوستان تک پہنچتے پہنچتے، جبلت وجدان اور فکر تینوں کو اپنا مایۂ خیال بنا چکی تھی۔ اور میرا یہ خیال کہ تشبیب عرب جبلت تک، غزل فارسی جبلت اور وجدان تک اور غزل اردو جبلت، وجدان اور دماغ و فکر تینوں تک کو اپنا مایۂ خیال بنالیتی ہے۔ اکرام آئی۔ سی۔ ایس کے مذکورہ بالا قول سے بھی یہ خیال تقویت پاتا ہے یہ بات غالب تک پہنچتے پہنچتے پوری طرح غزل کے پیش منظر میں آجاتی ہے اور غالب کو لفظ سازی یا علامت طرازی پر مجبور کرتی ہے جیسے جیسے ذہن کے دریچے کھلتے جاتے ہیں جیسے جیسے فکری محرکات کی سطحیں آتی جاتی ہیں جیسے جیسے گردوپیش کی کائنات پر انسان کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے اظہار اور بیان کے واسطے اور وسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ انسانی ذہن کی ساخت یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو سمجھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ پھیلاتی ہے اور بیان کے لئے وسیع سے وسیع مسئلے کو زیادہ سے زیادہ سمٹاتی ہے۔ پھیلانے اور سمٹانے کا یہ عمل لازمی طور پر سمجھنے کے لئے پھیلانے میں صرف ہوتا ہے اسے NEUTARALISE کرنے کے لئے بیان میں کم سے کم وقت لیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کی دو اصناف سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ نظمیں کسی ایک مسئلے کو پھیلا کر سمجھنے کی کوشش ہیں جب کہ غزلیں مختلف حسی یا فکری سطح پر طویل تجربات کے عرفان کے بعد کے بیان کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں بے انتہا سمٹاؤ اور بے پناہ اختصار آجاتا ہے اس سمٹاؤ اور اس اختصار کی بنیاد علامت پر ہوتی ہے۔ غالب کے مفکر ہونے میں شک کی گنجائش

---

[1] غالب نامہ از شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس۔

[2] محاسن کلام غالب از عبدالرحمٰن بجنوری۔

[3] غالب نامہ از شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس۔

[4] یادگار غالب از مولانا الطاف حسین حالی (مرحوم)۔

[5] غالب نامہ از شیخ محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس۔

نہیں ہے۔ مفکر ہونے کی حیثیت سے غالب کے مسائل گوناگوں تھے۔ ذات، حیات، کائنات، آگہی، جبلت، اخلاقیات غرض یہ کہ مکان و لامکان کے تمام ممکنہ مسائل جو اس وقت کے عصری ماحول میں جز کی حیثیت اختیار کر چکے تھے غالب کے ذہنی پس منظر میں موجود تھے۔ اسی فکری سرمائے اور اسی اسلوبی اور اظہاری سرمائے کی بنیاد پر غالب کو اپنے فکری تجربات کے نتائج بیان کرنے تھے جہاں جہاں ان کی فکر اپنے عصر کی حدود سے آگے بڑھ جاتی تھی وہاں وہاں انھیں اپنے تجربات کے اظہار کے لئے علامات وضع کرنے کی مجبوری تھی۔ یہ مجبوری ہر بڑے مفکر کو ہوئی اور اسی مجبوری نے الفاظ کی دنیا کو فروغ دیا۔ میں نے جن چند علامتوں کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے ان کے علاوہ بھی کچھ علامتیں ہیں جنھوں نے نئے افکار کے ابہام کا دروازہ کھولا ہے مثلاً "غبارِ صدا" غالب کے زمانے میں یہ علامت قطعی چیستاں سمجھی جا سکتی تھی اور سمجھی گئی کیوں کہ PARTICLE PHYSIC کا کوئی تصور اس وقت کے سننے والوں کو پیش نظر نہیں تھا وہ قوت (یا انرجی) پیکیٹس کا کوئی لفظ اپنے ذخیرے میں نہیں رکھتے تھے ظاہر ہے کہ یہ لفظ طویل المدت تجربات سے حاصل ہوا ہے اب ہر لہر یا گونج ان گنت انرجی پیکیٹس (ENERGY PACKETS) سے بنتی ہے۔ انھیں پیکیٹس کو PARTICLES کہتے ہیں جنھیں ہم ذرات کہہ سکتے ہیں۔ ذرات کے ازدہام کو غبار کہا جاتا ہے اس طرح ہر VIBERATION انرجی پیکیٹس کا غبار ہے۔ غبار ویرانوں میں اڑتا ہے یہ عام تجربہ ہے۔ غالب کا یہ شعر ؎

ویرانی جز آمد و رفتِ نفس نہیں
ہے کوچہ ہائے نے میں غبارِ صدا بلند

یقین مانئے کہ خود غالب بھی PARTICLE PHYSICS کا کوئی شعور اکتساب نہیں رکھتا تھا فکر وجدان آمیز ہو کر دورِ زمانی کو طے کر جاتی ہے اور ایسے نتائج اخذ کر لیتی ہے جو ادوارِ زمانی میں صدیوں بعد آ سکتے ہیں یہی مسئلہ پھر ملاحظہ کیجئے ؎

آہنگ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے
ہستی میں نہیں شوخیٔ ایجاد صدا ہیچ

اسی انرجی پیکیٹس کی وضاحت کے لئے ؎

گلزار دمیدن شررستان رمیدن
فرصت تپش و حوصلہ نشو و نما ہیچ

اس کی اضافیت (RELATIVITES) کا اظہار یوں ہوتا ہے ؎

بالیدگی نیازِ قدِ جاں فزا اسد
در ہر نفس بقدرِ نفس ہے قبا بلند

ہجوم تمنا (EXPRESSIVE POTENCY) ہے یا قوسی طبیعات کا POTENTIAL FIELD ہے جس سے ابھرنے والی ہر قوس اس POTENTIAL FIELD کی اپنی حالت کی وجہ سے ابھر آتی ہے جس ابھار میں اس کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی بھی قوس نہ تو گلہ ہی کر سکتی ہے اور نہ ہی دعا۔ یہ تکوینی تصور جدید ترین طبیعات کی دین ہے۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو؎

اسد شکوہ کفرو دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

اسی غزل کا ایک اور شعر جس میں ضبطِ تپش کی علامت استعمال کی گئی ہے جدید ترین تکوینی تصور کو پیش کرتا ہے یہاں بھی غبار، صدا یا نفس کا ذکر ہے؎

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرودن
کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم

تپش کا یہی تصور جو دوسری جگہ غزل کا پیکر پاتا ہے تو؎

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ نفس تمام

پچھلے صفحات پر جو چند علامتیں دی گئی ہیں ان سے متعلق اشعار کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوگا۔ ملاحظہ ہو؎

بے خون دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ سے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

"دامِ موج" ایک ایسی علامت ہے جو تکوینی تسلسل کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ تکوینی تسلسل کے سیال اور رقیق تصور کے لئے جو اس وقت کے فکر اور حکمت میں ایک مستقل تصور ہے "دامِ موج" سے بہتر علامت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح 'بساطِ عجز'، دہانِ زخم، شعلۂ حسن وغیرہ کی علامتیں ہیں جن میں وسیع فکر کی جھلکیاں

ہیں جہاں غالب اپنے عصر سے آگے کے زمانوں تک پہنچ جاتے ہیں ؎

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی | مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے | ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام | مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گذارِ بادِ یاں

یہ شعر پہلے بقول شیخ محمد اکرام آئی۔سی۔ایس کے یوں تھا ؎

ہے مری وحشت عدوئے اعتباراتِ جہاں | مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گذارِ بادِ یاں

اس صورت میں یہ شعر زیادہ عصری آگہی سے قریب ہے۔ یقیناً اپنے زمانے میں یہ شعر چیستاں سمجھا گیا ہوگا کیوں کہ اعتبارات یا RELTIVITY کی کوئی اہمیت اس وقت کی فکر یا ذہن میں نہیں تھی اس وقت نے غالب کو مجبور کیا کہ شعر کے اختصار کو مجروح کر کے پہلے مصرعہ میں سے "زوال آمادہ اجزائے آفرینش" کا طویل ٹکڑا دیا جائے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو | ہیں وبالِ تکیہ گاہ ہمتِ مردانہ ہم
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج | میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اس شعر میں جوہر اندیشہ کا بہت ہی خوبصورت بیان ہے۔ جب جوہر اندیشہ کی بات آگئی ہے تو غالب کا وہ شعر جس میں غالب نے خود اس علامت کا استعمال کیا زیادہ لطف دے گا اس شعر کا ذکر مضمون میں کئی جگہوں پر پہلے بھی آچکا ہے۔ بہرحال شعر یوں ہے ؎

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں | کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس طرح غالب کی علامتیں جو بلا مبالغہ بے شمار ہیں اور جن کا ذکر اس مضمون میں نہیں کیا گیا ہے اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان پر تحقیق کی جائے اور ان علامتوں میں پائی جانے والی فکری وجدانی چھلانگ کو اردو داں طبقے کے سامنے پیش کیا جائے جس سے انسانی ذہن کے بے پناہ امکانات پر جو دلیلیں علامتوں کی شکل میں اردو غزل میں موجود ہیں روشناس تعلق ہو سکے۔ اس کام کے لئے کوئی مختصر مضمون کافی نہیں ہے اردو کے اساتذہ اور محققین اگر غالب کی علامتوں پر پوری توجہ صرف کریں گے تو ممکن ہے کہ غالب کے افکار میں کوئی منظم نظریہ ہی مل جائے۔

میں نے اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں

"THE TAO OF PHYSICIS" BY FRITJOF CAPRA (1)

(۲) "SCIENCE AND THE MODERN WORLD" BY WHITE HEAD

(۳) " ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا " از ڈاکٹر محمد اقبال (مرحوم)

(۴) " یادگارِ غالب " از مولانا الطاف حسین حالی (مرحوم)

(۵) " غالب نامہ " از شیخ محمد اکرام آئی سی۔ ایس۔

(۶) " محاسنِ کلامِ غالب " از عبدالرحمٰن بجنوری

اور

(۷) " اردو غزل میں جدید علامتیں " از ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی وغیرہ ☐

اطہر عزیز
۳۳۷ ای/۱۳ بٹلہ ہاؤس
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تین غزلیں

کہنا ہے جو بھی کہہ دو یہیں میرے کان میں
دیکھو بلا نہ تو نہ مجھے سائبان میں

خوابوں کی سیڑھیوں پہ نظر رکھ کے کیا کریں
رہتی ہے اب تو یاد بھی اونچے مکان میں

لہجے میں ایک بار تو شبنم بھی گھول لو
یہ کیا! کہ لے کی بات لہو کی زبان میں!

سورج کی خودکشی کا بھی منظر عجیب تھا
بکھرا جو دائروں میں تو سمٹا چٹان میں

فکرِ جمیل جانے کہاں جا کے سو گئی
ہم ڈھونڈتے ہیں گیت غزل کی دکان میں

سانسوں سے پوچھتی تھیں یہی لب کی آہٹیں
یہ تو بتاؤ کیسا کیا امتحان میں

آہوں کے تیر اشک کے نیزے تو بن گئے
شعلے سمٹ کے رہ گئے لیکن کمان میں

اشک ہوں، آہ ہوں، آتش ہوں کہ اخگر دیکھو
کیا ہوں میں دوستو آؤ مجھے چھوکر دیکھو

سوچ کے غار سے اک شور اٹھا ہے تو سہی
اب کہاں جا کے ٹھہرتا ہے یہ لشکر دیکھو

میں نے مانا کہ گگن پھول کی کشتی ہے مگر
اپنی دھرتی پہ بھی کچھ دور تو چل کر دیکھو

چوٹ کیسی بھی ہو خود ہی چمک اٹھتے ہیں
کتنے مانوس ہیں کہرام سے کنکر دیکھو

میں نے جو سنگ اچھالا وہی سورج نکلا
ڈوبتی رت کے دہکتے ہوئے تیور دیکھو

دل کہ دیپک تھا کبھی آج ہے داغوں کا کھنڈر
کتنے رنگ اور دکھاتا ہے مقدر دیکھو

گل سے خوشبو ہی اگر روٹھ گئی ہو اطہر
پھر تو بس ایک مہکتا ہوا پتھر دیکھو

رنگ زاروں میں کہاں جاکے پکاروں تجھ کو
زندگی اب تو نظر آکہ سنواروں تجھ کو

رات کی گود میں سر رکھ کے سحر کہتی تھی
ساز تھم جائے تو سینے میں اتاروں تجھ کو

روشنی تو تو ہے یوں بھی رگِ گل سے نازک
سوچتا ہوں کہ نظر ہی سے نکھاروں تجھ کو

مجھ کو بہلا کے دلِ زار کہاں لے آیا
سرو کا دیس ہے کیا سنگ سے ماروں تجھ کو

شمیم صادقہ

شعبۂ اردو، گورنمنٹ ویمنس کالج
مریم منزل، گردنی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۲

پلکوں کے کانٹے

میرے گرد چہروں کا ہجوم ہے۔ اپنے اور پرائے چہرے۔ کہیں دکھ کے گہرے سائے ہیں، اور کہیں صرف اشتراکِ غم، کا لیبل چسپاں ہے۔ اداس چہروں میں ایک چہرہ تمہارا بھی ہے ــــ شاید تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو، ــــ کوئی معذرت سی، تمہارے ہونٹوں پہ لرز رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ان کہی کا غبار سا سمٹ آیا ہے۔ میں نے مگر، تمہارے چہرے سے نظریں ہٹالی ہیں ــــ تم ہی تو میرے قاتل ہو اور قاتلوں کو معاف کر دینے کی ڈپلومیسی مجھے نہیں آتی ــــ ان ہی چہروں کے بیچ میرے قتل کا دوسرا سبب بھی موجود ہے ــــ "رجیہ" ــــ تم نے اور رجیہ نے مل کر مجھے مار ڈالا ــــ رجیہ۔ ماتھے پہ سرخ بندیا، مانگ میں سیندور کی سرخی، رنگ برنگے پھولوں والی موٹی سی ململ کی ساری، کالے کالے، سرسوں کے تیل سے، سر پہ چپکے ہوئے بال، اور چہرے پہ یقین کا اجالا۔ یہی تو ہے۔ رجیہ اور تم، دونوں نے مل کر مجھے اتنی جلدی مار ڈالا کہ میں خود کو اس طویل سفر کے لئے آمادہ بھی نہ کر سکی۔ وہ سفر، جو پہلے بہت خوفناک اور دہلا دینے والا لگتا تھا، مگر جیسے جیسے زندگی کا لمحہ لمحہ، صدیوں کا بوجھ بنتا گیا، یہ سفر بھی، ایک خوش آئند خواب کی طرح میرے ذہن میں پلنے لگا۔ اور یہ خواب بڑے جان لیوا ہوتے ہیں ــــ لیکن تم یہ نہیں سمجھ سکتے ــــ تم نے کبھی خواب دیکھے ہی کہاں ہیں ــــ خوابوں کی نعمت ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی ــــ میں تمہیں بتاؤں، ابدی لمحوں کے ابدی احساس کے ابدی خواب کیا ہوتے ہیں؟ جب وہ اچانک، برسوں کا پہچانا ہوا لگتا تھا، وہ ایک غیر فانی لمحہ تھا، ــــ دل کی گہرائیوں سے اس کی پرستش کا احساس آج بھی باقی ہے ــــ میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا، اپنی اور اس کی زندگی کی ہم آہنگی کا پیارا سا خواب ــــ مگر خوابوں کا کشکول لے کر، اپنا تعارف دینا، میرے نزدیک مر جانے سے بھی اذیت ناک تھا۔ ان دنوں میں موت کو، جزا اور سزا کو بہت خوفناک سمجھا کرتی تھی بہت آئیڈیل تھی نا۔ آئیڈیلزم کے حصار کن کن قربانیوں سے بنتے ہیں، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اور جب یہ حصار بہت مضبوط اور فلک بوس ہو جاتا ہے تو اپنا ہی دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور

معمار خود ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے مرجاتا ہے مگر تازہ ہوا نہیں ملتی ـــــ

بس یہی تو ہوا تھا۔ زندگی کی بھول بھلیوں کا ایک موڑ آیا اور وہ نہ جانے کہاں کھو گیا ـــــ نہ نام۔ نہ پتہ۔ نہ سمت نہ منزل۔ میں بس اپنی تمناؤں کے مرجھائے ہوئے پھولوں کو لئے دم بخود سوچتی رہ گئی تھی! ـــــ پھر لوگوں نے بہت سوچ کر سمجھ کے، بڑی چھان پھٹک کے بعد، مجھے تمہارے حوالے کر دیا ـــــ تم میرے لئے ان دنوں اجنبی تھے ـــــ مگر یہ اجنبیت آہنی دیوار تو تھی ـــــ کیوں کہ میں جانتی تھی، جب شب و روز کا ساتھ ہوگا ـــــ دکھ اور سکھ کی تخصیص ختم ہوگی تو شاید تم اجنبی نہیں رہو گے ـــــ اور میں اپنے خوابوں کی منتشر پنکھڑیوں کو چن کر، ایک نئی سی، میکانیکی ہی سہی ترتیب دے لوں گی ـــــ میں نے کہا نا، خواب نہیں مرتے، کبھی نہیں، صرف احساس کی ہر کروٹ کے ساتھ ان کا روپ بدل جاتا ہے ـــــ خوابوں کے چہرے یقیناً مسخ ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کا وجود باقی رہتا ہے ـــــ میرے خوابوں کا یہ بدلا ہوا روپ تم ہی سے وابستہ تھا ـــــ تم اپنی زندگی کا سب کچھ نہ سہی منتخب حصہ مجھے سونپ دو گے اور میں تمہاری راہوں سے کانٹے چن چن کر کلیاں بکھیرتی ہوئی، جلتی دھوپ کا یہ سفر ختم کر دوں گی ـــــ میں یہ بھی جانتی تھی، تم بہت پڑھے لکھے، ایک بڑے آدمی ہو، یقیناً تمہارے اندر وہ پہچان بھی ہوگی جو انسان کو انسان سے تعارف کراتی ہے اور آدمی آدمی کو سمجھ لیتا ہے ـــــ مگر تم وہ نہیں تھے، ـــــ میرے خوابوں کی پرچھائیوں کی طرح تم ہمیشہ کچھ پرے، کچھ فاصلے پہ محسوس ہوئے ـــــ میں تمہاری طرف بڑھنا چاہتی تھی ـــــ اس قدر پیار، اتنا یقین دینا چاہتی تھی کہ تمہاری کامیاب شخصیت کامیاب ترین ہو جاتی، اگر تم اسی پہلو کو زندگی کا سب کچھ سمجھتے تو! ـــــ سچ بتا دوں ـــــ وہ شخصیتیں جن کے اندر ناکامی کا درد، نارسائی کا ناسور اور خلوص کی پیاس ہوتی ہے، بڑی فراخ دل اور مر مٹنے والی ہوتی ہیں ـــــ اگر تم مجھے پہچان پاتے تو تمہارا دامن ہیرے موتیوں سے بھر جاتا ـــــ مگر تم ہمیشہ اجنبی کے اجنبی ہی رہے ـــــ میرا تمہارا ساتھ صرف مشینی تھا ـــــ تم اندر اندر دور وحشت میں سانس لے رہے تھے ـــــ اور بظاہر اتنے بڑے اتنے کامیاب بزنس مین تھے ـــــ مجھ میں اور تم میں، عورت اور مرد میں یہی تو فرق ہوتا ہے ـــــ تمہارے اندر بھوک کی اہمیت تھی ـــــ طلب کا ایم' تھا ـــــ حصول، کی اکڑ تھی ـــــ اور ایسے لمحے عورت کے لئے جان کنی کے لمحے ہوتے ہیں۔ وہ صرف تن سے قبول کر لینے کو 'بازاری پن' سمجھتی ہے۔ اگر وہ خود کو کسی کے سپرد کر دیتی ہے تو اس سپردگی میں روح کی بے پایاں گہرائیاں شریک ہوتی ہیں۔ تم ان لمحوں کو کبھی پہچان نہ سکے ـــــ کیا تم نے کبھی شمع بجھ جانے کے بعد

کی معدوم ہوتی ہوئی دھویں کی لکیر دیکھی ہے ـــــ وہ لکیر کیا ہوتی ہے؟ مگر تم سمجھ نہیں سکو گے ـــــ کبھی سمجھا بھی نہیں ـــــ اور میں سمجھا بھی نہ سکی۔ کیوں کہ خود وضاحتی کا عذاب جھیلنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

ہر صبح تم مجھے اجنبی سے محسوس ہوتے۔ اجنبی لوگوں کے بیچ گھر جاتے۔ لوگ سویرے سے ہی مہمان خانے میں موجود ہوتے ـــــ تم تیار ہو کر چلے جاتے۔ اور نوکر تمھاری فرمائشوں کے مطابق، چائے کی ٹرے، سکواش کے گلاس اور کھانے کی ٹرالی لے جایا کرتا ـــــ کاش تم نے کبھی پکار کے کہا ہوتا "ذرا چاٹ بنا دو گی۔ پلیز ـــــ میرے دوست تمھارے ہاتھوں کی چائے پینا چاہتے ہیں بھئی ـــــ

میں خاموش سی، اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھا کرتی ـــــ اکثر مجھے پتہ بھی نہ چلتا کب تمھاری محفل برخاست ہوئی اور کب تم کام پر چلے گئے! ـــــ

میں جھلاہٹ کے مارے اکثر کئی کئی وقت کے کھانے گول کر دیتی ـــــ کبھی رو پڑتی ـــــ کبھی نٹنگ، سلائی وغیرہ لے کر بیٹھ جاتی۔ مگر کیا اندر کا اکیلا پن ان بہلاؤں سے بہلا ہے؟ ـــــ محلے کی، ادھر ادھر کی، اور کبھی رشتے کی عورتیں ملنے آتیں تو میں ان سے ڈھنگ سے باتیں بھی نہ کر پاتی ـــــ حالانکہ سبھوں سے ان کی سطح کی دلچسپ گفتگو کرنا میری عادت تھی۔ مجھے یاد ہے، امتحان کے دنوں میں، پڑھنے کے کمرے سے میں نے اکثر سنا تھا "آپ کے یہاں آج کل کیا آئیں ـــــ بٹیا تو مصروف ہیں، ـــــ" میں تو باجی سے باتیں کرنے آئی تھی ـــــ ان کو ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں اس لئے اجازت دیجئے" ـــــ

"اب اٹھو بھی ـــــ کتنا پڑھو گی ـــــ دیکھو یہ کتنا اچھا آرٹیکل ہے ـــــ آؤ ڈسکس کریں" ـــــ

وہ بھی میں ہی تھی ـــــ اور یہ بھی میں ہی ہوں۔ خالی الذہن احساس کمتری میں جکڑی ہوئی، خوف زدہ، نڈھال اور یہ متوحش ایکسپریشن ـــــ تم ہی بتاؤ کیوں؟ ـــــ کس کی وجہ سے؟

پھر وہ وحشت ناک موڑ بھی آیا ـــــ جب اڈری گاؤں شادی کرنے گیا تھا ـــــ اور اپنے ساتھ اپنی نئی نویلی بیوی رجیہ کو لایا تھا ـــــ رجیہ بھی میری قاتل ہے نا! ـــــ اس لئے اس کے متعلق تفصیل سے بتا دوں تاکہ تم سمجھ سکو! ـــــ وار کے کتنے طریقے ہوتے ہیں۔

رجیہ بھی میری ہی ہم عمر تھی۔ دیکھنے میں بھی اچھی خاصی صحت مند تھی۔ اور بھی ایک چیز ہوتی ہے جسے 'سکس اپیل' کہتے ہیں، یہ بات بھی مشترک تھی۔ مجھے رجیہ کے آجانے سے خوشی ہوئی ـــــ شاید کبھی تنہائی کا بوجھ بے حد وزنی ہو کر مجھے توڑنے لگے تو پل بھر کے لئے رجیہ سے باتیں کر کے میں اپنی اکھڑی سانسیں ہموار کر سکوں گی،

میں عورت ہوں نا! ـــــ اور عورتوں کے اندر کسی کے لئے سجنے سنورنے کی بے پناہ خواہش ہوتی

ہے ساکبھی جی چاہتا، تم کبھی میری جگ مگ کلائی کو بے اختیار ہو کے چوم لو ——— کبھی میری بندیا میں اپنا عکس دیکھتے دیکھتے بے خود ہو جاؤ ——— اور کبھی کسی "آؤٹنگ" کے لئے تیار ہوتے ہوئے مجھے کئی کئی بار لپسٹک لگانی پڑے۔ کبھی تم اپنی پسند کے رنگ کی ساری لے کر آؤ اور ضد کرنے لگو ——— "اسے ابھی پہن کے دکھاؤ تو"——— اور میں فخر اور خوشی، سرشاری اور بے اعتنائی کے ملے جلے لہجے میں کہوں ———

"اچھی تو ہے ——— مگر بہت قیمتی ہو گی"———

اور تم کہو ———

"اس کی قیمت صرف یہی ہے کہ تم پہن لو ——— OTHERWISE کاغذی ٹکڑے کا وجود کیا ہے؟"———

مگر ایسا کبھی بھی نہیں ہوا ——— میرے وارڈروب کپڑے سے ٹھسے ہوئے ہیں ——— ڈریسنگ ٹیبل چھوٹی بڑی شیشیوں اور ڈبوں سے بھرا ہوا ہے ——— یہ سب تمھارا خریدا ہوا ہے۔ تم ہی لائے ہو۔ اور میرے ہی لئے ——— مگر ویسے ہی جیسے تمھاری گاڑی کا پٹرول جب ختم ہو جاتا ہے تو کسی بھی پمپ کے پاس پارک کر دیتے ہو ——— جیسے، جب باورچی تم سے آ کے کہتا ہے۔

"چاول ہفتے بھر کا کم پڑ گیا ہے"———

اور تم ہفتے کی جگہ مہینے بھر کی رقم پکڑا دیتے ہو ——— یہ فرعونیت ہے، بے اعتنائی ہے۔ احساس برتری ہے۔ اس میں ان چیزوں کے سوا، اور بھی کچھ ہے ——— اور وہ ہے خرید لینے کا احساس!

مجھے بہت سوچنے کی عادت ہے نا، اس لئے تمھاری قلع بندی میں آجانے کے بعد، چند مہینے میں ہی، میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر سوفوکیشن سا ہے ——— جیسے میں سانس نہیں لے پاتی ——— بڑی بڑی کھلی ہوئی کھڑکیاں، کشادہ، ہال نما کمرے، چلتے ہوئے تیز رفتار پنکھے اور برسات کی خنک ہواؤں کے لمس کے باوجود مجھے لگتا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو ——— ہوا مجھ تک پہنچ نہیں پاتی ہو ——— اور پھر یہی احساس جب ذرا اسٹرلائزڈ ہوا تو میں نے محسوس کیا جیسے میرے اندر، دل کے پاس ایک شمع سی کسی نے جلا کر رکھ دی ہو ——— وہی سوزش اور وہی بے چینی اور جیسے موم کا قطرہ ایک جگہ ٹپک کے جم جاتا ہے، مجھے لگتا جیسے میرے اندر پل پل بڑھنے والا کانسٹینٹ بوجھ ہو ——— جیسے میرے دل کو نشتر لگا دیا ہو ——— دن بہ دن یہ احساس واضح ہو کر مجھے اپنی پہچان کا یقین دلانے لگا۔ اور میں متحیر سی سوچتی رہ جاتی ——— پتہ نہیں، اب زندگی کے کھنڈر کا کون سا ستون گرنا باقی رہ گیا ہے؟

رجیہ بہت سج دھج کے میرے سامنے فرش پہ پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ہونٹوں پہ پان کی سیاہی

مائل پیپڑی، آنکھوں میں موٹے موٹے بھدے کاجل ـــــ خوبصورت سے پرکشش بالوں کو اس نے تیل سے چپڑ کے گوندھ رکھا تھا ـــــ موٹے ململ کی سبز ساری سے جھانکتے ہوئے پیروں میں کچپیں پیسے والی آلتا کی شیشی سے نقش و نگار بنے تھے ـــــ وہ مجھے اپنے گھر کی باتیں بتا رہی تھی ـــــ اپنے ماضی کی باتیں کر کے سبھی خوشی ہوتے ہیں ـــــ میں بھی اس کی خوشی کی خاطر دلچسپی سے سن رہی تھی پھر میں نے دیکھا، وہ قصداً اپنا آنچل بار بار سنوار رہی ہے۔ جیسے وہ مجھ سے کسی سوال کی متقاضی ہو ـــــ عورت کا فطری تقاضا ـــــ اسی لئے میں نے پوچھا ـــــ

"رجیہ ـــــ نئی ساری ہے؟" ـــــ

"ہاں دیدی ـــــ ماں کہنے سے ساونی ناآئی تو مارے غصا کے لائے دہن ـــــ ای التا، چوڑی سب اوہی لائن ـــــ کہت ہیں ـــــ گڑیا بنائے کے رکھیں گے ـــــ سو ان کر کھاتر!"
ـــــ وہ کہتے کہتے شرما گئی اور اپنے پیروں کے بچھوؤں کو چھونے لگی ـــــ مجھے اس کا یہ انداز کتنا پیارا لگا ـــــ اس قدر دلچسپ کہ میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے 'سویس مس' کے نئے شیڈ، ایک خوبصورت سا ہیئر کلپ ـــــ اور دھل کر آئی ہوئی ـــــ صرف ایک بار کی پہنی ہوئی رین پرنٹ کی ساری اسے جلدی سے اٹھا کر دے دی اور کہا ـــــ

"رجیہ اسے پہن کر، یہ سب لگانا، وہ اور خوش ہوگا" ـــــ وہ تشکرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر لپسٹک کو انگلیوں سے چھوتی رہی ـــــ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی ـــــ اور میں وحشت زدہ سی خالی خالی دیواروں کو دیکھتی رہی۔ شمع کی لو جیسے کچھ اور بڑھ گئی ـــــ جیسے دل کو کسی نے مٹھیوں میں لے کر مل ڈالا ہو ـــــ وہی گھٹن اور وہی بڑھتی ہوئی بے چینی! ـــــ

مجھے شام کے بعد اکیلے باغیچے کی روشوں پہ ٹہلنے کی عادت ہے ـــــ پتہ نہیں نفسیات اسے کیا معنی دے۔ مگر نیچر کی طرف میری کشش بچپن سے ہی تھی ـــــ جب ٹوٹ کے بارش ہوتی، میں سب سے چھپ کے، بیماری کی پرواکئے بغیر پانی میں بھیگا کرتی ـــــ جب لو چلتی اور ماں سارے دروازوں اور کھڑکیوں پہ کالے پردے کھینچ کر بھائی بہنوں کو سلانے کی کوشش کرتیں، میں چپ چاپ دم سادھے سب کے سو جانے کا انتظار کرتی اور پھر چپکے سے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی کے پٹ کھول کر اٹھتے ہوئے بگولوں کو دیکھا کرتی ـــــ کٹکٹاتی سردیوں میں اکثر کارڈیگن اتار کر، ہڈیوں میں اتر آنے والی ٹھنڈک کو محسوس کرتی ـــــ اور گرمی کی راتوں میں جہاں سارے افراد کولر کا لطف لیتے، میں روشوں پہ ٹہلا کرتی ـــــ مجھے قطار میں کھلے ہوئے بیلا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، جھلسا دینے والی گرمی

کے بعد، رات کو پروا کے جھونکے اور جھومتے ہوئے آم کے درخت بہت اچھے لگتے۔ ممکن ہے، پیڑ پودوں کو تنہا تنہا، خاموش خاموش دیکھ کر میرے اکیلے پن کو لاشعوری سکون ملتا ہو، مگر یہ تو میری بچپن کی عادت تھی!

اس دن بھی میں خاموشی سے چہل قدمی کر رہی تھی کہ میرے قدم منجمد ہو گئے ـــــ سرونٹس کوارٹرز سے آنے والی پندرہ پاور کی مٹیالی روشنی میں، میں نے دیکھا، باہر ٹاٹ کے ٹکڑے پھیلا کر رجیہ اپنے شوہر کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ اور وہ بار بار لقمہ رجیہ کے منہ کی طرف لے جا کر کہتا ـــــ "ارے لے نا ـــــ ایک نوالہ ـــــ ہمری قسم ـــــ توہار ہاتھ میں جادو ہے ری ـــــ ایسن مجا ہے کی صاب لوگ کے بڑے بڑے ہوٹل فیل ہو جائیں" ـــــ اور رجیہ شرمائی سی کبھی اس کا ہاتھ پرے کر دیتی، کبھی اس کے اور قریب سرک کر ایک ادا سے منہ کھول دیتی! ـــــ

شاید تمھیں پتہ ہو، یا کہ تم بھول گئے ـــــ وہ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ تھی ـــــ میں تمھیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ میں نے تمھارے لائے ہوئے کپڑوں کے انبار سے چن کر ایک خوبصورت سی ساری پہنی تھی۔ تمھارے لئے دلہنوں والا سنگار کیا تھا ـــــ اور باورچی خانے میں خود جا کر تمھاری پسند کی چینیز تیار کی تھیں ـــــ اپنے کمرے کو کتنا کتنا سنوارا تھا ـــــ اور پھر تمھیں فون کر کے جلدی آ جانے کو کہنا چاہ رہی تھی ـــــ یہ پہلا موقع تھا، جب میں نے تمھیں فون کرنے کی جسارت کی تھی۔ مگر ریسیور تمھارے بجائے سکریٹری نے اٹھایا تھا ـــــ میں تمھارے اور اپنے اندر کے فاصلے کو بھول کر کہہ رہی تھی۔ "صاحب کو ریسیور دو ـــــ کہنا، ایک ضروری بات ہے"

دو سکنڈ کی خاموشی تھی ـــــ اس نے یقیناً تمھیں کہا ہو گا ـــــ مگر تیسرے سکنڈ، تمھارے بدلے اسی کی آواز آئی تھی ـــــ "سر بہت بزی ہیں ـــــ کوئی ضروری میسیج ہو تو نوٹ کروا دیجئے"

اور میں نے جھلا کر ریسیور رکھ دیا تھا ـــــ شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ میں پہلے بھی فون کا استعمال بہت کم کرتی تھی۔ اور پھر اگر کوئی فوراً نہ مل جائے، ـــــ ایزلی اویلیبل نہ ہو، لائن انگیج ہو تو میرا دل چاہتا، ریسیور کو پٹخ دوں ـــــ اور پھر یہ تو تم ـــــ وہیں موجود ـــــ میں گھنٹوں روتی رہی تھی۔ کمرے کی بتی تک نہیں جلا سکی ـــــ مجھے پتہ بھی نہ چلا کب شام ڈوب گئی۔ کہ تم آ گئے ـــــ آتے ہی ٹیوب لائٹ آن کی ـــــ اور میری طرف متوجہ ہوئے بغیر بولے ـــــ

"آج دوستوں نے مون لائٹ میں پارٹی مانگی ہے۔ اینی ورسری کے موقع پہ ـــــ چلو ـــــ تیار ہو جاؤ" ـــــ

پہلی بار تمھارا دوستانہ لہجہ سن کر مجھے گہری تاریکی میں اڑتے ہوئے جگنوؤں کو آنچل میں پکڑ لینے کی تمنا لئے ہوئے تمھارے سامنے آگئی ـــــ

"تیار تو کب سے ہوں ـــــ آج آپ کے لئے کتنا کچھ بنایا تھا" اور تم نے بیزاری سے کہا تھا ـــــ

"یہ کیا ـــــ جاہلوں والا حلیہ بنا ڈالا ہے ـــــ وہ نیلی میکسی پہن لو ـــــ جو میں پچھلی مرتبہ لایا تھا ـــــ"

اور میں پھٹی پھٹی نظروں سے تمھاری طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ تم کہہ رہے ہو، میرے محافظ ـــــ مجھے شوپیس بنا کر خود کو اپ ٹو ڈیٹ ثابت کرنا چاہتے ہو، جب کہ مجھے جسم کے پیچ و خم نمایاں کر دینے والے لباس سخت ناپسند ہیں۔ فیزیک کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ـــــ یہ تو ہے، مگر اہمیت ہے بھی۔ اور کوئی خود کو اشتہار نہیں بنانا چاہتا ـــــ وہ تو جذبہ سپردگی ہوتا ہے، عبادت کی طرح مقدس احساس، کہ کوئی اپنا آپ بھول جاتا ہے۔ کاش تم نے کبھی محسوس کیا ہوتا، عورت کیا ہوتی ہے؟ میری اپنی بھی کوئی طلب ہے جو صرف اور صرف تمھاری ذات سے وابستہ ہے۔ مگر تم ہجوم کے آدمی تھے۔ تم نے اپنی حیثیت ہنگامو میں گم کر دی تھی۔ اور جب میں تمھاری پارٹی سے واپس آئی، میرے سارے احساسات سو چکے تھے ـــــ تھکن اور اندرونی درد کی ٹیس نے مجھے نڈھال کر ڈالا تھا ـــــ

اچانک میری کراہ سن کر تمھاری نیند ٹوٹ گئی تھی ـــــ

تم نے پوچھا تھا۔

"کیا طبیعت خراب ہے ـــــ ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں"

میرے لبوں پہ سرد سی ایک پر اسرار مسکراہٹ تھی۔

وہ کون تھا، جو ہر ایسے لمحے، میرے سرہانے آکر بیٹھ جاتا۔ میرے بالوں کو دھیرے دھیرے سہلاتا۔ اور بڑے پیار سے کہا کرتا تھا۔

"ارے تم یوں گھبرا گئی ـــــ بالکل بچی ہو تم ـــــ میں جو ہوں، میرے ہوتے ہوئے تمھیں کیا ہو سکتا ہے ـــــ ڈاکٹر کیا کرے گا ـــــ صبح چلیں گے، اور صبح یوں باتیں کرتے کرتے آ جائے گی کہ تمھیں پتہ بھی نہ چل سکے گا" ـــــ

پتہ نہیں وہ کون تھا ـــــ مگر اکثر ہر ایسے لمحے وہ ایک دشمن کی طرح میرے سامنے آئینہ رکھ جاتا اور میں رو پڑتی۔ اور تم اس طرح مجھ سے سوال کر رہے تھے جیسے ڈاکٹر کا اسسٹنٹ، ڈاکٹر کے آنے سے قبل پرسکرپشن کی خانہ پری کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر آیا ـــــ اس کے الٹے سیدھے سوالا

بہت خاموش رہی ــــ وہ تمھیں فرنگی زبان میں کہہ رہا تھا کہ میرے نروس ــــ میرا ہارٹ سب پہ کمہ اینکلڈ ہے۔ تم اپنا زیادہ وقت میرے پاس گذارو ــــ مجھے خوش رکھو۔ اس عمر میں یہ سب نہیں ہوتا، مگر جب ہوتا ہے، بہت ہی سیریس ٹرن لیتا ہے، ــــ

"یس آئی ڈو مائی بسٹ" ــــ تمھارے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا۔ تم نے یوں جواب دیا جیسے عام سی بات ہو، نہ گھبراہٹ، نہ ندامت اور نہ بے چینی! ــــ

اور میں بس تمھیں کو دیکھتی رہ گئی تھی! ــــ

دو ایک دن تو واقعی جلدی آگئے! ــــ مگر بس یونہی بیٹھے خبریں سنتے رہے ــــ بیچ بیچ میں کوئی ایک جملہ کہہ جاتے ــــ خبروں سے متعلق۔ پھر تم نے کہا ــــ

"کیسیٹ سنو گی ــــ جب تک میں چند ضروری فائلیں دیکھ لوں" ــــ اور تم نے ٹیپ ریکارڈر لگا دیا۔ کیسیٹ بجتا رہا ــــ اور میں ویران آنکھوں سے دیواروں کو تکتی رہی۔ تم بہت مطمئن تھے کہ میں کتنے دھیان سے سن رہی ہوں۔ پھر تم نے دوسرا لگا دیا ــــ پھر تیسرا ــــ یونہی ایک ایک کر کے سارے کیسیٹ ختم ہو گئے ــــ پھر میں باغیچے میں ٹہلنے لگی۔ اور تم اپنا کام کرتے رہے ــــ جب بہت تھک گئی تو جا کر سو گئی ــــ چند دنوں، بعد تم نے آڈرلی کو کہہ دیا کہ وہ رجیہ کو میرے پاس بھیج دیا کرے ــــ تاکہ مجھے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ اور تم اپنے معمول پہ آگئے۔ اب میں تمھیں کیسے بتاتی کہ رجیہ میری تنہائی نہیں بانٹ سکتی بلکہ اس کا وجود میری تنہائی کے احساس کو اور بھی شدید کر دیتا ہے ــــ اس طبقے کی عورتوں کے پاس، جن کی نئی شادی ہوئی ہو، موضوع کیا ہوتا ہے؟ ــــ یہ تم نہیں جانتے کیا؟ ــــ شوہر ــــ اس کے بعد بچہ ــــ یا اگر جوائنٹ فیملی ہو تو سسرال والوں کے شکوے ــــ رجیہ صرف اپنے شوہر ہی کی باتیں کر سکتی تھی ــــ اب کیا میں اتنی خود غرض تھی کہ اس سے اس کی پسند کا موضوع چھین لیتی ــــ اور پھر رجیہ میں اور مجھ میں کچھ طبقاتی زینے بھی تھے ــــ میں اس کے سامنے اپنی تہی دامنی کا اعلان کرنا نہیں چاہتی تھی ــــ شاید تمھیں پتہ ہو کہ شکست خوردہ دل ایک ٹھیس لگا ہوا آبگینہ ہوتا ہے ــــ کیا پتہ اس کا کون سا لفظ مجھے چکنا چور کر دے۔ اور میں جینے کا یہ بھرم بھی کھو دوں ــــ اسی لئے میں نے رجیہ کو نظر انداز کر دیا ــــ بلکہ قصداً کچھ پڑھنے لکھنے بیٹھ جاتی۔ اور اس سے کہہ دیتی

"جاؤ رجیہ ــــ میں ٹھیک ہوں" اور وہ خوش خوش "سلام بی بی" کہہ کے چل دیتی ــــ

بعض غم ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شریک نہیں ہوتا ــــ آج تم سے بہت ساری باتیں کرنے کی خواہش ہے ــــ شاید اس لئے کہ جب میں نہیں ہوں گی، جب بھی یہ باتیں تمھیں یاد رہیں ــــ اور

میرے ہی لہو سے جل گیا یہ چراغ، یہ احساس نارسائی، تمھیں وہی خلش رہی، ٹوٹے ہوئے کانٹے کی ٹیسیں اور وہی بے چینی دے، جیسے میں برسوں جھیلتی رہی —— آج اس پل میں نے جانا، موت کتنی پیاری، کتنی خوش آئند، کتنی سکون بخش ہوتی ہے۔ لوگ فضول ہی اس نعمت سے خوف زدہ ہوتے ہیں —— ہاں میں تمھیں بتادوں —— اگر واقعی کوئی تمھیں ناپسند ہو تو اسے بے دریغ قتل کر دینا —— آج کل، —— اور آج کل ہی نہیں، ہر زمانے میں تمھارے جیسے لوگ قانون کی گرفت سے بچ ہی جاتے ہیں —— ، مگر یوں کسی کو قسطوں میں، پل پل رلا رلا کر مت مارنا —— یہ موت واقعی ناقابل برداشت ہوتی ہے —— میں اس کی گواہ ہوں —— مجھ سے پوچھو، —— یہ گھٹی گھٹی زندگی —— اور یہ موت کی پیہم آہٹ کیا ہوتی ہے؟ —— واقعی، جب کبھی سینے میں ٹیس اٹھتی تھی، تو میں یا تو رو پڑتی تھی، یا نفل کی نمازیں پڑھنے لگتی تھی —— ایسا لگتا تھا جیسے کسی ناکردہ گناہ کے سر بہت بڑا الزام عائد کر دیا گیا ہو —— اور میں اسی ڈراونے خواب سے سہم سہم کر زندگی کے بدلتے ہوئے چہرے کے نقوش پڑھنے کی کوشش کیا کرتی تھی —— یونہی ایک عرصہ بیت گیا ——

آج یہ چہروں کا ہجوم، یہ رسم غم میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا —— میرا مرنا آج جن کے لئے حادثہ ہے، وہ کیا جانیں، یہ حادثہ کب کیسے گذر چکا ہے —— میں تو صرف گنی ہوئی چند سانسوں کا قرض دار تھی —— اور کوئی بھی خوددار آدمی قرض کو اتار دینے میں کتنی جلدی کرتا ہے، یہ کسے پتہ نہیں —— اس کے لئے میں رجیہ کی ہی احسان مند ہوں کہ یکبارگی وہ اسی کی آواز تو تھی جس نے مجھے ہر ایک آواز سے بیگانہ کر دیا ہے ——

اس رات دس بجے کے قریب وہ جھلا کر، بہت ہی تیز اور تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی ——

"سب صفا —— صفا سن لیو —— تم یار دوست کے سنگ موج کرہیو، اور میں باٹ جوہت جوہت بھور کروں گی۔ ای ناہیں ہو گا ——

اور یہی آواز ایک پیشہ ور قاتل کی طرح میرا کام تمام کر گئی تھی —— حالانکہ اس آواز میں ایسا کچھ نہ تھا۔ جو پہلے نہ رہا ہو۔ پھر بھی، مجھے لگا جیسے کسی تیز آندھی نے اس درخت کو یکبارگی اکھاڑ دیا ہو جو بہت پہلے دھرتی کی نمی سے ناطہ توڑ چکا ہو —— شاید اسی لئے میں گھبرا کے بستر سے اٹھ گئی۔ ایک عجیب سی بے چینی اور تھکن جیسے یکبارگی کچھ چھن گیا ہو —— اور جو منظر نظروں کے سامنے ہو، وہ بہت ہی ڈراؤنا، اجنبی اجنبی سا، اور معنی خیزی کی وحشت لئے ہو، ——

کبھی تم نے سوچا، اپنی ہی شخصیت کے بکھرے ذرّوں کو تو بڑے سے بڑا فنکار بھی پھر سے جوڑ نہیں سکتا بلکہ جو جتنا اداس ہوتا ہے، اسی قدر تیزی سے ٹوٹتا اور بکھرتا ہے —— تم بھی تو

ہر رات، نصف شب گزار کے آتے ——— بغیر میرے پوچھے ہی اپنے نئے جواز دینے لگتے، مگر میں آج تک رجیہ کے پریقین لہجے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکی ——— نہ کوئی دعوا ——— نہ کوئی دھمکی ——— بلکہ مجھے تمہاری باتوں سے ایسی کوفت ہوتی کہ میں چپ رہ جاتی ——— معذرت کرلینا کبھی رسماً ہوتا ہے اور کبھی آدمی ندامت کے تمام تر احساسات کے ساتھ صلح کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مگر تمہاری معذرت کیا تھی، یہ میں آج تک نہ سمجھ سکی۔ شاید تم رسماً ہی کہا کرتے تھے۔ مگر تمہاری دنیا میں یہ رسم ان لوگوں کے ساتھ برتی جاتی ہے، جن سے کاروباری رشتہ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ تمہارے رشتے کا نام کیا ہے؟ ———

اور رجیہ کہہ رہی تھی ———

"مار ہمرے گھر کی ڈیوڑھی ایک کر دیئے رہو ——— ای ہی کھاتر! ——— ایکا سے ایک بات آوت رہے ——— اور ——— لاکے سنیت دیو" ———

اف! یہ عورت چپ کیوں نہیں ہو جاتی ——— اس کی شوخ سی یقین بھری جنگ مجھے چکنا چور کر گئی ہے ——— معاً مجھے لگا تھا جیسے میرے کمرے میں دھواں بھر گیا ہو ——— عجیب سی گھٹن ہو، میرا دم گھٹ رہا ہو ——— جیسے میرے اندر کی جلتی ہوئی شمع کی لو بہت بڑھ گئی ہو ——— کاش میں بھی رجیہ کی طرح چیخ کر تمہیں مخاطب کر سکتی ——— مگر نہیں ——— تم اجنبی راہوں کے مسافر تھے تمہارے پیش نظر شاہراہیں تھیں۔ اور میں بیتے ہوئے کل کی خواب ناک سی پگڈنڈی پھر تم ایک نیا ماسک پہن کر میرے سامنے کیوں آئے ہو ———

میری پلکوں پہ آنسو کے قطرے لرز رہے ہیں۔ کوئی بھی تو نہیں جسے میں وقت سفر الوداع کہہ سکوں؟ ——— یہ کیسا سفر ہے؟ ——— کہ دور دور تک کوئی نقش پا بھی نہیں اور نہ رخصت کرنے کے لئے اکھڑتی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوئی ٹیس ——— کوئی چبھن، کوئی یاد ——— کچھ بھی تو نہیں۔

وہ تو یہ ہے کہ میرے احساسات کی آگ بھی تمہارے بس کی نہیں ———

یہ پتہ نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ——— بالکل انجانی، اور سراسیمہ سی بے کلی ———

میری ویران ویران، بے چین بے چین نظریں اجلی دیواروں سے پیوست ہو کے رہ گئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو قاتل کی تصویر مرنے والی شخصیت کی آنکھوں میں منجمد ہو جاتی ہے! ———

اجلی پیشانی پہ بڑے قرینے سے بکھرے ہوئے بال، زخم کا ایک نمایاں سا نشان، شوخ نظر

میں سمٹی ہوئی بچوں کی سی معصومیت اور ایک بے ساختہ بہائے جانے والی قاتل ہنسی! ـــــ

اب تم اپنا ماسک اتار ہی دو ـــــ میں نے تمھیں واقعی معاف کر دیا ہے ـــــ کہ وہ تم نہ تھے جسے میں تمھارے اندر تلاش کر کر کے لہولہان ہوئی تھی۔

اس آخری لمحے شعور نے میری پلکوں کے کانٹے نکال دیئے اور میں محسوس کر رہی ہوں جیسے برسوں کا تھکا ہوا دل و دماغ غنودگی کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہو! ـــــ گہرا !! ـــــ اور گہرا !!! ـــــ □

احسن عزیز
آسٹریلیا

احمد شیخ
صیغۂ امتحانات مرہٹواڑہ یونیورسٹی
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

غزلیں

نہ آسماں سے چلے، اور نہ تیرے در سے چلے
تو پھر بتا مرے مشفق، ستم کدھر سے چلے
سزا جو جرمِ وفا کی ملی، سو ہم کو ملی
فسانہ ہائے نظر ان کے بام و در سے چلے
وہ قربِ گلبدناں، وہ نگارِ آتش لب
ہمیں تو یاد ہے اتنا کہ بے خبر سے چلے
ہوئی ہے کچھ نگہِ لطف اس طرح مائل
کہ اب نہ کام کوئی میرے چارہ گر سے چلے
نہیں کہ دستِ تمنا میں جام آیا نہیں
مگر جو دور چلے خونِ چشمِ تر سے چلے
الجھنے والے تری زلف سے الجھتے رہے
اور چلنے والے مقامِ دل و نظر سے چلے
بجھے بجھے سے در و بام مہ رخوں کے ہیں
چراغ لے کے چلے جو وہ رہ گذر سے چلے
اداس شب کا کنول منتظر رہا احسن
صبا سے شوخ کوئی دم لبِ سحر سے چلے

اب کے تو جو بھی ہاتھ لگا لے گئی ہوا
اوراق تک غزل کے اڑا لے گئی ہوا
اک پردۂ غبار ہے نظروں کے سامنے
آنکھوں کے سارے خواب چرا لے گئی ہوا
پچھتا رہا ہوں میں بھی کئی روپ دھار کے
چہرے سے ہر نقاب اڑا لے گئی ہوا
رنگوں کے اک ہجوم میں بکھرا ہوا ہوں میں
یہ کس طرف کو ذہن مرا لے گئی ہوا
تنہائی اس کی میرے سوا کون بانٹتا
مجھ کو رفیق اپنا بنا لے گئی ہوا
خط لکھ کے پڑ گئے عجب الجھن میں آج ہم
اس آدمی کے گھر کا پتہ لے گئی ہوا
چلتا ہے کس کا زور ہواؤں کے سامنے
ہمراہ اپنے سب کو بہا لے گئی ہوا
دہلیزِ دل پہ شام سے جلتا تھا اک دیا
احمد اسے بھی آج اٹھا لے گئی ہوا

علی حیدر ملک
۲۷۔ نور پلازہ، بلاک — ایم۔
شمالی ناظم آباد، کراچی، پاکستان

غیر تاریخی لمحات

شیشے کے پنجرے میں قید چڑیا لمحہ لمحہ دانہ چگ رہی ہے۔

رات آدھی اِس پار ہے اور آدھی اس پار۔

بالکونی میں کھڑا ——— وہ سگریٹ کے کش پہ کش لے رہا ہے۔

سامنے کے فلیٹ کی عورت بستر پر لیٹی ہے اور اس کا شوہر جھوم جھوم کر بڑے خلوص بڑی محبت سے اس کے پاؤں دبا رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ مرد کی تاریخ کا غیر تاریخی لمحہ ہے یا عورت کی تاریخ کا عین تاریخ ساز موقع؟

"نور جہاں نہایت خوبصورت اور خوب سیرت ملکہ تھی۔ مغلیہ دربار میں وہ شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔ حکومت کے نظم ونسق میں اس نے بہت اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ کیا عوام کیا خواص سبھی اس کی ذہانت اور خداداد صلاحیت کے معترف تھے۔ شہنشاہ جہانگیر بھی ملکہ کی بہت عزت کرتا تھا......"

بالکونی کے پیچھے اس کا چھوٹا بیٹا میز پر جھکا اپنا سبق یاد کر رہا ہے۔

بالکونی میں کھڑا ——— وہ دوسرا سگریٹ جلاتا ہے۔

سامنے والی فلیٹ کی عورت بستر سے اٹھتی ہے۔ اس کا شوہر سینڈل سیدھی کر کے اس کے قدموں کے پاس رکھ دیتا ہے۔ عورت ایک ناز، ایک بے نیازی کے ساتھ پیروں میں سینڈل ڈال کر غسل خانے میں چلی جاتی ہے۔ اس کا شوہر بے چینی سے ٹہلتا ہوا بار بار غسل خانے کے دروازے تک جاتا ہے اور پھر اسی بے چینی کے ساتھ واپس آجاتا ہے۔

"شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنے دور حکومت میں بہت ساری عمارتیں بنوائیں۔ ان عمارتوں میں سے ایک کا نام تاج محل ہے جس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ محل شہنشاہ شاہ جہاں کی یادگار ہے۔ شاہ جہاں نے ملکہ ممتاز سے وعدہ کیا تھا کہ......"

بالکونی کے پیچھے اس کا چھوٹا بیٹا میز پر جھکا تاریخ کا کچھ اور فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ سامنے والی فلیٹ کی عورت غسل خانے سے واپس آگئی ہے۔ اس کا شوہر بے قراری کے ساتھ اس کے پاس آتا ہے۔ عورت اپنے ننگے

گلے پر انگلیوں سے ایک نشان بنا کر سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔ شوہر اثبات میں اپنی گردن ہلاتا ہے ___ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ ...... اب کچھ نظر نہیں آتا راستے میں کمرے کی دیوار حائل ہوگئی ہے۔

بالکونی میں کھڑا ___ وہ جھلاہٹ کے ساتھ سگریٹ پھینک کر پاؤں سے مسلتا ہے اور پھر کمرے میں آکر بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ بیوی پیار بھری خفگی سے بچوں کی طرف اشارہ کرکے سوئٹر بننے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

کرسی میں دھنس کر ___ وہ پھر سگریٹ سلگا لیتا ہے۔

"آنکھ کا بیرونی خول غیر شفاف اور سخت ہوتا ہے جسے سفیدۂ چشم کہتے ہیں۔ اس کے مرکز میں ایک سوراخ ہوتا ہے جسے آنکھ کی تپلی کہتے ہیں۔ تیز روشنی میں یہ سوراخ سکڑ کر چھوٹا ہو جاتا ہے اور مدھم روشنی میں پھیل کر بڑا ہو جاتا ہے ......"

اس کی چھوٹی بیٹی کتاب پر نظریں جمائے زور زور سے پڑھ رہی ہے۔

سگریٹ کو ایڑی سے مسلتے ہوئے ___ وہ بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

بیوی پھر بچوں کی طرف اشارہ کرکے سوئٹر کی بنائی میں لگ جاتی ہے۔

"روشنی دراصل توانائی کی ایک قسم ہے جس کی مدد سے ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ تجربہ گاہ میں اس اصول کو ثابت کرنے کے لئے......"

اچانک گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ سارے میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔

"بجلی چلی گئی۔ بجلی چلی گئی۔"

"یہ بجلی روز روز کیوں چلی جاتی ہے؟"

"بچوں کے امتحان ہو رہے ہیں اور کم بخت بجلی والے......"

"لگتا ہے ٹرانسفارمر میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔"

"نہیں۔ پاور ہاؤس میں ہی کچھ گڑبڑ ہے اس لئے کہ دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

"بچو تم سو جاؤ۔ بجلی اب جلد نہیں آنے کی......" دور و نزدیک کی مختلف آوازوں کے درمیان اس کی بیوی کی آواز تاریکی میں اپنے بچوں سے مخاطب ہوتی ہے۔

تاریکی کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی آہستہ آہستہ اردگرد کی پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

مگر شیشے کے پنجرے میں قید چڑیا کے دانہ چگنے کی آواز اب بھی برابر آرہی ہے ـــــــ ٹک ٹک۔ ٹک ٹک۔

سگریٹ جلاتے ہوئے ماچس کی تیلی کی روشنی میں وہ دیکھتا ہے کہ بچے اوندھے سیدھے اپنے اپنے بستر پر سو گئے ہیں۔ بیوی کی پنڈلیاں کھلی ہیں مگر اس کی آنکھیں بھی بند ہیں۔ اون کا گولہ جس میں بنائی کی تیلیاں پیوست ہیں اس کے سرہانے پڑا ہے۔ کچھ دیر ـــــــ وہ یوں ہی بیٹھا رہتا ہے۔ سگریٹ جل جل کر جب ختم ہو جاتا ہے تو وہ اس کے ناقابلِ استعمال ٹکڑے کو کھڑکی کے باہر پھینک کر دوسرا سگریٹ جلاتا ہے ـــــــ پھر تیلی کی روشنی میں شیشے کے پنجرے کی جانب نگاہ کرتا ہے۔

چڑیا لمحہ لمحہ دانہ چگ رہی ہے۔

تین چوتھائی رات اس پار ہے اور ایک چوتھائی اس پار۔

یکایک روشنی کسی وحشی درندے کی مانند چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی ہے اور چپے چپے پر اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے۔

اس کی بیوی بچے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

" سوتے میں بتیاں کس نے جلا دیں ؟" ـــــــ اس کی بیٹی آنکھیں ملتی ہوئی سوال کرتی ہے۔

" بجھاؤ۔ جلدی بجھاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے روشنی کا ؟" ـــــــ بیوی کروٹ بدلتے ہوئے اکتاہٹ سے چیختی ہے۔

ہاتھ بڑھا کر ـــــــ وہ کھٹ کھٹ ساری سوئچیں آف کر دیتا ہے اور اندھیرے میں وہم سے اپنے بستر پر گر جاتا ہے۔

شیشے کے پنجرے میں قید چڑیا شاید اب بھی لمحہ لمحہ دانہ چگ رہی ہے ......" ☐

نجم الحسن نجمی

۱۵۸- پھلو رام سٹریٹ
احمد پور شرقیہ (بہاولپور) پاکستان

غزلیں

ماحول اجنبی ہے، بڑی الجھنوں میں ہوں
بیتی رتوں کا پھول نئے موسموں میں ہوں
پیروں تلے زمیں ہے نہ سر پر ہے آسماں
جانے رہِ حیات کے کن مرحلوں میں ہوں
کوئی کرن بھی ہاتھ مرا تھامتی نہیں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں
لوگوں کی بات چھوڑ، کبھی خود بھی غور کر
میں دوستوں میں ہوں، کہ ترے دشمنوں میں ہوں
جیتے ہوئے حریف، مرا حوصلہ بھی دیکھ
میں پا بریدہ ہو کے بھی اگلی صفوں میں ہوں
مجھ کو کبھی دیکھ میں بھی تری چاہتوں میں تھا
مجھ کو کبھی سوچ، اب بھی تری خواہشوں میں ہوں

منظر دکھلاتی ہے، قاتل لہر، نیا
سیلابوں سے ابھر رہا ہے شہر، نیا
رفتہ رفتہ، جسم کی یہ دیوار گری
دھیرے دھیرے رگوں میں اترا زہر، نیا
کیا کیا دہشت ناک مناظر دیکھے تھے
دیدہ و دل پر اب کے ٹوٹا قہر، نیا
کرب کی شدت یوں بھی چین نہ دیتی تھی
درد اٹھا ہے رات کے پچھلے پہر، نیا
نجمی اب تو جان بچانا مشکل ہے
رات اندھیری، قاتل چہرے، شہر، نیا

قیوم راہی

اے-۲۰۰، بلاک-ڈی،
شمالی ناظم آباد، کراچی - ۳۳

زہریلا آدمی

اس کے لمبے لمبے خشک کھچڑی بال خنک آلود ہواؤں کے دوش پر بکھر بکھر کر اس کی پیشانی کو ڈھانپ دیتے تھے، وہ بار بار انگلیوں سے کنگھا کر کے انھیں اوپر کر دیتا تھا۔

اس البیلی شام کو جب کہ ہر طرف رنگ برنگی روشنیاں تھیں، لوگوں کا اژدھام تھا، وہ صدر کے علاقے میں خاصی دیر سے اکیلا اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا، بغیر کسی کام اور بنا کسی پروگرام کے۔ یہ اس کا معمول تھا ہفتے کی چند شامیں وہ اس طرح گزار دیتا تھا، مختلف بازاروں میں گھوم پھر کر ــــ

سڑک کے کنارے لوہے کی ریلنگ کا سہارا لئے وہ سستانے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سگریٹ پیتا ہوا اس کے نزدیک آیا اور بولا "کیا آپ پینورا ما سینٹر کا راستہ بتا سکیں گے؟"

"جی ــــ جی ہاں، کیوں نہیں"

"دراصل میں کراچی میں نیا نیا شفٹ ہوا ہوں ــــ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کی اس میں کون سی بات ہے۔" اس نے کچھ سوچا، حالانکہ اس میں سوچنے کی کوئی بات ہی نہ تھی سرے سے۔ جب وہ اس کنڈلی سے باہر نکلا تو بولا "راستہ تو آپ کو بتا ہی دوں گا، آپ کچھ تھکے تھکے سے نظر آرہے ہیں، میں بھی اب زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا، آیئے کیوں نہ ایک ایک کپ چائے ہو جائے۔"

نوجوان نے اس کو یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات ہوئی کہ نوجوان بلا پس و پیش اس کے ساتھ ایک ریستوران میں چلا گیا۔

چائے پینے کے دوران تعارف ہوا، ایک دوسرے کے ناموں، پیشوں، مشاغل اور دلچسپیوں کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ بہت سی باتیں ہوئیں خاصی دیر تک، دلچسپی اور اپنائیت کے ساتھ گویا وہ ایک دوسرے گہرے دوست ہوں ــــ اس عرصے میں دونوں کی تکان دور ہو گئی۔

"اب چلا جائے، کیا خیال ہے؟" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔

"ہاں" نوجوان بولا "اب تو ملاقاتوں کا سلسلہ رہے گا نا، آپ سے مل کر یوں معلوم ہوا کہ پہلی ملاقات نہ ہو بلکہ ...."

"میں سمجھ گیا" اس نے بات کاٹ دی۔ پھر وہ چپ ہوگیا۔

نوجوان بولا "تو فی الحال آپ مجھے اپنے دفتر کا پتہ نوٹ کرا دیجئے"

"پتہ"

"ہاں"

اس نے ایک بار خاص نظروں سے نوجوان کو دیکھا پھر اپنی کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور ٹھوڑی کا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ڈال کر آنکھیں میچ لیں گویا کوئی گتھی سلجھا رہا ہو۔

پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو نوجوان نے اپنا سوال دوہرایا "میں نے آپ سے دفتر کا پتہ نوٹ کرنے کے لئے کہا تھا آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

نوجوان ایک تذبذب میں الجھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی ساکت پتلیاں اس سے کوئی سوال کرنے لگیں۔ وہ نہ بولا تو نوجوان کو ہونٹوں سے بھی کام لینا پڑا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں"

"میں سمجھ نہیں سکا آپ کا مطلب"

"مطلب" اس نے ایک لمبا سانس لیا "دراصل یہ جان پہچان ہی تو....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جان پہچان ــــــ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں آپ" نوجوان سے اب ضبط نہ ہوسکا۔

اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ اس نے نوجوان کی بات سنی ہی کب تھی جو توجہ دیتا۔

نوجوان کے ذہن کو تجسس بری طرح کریدنے لگا۔

پھر صدیوں بعد وہ نوجوان سے مخاطب ہوا، ایک اعتماد اور وقار کے ساتھ "میں نے کہا نہیں تھا بس اتنا ہی کافی ہے، اور میں نے ٹھیک ہی کہا ہے" پھر وہ کھوئے انداز میں بولا "میرا کہا مان جاؤ نوجوان ورنہ ایک ایک سارے پھول جھلس جائیں گے، جن پھولوں کی خوشبو سے اس وقت ہمارا ذہن و دل مہکے ہوئے ہیں۔ (نوجوان ایک اسرار کی ڈوریوں میں جکڑا ہوا تھا ــــــ اور بھائی میرے۔

اس حد سے نہ بڑھو کہ اس سے آگے کانٹوں اور انگاروں بھا راستہ شروع ہو جاتا ہے ——
لیکن مجھے تو تمھیں پینورا ما سینٹر کا راستہ بتانا ہے —— آؤ چلیں۔"

اور نوجوان نے دیکھا کہ وہ شخص جو ابھی ابھی اس کے روبرو چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا یوں دور ہو گیا ہے۔

اس نے کھڑے ہو کر نوجوان کا شانہ تھپتھپایا اور سر کے اشارے سے اپنی بات دوہرائی۔ نوجوان اٹھا تو وہ تیزی سے کاؤنٹر کی طرح لپکا۔

اس نے چائے کا بل ادا کیا اور وہ ریستوران سے باہر نکل آیا جہاں روشنیاں تھیں، انسانوں کا ہجوم تھا اور بے پناہ ٹریفک۔ نوجوان کو شبہ سا ہو رہا تھا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے —— نوجوان کو پینورا ما سینٹر کا راستہ بتا کر وہ ہلے ہلے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے سڑک کراس کی اور پھر وہ تیزی سے کچھ دور چلا اور زمین دوز راستے کی سیڑھیوں پر اترنے لگا۔

زمین دوز راستے میں کیسٹوں کی ساری دوکانوں سے بیک وقت اونچی آواز میں گانے چل رہے تھے۔ مختلف دھنوں میں، مختلف سازوں کے ساتھ، مختلف گلو کاروں کے گائے ہوئے گانے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور ہو رہے تھے، ایک گانے کا ایک بول اس کے کانوں میں پڑا تو وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور گانوں اور سازتیوں کے اس میدان کارزار میں اس گانے کے باقی بولوں کا سراغ لگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ آخر وہ اوپر چوک پر آکر ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی جو کچھ ہوا تھا وہ اچھا نہیں تھا۔ وہ مسلسل ایک اضطراب اور پچھتاوے کی آنچ میں پگھلا جا رہا تھا۔

نوجوان عجیب سوچوں میں گم دھیرے دھیرے پینورا ما سینٹر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کا شانہ کسی ہاتھ کی گرفت میں آیا تو وہ گھبرا سا گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اجنبی دوست جو ابھی ابھی اسے حیران کر گیا تھا اس کے نزدیک کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"ارے آپ ——" نوجوان نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں —— میں" اس نے پھولتی ہوئی سانسوں کو درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

نوجوان نے سوال کرنے کے لئے زبان کے بجائے آنکھوں سے کام لیا۔

اس نے نوجوان کی طرف کاغذ کی ایک چٹ بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے اس پر اپنے دفتر اور گھر کا پتہ نوٹ کر دیا ہے۔"

نوجوان نے اس کے ہاتھ سے چٹ لیتے ہوئے بڑی تحیر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاں چاہے آسکتے ہو ـــــ جب جی چاہے"، نوجوان کے ہاتھ میں چٹ تھماتے ہوئے اس نے کہا اور جلدی سے پلٹ کر چل دیا۔

نوجوان کچھ بھی تو نہ بول سکا۔ اس نے چٹ لے کر جیب میں رکھ لی۔ ایک بار پھر اسے شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ □

ایس۔ این۔ شاہ

گیبریل گارسیا مارکوئز

گیبریل گارسیا مارکوئز کولمبیا کا ہسپانوی نژاد ناول نگار ہے۔ ہسپانوی زبان میں لکھتا ہے اور اس سال اسے نوبل پرائز کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

اس کا سنہ ۶۷ء کا چھپا ہوا ناول "تنہائی کے سو سال" ایک بار پھر اہلِ ذوق کی ادبی گفتگو کا موضوع بن گیا ہے۔ "تنہائی کے سو سال" اس کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

گارسیا برسوں سے اپنا وطن چھوڑ کر میکسیکو میں رہ رہا ہے۔ اس لئے کہ سیاست میں دائیں بازو والے اس کے اہلِ وطن اس کے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ کو اور اس کی فنڈل کاسترو سے دوستی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

گارسیا سنہ ۲۸ء میں ایک چھوٹے سے ساحلی شہر "اراکاٹاکا" میں پیدا ہوا۔ اس کے بچپن میں وہ ایک دور افتادہ سی جگہ تھی، جہاں کبھی کبھی کھیل تماشے والے، مداری، جادوگر وغیرہ آتے رہتے تھے۔ اکثر ہفتے کی چھٹی کے دن، شراب، شور شرابہ اور مار دھاڑ کے واقعات اور قتل کی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔ یہی شہر بعد میں اس کے مشہور ناول "تنہائی کے سو سال" میں میکونڈ شہر بن کر نمودار ہوا۔ اس کے ناولوں میں بہت کچھ اسی شہر کے تجربات پر مبنی ہے۔

بچپن اس نے اسی شہر میں اپنی دادی کے ساتھ گزارا۔ لکڑی کے مکان میں جس کی ٹین کی چھت تھی اور جہاں آنے والوں کے لئے دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اس لئے کہ اس کے دادا کے سترہ بیٹے تھے جو مختلف شہروں میں بس گئے تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی چچا، تایا، بھائی، بھتیجا آتا رہتا تھا گھر پر عورتوں کی حکمرانی تھی۔ دن چھپتے ہی وہ گارسیا کو اپنے پاس لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور اندھیرے میں باہر نکلنے کو منع کرتی تھیں۔ مردوں کی روحوں سے، بھوت پریت سے ڈرا کر جلدی ہی سلا دیتی تھیں۔ اسی بچپن کی دین اس کا وہ تخیل ہے جو اس کے ناولوں میں جگہ جگہ ڈراؤنے ہیولے تراشتا ہے۔

اس کا ناول "تنہائی کے سو سال" ایک شہر کے آباد ہونے اور پھیلنے بڑھنے اور ایک خاندان کی چھ نسلیں گذرنے کی داستان ہے۔

ناول کے وسیع کینوس پر امریکہ کی دریافت، کولمبیا کی تاریخ اور گارسیا کے اپنے خاندان کی تفصیلات پھیلی پڑی ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اتنے وسیع تناظر کے اس ہسپانوی زبان کے کارنامے کے آگے آج کل کے انگریزی زبان کے ناول بہت ہی ہلکے پھلکے اور بے ریڑھ کے محسوس ہوتے ہیں۔

مشہور شاعر پیبلو نرودا کا خیال ہے کہ ہسپانوی زبان میں ایک عرصے کے بعد ایسی عظیم تصنیف وجود میں آئی ہے۔

انگریزی زبان کے پڑھنے والوں نے شروع شروع میں اس کے حسن و قبح کو اچھی طرح نہیں پہچانا لیکن اب آہستہ آہستہ اس کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ V. S. PRITCHETT گارسیا کو دنیا کے چند بڑے ادیبوں میں سے مانتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ حقیقت خیالی اندازے کی بُنت سے پلاٹ بنانے میں وہ بڑا ماہر فن کار ہے۔ اسے جذبات نگاری پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ اور اس کی صاف سیدھی سچی نثر ان کے ہاتھوں میں بہت آسانی کے ساتھ جگہ جگہ ایک بڑی شگفتہ سطح تک اٹھ جاتی ہے۔

گارسیا چند سال BARRAQUILLAH کے چھوٹے سے ساحلی شہر میں رہا ہے۔ وہ وہاں اخبار میں کام کرتا تھا اور ایک ہوٹل میں رہتا تھا۔ بیشتر شہری نیگرو باشندے تھے۔ بھیڑ بھاڑ، گندگی اور مفلسی عام تھی۔ اس کے ہوٹل میں رات کو طوائفیں آتی تھیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسران ان کے گاہک تھے۔ عیاشی کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں بھری زندگی کی مصروفیتوں سے تھک کر ان سے باتیں کرنے کے لئے۔

اس کے خیال میں "ناول لکھنے کے لئے یہ سب سے اچھی جگہ تھی کیوں کہ ادیب رات کو دلچسپ زندگی کی چہل پہل اور صبح کو خاموشی اور تنہائی چاہتا ہے"۔ ولیم فاکنر کہا کرتا تھا کہ فکشن رائٹر کو رنڈی خانے میں رہنا چاہیئے جہاں رات پڑتے ہی زندگی کے نرالے مناظر اور مست محفل کا ہنگامہ ہوتا ہے اور پھر صبح کو سناٹا۔

گارسیا کے ادبی مزاج پر کافکا، فاکنر اور اس کے دادا جو اسے عجیب عجیب لمبی کہانیاں سنایا کرتے تھے اثر انداز ہوئے ہیں۔

سیاسی نظریے کے اعتبار سے وہ سوشلسٹ ہے اور مستقبل میں دنیا میں سوشلسٹ سماج کی امید رکھتا ہے۔ لیکن ادب کے سلسلے میں اس کا خیال ہے کہ سیاسی نظریے کو براہِ راست ادب

میں گھونٹنے سے کبھی بھی اچھا ادب نہیں پیدا ہو سکتا اس لئے سیاسی طور پر فعال ادیب کو اس چیز سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔

اپنے سیاسی موقف کے سلسلے میں صرف زبانی جمع خرچ ہی نہیں بلکہ وہ مالی بار بھی برداشت کرتا ہے۔ انسانی حقوق کے لئے جدوجہد کرنے والے اداروں کو اپنے مقدور بھر مالی مدد دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ میں ایک کثیر الاولاد کلرک کا بیٹا ہوں اور تنگدستی کے بہت قریب سے گزرا ہوں۔ ☐

یادآوری کا شکریہ

● جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ء کا الفاظ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ رسالے میں اوراق کی تنگ دامانی نے شاید آپ کو جوش کی شاعری کا بھرپور انتخاب شایع کرنے سے روک لیا۔ لیکن اس کی تلافی اس طرح ہوسکتی ہے کہ آپ اپنے مکتبہ سے جوش کا ایک انتخاب شایع کریں جو تین چار سو صفحات پر مشتمل ہو۔ گوپی چند نارنگ، فارغ بخاری اور ڈاکٹر محمد عقیل کے مضامین جوش کی شاعری اور شخصیت کا اچھا تعارف ہیں۔ وہ بھی اپنے اختصار کی وجہ سے جوش کی پوری شاعری کا احاطہ نہ کرسکے۔ جوش کی رباعیاں خاصے کی چیز ہیں جن کی طرف ڈاکٹر وحید اختر نے اشارہ کیا ہے۔ ان رباعیوں میں جوش کے احساس وفکر کی مختلف جہات ہیں۔ اس صنف میں جوش کا شاعرانہ کمال عروج پر ہے۔ تشبیہ اور استعارے کی ندرت کے ساتھ ان کے احساس حسن کی لطافت جب شعروں میں ڈھلتی جاتی ہے تو اعجازِ سخن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ میری نظر سے انگریزی، فارسی، اردو، ہندی کی شاعری گزری ہے جس کو میں نے اصل زبان میں پڑھا ہے۔ ترجموں کی شکل میں دوسری زبانوں کی شاعری بھی دیکھی ہے لیکن ایسے مصرعے سامنے نہیں آئے "شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم"۔ جوش کی شاعری اور خاص طور سے رباعیوں کی صنف میں جسمانی حسن جنسیات کی سطح سے بلند ہوکر، اپنی جمالیاتی کیفیت کو برقرار رکھتا ہے مثلاً:

سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا　　ہونٹوں کا خفیف ابھار الٰہی توبہ

حیراں ہوں کہ کس طرح گلوں کی "خوشبو"　　"رخسارۂ جاناں" میں بدل جاتی ہے

گفتار میں کھل رہی ہے بیلے کی کلی　　رفتار مڑ رہی ہے ساون کی ندی

میرا خیال ہے کہ اگر جوش نے کچھ نہ کہا ہوتا تب بھی ان کی رباعیاں ان کے بڑے شاعر ہونے کی شہادت دینے کے لئے کافی تھیں۔ اپنی بعض رباعیوں میں جوش نے رندانہ انداز سے وہ باتیں کہی ہیں جو اقبال نے فلسفیانہ بلندی سے کہی ہیں۔ مثلاً اقبال کا مشہور شعر ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اب جوش کی اس رباعی کو ملاحظہ کیجئے ؎

کل رات گئے عین طرب کے ہنگام — سایہ وہ پڑا پشت سے آکر سرِ جام
تم کون ہو؟ جبریل ہوں۔ کیوں آئے ہو — سرکارِ فلک کے نام کوئی پیغام؟

دراصل جوش اور اقبال دونوں عظمتِ انسان کے شاعر ہیں۔ ان دونوں کے تصورِ زماں کا تقابلی مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا درجہ جوش سے بلند تر ہے لیکن اس کی وجہ سے جوش کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جوش کا علم اقبال کے علم سے کم تھا۔ لیکن وہ اتنے کم علم بھی نہیں تھے جتنا بعض نقاد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بڑا ظلم ہے کہ جوش کی ایک نظم کو جس میں یہ مصرعہ ہے "اب کھلا مجھ پر کہ میں طفلِ دبستاں ہوں ہنوز" یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جائے کہ انھیں خود اپنی کمیوں کا احساس اور اعتراف تھا۔ یہ بڑے شاعر کے انکسار کا ایک انداز ہے۔ اس طرح تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کو اس کا احساس تھا کہ وہ شاعر نہیں ہیں اور انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے خیالات پریشان ہیں اور یہ مصرعہ پیش کر دیا جائے کہ "مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ" یا "خوش کر گئی ہے جہاں کو قلندری میری / وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے"

میرے عزیز بھائی! یہ تنقید نہیں ہے بلکہ اپنے ذہنی تحفظات اور تعصبات کا اظہار ہے۔ دراصل اقبال اور جوش سے پہلے اردو شاعری کے پاس انقلابی شاعری کی کوئی روایت نہیں ہے اور ابھی ہمارے ذہنوں میں بہت سی فرسودگی کے جالے لگے ہوئے ہیں مگر کیا کیا جائے کہ ہماری "متاعِ عزیز" ابھی صرف اتنی ہی ہے۔

بہر حال آپ نے جو کام کیا ہے وہ قابلِ مبارکباد ہے۔ اس سے جوش کی نئی دریافت کا سلسلہ شروع ہوگا۔

سردار جعفری، بمبئی

● الفاظ کے تازہ شمارے کے اداریے میں اردو سے متعلق کئی مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ الفاظ میں اس سے پہلے بھی ان مسائل کو دوسرے عنوانات سے چھیڑا گیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ الفاظ کے خطوط کے کالم میں ایسے خطوط تو اکثر نظر آئے جن میں الفاظ کے ایک اچھے رسالے ہونے کی تعریف کی گئی یا الفاظ میں شایع ہونے والی تخلیقات کو سراہا گیا لیکن اداریوں پر اظہارِ خیال عام طور سے نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عام اردو والے پیشہ ور اردو دوستوں اور بہی خواہوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ میں اپنا شمار بھی انھیں عام اردو والوں میں کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کے حقوق کے تحفظ کا حق جن لوگوں نے اپنے نام محفوظ کرا لیا ہے وہی دراصل اردو کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ورنہ ساری اردو اکیڈیمیاں انعام تقسیم کرنے کے مقصد کو اردو کی خدمت نہ سمجھتیں اور اس کے سارے اراکین انعام دینے اور لینے کے لئے جوڑ توڑ کرتے نظر نہ آتے۔

اردو کا مستقبل اردو پڑھنے والوں سے خاص طور سے بچوں سے وابستہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پڑھنے کے لئے مواد کہاں ہے۔ کیا اردو میں ایسے رسالے اور کتابیں موجود ہیں جو آج کے بچوں کے تخیل اور ذہن کو اپیل کریں۔ معلوم نہیں اردو کے پیشہ ور دوستوں کو اس کا علم ہے کہ نہیں کہ آج کے بچے نصابی

کتابوں کے علاوہ بہت کچھ پڑھتے ہیں۔ ان میں کسی زبان سے کوئی تعصب نہیں ہے۔ ان کا مطالبہ بس اتنا ہے کہ کتابیں خوبصورت ہوں اور دلچسپ ہوں۔ یہ بات کتنے سامنے کی ہے لیکن ہم اردو والے شاید جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کرتے ہوئے ہیں۔ اردو کا مستقبل سیاسی جماعتوں سے نہیں، بچوں سے وابستہ ہے۔ اور بچوں میں اردو سے محبت صرف اچھے اور خوبصورت رسالوں سے، کتابوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ کاش اردو اکیڈیمیاں اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور اس کام کو ایک اسکیم کے تحت آپس میں تقسیم کر لیں اور اگلے دس سال تک صرف بچوں کے ادب کی اشاعت پر توجہ دیں کہ کوئی پرائیوٹ ادارہ اس طرف توجہ دینے سے رہا۔

حکومت سے شکوہ شکایت کرتے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ہمارے پاس جو وسائل ہیں ان کے صحیح استعمال کی ذمہ داری تو صرف ہم پر عائد ہوتی ہے۔

شہریار

تبصرے

[تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں ادارہ تبصرہ شایع کرنے سے معذور ہوگا۔ ادارہ]

اردو ادب کی تاریخ ○ عظیم الحق جنیدی ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ○

۹ روپے۔

مرحوم عظیم الحق جنیدی ایک تجربہ کار استاد تھے۔ انھوں نے طلبہ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں مرتب کیں۔ ان میں سب سے اہم اردو ادب کی یہ تاریخ ہے جو آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا جو تازہ ترین ایڈیشن اس وقت پیش نظر ہے اس میں ایک مفید اضافہ کیا گیا ہے۔ مختلف امتحانات میں تاریخ ادب کے سوال ناموں میں جو سوالات اکثر دہرائے جاتے ہیں اس بار ان عنوانات پر زیادہ تفصیل پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس ایڈیشن میں اہم اصناف ادب، اہم تحریکات اور اہم مصنفین کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس طرح کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ تاریخ ادب کی یہ مختصر کتاب طلبہ میں بہت مقبول رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تبدیلی کے بعد اس کتاب کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوگا۔

غالب اور صفیر بلگرامی ○ ڈاکٹر مشفق خواجہ ○ عصری مطبوعات کراچی ○

پچیس روپے۔

جناب مشفق خواجہ نے ہمارے ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے اب سے کوئی بارہ برس پہلے انھوں نے غالب اور صفیر بلگرامی کے باہمی تعلقات پر ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو "صحیفہ" لاہور کے غالب نمبر میں شایع ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس مضمون کی اشاعت کے بعد بھی خواجہ صاحب اس موضوع پر مواد فراہم کرتے اور اس پر غور کرتے رہے جس کے نتیجے میں یہ کتاب وجود میں آئی۔

صفیر بلگرامی کی حیثیت صرف تلمیذ غالب ہی کی نہیں بلکہ انھوں نے کئی حیثیتوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ اس لئے یہ کتاب اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے غالب و صفیر کے تعلقات کی نوعیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان جو مراسلت ہوئی وہ

بھی اس کتاب میں موجود ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں جہاں کہیں اظہار خیال کیا اسے بھی یک جا کر دیا گیا ہے۔ تلاش و تحقیق خواجہ صاحب کا مزاج ہے چنانچہ انھوں نے فراہمی مواد کے سلسلے میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ نادر مخطوطات سے بھی استفادہ کیا ہے اور حسب ضرورت مفید حواشی کا اضافہ کر کے اپنی اس تصنیف کو ایک اہم تحقیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔

اردو قصیدہ نگاری ○ ڈاکٹر ام ہانی اشرف ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ○ پینتیس روپے۔

ڈاکٹر ام ہانی اشرف نے ڈاکٹریٹ کے لیے اردو قصیدہ نگاری پر کام کیا ہے۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں انھیں اردو قصائد اور ان پر لکھے گئے مضامین کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے کے اہم مضامین کا انتخاب کر کے انھیں ایک مجموعہ مضامین کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس سے اردو قصیدہ نگاری کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ اس مجموعے میں بیس مضامین شامل ہیں اور لکھنے والوں میں حالی، شبلی، عبدالسلام ندوی، پروفیسر محمود الہٰی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر ابو محمد سحر، مولانا ضیا احمد بدایونی جیسے معتبر اہل قلم شامل ہیں۔ یقین ہے اردو ادب کے طلبہ اس مجموعے سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

بوئے سمن ○ مسعودہ حیات ○ رانی کتاب گھر دہلی ○ بیس روپے۔

"بوئے سمن" ایک نو عمر شاعرہ کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے لیکن پہلی غزل پر نظر پڑتے ہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاعرہ کا فنی شعور پوری طرح تربیت یافتہ اور جمالیاتی احساس پختہ ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اساتذہ و معاصرین کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اپنی شعر گوئی کی اس مختصر عمر میں خاصی مشق بہم پہنچالی ہے۔ زیر نظر مجموعے میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں بھی شامل ہیں لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت غزل سے ہی ہے۔ ان کی غزل فلسفہ طرازی سے مبرا نظر آتی ہے۔ غزل میں یوں بھی کسی خاص فلسفے و نظریے کی پابندی مشکل ہے تاہم ان کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں جن میں عصری حسیت کسی نہ کسی درجے میں موجود ہے۔ اس رسالے کے مختصر صفحات متحمل ہو سکتے تو ہم ان کے کلام سے کچھ شعر یہاں ضرور نقل کرتے۔

در دل کشا ○ منظور الہٰی ○ فیروز سنس لمیٹڈ، لاہور ○ ۱۵ روپے۔

اس کتاب کو نہ مجموعہ مضامین کا نام دیا جا سکتا ہے، نہ اسے سفرنامہ کہا جا سکتا ہے اور نہ انشائیوں کا مجموعہ۔ مصنف کو قدرت نے اپنی ساری نعمتوں سے نوازا۔ اعلیٰ تعلیم، سیر و سیاحت، طرح طرح کے لوگوں سے رسم و راہ۔ تاریخ و ادب کے مطالعے کا ذوق بچپن میں پیدا ہوا۔ فوجی ملازمت

ہیں قدم رکھا تو مختلف ملکوں اور قوموں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر جب قلم ہاتھ میں لیا تو ان سب چیزوں نے مل کر تحریر میں گہرائی اور جاذبیت پیدا کر دی۔ جب بھی مصنف کے پیش نظر کوئی اہم شخصیت یا کوئی اہم شے ہو ــــ خواہ وہ کسی قوم کا رہنما ہو، کوئی تاریخی عمارت ہو، کوئی بھلا شہر ہو تو اس کے ذہن کی رو بہک نکلتی ہے کبھی وہ ماضی کی دنیا میں کہیں بہت دور جا پہنچتا ہے۔ تو کبھی مستقبل کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے موضوعات متنوع ہیں اور انداز بیان ایسا دلکش و پر اثر کہ "گلستان اندلس کا ذکر ہو" سونار دیش کا بیان ہو یا قرۃ العین طاہرہ کا تصور ہو قاری مصنف کے ساتھ دور و دراز کے سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔

روزن دیوار سے ○ عطاء الحق قاسمی ○ مطبوعات، لاہور ○ تیس روپے۔

عطاء الحق قاسمی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ کالم نویس بھی ہیں اور "روزنِ دیوار سے" ان کالموں کا انتخاب ہے جو وہ 'نوائے وقت' میں لکھتے رہے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس اخبار کی مقبولیت میں ان کالموں سے اضافہ ہوا۔ طنزیہ و مزاحیہ کالم کی زندگی بے حد مختصر اور بالعموم یک روزہ ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی کالم نویس کے قلم سے ایسی تحریر بھی نکل جاتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی بہت سی تحریریں ایسی ہیں جنھیں سدا بہار کہا جا سکتا ہے۔ ان کا طنز بڑا بھرپور اور کارگر ہوتا ہے۔ زباں پہ مہر لگ جائے تو انسان اشارے کنایے سے کام لیتا ہے ادب میں حسن اسی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کے طفیل بہت سی تحریریں زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ کسی اور بھائی کو اعتراض، براستہ بیڈن روڈ طوطے ای طوطے وغیرہ اسی طرح کی تحریریں ہیں جن کی تازگی کبھی کم نہ ہو گی۔

نساخ ــــ حیات و تصنیف ○ ڈاکٹر محمد صدر الحق ○ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ○ تیس روپے

نساخ اردو کے ایک باصلاحیت ادیب و تذکرہ نویس ہیں۔ غالب نے صرف ان کے نام خطوط ہی نہیں لکھے بلکہ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا۔ ان کا تذکرہ سخن شعرا ہماری قدیم شاعری کے مطالعے میں آج بھی معاون و مددگار ہے لیکن وہ جس توجہ کے مستحق تھے اس سے محروم رہے ڈاکٹر محمد صدر الحق نے ان کی حیات و تصنیف کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنا کر اس بے توجہی کا ازالہ کیا ہے۔

ڈاکٹر حق نے بڑی تلاش کے بعد ان کی جملہ کتابوں تک رسائی حاصل کی، عرق ریزی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا اور انھیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ انھوں نے نساخ کی زندگی اور علمی کارناموں

کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ نساخ نے "انتخاب نقص" میں شعرائے لکھنؤ کے کلام پر نکتہ چینی کی تھی تو اس زمانے کے ادبی حلقوں میں اعتراضات جوابات کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا تھا۔ ڈاکٹر حق نے اس سلسلے کے تمام مباحث کو یکجا کر کے ان پر محاکمہ کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے گو تاخیر سے ہی سہی۔

سلہٹ میں اردو ○ محمد عبدالجلیل بسمل ○ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ○ چالیس روپے۔

سلہٹ آسام کا ایک ضلع تھا جہاں آٹھویں صدی میں اسلام کی کرنیں پہنچیں، علم و ادب کو فروغ ہوا اور اس کے ساتھ ہی وہاں اردو کی جڑیں مستحکم ہونے لگیں۔ تقسیم ملک کے بعد یہ ضلع مشرقی پاکستان کا ایک حصہ بن گیا اور وہاں اردو کی ترقی جاری رہی۔ اس دور افتادہ علاقے میں اردو کی طرح نشو و نما ہوئی، کن ادیبوں اور شاعروں نے اس کی آبیاری کی اس پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی۔ محمد عبدالجلیل بسمل نے آخر کار اس کام کا بیڑا اٹھایا اور بہت چھان بین کے بعد سلہٹ کے ادیبوں، شاعروں اور وہاں کے اداروں سے متعلق جملہ معلومات سلیقے سے یکجا کر دی۔ اس کام کے لئے وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔

ماخذات (احوال شعرا و مشاہیر) ○ سرفراز علی رضوی ○ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

ماخذات ایک اہم، بنیادی مگر بے حد مشکل کام کا آغاز ہے۔ اگر یہ کام تکمیل کو پہنچ سکا تو یہ اردو کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس سے تحقیقی کاموں میں سہولت ہو جائے گی۔ رضوی صاحب نے مشاہیر اور شعرا کے نام یا تخلص حروف تہجی کے لحاظ سے یکجا کر دیئے ہیں اور ہر ایک کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کر کے تفصیلی معلومات کے ماخذ کی نشاندہی کر دی ہے۔ دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ابھی الف سے شروع ہونے والے نام بھی تکمیل کو نہیں پہنچے۔ گویا ابھی منزل دور ہے اور جو کام ایک جماعت کے کرنے کا ہے وہ رضوی صاحب تنہا انجام دے رہے ہیں۔ خدا کرے ان کے حوصلے بلند رہیں اور یہ اہم کام اختتام کو پہنچے۔

ششماہی افکار علی گڑھ ○ مدیر: ابوالکلام قاسمی ○ ایک شمارہ ۱۵ روپے، دو شمارے ۲۵ روپے

دو سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل "افکار" کا پہلا ضخیم شمارہ پیش نظر ہے۔ سرورق پر اسے غیر مطبوعہ اہم تحریروں کا کتابی سلسلہ کہا گیا ہے اور اسی مناسبت سے ۱۸×۲۲ سائز منتخب کیا گیا ہے۔ ادار

میں مدیر نے ادبی صورت حال، معاشرتی معاملات، تعلیمی ماحول، سیاسی حالات سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے یہ سوال کیا ہے کہ کیا ان حالات میں ایسے انکار کی ضرورت نہیں جو ہمیں ان نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کر سکے۔

اس شمارے میں ایک رپورتاژ، پانچ افسانے، دس شعری تخلیقات کے علاوہ، امکانات کے تحت کئی ابھرتے ہوئے فنکاروں کی تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ 'مباحث' کے عنوان سے دانشوری کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں کئی کتابوں پر تفصیلی اور دیانت دارانہ تبصرے شامل ہیں۔ امید ہے "انکار" پابندی سے نکلتا رہے گا اور اس معیار کو برقرار رکھے گا۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک ○ پروفیسر خلیق احمد نظامی ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۴۵/۔۔

سرسید اور علی گڑھ تحریک سے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا شغف بہت پرانا ہے۔ اس سلسلے کا جتنا ذخیرہ یہاں بے ترتیبی کی حالت میں موجود تھا اس کی ورق گردانی میں انھوں نے برسوں صرف کئے اور اپنے تحقیقی مضامین سے سرسید کے کارناموں کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی لیکن ان کا اس سے بھی اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پچھلی چوتھائی صدی اس کوشش میں صرف کی کہ مسلمانوں کی جدید نسل بالخصوص علی گڑھ میں زیر تعلیم نوجوان سرسید کی ناقابل فراموش خدمات اور عہد آفریں کارنامے سے کسی طرح روشناس ہو جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے علمی و تحقیقی اور ان کے پہلو بہ پہلو مختصر پر اثر معلوماتی مضامین لکھے۔ ایک شیڈو پلے (SHADOW PLAY) ترتیب دیا جس کی اپیل وسیع ترتھی۔ اس میں سرسید طلبۂ علی گڑھ سے خطاب کرتے تھے۔ یہ آواز نوجوانانِ علی گڑھ کے کانوں میں برسوں گونجتی رہی۔ "سرسید علی گڑھ تحریک" میں یہ ڈراما بھی شامل ہے اور پندرہ دیگر مضامین و تقاریر بھی۔

سرسید احمد خاں اور جمال الدین افغانی، سرسید احمد خاں، شخصیت اور کارنامے، سرسید اور عصر جدید کے تقاضے، علی گڑھ کی علمی خدمات، علمی اور تحقیقی مضامین ہیں جو بہت پہلے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سرسید اور ان کے جانشین وہ شیڈو پلے ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ بعض تعارفی تقریریں ہیں جن کا انداز دل نشین ہے اور جن کا مقصد یہ تھا کہ فرزندان علی گڑھ اپنی مادر درس گاہ کے بانی اور اس کی شروع کی ہوئی تحریک سے روشناس ہو سکیں۔ چند مضامین کا انداز افسانوی ہے اور یہاں بھی یہی خواہش کارفرما ہے کہ کسی طرح قوم کے نونہال سرسید کے سوز جگر سے مالا مال ہو جائیں۔ یقین ہے کہ اس کتاب کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

روشنی کی رفتار (افسانوں کا مجموعہ) ○ قرۃ العین حیدر ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۳۰/۔۔

"روشنی کی رفتار" قرۃ العین حیدر کے اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر حال ہی میں لکھے گئے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ جدید اردو افسانے میں قرۃ العین حیدر کو قابلِ رشک مقام حاصل ہے۔ افسانے کے بعض ناقدین جدید اردو افسانے کا نقطۂ آغاز منٹو کے "پھندنے" کو قرار دیتے ہیں اور بعض اس سے بھی پیچھے جا کر پریم چند کے "کفن" کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن جس افسانہ نگار نے اردو افسانے کو تجریدی تجربوں کے فنکارانہ اظہار کے قابل بنایا اور اسے فکری بعد عطا کیا وہ بلاشبہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ مغربی ادب پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ مغرب کے کئی فنکاروں سے متاثر نظر آتی ہیں۔ کرداروں کی ذہنی فضا کی پیش کش میں وہ منفرد ہیں۔ ان کے بیشتر کردار شعور کی رو کے سہارے ماضی کی بے کراں وسعتوں میں سفر کرتے کرتے بہت دور تک جا پہنچتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اردو فکشن کو وقت کا مابعد الطبیعاتی تصور عطا کیا۔ جس کے سہارے ہزاروں سال میں پھیلی ہوئی زندگی چند صفحات اور بعض اوقات چند سطروں میں سمٹ آتی ہے۔

"روشنی کی رفتار" میں شامل زیادہ تر افسانے علامتی ہیں۔ سینٹ فلورا (سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات) اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہوئے خدائے تعالیٰ سے مخاطب ہوتی ہے "خداوند قدوس! تو خوب واقف ہے میں لاعلم تھی کہ یہ کون سی صدی ہے، کون سا مہینہ اور دن۔ میں اپنے کھلے تابوت میں خوابیدہ تھی جب تیرے کسی فرشتے کا روپہلا پر میری ہڈیوں سے ٹکرایا اور میں اٹھ بیٹھی۔ میری کھوپڑی پائنتی پڑی تھی۔ نیچے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا۔ اس کی گرد جھاڑی اور گردن میں فٹ کیا۔ گھپ اندھیرا تھا کھوپڑی غلط فٹ ہو گئی۔ یہ افسانے جدید ہونے کے باوجود بے حد پُرکشش ہیں اور ان میں دلچسپی کے عنصر کے پہلو بہ پہلو نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے نئے افسانوں کے یکجا شائع ہونے کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے خوبصورت کتابت اور عمدہ طباعت کے ساتھ اسے شائع کر کے طویل انتظار کی تلافی کر دی ہے۔

ضدی ○ عصمت چغتائی ○ مکتبہ الفاظ، علی گڑھ ○ قیمت : ۱۲/۰۰

"ضدی" عصمت چغتائی کا پہلا ناول ہے۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب عصمت کا فنی شعور پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا لیکن ان کی تحریر میں وہ فنکار انگڑائیاں لینے لگا تھا جس کے ہاتھوں "ٹیڑھی لکیر" سا مقبول ناول وجود میں آنے والا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان پر ترقی پسند تحریک کا غلبہ تھا۔ چنانچہ اس میں آشا کا المیہ بیان کیا گیا ہے جو نادار ہے۔ اس لئے امیروں کے محل میں اس کے لئے گنجائش نہیں۔ پورن اسے چاہتا ہے مگر سرمایہ داری کے مضبوط ہاتھ اسے پیش قدمی سے باز رکھتے ہیں۔ اس میں غربت و امارت کی کشمکش دکھائی گئی ہے لیکن یہ ایک اوسط درجے کے رومانی ناول سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ زبان و بیان پر عصمت کی گرفت یہاں پوری طرح نمایاں ہے۔ مصنف نے اس ناول میں کردار نگاری پر بہت زور دیا ہے اور پورن جیسا توانا کردار پیش کرنے میں کامیاب

ہوئی ہیں۔ عصمت کے فن کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ "ضدی" کچھ عرصہ سے نایاب تھا۔ مکتبہ الفاظ نے اس ناول کو شائع کر کے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اقبال ــ شاعر اور فلسفی ○ سید وقار عظیم ○ مکتبہ الفاظ، علی گڑھ ○ قیمت: ۲۰/۰۰

سید وقار عظیم اردو کے ایک فرض شناس معلم ہیں۔ تدریس کی طویل مدت میں انھیں کلام اقبال کے تمام پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے غور کرنے کا موقع ملا۔ اس غور و فکر کے نتائج کو وہ بالعموم مضامین کی شکل دیتے رہے اور یہ مضامین رسائل میں شائع ہوتے رہے بعد ازاں انھیں یکجا کر کے اس کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان میں سے بیشتر مضامین مختصر ہیں اور چونکہ یہ طلبہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھے گئے۔ اس لئے سہل اور واضح طرز تحریر اختیار کیا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ مضامین میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کا فلسفہ یقیناً اہم اور قابل قدر تھا لیکن وہ محض فلسفی نہ تھے بلکہ فلسفی سے پہلے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی فکر کو زیادہ سے زیادہ دل نشیں اور پر اثر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے کلام کے بیشتر حصے میں فکر و فن کی مکمل ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ کلام اقبال کے مطالعے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوئی ہے۔

اردو لسانیات ○ شوکت سبزواری ○ مکتبہ الفاظ، علی گڑھ ○ قیمت: ۱۲/۰۰

زمانۂ حال میں علم لسانیات نے بہت ترقی کی ہے اور زبان کے ارتقا کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملی ہے۔ علمائے لسانیات اسے دو شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات۔ کسی زبان کا پورا عرفان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کسی زبان کے مطالعے میں ان دونوں شاخوں سے کام نہ لیا جائے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو لسانیات کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کئی توسیعی خطبات بھی شامل ہیں۔ پہلے تین مضامین (اردو کی اصل اور اس کی ابتدا، اردو زبان کا ارتقا، اردو کی ساخت اور اس کی سرشت) زبان اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق نہایت اہم مقالات ہیں۔ اس کے بعد جو ایک درجن مضامین شامل کتاب ہیں ان میں ہماری زبان کی بنیادی خصوصیات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اندیشہ تھا کہ اس موضوع پر لکھے گئے مضامین مشکل اصطلاحات سے گرانبار ہو جاتے لیکن مصنف نے انھیں آسان اور اردو ادب کے طالب علموں کے لئے قابل فہم اور دل نشیں بنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی ایک فرہنگ شامل کر دی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ مختصر کتاب اردو لسانیات کے مطالعے کے لئے بہت مفید ہے۔

خطوط غالب (فنی تجزیہ) ○ حامدہ مسعود ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۲۰/۰۰

"خاکم بدہن اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب ہوتے تو بھی اردو ادب میں غالب کا وہی مقام ہوتا جو آج ہے۔" ہمارے ایک نقاد نے خطوطِ غالب کے بارے میں یہ بہت سچی بات کہی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس فارسی دانی اور فارسی شاعری پر وہ ساری زندگی ناز کرتے رہے وہ ان کے قد میں ذرا سا بھی اضافہ نہ کر سکی اور جس کام کو انھوں نے دل لگا کر نہ کیا وہ ان کے بقائے دوام کا ضامن بن گیا۔ ان خطوط کی اردو ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ حیاتِ غالب کی مکمل کتاب بھی ہیں اور عہدِ غالب کی تاریخ بھی۔ جدید اردو نثر کا ذکر چلے تو بات بہر حال خطوطِ غالب تک پہنچتی ہے لیکن یہ خطوط جس توجہ کے طالب تھے اس سے آج تک محروم ہیں۔ ان کا حق ادا کرنے کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہیں۔ محترمہ حامدہ مسعود نے اس طرف توجہ کی اور کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا اور اہم نتائج اخذ کئے۔ اس کتاب میں انھوں نے خطوطِ غالب کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ غالبیات میں اس کتاب کو ایک اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

—— نورالحسن نقوی

ہوئی ہیں۔ عصمت کے فن کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے اس ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔ "ضدی" ایک عرصہ سے نایاب تھا۔ کتبہ الفاظ نے اس ناول کو شائع کرکے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اقبال — شاعر اور فلسفی ○ سید وقار عظیم ○ کتبہ الفاظ، علی گڑھ ○ قیمت: ۲۰/۰۰

سید وقار عظیم اردو کے ایک فرض شناس معلم ہیں۔ تدریس کی طویل مدت میں انھیں کلام اقبال کے تمام پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے غور کرنے کا موقع ملا۔ اس غور و فکر کے نتائج کو وہ بالعموم مضامین کی شکل دیتے رہے اور یہ مضامین رسائل میں شائع ہوتے رہے بعد ازاں انھیں یکجا کرکے اس کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان میں سے بیشتر مضامین مختصر ہیں اور چونکہ یہ طلبہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے لکھے گئے۔ اس لئے سہل اور واضح طرز تحریر اختیار کیا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ مضامین میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کا فلسفہ یقیناً اہم اور قابل قدر تھا لیکن وہ محض فلسفی نہ تھے بلکہ فلسفی سے پہلے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی فکر کو زیادہ سے زیادہ دل نشیں اور پر اثر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے کلام کے بیشتر حصے میں فکر و فن کی مکمل ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ کلام اقبال کے مطالعے میں یہ کتاب معاون ثابت ہوئی ہے۔

اردو لسانیات ○ شوکت سبزواری ○ کتبہ الفاظ، علی گڑھ ○ قیمت: ۱۲/۰۰

زمانۂ حال میں علم لسانیات نے بہت ترقی کی ہے اور زبان کے ارتقا کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملی ہے۔ علمائے لسانیات اسے دو شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات۔ کسی زبان کا پورا عرفان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کسی زبان کے مطالعے میں ان دونوں شاخوں سے کام نہ لیا جائے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو لسانیات کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کئی توسیعی خطبات بھی شامل ہیں۔ پہلے تین مضامین (اردو کی اصل اور اس کی ابتدا، اردو زبان کا ارتقا، اردو کی ساخت اور اس کی سرشت از زبان اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق نہایت اہم مقالات ہیں۔ اس کے بعد جو ایک درجن مضامین شامل کتاب ہیں ان میں ہماری زبان کی بنیادی خصوصیات کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اندیشہ تھا کہ اس موضوع پر لکھے گئے مضامین مشکل اصطلاحات سے گرانبار ہو جاتے لیکن مصنف نے انھیں آسان اور اردو ادب کے طالب علموں کے لئے قابل فہم اور دل نشیں بنانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی ایک فرہنگ شامل کر دی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ مختصر کتاب اردو لسانیات کے مطالعے کے لئے بہت مفید ہے۔

خطوط غالب (فنی تجزیہ) ○ حامدہ مسعود ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ○ قیمت: ۰۰/

"تاہم بدرجہ اگر دیوان غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب ہوتے تو بھی اردو ادب میں غالب کا وہی مقام ہوتا جو آج ہے۔" ہمارے ایک نقاد نے خطوطِ غالب کے بارے میں یہ بہت سچی بات کہی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس فارسی دانی اور فارسی شاعری پر وہ ساری زندگی ناز کرتے رہے وہ ان کے قد میں ذرا سا بھی اضافہ نہ کر سکی اور جس کام کو انھوں نے دل لگا کر نہ کیا وہ ان کے بقائے دوام کا ضامن بن گیا۔ ان خطوط کی اردو ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ یہ حیات غالب کی مکمل کتاب بھی ہیں اور عہد غالب کی تاریخ بھی۔ جدید اردو نثر کا ذکر چلے تو بات بہر حال خطوط غالب تک پہنچتی ہے لیکن یہ خطوط جس توجہ کے طالب تھے اس سے کچھ تک محروم ہیں۔ ان کا حق ادا کرنے کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہیں۔ محترمہ حامدہ مسعود نے اس طرف توجہ کی اور کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غالب کے قلم سے نکلی ہوئی ایک ایک سطر کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور اہم نتائج اخذ کئے۔ اس کتاب میں انھوں نے خطوطِ غالب کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ غالبیات میں اس کتاب کو ایک اہم اضافہ قرار دینا بجا ہے۔

—— نورالحسن نقوی

ں عہد کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض کے مجموعے پہلی بار ہندوستان میں خوشنما فوٹو آفسٹ سے

کلامِ فیض (عکسی)

فیض احمد فیض

- فیض کے مجموعوں کو ترتیب وار پیش کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ مجموعوں کی ترتیب میں کتابوں کی انفرادی حیثیت بھی قائم رہے۔
- کلامِ فیض نہایت عمدہ فوٹو آفسٹ کتابت و طباعت سے دیدہ زیب انداز میں آفسٹ کاغذ پر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔
- کلامِ فیض میں نقشِ فریادی ۔ دستِ صبا ۔ زنداں نامہ اور دستِ تہِ سنگ شامل ہیں۔
- چاروں مجموعوں کے مسودات کی تصحیح فیض صاحب کی ہدایت کے مطابق کی گئی ہے۔
- کلامِ فیض ہم نے "کلیاتِ اقبال" کے انداز پر فوٹو آفسٹ سے شائع کیا ہے۔ قیمت -/۲۰

نقشِ فریادی (عکسی)

فیض احمد فیض

پہلا مجموعۂ کلام جس نے فیض کو دنیائے شاعری میں امتیاز کے ساتھ متعارف کرایا۔ یہ مجموعہ متعدد بار شائع ہوا ہے۔ اب ہم نے فیض کی نظرثانی کے بعد فوٹو آفسٹ سے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔ قیمت -/۶

دستِ صبا (عکسی)

فیض احمد فیض

دوسرا مجموعۂ کلام جو بیشتر قید و بند کے عالم وجود میں آیا۔ اس مجموعے کا شعری حسن صعوبتوں کی میں کندن بنا ہے فیض کی نظرثانی کے ساتھ فوٹو آفسٹ سے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا گیا ہے قیمت

زنداں نامہ (عکسی)

فیض احمد فیض

فیض کا تیسرا مجموعۂ کلام بھی جیل کی چہار دیواری میں مرتب ہوا اور اپنے فنی معیار و فکری اظہار کے سبب بے حد مقبول ہوا۔ ہم نے اسے فیض کی اپنی ترتیب کے مطابق فوٹو آفسٹ کے ذریعے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔ قیمت ۷/۵۰

دستِ تہِ سنگ (عکسی)

فیض احمد فیض

چوتھا مجموعۂ کلام جو زندگی کے نشیب و فراز سے اور انسان کے بارے میں وسیع تجربات کا نمائندہ مجموعے سے فیض کی فکری و فنی بالیدگی آشکار ہوتی نے اسے فیض کی منظور کردہ ترتیب کے مطابق فوٹو آفسٹ ذریعے انتہائی دلکش انداز میں شائع کیا ہے۔ قیم

ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

Regd. No. L. ALG/91 Nov., Dec. 1982

ALFAZ Aligarh

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 29123/76